PAKSOCIETY.COM
ماہنامہ
کرن
فروری 2012
افسانہ نمبر
اس شمارے کے ساتھ
کرن کتابچہ
www.Paksociety.com

## انٹرویو



## ناول



## مکمل ناول



## ناولٹ



## افسانے




زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

| | |
|---|---|
| پاکستان (سالانہ) | 600 روپے |
| ایشیا، افریقہ، یورپ | 5000 روپے |
| امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا | 6000 روپے |




## مستقل سلسلے



فروری 2012

جلد 34 شمارہ 11

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی



Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ربیع الاول کے مہینے کو سرورِ کائنات، فخرِ موجودات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص نسبت ہے۔
قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے مقاصد اس طرح بیان فرمائے ہیں۔

"ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے۔ تمہاری زندگیاں سنوارتا ہے۔ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، آپ کا پیغامِ ہدایت، آپ کا عطا کردہ دین اور نظام عدل اجتماعی پوری انسانیت کے لیے رہنما ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کے تہ در تہ اسرار اور اوصافِ حمیدہ کی صداقت اور سچائی ذہنِ انسانی پر تاقیامت منکشف ہوتی رہے گی۔ ہر آنے والا وقت اس کی گواہی دیتا رہے گا۔

انسانی زندگی کا کوئی گوشہ، دنیا کا کوئی خطہ اور وقت و زمانے کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں بنی نوع انسان کو درپیش مسائل کے حل کے لیے نظامِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں رہنما اصول نہ ملتے ہوں۔ آپ کے ذریعے ہدایت کی جو روشنی پھیلی وہ انسانیت کے ہر طبقے کے لیے مکمل رہنمائی ہے لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اسی قرآن و سنت کے مطابق اپنی زندگی کا راستہ طے کریں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

## سالگرہ نمبر،

اس شمارے کے ساتھ کرن نے اپنی عمرِ عزیز کے چونتیس سال مکمل کر لیے ہیں۔ اگلا شمارہ یعنی مارچ کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں مصنفین اور قارئین سے گزارش ہے کہ اپنی تحریریں ہمیں جلد از جلد روانہ کر دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں شاملِ اشاعت ہو سکیں۔

## اس شمارے میں،

- اداکار "کنور ارسلان" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "امبر ارشد" دھنک کے بہاڑے کے ساتھ،
- "مجھ سے ملیے" میں "صائمہ اکرم چوہدری" اپنے بارے میں کیا کہتی ہیں۔
- اداکار "عابد علی" قارئین کی عدالت میں،
- آر جے "فضا علی عابد" آواز کی دُنیا سے،
- "دستِ کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "دردِ دل" نمیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "اور بے پیا" نایاب جیلانی کا طویل مکمل ناول،
- مقیدِ خاک"، صوبارہ ساحر کا طویل مکمل ناول،
- "سحر ہونے کو ہے" عنیزہ گل کا ناولٹ،
- رودادِ قفس کے سلسلے کی نئی کہانی صوفیہ سرور کے قلم سے،
- شہزادی عباس، آسیہ اکبر، سعدیہ غزل، ام ثمامہ، قرۃ العین چنا، نفیسہ سعید، فرخ فاطمہ، شمہ فیصل اور سمیرا حمید کے افسانے اور مستقل سلسلے،

## ہفت،

کرن کتاب "چائنیز ذائقے" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت پیشِ خدمت ہے۔ استفادہ کریں۔



# حمد باری تعالیٰ

جو دِل کی آنکھیں کُھلیں ہم کو یہ ہوا معلوم
وہ راز جان گئے جو نہ پہلے تھا معلوم

گناہ گارِ ازل ہوں سرشت میں ہے خطا
تجھے تو میرے خُدا سب ہے ماجرا معلوم

خُدا کی ذات کو کیا سمجھے عقلِ انسانی
ابھی تو اپنی ہی ہستی کا راز نامعلوم

خدا کی ذات کے مُنکر رہے یہ بھول ہوئی
اجل کا وقت جو آیا تو ہو گیا معلوم

نہیں ہے تُو ابھی رازِ حیات سے واقف
تجھے وجودِ عدم کا ہے کیا پتا معلوم

جو حال پھُول کا پوچھا کلی سے بُلبل نے
لگی وہ کہنے مجھے کیا پتا، خدا معلوم

تنویر پھول،

# نعت رسول مقبولؐ

لازم ہے اس سے پہلے کہ نعتِ نبیؐ لکھوں
جو کچھ لکھا ہے کچھ نہیں لکھا یہی لکھوں

پاسِ ادب میں جنبشِ لب کی کہاں مجال
اور شوقِ مدح اس پہ مُصر ہے ابھی لکھوں

وہ کائنات علم ہیں، وہ علمِ کائنات
منجملۂ صفات لکھوں تو یہی لکھوں

جو ان سے آشنا ہوا، حق آشنا ہوا
آگاہی نبیؐ کو خُدا آگہی لکھوں

یارب عطا وہ ذہنِ رسا ہو کہ نعت میں
جو ماورائے فکر ہے وہ بھی کبھی لکھوں

اس جزوِ نورِ کُل سے ہے تابندگی تمام!
میں کیوں نہ اس کے سائے کو بھی روشنی لکھوں

محسن بھوپالی،

# کنور ارسلان سے ملاقات

شاہین رشید

ہر ڈرامہ سیریل میں ایک نہ ایک نیا چہرہ ضرور ہوتا ہے کچھ چہرے جلدی متاثر کر جاتے ہیں اور کچھ کو ٹائم لگتا ہے۔ اصل میں اس فیلڈ میں اچھی شکل کا ہونا تو ضروری ہے ہی لیکن اس سے بھی زیادہ صلاحیت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ صلاحیت نہ ہو تو وہ اچھی شکل بھی بری لگ رہی ہوتی ہے۔ لہٰذا دونوں باتوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کنور ارسلان شوبز کا نیا چہرہ ہیں باصلاحیت ہیں مگر ابھی انہیں بہت محنت کی ضرورت ہے۔ اب تک انہوں نے جتنا کام کیا ہے، بہتر کیا ہے اور انہیں اسی طرح کام ملتا رہا تو یقیناً" اپنے آپ کو ایک دن منوالیں گے۔ ان سے گفتگو ہوئی جو نذر قارئین ہے۔

★ "کیسے ہیں کنور ارسلان؟"

✳ "جی اللہ کا شکر ہے۔"

★ "آج کل کیا مصروفیات ہیں۔ اس کے بارے میں تو بعد میں پوچھیں گے۔ پہلے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

✳ "جی فیملی بیک گراؤنڈ کچھ یوں ہے کہ ہم راجپوت ہیں اور اردو اسپیکنگ ہیں۔ میرے والد کا نام ظفر اقبال ہے اور وہ بینکر ہیں۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ میرا نام جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کنور ارسلان ہے اور سب مجھے کنور کے نام سے ہی بلاتے ہیں اور میں 27 اکتوبر 1985ء میں اسلام آباد میں پیدا ہوا اور میرا ستارہ اسکارپیو ہے اور میں گریجویٹ ہوں۔"

★ "بہن بھائی اور آپ کا نمبر اور کیا بیچلر ہیں؟"

✳ "ہم چھ بہن بھائی ہیں اور میرا نمبر تیسرا ہے اور جی بیچلر ہوں اور شادی ان شاء اللہ چار پانچ سال بعد کروں گا اور اپنی پسند سے کروں گا۔"

★ "آج کل کیا آن ایئر ہے۔ کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"

✳ "آج کل بہو رانی

میرے سنوریا کا نام' ہریالے بنے' لڑکیاں محلے کی" آن ایئر ہے۔"

★ "شوبز میں آمد کیسے ہوئی؟"

✳ "سچ بتاؤں۔ مجھے بچپن سے ہی بہت شوق تھا اس فیلڈ میں آنے کا اور اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے میں نے بہت جدوجہد بھی کی ہے۔ بہت مراحل سے گزرا ہوں اور تھرو پراپر چینل پہنچا ہوں۔ شروع میں جس طرح ہوتا ہے کہ پورٹ فولیو دو' پھر آڈیشن دو تو میں پورے سسٹم سے گزرا ہوں' کامیاب ہوا ہوں اور پھر میں نے کام شروع کیا ہے۔"

★ "زیادہ تر تو یہی کہانی سناتے ہیں کہ دوست نے کہا میرے ساتھ چلو یا فلاں ڈرامے کی شوٹ دیکھنے گیا یا کسی تقریب میں فلاں ڈائریکٹر نے دیکھا تو آفر دے دی تو آپ کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا کیا؟"

✳ "نہیں جی' میرے ساتھ ایسی کوئی کہانی نہیں ہوئی مجھے شوق تھا اور میں یہی کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے اس فیلڈ کے لیے جدوجہد کی۔"

★ "مثلاً" کیا دشواریاں پیش آئیں؟"

✳ "میں نے سب سے پہلے اے آر وائی کے پروگرام "فیس آف دی منتھ" کے لیے ماڈلنگ کی اور جب میں کسی کو بتاتا تھا کہ میں ماڈلنگ کرتا ہوں یا کی ہے تو کوئی یقین نہیں کرتا تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ ہم نے تو ٹی وی اسکرین پہ نہیں دیکھا۔ تو پھر میں نے سوچا کہ اداکاری کی طرف بھی آنا چاہیے۔ تو میں اس طرف آ گیا۔"

★ "ماڈلنگ سے اداکاری کی طرف' آئے تو مشکل ہوئی؟"

✳ "بالکل ہوئی کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ اداکاری اور ماڈلنگ' بالکل الگ الگ شعبے ہیں۔ ابتدا میں مجھے اداکاری میں مشکل پیش آئی لیکن کوشش کرتے کرتے میں نے بھی تھوڑی سی گرفت حاصل کر ہی لی اداکاری میں۔"

★ "اداکاری میں سب سے زیادہ کس سے سیکھا؟"

✳ "میں کسی ایک بندے کا نام تو نہیں لے سکتا۔ سب نے مجھے بہت سکھایا۔ لیکن پھر بھی سب سے زیادہ سید عاطف نے مجھے سپورٹ کیا۔ پھر رومی انشاء بھی ہیں باقی بھی بہت اچھے ہیں۔ مجھے تو سب سے ہی سیکھنے کا موقع ملتا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک تو بہت اچھے لوگ ملے ہیں مجھے۔ آگے کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

★ "گھر والوں نے آپ کی جدوجہد دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ اس فیلڈ میں اتنا خوار ہونے سے بہتر ہے کہ کچھ اور کر لیں؟"

✳ "گھر والوں نے تو بہت کہا اور میں نے ایک سال بینک کی جاب بھی کی اور ساتھ ساتھ اس فیلڈ کو بھی جاری رکھا' تو میرا جنون دیکھ کر گھر والوں نے کہا کہ ٹھیک ہے تمہیں شوق ہے تو کر لو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

★ "اداکاری میں پہلا ڈرامہ کون سا تھا اور آپ کی پہچان کون سا ڈرامہ بنا؟"

✻ "میں نے سب سے پہلے مصباح خالد کی ڈائریکشن میں ایک ڈراما "محبت تم سے ہے" میں کام کیا تھا اور میری پہچان ڈرامہ سیریل "طائر لاہوتی" بنا۔"

★ "پہچان کروا کے فخر ہوا یا مغرور ہو گئے؟"

✻ "فخر تو ہوا ہی غرور بھی آ گیا۔ میں تھوڑا سا مغرور انسان تھا، لیکن جب لوگوں کی محبت اور خلوص کو دیکھا تو احساس ہوا کہ مجھے غرور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ لوگوں کی محبت ہی تو ہے، جو مجھے پہچان کر محبت سے ملتے ہیں۔"

★ "آپ نے کہا کہ میں اس فیلڈ میں آنا چاہتا تھا اور آ گیا..... گویا اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے قائل ہیں؟"

✻ "جی بالکل اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا قائل ہوں۔ مجھے یہی فیلڈ پسند تھی اور اس لیے اس فیلڈ میں آنے کے لیے میں نے جدوجہد کی۔"

★ "فیوچر پلاننگ کرتے ہیں؟"

✻ "فیوچر پلاننگ تو نہیں کرتا، لیکن یہ کوشش ضرور کرتا ہوں کہ ہر کام کو محنت کے ساتھ کروں۔ جس طرح آہستہ آہستہ میرے کام میں بہتری آ رہی ہے اسی طرح مزید آئے تاکہ میں اپنا، اپنے گھر والوں کا اور پاکستان کا نام روشن کر سکوں۔"

★ "شوبز میں جدوجہد کے بعد مقام بنایا..... کچھ خامی بھی نظر آئی یا سب اچھا ہی نظر آتا ہے؟"

✻ "خوبیاں، خامیاں تو ہر فیلڈ میں ہوتی ہیں اور اس میں بھی ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ فیلڈ کسی کی بھی وفادار نہیں، یہاں سب کو آنا ہے اور جانا ہے اور اس کی سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ یہ ایک دن ختم ہو جائے گی۔"

★ "لوگ کہتے ہیں کہ شہرت پرائیویٹ لائف کو ختم کر دیتی ہے؟ ایسا ہے؟"

✻ "نہیں فی الحال تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ لوگ بڑے معصوم ہوتے ہیں۔ اکثر تو لوگ پاس آ کر بڑی عاجزی اور پیار سے پوچھتے ہیں ایکسکیوزمی آپ وہی ہیں نا جو فلاں ڈرامے میں آتے ہیں۔ میں کہتا ہوں "جی" تو پھر کہتے ہیں آپ ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں آپ بہت اچھی اداکاری کرتے ہیں۔ تو اس طرح کا کوئی رسپانس دے تو پھر کام میں بھی انرجی آتی ہے اور مزید اچھا کام کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

★ "غصے کے تیز ہیں؟"

✻ "غصہ ایک قدرتی عمل ہے۔ سب کو آتا ہے اور یہ بلاوجہ تو نہیں آتا اس کی بھی وجوہات ہوتی ہیں۔ کوئی ایسا بندہ جس کے خود کے اعمال اچھے نہ ہوں وہ اگر آپ کو کسی بات کی نصیحت کرے تو پھر غصہ آتا ہے۔ جب کوئی میری بات کو نہ سمجھے تب بھی غصہ آ جاتا ہے۔ تو کئی باتیں ہیں جن پر بندہ کنٹرول نہیں کر سکتا۔"

★ "پھر ری ایکشن کیا ہوتا ہے؟"

✻ "کوئی عام بندہ ہو تو سنا دیتا ہوں اور کوئی ایسا بندہ ہو جس سے میں پیار کرتا ہوں یا جو مجھ سے بڑا ہو تو پھر خاموشی اختیار کر لیتا ہوں۔"

★ "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"

✻ "جب گھر والے فورس کرتے ہیں کہ شادی کر لو۔ بھئی مجھے ابھی نہیں کرنی شادی، ابھی مجھے کچھ بننا ہے۔ کچھ کمانا ہے..... اصل میں میری چار بہنیں ہیں ان کی شادیاں ہو گئی ہیں اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔ تو چونکہ نمبر میرا ہے اس لیے گھر والوں کو جلدی ہے۔"

★ "اس فیلڈ میں آ کر اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے کتنا مختلف پاتے ہیں؟"

✻ "بہت زیادہ مختلف پاتا ہوں۔ اس لحاظ سے کہ ہمارا گھر سے جانے کا تو ٹائم ہے کہ فلاں وقت پہنچنا ہے لیکن واپسی کا کوئی ٹائم مقرر نہیں ہے۔ پھر ہماری چھٹیاں نہیں ہوتیں کوئی ویک اینڈ نہیں ہوتا۔ سب لوگ چھٹیاں کر رہے ہوتے ہیں اتوار کو، مزے کر رہے ہوتے ہیں لیکن ہمارے لیے سب دن برابر ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کی طرح گھوم پھر نہیں سکتے۔ زندگی





محدود ہو جاتی ہے۔"

★ "کردار کس قسم کے پسند ہیں؟"

✻ "مجھے سنجیدہ رول پسند ہیں، مزاحیہ بھی کرتا ہوں، مگر زیادہ مزا سنجیدہ کردار کرنے میں ہے کیونکہ سنجیدہ رول کرنے میں پرفارمنس کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔"

★ "خواب آنکھیں خواہش چہرے" میں آپ کا رول نگیٹو تھا۔ کیسا لگا؟"

✻ "بہت اچھا لگا اور پہلی بار میں نے نگیٹو رول کیا اور اس رول کو کر کے اندازہ ہوا کہ لوگ برائی کو اور برے لوگوں کو کتنا ناپسند کرتے ہیں۔"

★ "تو کیا رسپانس ملا؟"

✻ "لوگوں نے یہ کہا کہ آپ غلط کر رہے ہیں آپ کو کسی کی زندگی برباد نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

★ "پھر آئندہ کے لیے کیا ارادے ہیں! نگیٹو رول کرنے ہیں یا پازیٹو؟"

✻ "دونوں طرح کے..... فنکار کو کسی بھی کردار کو کرنے سے گھبرانا نہیں چاہیے اور یہی تو فنکار کی کامیابی ہے کہ لوگ اسے اس کے نام کی بجائے اس کے کردار سے پہچانیں اور اس سیریل میں میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔"

★ "کوئی بھی کردار لیتے وقت کیا دیکھتے ہیں رائٹر یا ڈائریکٹر؟"

✻ "پہلے اپنا کردار..... کہ کتنا اہم ہے، کتنا پاور فل ہے اور چونکہ ابھی میں اس فیلڈ میں نیا ہوں اس لیے بہت سوچ سمجھ کر کردار لیتا ہوں۔ تاکہ میں مزید ابھر کر سامنے آؤں اور لوگ مجھے زیادہ سے زیادہ بک کریں اور رائٹر سے زیادہ میں ڈائریکٹر کو دیکھتا ہوں کیونکہ اگر ڈائریکٹر اچھا ہو تو سب کچھ اچھا کر لیتا ہے۔"

★ "ویسے سب سے اچھا ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کون ہے آپ کی نظر میں؟"

✻ "میرا خیال ہے سب ہی اچھے ہیں۔ مجھے سب کے ساتھ کام کرنا ہے۔ اس لیے کسی ایک کا نام لے کر دوسروں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے ابھی تک

جن کے ساتھ بھی کام کیا ہے وہ سب ہی بہت اچھے اور بہت قابل احترام ہیں میرے لیے۔"

★ "سینئرز فنکار تعاون کرتے ہیں؟"

✻ "جی اکثر کرتے ہیں۔ اگر ہم کچھ پوچھیں تو فوراً گائیڈ کرتے ہیں۔ کبھی انکار نہیں کرتے۔ اس طرح ہمیں ڈائریکٹرز سے بھی بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے اور پھر شوق تو ویسے ہی بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔"

★ "زندگی بدلی؟ بدلی تو کب؟"

✻ "جی ہاں زندگی میں بہت تبدیلی آ گئی ہے اور ایسا تب سے ہوا جب میں اس فیلڈ میں آیا اور پھر اس وقت جب مجھے بھرپور طریقے سے کام ملنے لگا۔ آج کل میں بہت خوش ہوں کہ مجھے بھی لوگ پہچاننے لگے ہیں۔"

★ "کبھی شارٹ ٹمپر ہوئے؟"

✻ "ہاں جی کافی مرتبہ اور ایسا اس وقت ہوتا ہے کہ جب آپ بہت دیر تک کسی کو سمجھاتے رہیں اور کوئی آپ کی بات نہ سمجھے تو پھر میرا ٹمپر لوز ہو جاتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ سامنے والے کو تھپڑ مار دوں۔"

★ "کنٹرول نہیں ہے کیا؟"

✻ "نہیں جی بالکل نہیں، مجھے تو اپنی زبان پر ہی کنٹرول نہیں ہے۔ بہت صاف گو ہوں جو منہ میں آتا ہے جو دل میں ہوتا ہے بول دیتا ہوں۔ کوئی بھی سچویشن میرے سامنے ہو اس کے حساب سے بول دیتا ہوں۔"

★ "کبھی محبت کی؟"

✻ "بہت بار، لیکن مستقل والی محبت ۔ جس کے بغیر میں رہ ہی نہ سکوں ابھی تک نہیں ہوئی۔ شاید بیوی سے ہوگی۔"

★ "آپ بتا رہے ہیں کہ زبان پر کنٹرول نہیں۔ سب کچھ منہ پر بول دیتے ہو۔ کبھی احساس ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟"

✻ "ہاں جی۔ کیوں نہیں احساس ہوتا ہے۔ پھر اپنے آپ سے ہی عہد کرتا ہوں کہ آئندہ خیال رکھوں گا۔ لیکن کسی کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا۔"

★ "فضول خرچی کرتے ہیں؟"

✻ "زیادہ نہیں کیونکہ مجھے احساس ہے کہ کمانا بہت مشکل ہے۔ لیکن چونکہ اس فیلڈ سے تعلق ہے تو پھر کپڑوں اور جوتوں پہ زیادہ خرچ کرتا ہوں۔"

★ "آج کل سیاست میں بہت گہما گہمی ہے آپ پاکستان کے حالات کے لیے کیا سوچتے ہیں؟"

✻ "بس دعا کرتا ہوں کہ ہمارے ملک کے حالات اچھے ہو جائیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے لوگ خوش ہوں۔ ملک میں خوشحالی آئے..... اور آئندہ انتخابات میں جو بھی پارٹی آئے وہ ملک کے لیے بہتر کام کرے۔"

★ "لوگ تعریف تو کرتے ہی ہیں۔ کسی نے پریشان بھی کیا؟"

✻ "نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ابھی تک تو تعریف ہی مل رہی ہے کردار کے حوالے سے لوگ تعریف و تنقید کرتے ہیں مگر کبھی کسی نے پریشان نہیں کیا۔"

★ "ابھی ہم ملک کے حالات پہ بات کر رہے تھے۔ یہ بتائیں کہ اگر آپ کو اقتدار —— مل جائے تو کیا کریں گے؟"

✻ "ہمارے ملک میں امیروں کے بہت عیش ہیں۔ انہیں مہنگائی اور بے روزگاری کی نزاکتوں کا کچھ پتا نہیں ہے تو اگر اللہ نے معجزانہ طور پر مجھے کوئی موقع دیا تو سب سے پہلے تو مہنگائی کو قابو کرنے کے لیے اقدامات کروں گا اور ایسے قوانین بناؤں گا کہ غریبوں کو ریلیف ملے۔"

★ "اخبار کا مطالعہ کرتے ہیں؟"

✻ "جی بالکل کرتا ہوں اور بہت غور سے کرتا ہوں۔ اگرچہ نیوز چینل پہ سب خبریں آجاتی ہیں لیکن اخبار کا اپنا ہی مزا ہے۔ اس لیے اخبار کا مطالعہ ضرور کرتا ہوں۔"

★ "نیوز چینل کے علاوہ کون سے چینل شوق سے دیکھتے ہیں؟"

✻ "ڈراموں کے اور میوزک چینل کیونکہ مجھے میوزک سے بہت لگاؤ ہے۔"

★ "دنیا کے بارے میں کوئی دو جملے؟"

✻ "دنیا اور دنیا میں عورت بہت خوب صورت تخلیق ہے اللہ کی۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے کنور ارسلان سے اجازت چاہی۔

✻ ✻

کرن مارچ کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ حسب روایت ہم قارئین سے ایک سروے کر رہے ہیں۔

1 ۔ زندگی کا ایک اور سال گزر جانے پر آپ کے کیا احساسات ہوتے ہیں؟

2 ۔ شیکسپیئر نے کہا تھا دنیا ایک اسٹیج ہے "اس اسٹیج پر آپ نے کون سا اہم کردار ادا کیا ہے؟

3 ۔ شاعر نے کہا ہے۔

ہر داغ ہے اس دل میں، بجز داغ ندامت

آپ کی کوئی ایسی غلطی یا پچھتاوا جس پر آپ نادم ہیں اور اس کا ازالہ کرنا چاہتی ہیں؟

4 ۔ سال گزشتہ میں کرن کی کس مصنفہ کی کون سی تحریر نے آپ کو متاثر کیا اور کیوں؟

ان سوالات کے جواب اور اپنی تصویر (اگر آپ دینا چاہیں تو) ہمیں جلد از جلد روانہ کردیں، تاکہ کرن کے سالگرہ نمبر میں شامل اشاعت ہوسکے۔







# امبر داؤد شاہ

شاہین رشید

1 "اپنے نام کے علاوہ کون سے دو نام آپ کو پسند ہیں؟"

☆ "میرا نام امبر بہت خوب صورت ہے اور اس کے معنی بھی "آسمان" کے ہیں اور مجھے بھی "آسمان" چھو لینے کی خواہش ہے۔ اس لیے مجھے اپنا ہی نام پسند ہے۔"

2 "آپ کے دو لکی نمبر؟"

☆ "پانچ اور سات۔"

3 "دو تاریخی ادوار جس میں آپ جانا چاہتی ہیں؟"

☆ "کاش میں مغلیہ دور میں پیدا ہوئی ہوتی تو میں بھی مغلیہ شہزادی ہوتی اور آج کا دور تو ہے ہی بہت اچھا۔"

4 "کوئی دو افراد جن کے ایس ایم ایس کے جواب آپ فوراً دیتی ہیں؟"

☆ "اپنی ماں کے اور اپنے میاں کے کیونکہ اگر ان کے جواب فوری نہ دوں تو بہت پریشان ہو جاتے ہیں۔"

5 "دو بری عادتیں جن سے آپ نجات چاہتی ہیں؟"

☆ "میرا غصہ بہت تیز ہے۔ کاش کہ یہ ختم ہو جائے۔ میرے غصے سے ہر کوئی پریشان ہے اور میں خود بھی پریشان ہوں۔ اور دوسری بری عادت یہ کہ میں جلد باز بہت ہوں صبر بہت کم ہے مجھ میں۔"

6 "دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتی ہیں؟"

☆ "میں جھوٹ بہت کم بولتی ہوں۔ بہت مجبوری میں جھوٹ بولنا پڑے تو بولتی ہوں اور جب کبھی لوگ کرید کرید کر کچھ جاننا چاہتے ہیں تب گول مول جواب دے دیتی ہوں۔"

7 "اپنے بارے میں کن دو باتوں کو سن کر غصہ آجاتا ہے؟"

☆ "شوبز میں اچھا رہنا بہت مشکل کام ہے۔ اچھے انسان کے بارے میں بھی لوگ غلط غلط باتیں بنا رہے

ہوتے ہیں..... تو اپنے بارے میں ہی کیا دوسروں کے بارے میں بھی غلط باتیں سن کر مجھے غصہ آرہا ہوتا ہے۔"

8 "حالات حاضرہ کے دو اینکر جو سفارشی لگتے ہیں
☆ "ارے نہیں بڑے ڈیشنگ قسم کے اینکرز ہیں' کامران خان' حامد میر' کاشف عباسی سب زبردست ہیں۔ سب پڑھے لکھے اور ٹیلنٹڈ لوگ ہیں۔"

9 "مارننگ شو کے دو بہترین اینکر آپ کی نظر میں؟"
☆ "کوئی بھی نہیں ہے..... نادیہ خان تھی جو کہ بہت زبردست تھی' اس جیسی کوئی نہیں ہے۔ کچھ ایسے ہیں جنہیں ٹھیک طرح سے بولنا بھی نہیں آتا۔ ایک زمانے میں مستنصر حسین تارڑ پروگرام کرتے تھے۔ ہم کافی چھوٹے تھے اس وقت وہ بہترین اینکر تھے۔ اب تو سوائے ہلے گلے کے کچھ نہیں ہوتا۔"

10 "دو دوست جن پر آپ بھروسہ کر سکتی ہیں؟"
☆ "کسی پہ بھی نہیں' سوائے اپنی امی کے اپنے میاں پہ بھی نہیں۔"

11 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ آپ دنیا گھومنا چاہتی ہیں؟"
☆ "وسیم اکرم۔ مگر ایسا ہونا ناممکن ہے اور شاہ رخ خان مجھے بہت پسند ہے۔ اگر اس کے ساتھ کام کروں تو دنیا گھوم سکتی ہوں۔"

12 "دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پہ رشک آتا ہے؟"
☆ "شاہ رخ خان اور ایشوریا رائے' پتا نہیں لوگ ایشوریا کو حسین عورت کیوں کہتے ہیں جبکہ اس سے زیادہ حسین عورتیں اس دنیا میں موجود ہیں جو ہاتھ لگانے سے میلی ہو جائیں۔ اس کی قسمت پر اس لیے رشک آتا ہے کہ اس کو بیٹھے بٹھائے سب کچھ مل گیا؟"

13 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتی ہیں؟"
☆ "رمضان المبارک' عید اور اپنی برتھ ڈے۔"

14 "دن کے چار پہر میں کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"
☆ "فجر کا اور شام کا۔"

15 "پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتی ہیں؟"
☆ "السلام علیکم' کیسی / کیسے ہیں آپ۔"

16 "دو کھانے جن کو کھا کر کبھی بور نہیں ہوتیں؟"
☆ "بریانی اور چائنیز۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتیں؟"
☆ "اپنی ماں اور اپنے سے بڑے جو بھی ہوں۔ ان سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتی۔"

18 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے آپ کرکٹ دیکھتی ہیں؟"
☆ "عمران خان' بحیثیت کرکٹر بہت پسند تھے اور اب سیاست دان اور پھر وسیم اکرم۔"

19 "دو خواہشات جو ابھی تک پوری نہیں ہوئیں؟"
☆ "اللہ کا کرم ہے تمام پوری ہوتی ہیں اور ہو رہی ہیں۔"

20 "شوبز کی دو بڑی برائیاں؟"
☆ "منافق لوگ بہت ہیں' یہی بڑی برائی ہے جو سب پہ بھاری ہے۔"

21 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتیں؟"
☆ "موبائل فون اور کچھ ضرورت کی چیزیں۔"

22 "دو الفاظ جو آپ بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں؟"
☆ "نہیں کچھ زیادہ بولنے کا خبط نہیں ہے۔ ایسا کوئی چکر نہیں ہے۔"

23 "دو پسندیدہ صحافی؟"
☆ "سب ہی اچھے ہیں۔ کامران خان اور حامد میر بہت پسند ہیں۔"

24 "سات دنوں میں کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"
☆ "جمعہ اور ہفتہ۔"

25 "بارہ مہینوں میں کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟"
☆ "جنوری میری سالگرہ بھی اور میری ماں کی سالگرہ



بھی ہوتی ہے اور نومبر میں اپنے میاں کی سالگرہ کا انتظار رہتا ہے۔"

26 "اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟"
☆ "میرا گوشہ عافیت میرا کمرہ میرا بستر اور باتھ روم۔"

27 "گھر کے دو کام جو آپ کو پسند نہیں؟"
☆ "مجھے سارے کام پسند ہیں کیونکہ میں ایک گھریلو اور مشرقی لڑکی ہوں۔"

28 "دو پسندیدہ پکنک پوائنٹ؟"
☆ "ساحل سمندر اور کہیں بھی باہر گھومنا اچھا لگتا ہے۔"

29 "دو سیاست دان جو ملک کے لیے بوجھ ہیں؟"
☆ "آپ کو پتا تو ہے ضروری ہے کہ نام لیا جائے (قہقہہ)۔"

30 "کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"
☆ "ملائشیا' اور بنگلہ دیش۔"

31 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"
☆ "کالا اور باقی وہ رنگ جس کا بہت فیشن چل رہا ہو۔"

32 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"
☆ "کراچی جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور لوگ خوامخواہ کہتے ہیں کہ لاہور لاہور ہے جبکہ میں کہتی ہوں کراچی کراچی ہے۔ بس یہی ہے۔ کراچی اور کراچی۔"

33 "اگر ایک دن کے لیے ساری دنیا سو جائے سوائے آپ کے تو کیا دو چیزیں لینا پسند کریں گی؟"
☆ "مہتہ پیلس' (قائداعظم کی جائے پیدائش) اور قائداعظم کی بلیک گاڑی۔"

34 "لڑکوں کے لیے کوئی دو نصیحتیں؟"
☆ "لڑکیاں ہاتھ سے نکلی جا رہی ہیں لڑکے کہاں نصیحتیں سنیں گے۔ لڑکیاں ہی قابو میں نہیں آرہیں تو لڑکوں کو کیا نصیحت کروں۔"

35 "سال کے چار موسموں میں سے کون سے دو موسم پسند ہیں؟"
☆ "بہار کا اور بارش کا موسم۔"

36 "لڑکوں کی دو ناپسندیدہ عادتیں؟"
☆ "آج کے لڑکے لڑکیوں سے تھوڑے بہتر ہی ہیں اور پھر ٹائم کے ساتھ ساتھ عادتیں بدلتی رہتی ہیں۔"

37 "کن دو تاریخی شخصیات سے ملنے کی خواہش ہے؟"
☆ "قائداعظم ان جیسا کوئی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی علامہ اقبال جیسا کوئی پیدا ہو سکتا ہے۔ ان دونوں سے ملنے کی خواہش ہے۔"

38 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام سب سے پہلے کرتی ہیں؟"
☆ "کلمہ پڑھتی ہوں اور میری بالکونی کا جو دروازہ ہے اس پہ میں نے "لوح قرآنی" لگائے ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھتی ہوں اور دعا مانگتی ہوں پھر دنیاوی کام کرتی ہوں۔"

39 "دو مرد جنہوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا؟"
☆ "میرے میاں نے اور میرے میاں نے..... وہی

ہیں میرے لیے سب کچھ۔"

40 "آپ کے نزدیک دنیا کے دو خوب صورت ترین مرد؟"

☆ "میں اپنے میاں کا نام ضرور لکھوں گی۔ میرے میاں ہر لحاظ سے بہت اسمارٹ اور خوب صورت انسان ہیں اور شاہ رخ خان۔"

41 "دو پسندیدہ پروفیشن؟"

☆ "ٹیچنگ جو کہ میں بھی کر چکی ہوں اور باقی بھی سب اچھے ہیں اگر انسان اپنے پروفیشن کے ساتھ سنجیدہ ہو۔"

42 "دنیا کے دو بہترین سیاست داں؟"

☆ "ذوالفقار علی بھٹو اور اگر بے نظیر بھٹو زندہ ہوتیں تو پھر وہ پسندیدہ ہوتیں اور آج کل عمران خان خدا کرے یہ ہمارے لیے ملک کے لیے بہتر ثابت ہوں۔"

43 "والدین کی دو نصیحتیں جو گرہ سے باندھ لی ہوں؟"

☆ "جب چھوٹی تھی تو ماں نے کہا تھا کہ تمہاری عزت ہم سے جڑی ہوئی ہے۔ یعنی کوئی کام ایسا نہ کرنا کہ ہم شرمندہ ہو جائیں اور کبھی بھی اپنے پاؤں سے زیادہ چادر نہیں پھیلانا اور اپنی اوقات مت بھولنا۔"

44 "اپنے دو ڈرامے جو فراموش نہیں کر سکتیں؟"

☆ "سارے ہی اچھے کیے ہیں۔ مجھے اپنے سارے ڈرامے پسند ہیں۔"

45 "دو قیمتی چیزیں جو آپ خریدنا چاہتی ہیں؟"

☆ "مہنتہ پیلس شدید ترین خواہش ہے۔ کاش کہ میری خواہش پوری ہو جائے میں نے تو پیسے بھی جمع کرنا شروع کر دیے ہیں۔ بس یہی بہت مہنگی ہو گی۔"

46 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوتے ہوں؟"

☆ "کچھ فیصلے نادانی میں غلط بھی ہو جاتے ہیں۔ جس کا بعد میں پچھتاوا ہوتا ہے لیکن ایسا کوئی نہیں ہوا کہ بتایا جائے۔"

47 "کن دو باتوں سے پرہیز کرتی ہیں؟"

☆ "بہت زیادہ بولنے سے اور کئی ایسی باتیں بول جاتی ہوں بعد میں احساس ہوتا ہے کہ نہیں بولنا تھا۔ اب ان باتوں سے پرہیز کرتی ہوں۔"

48 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سی دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتی ہیں؟"

☆ "الحمدللہ پانچوں وقت کی، کبھی کبھی عصر رہ جاتی ہے کیونکہ ٹائم بہت کم ہوتا ہے۔"

49 "بیرون ملک شاپنگ میں کیا چیزیں لازمی خریدتی ہیں؟"

☆ "پرفیومز بہت زیادہ پسند ہیں اور بیگز۔"

50 "دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

☆ "اپنی امی کے غصے سے اور کسی سے نہیں۔"

51 "کن دو لوگوں کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتیں؟"

☆ "جو بھی تعریف کے قابل ہوتا ہے اس کی تعریف کرتی ہوں۔"

52 "دو پسندیدہ مشروب جن کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟"

☆ "نہیں ایسا کوئی مشروب نہیں ہے۔"

53 "آج کے دور کے دو پسندیدہ گلوکار؟"

☆ "سجاد علی اور راحت فتح علی اور شہزاد رائے بھی اچھا ہے۔"

54 "شادی کی دو رسمیں جو انجوائے کرتی ہیں؟"

☆ "مہندی اور انگلی پکڑائی۔"

55 "دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہیں؟"

☆ "کہیں جانا ہو اور جا نہ سکوں اور کوئی بہانہ بنا دے تو۔"

56 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں؟"

☆ "اچھا لگے اور جسم نمایاں نہ ہو۔"

57 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتی ہیں؟"

☆ "بہن کے بچوں کے ساتھ اور اپنے شوہر کے ساتھ۔ مگر وہ اس معاملے میں تھوڑے بور ہیں۔"

58 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"



☆ "چھپکلی سے اگر نظر بھی آجائے تو زندگی حرام ہو جاتی ہے باقی کوئی نہیں۔"

59 "دو ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتی ہیں؟"

☆ "چائنا ٹاؤن اور بریانی کی کوئی بھی جگہ ہو۔"

60 "اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرتی ہیں؟"

☆ "سنڈے بازار اور میلینیم مال۔"

61 "دو چینلز جو آپ شوق سے دیکھتی ہیں؟"

☆ "جیو اور ہم۔"

62 "کھانے کی ٹیبل پہ کون سی دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"

☆ "پانی اور نمک کیونکہ میں نمک تیز کھاتی ہوں۔"

63 "اپنے بیگ میں کون سی دو چیزیں لازمی رکھتی ہیں؟"

☆ "موبائل اور شناختی کارڈ۔ کیونکہ انسان کے ساتھ کبھی بھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

64 "کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"

☆ "صرف آصف زرداری کو اغوا کروں گی اور تاوان میں پورا ملک لینا چاہوں گی اور پھر اسے عوام کی خواہشات کے مطابق چلاؤں گی۔"

# عابد علی

نازیہ کنول نازی

قارئین!

آپ کی فرمائش پر اس ماہ "جناب عابد علی" سے آپ کی ملاقات کروا رہے ہیں ہماری اگلے ماہ کی مہمان شخصیت "ثمینہ پیرزادہ" صاحبہ ہوں گی۔ بہنیں بر وقت اپنے سوال ارسال فرما کر سلسلہ میں شامل ہو سکتی ہیں۔

عابد علی ٹیلی وژن کے جتنے کہنہ مشق فنکار ہیں اتنے ہی سچے کھرے، خوش مزاج اور نرم طبیعت کے مالک انسان ہیں۔ "قارئین کی عدالت" کے لیے جناب عابد علی سے ملاقات بہت دلچسپ رہی۔ جو نذر قارئین ہے۔

○ "السلام علیکم عابد علی ــــــ کیسے ہیں آپ؟"

☆ "جی الحمدللہ میں ٹھیک ہوں۔"

○ "عابد علی ــــــ میرا خیال ہے اب آپ فارغ ہوں گے؟"

☆ "جی میں آفس میں ہوں آپ بات کریں۔"

○ "میرے پاس آپ کے لیے آپ کی پرستار بہت سی بہنوں کے دلچسپ سوالات ہیں، اب آپ مشکل سے ہاتھ لگ ہی گئے ہیں تو سوالات کا سلسلہ شروع کروں۔"

☆ "جی ضرور۔"

یہ پہلا سوال میرے ہاتھ میں ہماری بہت پیاری بہن اور کرن کی دیرینہ قاری دانیہ خان کا ہے فورٹ منرو سے پوچھتی ہیں۔

○ "آپ نے فورٹ منرو آنے کا وعدہ کیا تھا مگر ایفاء نہیں کیا، کیوں؟"

☆ (مسکراتے ہوئے) "فورٹ منرو کے لیے دل تو چاہتا ہے مگر موقع نہیں ملتا، دیکھیں کبھی موقع ملا اور زندگی رہی تو ان شاءاللہ ضرور چکر لگائیں گے۔"

یہ سوال بہاولپور سے بہن ایمن صادق اور اریبہ شاہ نے مشترکہ ارسال کیا ہے پوچھتی ہیں۔

○ "آپ کا ڈرامہ "ہوا پہ رقص" بہترین ڈرامہ تھا مگر چند اقساط کے بعد بند ہو گیا۔ کیوں؟"

☆ "نہیں چند اقساط کے بعد تو نہیں، چند اقساط رہ گئی تھیں جب یہ بند ہوا اور ہوا یوں کہ ہمارے جو پروڈیوسر تھے ان کا ڈسٹری بیوٹر ــــ کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا میں اس وقت جاپان میں تھا اگر پاکستان میں ہوتا تو شاید یہ جھگڑا نہ ہونے دیتا۔"

یہ سوال ہمارے پاس میرپور آزاد کشمیر سے بہن فرح احمد اور مہوش کا ہے، پوچھتی ہیں۔

○ "آپ نے اب تک جتنا کام کیا اس میں سنجیدہ رول پلے کیے، کبھی مزاحیہ کردار کرنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟"

☆ "نہیں میں نے مزاحیہ کریکٹر بھی کیے ہیں۔ "فیملی فرنٹ" میں میں نے مزاحیہ کردار کیے، پھر میری ایک ٹیلی فلم کافی چلی "برنس روڈ کی نیلوفر" اس میں بھی میرا کردار کامیڈی تھا۔ ابھی میرا ایک سیریل آنے والا ہے جو ہے تو نیگیٹو مگر میں نے اسے لائیٹ کامیڈی بھی رکھا ہے۔ مجھے اپنا یہ کردار اچھا لگتا ہے تو کامیڈی کریکٹر میں نے کیے ہیں مگر زیادہ نہیں کیے۔"

لاہور سے ایم حسن علی اور ہری پور ہزارہ سے گل فراز احمد کا سوال ہے۔

○ "آپ نے اپنی وائف اور بچوں سے علیحدگی کا مشکل فیصلہ کیا، کیا سبب رہا اس کا؟"



☆ "نہیں بچوں سے تو میں علیحدہ نہیں ہوں نہ کبھی ہو سکتا ہوں۔ ہاں نکاح کا آپ کہہ سکتی ہیں کیونکہ یہ جتنا مضبوط رشتہ ہے اتنا ہی کمزور بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں زندگی میں بعض اوقات آپ کو مشکل فیصلے کرنے پڑتے ہیں یہ مشکل ہوتا ہے۔ اچھا بھی نہیں ہوتا مگر کبھی کبھی اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا آپ کے پاس، باقی بچوں کا مجھ سے جو رشتہ ہے وہ ایسا ہے جو اختیاری نہیں ہے نہ ہی یہ ٹوٹ سکتا ہے بچے کل بھی میرے تھے آج بھی میرے ہیں میں ہی ان کو سپورٹ کرتا ہوں، ان کا خیال رکھتا ہوں۔"

میاں چنوں سے صائمہ عابد اور لاہور سے، صائمہ علی کا مشترکہ سوال ہے۔ یہی سوال ہری پور ہزارہ سے گل کا بھی ہے پوچھتی ہیں۔

○ "ایمان علی کی فلم "خدا کے لیے" ایک بے مثال فلم ثابت ہوئی، کیسا لگا ان کی اس کامیابی پر اور اگر انہیں بالی وڈ سے کام کی آفر ہوئی تو کیا آپ اجازت دیں گے؟"

☆ "جی ابتدا میں میں چاہتا تو نہیں تھا کہ وہ اس فیلڈ میں آئے مگر وہ اچھی بچی ہے۔ اب تک اس نے جتنا کام کیا ہے بہت اچھا کیا ہے ماشاءاللہ سے بہت ٹیلنٹڈ ہے، اپنے آپ کو منوایا ہے اس نے تو میں سمجھتا ہوں یہ جو صلاحیتیں ہوتی ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں اگر ان کا صحیح استعمال کیا جائے تو خوشی ہوتی ہے۔ میری طرف سے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔"

کوہاٹ راولپنڈی سے فرح نذیر چوہدری اور حمیرا عرفان کا مشکل سوال ہے۔

○ "زندگی میں دوسری شادی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟"

☆ "دیکھیں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قطعی میرا ذاتی فعل ہے دوسری بات کمی کیوں محسوس ہوئی تو دیکھیں کچھ کمی ہی محسوس ہوئی ہو گی۔ کہیں کوئی کمی رہ گئی ہو گی۔ کچھ چیز چاہیے ہو گی جو نہیں ملی، اصل میں انسان کی جو زندگی ہے اس میں ہر انسان مختلف حالات سے گزرتا ہے۔ کون چاہتا ہے کہ روز اپنے رشتے بدلے مگر کچھ مسائل ہو جاتے ہیں۔"

چنیوٹ سے اقصیٰ شاہد اور بہاول پور سے ایمن صادق کا مشترکہ سوال ہے۔

○ "کیا دوسری شادی کے بعد اپنے بچوں کو پہلے جیسا ٹائم دے پاتے ہیں؟"

☆ مسکراتے ہوئے "جی ہاں بالکل پہلے جیسا ٹائم دیتا ہوں کیونکہ پہلے بھی ٹائم نہیں دے پاتا تھا اب بھی

نہیں دے پاتا ہوں' لیکن وہ جو ایک باپ کے فرائض ہوتے ہیں اس سے ہٹ کے' وہ ضرور پورے کرتا ہوں' اب میں کراچی میں ہوں۔ وہ لاہور میں ہیں' وہ کراچی آنا نہیں چاہتے' بہرحال جو محبت کا رشتہ ہے وہ تو ختم نہیں ہو سکتا۔ اور ویسے بھی ہماری فیلڈ میں وقت ہوتا ہی نہیں۔"

وہاڑی سے سدرہ ملک اور اوکاڑہ سے بشریٰ باجوہ کا سوال ہے۔

○ "آپ نے ایک لمبا عرصہ ٹی وی کے لیے بہترین کام کیا' کن ساتھی فنکاروں سے متاثر ہوئے اس فیلڈ میں؟"

☆ "بہت سے لوگ ہیں' پوری دنیا میں' ہالی ووڈ سے بالی ووڈ' بالی ووڈ سے پاکستان' ہر کام میں دنیا ٹیلنٹ سے بھری پڑی ہے' میں بہت زیادہ شخصیت پرست نہیں ہوں۔ لیکن جس کا جتنا مقام ہوتا ہے اچھا کام ہوتا ہے اس کی ضرور تعریف کرتا ہوں۔ کافی لمبی لسٹ ہے کہاں سے گنوانا شروع کروں پاکستان میں پرانے لوگوں میں عظمیٰ تھیں' فردوس جمال ہیں ہمارے ساتھ' نئے لوگوں میں فیصل قریشی ہیں' فہد مصطفیٰ ہیں' نئی بچیوں میں آمنہ شیخ ہیں' صبا قمر ہیں بہت لوگ ہیں۔"

صدف آرزو لاہور سے اور عفیفہ جٹ پریشے ہاشمی' وحیدہ مغل' دیا' عطیہ انصاری اور مسز عامر شہزاد تحصیل دیپالپور ضلع اوکاڑہ سے پوچھتی ہیں۔

○ "طویل عرصہ سے ٹیلی ویژن اسکرین پر آپ کو ایکٹو اور اسمارٹ دیکھ رہے ہیں اس صحت اور جوانی کا کیا راز ہے؟"

☆ مسکراتے ہوئے "راز یہی ہے کہ میں شاید کسی کا مال بے ایمانی سے نہیں کھاتا' ویسے میں ایکسرسائز کرتا ہوں اور خود کو فٹ رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر یہ بھی ہوا کہ ایک زمانے میں میں نے بہت چھوٹی عمر میں بہت بڑے کردار ادا کر لیے تھے اب بڑی عمر میں آگیا ہوں تو لوگوں کو لگتا ہے شاید یہ وہی ہے۔"

بھلوال سے شگفتہ خان کا سوال ہے یہی سوال باغ آزاد کشمیر سے ارم گل مہو' اور لاہور سے سلمیٰ خان نے ارسال کیا ہے پوچھتی ہیں۔

○ "اداکار نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟"

☆ "آرٹسٹ ہی ہوتا' کیونکہ سیاست میں کر نہیں سکتا اس میں کرپشن اور منافقت بہت زیادہ ہے' سرکاری نوکری نہیں کر سکتا کہ اس میں رشوت اور سفارش بہت ہے تو اگر ایکٹر نہ ہوتا تو سنگر ہوتا' سنگر نہ ہوتا تو پینٹر ہوتا' پینٹر نہ ہوتا تو رائیٹر ہوتا' ویسے پینٹنگ میں اب بھی کرتا ہوں اور کہانیاں لکھنے سے میں نے اس فیلڈ کا آغاز کیا تھا۔"

ہری پور ہزارہ سے عالیہ راجا اور میاں چنوں سے صائمہ عابد کا سوال ہے۔

○ "کریئر کا آغاز کس پلے سے کیا اور اس میں آپ کا کردار کیا تھا؟"

☆ "میرا سب سے پہلا پلے ایک سیریل تھی یاور حیات صاحب کی "تلاش" وہ تسلیم چشتی صاحب کا لکھا ہوا تھا تو میں نے اس میں ڈی ٹیکٹو کا کردار ادا کیا تھا جو قتل کا سراغ لگاتا ہے۔"

زوبی رانا شاہ کوٹ سے پوچھتی ہیں۔

○ "اب تک جتنا کام کیا اس میں کس پلے کو بہت انجوائے کیا؟"

☆ "یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ فراز صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ کا پسندیدہ شعر کون سا ہے تو فراز صاحب نے کہا کہ میرا کام شعر کہنا ہے پسند یا ناپسند کرنا آپ کا کام ہے تو میرا بھی یہی کہنا ہے کہ جو کام ڈیسنٹ ہوتا ہے اچھا لگتا ہے۔ جو راز پرانا ہو جاتا ہے اس میں پھر خامیاں بھی نظر آتی ہیں تو یہ تو ناظرین ہی بتا سکتے ہیں کہ انہیں کون سا زیادہ اچھا لگا۔"

پروین افضل شاہین بہاول نگر سے پوچھتی ہیں یہی سوال فوزیہ ثمر بٹ کا گجرات سے ہے۔

○ "اگر کوئی آپ کی ذات کا کھوج لگانا چاہے تو کیا خفیہ بات سامنے آئے گی؟"

☆ "میں سمجھتا ہوں ایک آدمی کے اندر کوئی ایک ذات تو ہوتی نہیں' بڑی پرتیں' بڑے برتاؤ ہوتے ہیں' تو وہ جس پوائنٹ آف ویو سے آپ کو دیکھنا چاہتا ہے اس کو اس لحاظ سے کوئی مل جاتا ہے' کبھی مایوسی ہوتی ہے۔ میں تو ویسے آج تک خود نہیں سمجھ سکا اپنے آپ کو۔"

ثروت رشید گل ڈگری سے اور نرجس رانی ساہیوال سے پوچھتی ہیں۔

○ "ٹیلی ویژن کی طرف آنے کا خیال کیوں آیا؟"

☆ "بس اتفاق سے ہی آگئے۔ ریڈیو گیا تھا وہاں انہوں نے کہا کہ آپ کو ٹی وی پر جانا چاہیے۔ لاہور آ کر آڈیشن وڈیشن دیے' پاس ہو گئے تو بس لگ گئی ابھی تک لگے ہوئے ہیں اس میں۔"

عائشہ ملک وہاڑی سے پوچھتی ہیں۔

○ "زندگی میں کس رشتے کو بہت اہمیت دیتے ہیں؟"

☆ "رشتے تو سارے ہی بہت اچھے ہوتے ہیں اگر ان کی بنیاد خلوص پر رکھی جائے وگرنہ کائنات میں انسان کا اللہ سے جو رشتہ ہے وہ بہت خوب صورت ہے' ماں باپ' بہن بھائیوں سے جو رشتہ ہے وہ بہت خوب صورت ہے' دوستی کے جو رشتے ہوتے ہیں بہت خوب صورت ہوتے ہیں اور انسان ساری زندگی انہیں نبھاتا ہی رہتا ہے۔"

ثوبیہ وزیر آباد سے پوچھتی ہیں۔

○ "زندگی کی کوئی ایسی خواہش جو آج تک پوری نہ ہوئی ہو؟"

☆ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
"بہت سی خواہشیں ہیں کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔ خواہشیں ہونی بھی چاہئیں کیونکہ یہ آپ کو زندگی میں آگے لے کر چلتی ہیں۔ خواہش پوری ہو یا نہ ہو مگر خواہشیں ہر انسان ہی رکھتا ہے۔"

بہاولپور سے ہادیہ بخاری کا سوال ہے۔

○ "بے پناہ شہرت اور محبتوں نے آپ کی شخصیت میں کیا نمایاں تبدیلی پیدا کی ہے؟"

☆ "یہ تو مجھے یاد نہیں اصل میں جتنا آپ اوپر جاتے

ہیں لوگ محبت کرتے ہیں اتنا ہی آپ کو جھکنا پڑتا ہے میں سمجھتا ہوں کچھ خامیاں رہ جاتی ہیں مگر انسان اپنے آپ کو بیلنس رکھنے کی کوشش تو کر سکتا ہے۔"

کوئٹہ سے ناہید نیازی اور کراچی سے نجم انجم پوچھتی ہیں۔

○ "اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے؟"

☆ "یہ تو بڑا لمبا سوال ہے۔ بچپن میں ہم ایک چھوٹے سے شہر میں رہتے تھے۔ کوئٹہ میں' بچپن میں خواب بہت دیکھتا تھا جیسے ہر بچہ دیکھتا ہے کہ کیا بنے گا۔ پھر میٹرک کے بعد میں ریڈیو کی طرف آگیا' ایک سمت میں چلنے لگے۔ ابتدا میں اور بچوں کی طرح شرارتیں بھی کرتے تھے' بدتمیزیاں بھی کرتے تھے۔ باقی ہم چھ بہن بھائی تھے تین بہنیں' تین بھائی۔"

جڑانوالہ سے ام مریم کا سوال ہے۔

○ "بچپن کا کوئی ایسا واقعہ یا یاد جو آپ کبھی فراموش نہ کر سکے؟"

☆ "بچپن کے تو بہت سے واقعات ہوتے ہیں۔ مگر ابھی یوں ایک دم سے اچانک کچھ بتانا مشکل ہے۔ بچپن تو ایک کبھی نہ بھولنے والی چیز ہے۔"

بہاولپور سے اسمعہ رباح، مبین شفیع اور ثمینہ رفیق نے آپ کے ہر ڈرامہ کو پسند کیا ہے۔ ان کا سوال ہے

○ "کن چیزوں کو زندگی میں بہت اہمیت دیتے ہیں؟"

☆ "انسان جو ہے اسے توجہ چاہیے ہوتی ہے۔ جیسے زندہ رہنے کے لیے ہوا کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی، ویسے ہی محبت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور کچھ تھوڑی سی تعریف کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں ہر بندہ ہی تھوڑا سا خوشامد پسند بھی ہوتا ہے۔ اس میں پھر کچھ ایسی خوشیاں بھی ہوتی ہیں، جو آپ دوسروں کے کام کر کے حاصل کرتے ہیں۔ تو یہ ساری چیزیں ہی ہیں جو ضروری ہیں۔"

○ "محبت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں یہ سوال ہے؟"

وریشہ علی، پریشے ہاشمی، احمرین شجاع، شازیہ اقبال، میرب فاطمہ، پرنس کنول اور نوشین اقبال نوشی کا کھاریاں سے۔

☆ "محبت بڑا اچھا جذبہ ہے۔ یہ صرف میل فی میل میں نہیں ہوتا، یہ تو بڑا آفاقی، بڑا عالمگیر جذبہ ہے۔ محبت اللہ سے، پھولوں سے، پودوں سے، ہوا سے، اپنے رشتوں سے، جانوروں سے، کسی سے بھی ہو سکتی ہے محبت کے بغیر کوئی زندگی نہیں ہوتی۔"

ساہیوال سے نرجس رانی کا سوال ہے۔

○ "کھانے میں کیا پسند کرتے ہیں؟"

☆ "مجھے کھانا کھانے کا بھی شوق ہے اور کھانا پکانے کا بھی۔ دیسی کھانوں میں مجھے دال چاول بہت پسند ہے، پلاؤ بہت پسند ہے۔ کچھ کھانے میں خود بھی بناتا ہوں۔ باقی میں کم کھاتا ہوں مگر اچھا کھاتا ہوں۔"

میرپور سے اریبہ ماروی، روشانے رحمن، انعم فصیح، زارا ارمان، غزل بلوچ، صبا جگنو، ہیر مومو اور سدرہ سحر پوچھتی ہیں۔

○ "کس قسم کا کردار ابھی تک ادا نہیں کر پائے اور کرنے کی خواہش ہے؟"

☆ "نیگیٹو ہو یا پوزیٹو، خواہش یہی ہوتی ہے کہ نئے سے نیا اچھے سے اچھا کام سامنے آتا رہے۔ اگر مجھے ڈیفرینٹ کام ملتا ہے تو میں خوش ہو جاتا ہوں، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک جیسے کردار ملتے ہیں تو میں بور ہو جاتا ہوں۔ خواہش میری ہوتی ہے کہ جو کام ملے وہ ڈیفرینٹ اور ایکٹو ہو۔ جیو پر میرا ایک سیریل چلا تھا جس میں میرا نیگیٹو کردار تھا، ایک میرا سیریل ہے "مائے نی" پھر ایک "کالا جادو" تو ان میں ڈیفرینٹ کام تھا یہ میں نے انجوائے کیا۔"

راولپنڈی سے مبین جاوید نے آپ کے پلے سورج کے ساتھ ساتھ کو بہت پسند کیا ہے، چنیوٹ سے اقصیٰ شاہد اور دیپالپور سے طاہرہ ملک کا سوال ہے۔

○ "آپ نے ٹیلی وژن کے لیے اتنا کام کیا کون سا پلے یادگار رہا؟"

☆ "یہ بڑا ظلم ہے کسی آرٹسٹ کے ساتھ، کسی پینٹر کے ساتھ کہ اس سے پوچھا جائے کہ اسے کون سا ایک کام زیادہ اچھا لگا۔ یا تو سارا کام ہی اچھا ہے یا پھر کوئی بھی اچھا نہیں باقی جو کردار میری پہچان بنے وہ بہت ہی برے کردار تھے اس لائق ہی نہیں تھے کہ کوئی ایکٹر انہیں کرے۔ بہرحال میرا ایک ڈرامہ تھا "سمندر" جو دلیپ کمار صاحب کو بڑا پسند آیا تھا اور انہوں نے اس کی کافی تعریف کی تھی۔ یہی یادگار حوالہ ہے۔"

تحصیل دیپالپور ضلع اوکاڑہ سے مسز عامر شہزاد نے آپ کے ڈرامہ "نصیب" کو بے حد پسند کرنے کا پیغام بھجوایا ہے اور مبارک باد دی ہے۔ کراچی سے بہن نورین ـــــ نے آپ کے ڈرامہ "معمندی" کو بہت پسند کیا ہے اور ہمارے ہاتھ میں آج کا آخری سوال بھی انہی کا ہے پوچھتی ہیں۔

○ "کس قسم کے لوگوں سے تعلقات رکھنا پسند کرتے ہیں؟"

☆ "اچھے لوگوں سے جو دل میں کینہ نہ رکھتے ہوں، کسی کی برائی نہ چاہتے ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے عابد علی سے اجازت چاہی۔

☆ ☆ ☆





# صائمہ اکرم چوہدری

ادارہ

★ "تاریخ پیدائش/اسٹار؟"

* "23 جون/سرطان۔"

★ "خدا سے تعلق؟"

* "بہت ذاتی اور کسی حد تک بے تکلفانہ بھی۔ کبھی کبھی تو ضدی بچے کی طرح پیچھے پڑ جاتی ہوں اور بات منوا کے ہی دم لیتی ہوں۔ بس ایک خواہش ہے، جو ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔"

★ "فرصت کے لمحات گزارنے کا بہترین طریقہ؟"

* "یار ریحانہ! یہ فرصت کس چڑیا کا نام ہے کم از کم میری لغت میں ایسا کوئی لفظ نہیں۔ پھر بھی اگر کچھ لمحات مل جائیں تو وہ آج کل کی جدید ٹیکنالوجی انٹرنیٹ اور سیل فون کی نذر ہو جاتے ہیں۔ مطالعہ میری واحد عیاشی ہے اور لکھنے کا کام میں چسکے کے طور پر کرتی ہوں۔"

★ "کون سی چیز خوشگوار تاثر قائم کرتی ہے؟"

* "صبح آفس جاتے ہوئے جب مارگلہ کی خوب صورت پہاڑیوں پر اترا ہوا اجلا اجلا سا دن دیکھتی ہوں تو ایک دلفریب سا احساس ہوتا ہے۔ صبح صبح جب آفس میں جا کر اپنے لیپ ٹاپ پر قاری وحید ظفر کی آواز میں تلاوت کلام پاک سنتی ہوں تو بہت اچھے دن کا آغاز ہوتا ہے۔"

★ "وہ چیز جو موڈ خراب کر دے؟"

* "جب ٹریفک جام میں گاڑی پھنس جائے یا آفس پہنچ کر میز پر پروف ریڈنگ کے کام کا انبار لگا ہوا ہو۔ جب میگزین کی ڈیڈ لائن سر پر سوار ہو اور باس کی نظروں کا سامنا کرنا پڑے اور کسی انٹرویو کی طویل ریکارڈنگ سن کر اسے لکھنا پڑے یہ چیز سارے موڈ کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ بھئی ہم ٹھہرے افسانہ نگار من موجی بندے، ہمیشہ دل کی انگلی پکڑ کر لکھا اور وہی لکھا جو اندر موجود کسی چیز نے لکھوایا۔ جب زبردستی کوئی آرٹیکل لکھنا پڑے تو بہت کوفت ہوتی ہے۔"

★ "مشکل ترین لمحہ؟"

* "جب فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے پینل نے انٹرویو میں میرے بخیے ادھیڑ دیے اور سارا مطالعہ جو میں اس انٹرویو کے لیے کر چکی تھی وہ دماغ سے باہر آنے کو بے تاب تھا جبکہ انٹرویو پینل کا اصرار تھا کہ جواب مختصراً دیے جائیں جبکہ ہمارا کہنا تھا کہ اندر جو تفصیل سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہی ہے اس کا رخ کیسے موڑوں اور سب سے مشکل مرحلہ وہ تھا جب انٹرویو کے لیے آتے ہوئے گیٹ کے پاس ایک سادہ سی بزرگ خاتون سے ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ اندر آتے ہوئے ہم فیڈرل گورنمنٹ کے بارے میں اپنے ناقابل اشاعت خیالات کا اظہار انتہائی بے تکلفانہ انداز میں کرتے آئے اور جب انٹرویو بورڈ کے سامنے حاضری ہوئی تو سامنے انہی خاتون کو دیکھ کر یوں لگا جیسے فیڈرل بورڈ کی ساری عمارت ہمارے سر پر آن گری ہو۔ پہلی دفعہ اپنی درازی زبان پر غصہ آیا۔"

★ "بہترین تعریف جو وصول کی؟"

* "پمز ہوسپٹل میں دو سرجڑی بچیوں پر ایک کیس اسٹڈی پر میرے ایڈیٹر عامر فاروق صاحب نے جو کمنٹس لکھے انہوں نے میری ساری تھکن اور خواری کو ختم کر دیا وہ تعریف آج بھی راحت فین کی طرح دل کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔"

★ "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"

✻ "فیس بک پر اونگیاں بونگیاں مارنا۔"

★ "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"

✻ "جب میاں صاحب کو اپنا آپریشن کروا کے تھیٹر کے سبز لباس میں صرف چار یا پانچ گھنٹوں کے بعد اپنے آفس آتے دیکھا۔ جب ہاتھ پر ڈرپ والی سوئی لگی ہوئی تھی اور پیٹ پر پٹی کے اوپر خون اور خود وہ ٹھاٹ سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہمیں لینے آن پہنچے۔ کافی دیر تک تو میں کچھ بول ہی نہیں سکی۔ اور دوسرا واقعہ جب عید پر گھر جاتے ہوئے ملتان روڈ پر ایک بے آسرا پڑی لاش دیکھی اور پولیس کو کال کی۔ آدھی رات کو کوئی اس موٹر سائیکل پر سوار نوجوان کو ٹکر مار کر بھاگ چکا تھا اور اس وقت کسی ماں کا لاڈلا لخت جگر زندگی کی بازی ہار کر سڑک پر بہت بری حالت میں پڑا ہوا تھا اور میاں صاحب نے ایک نظر دیکھنے پر ہی موت کی تصدیق کردی۔"

★ "بہترین تحفہ، میری نظر میں؟"

✻ "بہترین مشورہ اور بے غرض محبت۔"

★ "ایک تاریخی شخصیت جس سے ملنا چاہوں؟"

✻ "حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، یوسف بن حجاج، مدر ٹریسا، لیڈی ڈیانا اور غالب۔"

★ "پسندیدہ ساتھی؟"

✻ "جو زندگی کے سفر میں ہر لمحے کا ساتھی ہے یعنی ڈاکٹر غلام شبیر۔"

★ "پسندیدہ ہستی؟"

✻ "حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور عبدالستار ایدھی ایک درویش مسیحا۔"

★ "پسندیدہ پروفیشن؟"

✻ "الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا۔"

★ "بہترین کاوش؟"

✻ "آنکھوں کے پار چاند، نارسائی۔"

★ "پسندیدہ ملکیت؟"

✻ "میرا قلم جس کا رنگ اڑ چکا ہے لیکن میری مجبوری ہے کہ میں بال پوائنٹ سے نہیں لکھ سکتی اور میرا لیپ ٹاپ جو میری تنہائی کا ساتھی ہے۔"

★ "زندگی کی خواہش؟"

✻ "اندلس کی وہ عظیم سلطنت دیکھوں جہاں مسلمانوں نے بڑے ٹھاٹ سے حکومت کی۔ مسجد قرطبہ میں دو نفل پڑھوں، غار حرا میں کچھ وقت گزاروں۔ مصر کی پراسرار سرزمین کی حقیقت جانوں، غالب کا مقبرہ دیکھ کر آؤں اور میاں صاحب کے ساتھ لیڈی ڈیانا کی قبر پر پھول رکھ کر آؤں۔"

★ "پریشان کن لمحہ؟"

✻ "ایک لمحہ نہیں، بے شمار لمحات ہیں جب ڈاکٹر صاحب نے پشاور کا آٹھ سالہ بچہ دکھایا جس کے منہ میں کھلونا بم پھٹ گیا تھا۔ جب چارسدہ، مانسہرہ میں سیلاب سے متاثرہ لوگوں کو اپنے گھروں کے ملبوں پر بیٹھے دیکھا اور جب ہماری ٹیم کے اردگرد بے شمار لوگ صرف اس آس پر آن کھڑے ہوئے کہ شاید ہم ان کے لیے امداد لے کر آئے ہیں۔ اور وہ بہت کرب انگیز لمحات تھے جب راولپنڈی کے اولڈ پیپلز ہوم میں بے شمار بے آسرا بوڑھوں کو دیکھا وہ عمر رسیدہ لوگ بھی وہاں تھے جن کے پانچ پانچ چھ چھ بچے زندہ تھے اور اپنی زندگیوں میں مگن بوڑھے والدین کو بوجھ سمجھ کر یہاں پھینک گئے تھے۔"

★ "جب موڈ آف ہو تو کیا کرتی ہیں؟"

✻ "بہت رولا ڈالتی ہوں۔"

★ "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟"

✻ "میرے فادر۔"

★ "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"

✻ "جب آپ کو پتا چلے کہ یہ فیشن آپ کو سوٹ نہیں کررہا اور اسے کرکے آپ نمونہ لگیں گی۔"

★ "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"

✻ "جب توقعات کا پیالہ ٹوٹتا ہے۔"

★ "کیا چیز جذباتی کردیتی ہے؟"

✻ "کوئی تلخ لہجہ، چبھتی ہوئی نظر، کوئی بوڑھا فقیر اور خوامخواہ کی غلط بات۔"

★ "زندگی کا یادگار دن؟"

✻ "14 اگست 2008ء کو جب نکاح نامے پر سائن کیے۔ دسمبر 2010ء جب کراچی سے اسلام



آباد ٹرانسفر ہوا۔ فروری 2010ء جب پہلی دفعہ پہاڑوں کو برف کی سفید چادر اوڑھے دیکھا اور جب نتھیا گلی میں زندگی کی رعنائی کو محسوس کیا۔ 28 مارچ 2011ء جب فیڈرل کمیشن کا ایگزام پاس کیا۔"

★ "موسیقی میری نزدیک؟"

✻ "روح کی بہترین غذا ہے۔"

★ "پسندیدہ گانا؟"

✻ "راحت فتح علی خان کا "میں تینوں سمجھاواں کی" اور "چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائے ہم دونوں" جو شاید کمار سانو نے گایا ہے اس کے علاوہ ہم دونوں میاں بیوی کی فیورٹ عابدہ پروین جس کی غزلیں صبح شام گاڑی میں سنی جاتی ہیں۔"

★ "پسندیدہ فقرا؟"

✻ "I can't stop loving you"۔

★ "پسندیدہ کردار؟"

✻ "حقیقی کرداروں میں تو اسلام آباد کے ایچ ایٹ سیکٹر کے قبرستان میں ابدی نیند سوئے ممتاز مفتی قدرت اللہ شہاب اور پروین شاکر اور اپنی کیس اسٹڈی کی ڈھرکی کی شبانہ بلوچ جو اپنے قدموں پر چلنا چاہتی ہے جو پچھلے سات آٹھ سالوں سے ہسپتال میں ہے اور روز ڈاکٹرز سے بحث کرتی ہے کہ جب قرآن پاک میں لکھا ہے کہ ہر چیز کا علاج ممکن ہے تو وہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ آپ کی ریڑھ کی ہڈی لاعلاج ہے اور آپ کو ساری زندگی یونہی رہنا ہوگا۔ جبکہ ناولز اور افسانوں میں "راجہ گدھ" کی امتل اور "پیار کا پہلا شہر" کی پاسکل۔"

★ "پہلی کاوش شائع ہونے پر کیا تاثرات تھے؟"

✻ "دس بارہ سال پہلے پہلا افسانہ کرن میں "محبت مر بھی سکتی ہے" کے عنوان سے شائع ہوا اور ویسی خوشی کا احساس باقی 50 یا 60 افسانے اور ناول لکھ کر نہیں ہوا۔"

★ "وہ رات کبھی نہیں بھولے گی؟"

✻ "جب اولڈ پیپلز ہوم کے بوڑھے تاج محمد جس کی عمر 104 سال تھی اس کا انٹرویو کرکے گھر آئی۔ اس بزرگ کی باتوں نے ساری رات بے چین رکھا۔"

★ "میرا خواب؟"

✻ "ایک اپنا ذاتی خوب صورت گھر مارگلہ کی پہاڑیوں کے درمیان اور میاں صاحب کو مکمل سرجن کے روپ میں دیکھنا۔"

★ "پسندیدہ مزاح نگار؟"

✻ "مشتاق احمد یوسفی، ان کا کوئی ثانی نہیں۔"

★ "حسد محسوس کرتی ہیں؟"

✻ "نہیں بلکہ رشک آتا ہے ان لوگوں پر جو مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے ہیں۔"

★ "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"

✻ "کیونکہ وہ اعصاب کو طمانیت کا احساس بخشتی ہے۔"

★ "پسندیدہ خوشبو؟"

✻ "سگار، جوائے اور چینل فائیو۔"

★ "آخری کتاب، جو میں نے پڑھی؟"

✻ "بچپن کا دسمبر، عشق کا عین۔"

★ "پسندیدہ جگہ؟"

✻ "میرا گھر، جہاں داخل ہوتے ہی ملکیت کا احساس ہوتا ہے۔"

★ "وہ جگہ جہاں چھٹی گزارنا پسند ہے؟"

✻ "مری اور ایبٹ آباد۔"

★ "میری قوت ارادی؟"

✻ "بالکل زیرو ہے زیرو۔"

★ "گھر کا پسندیدہ کمرہ؟"

✻ "میرا بیڈ روم اور کچن۔"

★ "کیا پہننا پسند کرتی ہیں لباس میں؟"

✻ "شلوار قمیص۔"

★ "پسندیدہ رنگ؟"

✻ "پنک، وائٹ اور محبت کے سبھی رنگ۔"

★ "پسندیدہ مصنف؟"

✻ "بانو قدسیہ، ممتاز مفتی، مستنصر حسین تارڑ، مشتاق احمد یوسفی، میکسم گورکی، امرتا پریتم، غلام عباس، عنیزہ سید، عالیہ بخاری، فرحت اشتیاق اور آمنہ ریاض۔"

★ "پسندیدہ شاعر؟"

✻ "فیض احمد فیض، محسن نقوی، غالب۔"

★ ”ویران سنسان جزیرے پر سب سے پہلا کام کیا کروں گا؟“

✻ ”اپنی کمپنی کو انجوائے کروں گی اور ڈھیر سارے خواتین شعاع اور کرن ساتھ لے جا کر پڑھوں گی۔“

★ ”اپنی بری عادت؟“

✻ ”جذباتی پن اور بے صبری ہوں بہت۔“

★ ”کھانے کی پسندیدہ جگہ؟“

✻ ”وہی ہوٹل جہاں ہم اکثر کھانا کھانے جاتے ہیں۔“

★ ”اگر مصنفہ نہ ہوتی تو؟“

✻ ”بہت اچھی سول جج ہوتی۔“

★ ”ایک لفظ جو مجھے واضح کرے؟“

✻ ”موڈی۔“

★ ”جنس مخالف کے بارے میں رائے؟“

✻ ”اگر مضبوط کردار اور بھرپور قوت ارادی کے حامل ہوں تو زبردست ورنہ چھچھورے۔“

★ ”محبت کے بارے میں خیال؟“

✻ ”اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔“

★ ”پسندیدہ رشتہ؟“

✻ ”اگر زندگی کے ساتھی کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ہو تو بہترین رشتہ یہی ہے ورنہ بدترین بھی یہی۔“

★ ”اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلیں گے؟“

✻ ”بہت عمدہ اور بلے بلے ہو جائے گی۔“

★ ”پسندیدہ لو اسٹوری؟“

✻ ”وہ جو مقبوضہ کشمیر کے یاسین اور ان کی بیگم کا نام بھول گیا ہے۔ ان دونوں کی۔“

★ ”کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟“

✻ ”childern of the heaven“۔

★ ”چہرے کچھ بتاتے ہیں؟“

✻ یوں غلط تو نہیں چہروں کا تاثر مگر
لوگ ویسے بھی نہیں جیسے نظر آتے ہیں

★ ”شاعری کے بارے میں خیال؟“

✻ ”لاکھ پردوں میں ہو بھید یہ کھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے۔“

★ ”بہترین کامیابی؟“

✻ ”ابھی تک تو کوئی بھی نہیں۔“

★ ”غم و ہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہیں؟“

✻ ”قرآنی آیات پڑھ کر۔“

★ ”سائنس کی بہترین ایجاد؟“

✻ ”انٹرنیٹ اور موبائل۔“

★ ”بدترین ایجاد؟“

✻ ”انٹرنیٹ۔“

★ ”ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟“

✻ ”حمیرا ناز سرور اور شازیہ اصغر دونوں ہی اس جہان میں نہیں۔“

★ ”بستر پر جانے سے پہلے کیا جانے والا آخری کام۔“

✻ ”لائٹ آف کرتی ہوں۔“

★ ”ایک بات جو ہمیشہ یاد رہی؟“

✻ ”ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔“

★ ”سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی اثاثہ؟“

✻ ”میرا قلم اور وہ سب کہانیاں جن کو میں نے ابھی تحریر کرنا ہے۔“

★ ”پیغام قارئین کا نام؟“

✻ ”ہمارے قارئین ماشاء اللہ باشعور اور سمجھدار ہیں اور کرن کے پلیٹ فارم پر ان کی بہترین تربیت ہو رہی ہے لیکن بہنوں سے جو شادی شدہ ہیں ان سے کہنا ہے کہ دوسروں کے تجربات کی روشنی میں اپنی زندگی کی راہیں متعین نہ کریں کیونکہ ایک چیز اگر کسی کے حالات میں ایک کے لیے بہتر ہے تو ضروری نہیں کہ آپ کے لیے بھی اچھی ہو۔ اپنے حالات و واقعات کو مد نظر رکھ کر اپنے راستے خود نکالیں اور وہ تمام بہنیں جو غیر شادی شدہ ہیں ان سے کہنا ہے۔ بس اچھے نصیب کی دعا کریں۔ قسمت اچھی ہو تو سب دروازے کھلتے جاتے ہیں۔“

★ ”کرن کے بارے میں رائے؟“

✻ ”ہر عمر کی خواتین کی رہنمائی کے لیے ایک بہترین انسٹی ٹیوٹ کے فرائض کرن بہت عمدگی سے سر انجام دے رہا ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔“ آمین

# فضا عابد جمیل

شاہین رشید

اگر میوزک روح کی غذا ہے تو اچھی گفتگو، اچھی آواز بھی روح کی غذا ہے۔ خوب صورت گفتگو اور خوب صورت میوزک کے ذریعے دل میں اترنے کا فن ایف ایم کے آر جے خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔

"فضا عابد" ایف ایم کی ایک خوب صورت آواز ہیں اور ان کے پروگراموں کو پسند کرنے والوں کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ FM-103 سے وابستہ ہیں۔ آیئے ان سے آپ کی ملاقات کروائیں۔

★ "کیا حال ہیں؟ کیا کر رہی تھیں؟"

✳ "میں بالکل ٹھیک، خیریت سے ہوں اور صبح کا وقت تو کافی مصروف ہی گزرتا ہے۔ گھر کے کام کاج وغیرہ میں۔"

★ "پروگرام کب کب ہوتا ہے آپ کا؟"

✳ "جی میرے پروگرام پیر اور منگل شام 4 سے 6 بجے تک اور ہفتہ کو صبح 10 سے 12 بجے تک ہوتا ہے۔"

★ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں ..... پھر ریڈیو کی طرف آتے ہیں؟"

✳ "میرا پہلا نام فضا احسن تھا۔ شادی کے بعد فضا عابد جمیل ہو گیا ہے احسن میرے والد کا نام ہے 2010ء جون میں میری شادی ہوئی اور اب میری دس ماہ کی بیٹی بھی ہے اور فیملی بیک گراؤنڈ کچھ یوں ہے کہ میرے دادا، دادی کا تعلق انڈیا سے ہے نگریا سادات سے آئے تھے۔ سید فیملی سے ہیں اردو اسپکنگ ہیں دادا، دادی حیات نہیں ہیں۔ ہم بہت مختصر فیملی ہیں یعنی امی ابو ہیں، میں ہوں اور میرا ایک بھائی ہے اور جہاں شادی ہوئی ہے وہاں ماشاء اللہ ایک بڑا خاندان ہے اور چھوٹی بہو ہوں۔"

★ "اکیلے رہنے کی عادت ہو جائے تو پھر بڑی فیملی میں ایڈجسٹ ہونا ذرا مشکل ہو جاتا ہے؟"

✳ "نہیں آپ کا خیال غلط ہے..... بڑی فیملی ہو تو بہت مزا آتا ہے اور پھر جو انسان اکیلا رہا ہو وہ ترستا ہے اچھے رشتوں اور بھرا پُرا گھر کے لیے میرے والد صاحب کے بھی بہن بھائی نہیں ہیں اور اکلوتے تھے تو نہ پھوپھو کا رشتہ دیکھا نہ تایا چچا کا خالائیں ہیں مگر جو بات ددھیال کی ہوتی ہے وہ ننھیال کی نہیں ہوتی۔ ہم ددھیال میں رہتے ہیں ننھیال میں نہیں تو مجھے جوائنٹ فیملی میں رہنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔

خیر میں آپ کو اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتا رہی تھی کہ میرے والد صاحب ڈاکٹر ہیں ان کا نام احسن مصطفیٰ ہے اور والدہ کا نام سیدہ شبانہ احسن ہے اور فضائیہ انٹر کالج میں ٹیچر کورڈنیٹر ہیں اور لیکچرار بھی ہیں کیمسٹری پڑھاتی ہیں۔ بھائی این ای ڈی یونیورسٹی میں فرسٹ ایئر کا طالب علم ہے۔ میں کراچی میں 26 دسمبر 1986ء کو پیدا ہوئی..... اور میرے والدین کی شادی بھی 1986ء میں ہوئی اور میں بھی 1986ء میں پیدا ہو گئی تو یہ سال میرے گھر والوں کے لیے بہت اچھا سال تھا۔ اور یہاں میں ایم بی اے کی طالبہ ہوں۔ ریڈیو کے ساتھ ساتھ تعلیمی سلسلہ بھی جاری ہے۔"

★ "ریڈیو کی طرف رجحان کیسے ہوا؟"

✳ "میری امی کی خواہش تھی کہ میں اکاؤنٹ پڑھوں اور اکاؤنٹ کے لیے دماغ چاہیے ہوتا ہے جو کہ سچی بات ہے میرے پاس نہیں ہے۔ امی کی ضد تھی کہ سی اے کرو اور میرے رونے دھونے کے باوجود میرا ایڈمیشن کرا دیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ ٹیچرز اور کلاس کے لوگ مجھ سے تنگ رہتے تھے۔ ہمارے کالج کی سامنے والی بلڈنگ میں ایک آفس تھا ایف ایم 105 کا جو کہ ابھی بنا نہیں تھا اور اس کی ٹیم حیدر آباد سے آئی ہوئی تھی تو ان کی مینجمنٹ سے ہماری اچھی خاصی دعا سلام تھی اور اکثر ہم وہاں چلے جاتے تھے۔ تو بڑا اچھا وقت گزر جاتا تھا تو وہاں سے پتا چلا کہ ایف ایم 103 پر آڈیشن ہو رہے ہیں اور مجھے بھی وہاں جانا چاہیے دس بارہ لڑکیوں کا گروپ بنا کر ہم وہاں چلے گئے۔ تفریح کے لیے وہاں پر پروگرام کورڈنیٹر ساحر علی اور عالیہ سحر تھیں۔ انہوں نے ہمارا آڈیشن لیا اور تھوڑی دیر بعد ہی ہمیں کال آ گئی کہ آپ کا سلیکشن ہو گیا ہے آپ آجایئے بس تفریح تفریح میں سب کچھ ہو گیا کوئی کریز نہیں تھا کہ جی مجھے ریڈیو جوائن کرنا ہے اور ضرور کرنا ہے تفریح تفریح میں پہلا شو بھی ہو گیا۔"

★ "کیا احساسات تھے۔ تفریح تفریح میں کوئی کامیابی مل جائے تو کیا محسوس ہوا تھا؟"

✳ "خوشی تھی بے اندازہ کہ ہم نے تو یونہی اپلائی کیا اور کامیابی مل گئی تو خوشی کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں تھا..... پھر جب پروگرام شروع کیا تو شوق ہوا کہ اپنی آواز تو سنوں کہ میں کیسا بولتی ہوں اور آواز کیسی آتی ہے۔ تو آواز سن کر بہت مایوسی ہوئی تھی اور بڑا موڈ آف ہوتا تھا۔ کیونکہ غلطیاں بھی ہوتی تھیں تو اپنے پروگرام سن سن کر اپنے آپ کو بہتر کیا۔"

بقیہ صفحہ 266 پر

فوزیہ یاسمین

# دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی' جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے.... زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے.... وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ' سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے.... اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم' ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کر لیتا ہے' اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کر دیتا ہے۔

## ۲۲

## بائیسویں قسط

"اگر اس شخص میں اتنی خوبیاں ہیں تو وہ اچانک مجھ سے ساتھ شادی کرنے کے لیے کیوں تیار ہو گیا۔"
رومیلہ کو ان کے جواب سے کوئی خاص تقویت نہیں ہوئی تھی۔
"کیونکہ وہ میرا دوست ہے۔ میں نے بتایا تو ہے تمہیں 'جب اسے یہ پتا چلا کہ میرے ساتھ اتنا برا دھوکا ہو گیا تو اس نے فوراً "تمہارے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"
گلفام کی موجودگی میں بھی اگر اس کا رشتہ آتا تو میں گلفام پر اسے ہی ترجیح دیتا' بلکہ سچ تو یہ ہے کہ الیان سے بہتر لڑکا ملنا ناممکن ہے' عام حالات میں بھی اس کا پروپوزل ہر حال میں قبول کیا جاتا اور اس وقت گویا اس کا شادی کے لیے خود کو پیش کرنا ہماری کسی نیکی کا ہی اجر ہے۔" ابرار بھائی خوشی جتاتے رہے۔
اتنی پریشانی کے عالم میں بھی انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی بجائے یا اس رشتے کو اپنی خوش نصیبی گرداننے کی بجائے اسے اپنی کسی نیکی کا بدلہ سمجھ لیا تھا۔
رومیلہ ان کی بات سن کر نمل کی طرف دیکھنے لگی جو چپ چاپ کسی سوچ میں ڈوبی لگ رہی تھی۔
اصل میں ابرار بھائی نے اپنی بات کے آغاز میں یہ کہہ کر۔
"نمل اپنے والد سے پوچھ لے۔" اپنی بات میں وزن پیدا کر لیا تھا۔
عظمت خلیل ایسے شخص تھے جو واقعی شہر کی جانی مانی ہستیوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ حقیقتاً "کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھنے والا ہو گا۔ ورنہ عظمت خلیل کا حوالہ دے کر انہیں کسی ایسے معاملے میں گھسیٹنا کوئی مذاق نہیں تھا' وہ کسی کا بھی لحاظ کیے بغیر الیان غفار کے بارے میں اپنی لاعلمی کا صاف اظہار کر سکتے تھے۔
جبکہ ابرار بھائی کا خود اعتماد لہجہ ضمانت دے رہا تھا کہ اگر عظمت خلیل سے تصدیق کی گئی تو ان کی بات سچ ثابت ہو گی جھوٹ نہیں۔
پھر نمل کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ اس طرح بارات کا لوٹ جانا رومیلہ کے لیے آئندہ زندگی میں کئی مسائل کھڑے کر دے گا' ایسے میں اگر اسے کوئی اچھا رشتہ مل رہا تھا تو سمجھ داری کا تقاضا یہ ہی تھا کہ اس پر فوراً" ہاں کر دی جائے۔
آخر رومیلہ کو کسی نہ کسی سے تو شادی کرنی تھی' اس کی کون سی گلفام کے ساتھ کوئی جذباتی وابستگی تھی جو اس کے لیے فوری طور پر اس کی جگہ کسی اور کو دینا مشکل لگتا' اسی لیے وہ خاموش سی ہو گئی۔
پھر بھی اپنے اطمینان کے لیے انہوں نے عظمت خلیل سے بھی ایک دفعہ بات کر لینے کا فیصلہ کر لیا' جس کے لیے نمل تو راضی نہیں ہوئی' البتہ سنبل نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔
اس نے اسی وقت عظمت خلیل کو فون ملایا اور رومیلہ کی شادی ٹوٹ جانے کی اطلاع دے دی' جسے سن کر کچھ لمحوں کے لیے عظمت خلیل کچھ کہنے سننے کے قابل نہ رہے۔
ایک طرح سے وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے تھے' انہیں ابرار پر اس قدر غصہ آ رہا تھا کہ جس کی کوئی حد نہیں تھی۔
اس کی غیر ذمہ داری سے کیے گئے فیصلے کی وجہ سے آج نمل ان کے سامنے سرخرو ہو گئی تھی' وہ نمل کو اس کے منہ پر تو کیا دل میں بھی سراہنے کو تیار نہیں تھے کہ محض اس کے کینیڈا جانے کی وجہ سے آج رومیلہ ایک بہت غلط آدمی کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئی۔
ان کی انا پر کاری ضرب پڑی تھی' گلفام کی اصلیت جاننے سے۔
انہوں نے شکر ادا کیا تھا کہ نمل نے انہیں فون نہیں کیا' بلکہ سنبل نے اس کی جگہ بات کر لی۔ حالانکہ انہیں یقین تھا کہ نمل اگر بات کرتی بھی تو محض اپنے سوالوں کا جواب حاصل کر کے فون بند کر دیتی اور کسی قسم کا طنزیا



طعنہ انہیں ہرگز نہ دیتی۔
مگر پھر بھی ان کے دل کا چور نمل کا سامنا کرنے یا اس سے بات کرنے سے گھبرا رہا تھا۔
ایک طرح سے انہوں نے سنبل سے بھی زیادہ تفصیلی بات نہیں کی اور جلدی سے فون بند کر دیا۔ البتہ الیان غفار کے متعلق اس کے سارے سوالوں کا جواب مختصر مگر جامع دے دیا۔
ریاض غفار اپنے وسیع و عریض بزنس کی وجہ سے اونچے طبقے میں خاصے مقبول تھے' انہیں شہر کے تمام بڑے گھرانے اور اچھی حیثیت کے لوگ بخوبی جانتے تھے۔
چنانچہ عظمت خلیل نے الیان کے فیملی بیک گراؤنڈ اور حیثیت کے متعلق تسلی بخش جواب دے دیا اور ساتھ ہی سنبل کو تذبذب میں مبتلا بھی کر دیا یہ کہہ کر۔
"اتنے اچھے لڑکے کا اس طرح اچانک شادی کے لیے محض دوستی کی وجہ سے تیار ہو جانا بڑے تعجب کی بات ہے' مگر جو بھی ہو رومیلہ کے لیے وہ ہر طرح سے مناسب رہے گا' بلکہ یہ یقیناً "کسی نیکی کا نتیجہ ہے۔" عظمت خلیل نے مزید دو چار اسی قسم کے جملے بول کر فون بند کر دیا۔
ان کا بھی یہی خیال تھا کہ پریشانیوں کا ٹلنا انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے اور دنیا بھر کے ننانوے لوگوں کی طرح پریشانیوں کا آنا کسی گناہ کی سزا نہیں' بلکہ اس وقت لوگوں کے سامنے ضبط و صبر کا ڈرامہ کرتے رہنے کے بعد دل ہی دل میں وہ بھی جانے کون سا گناہ سرزد ہو گیا کہ تکرار کرتے رہتے تھے اور یہ نہیں سوچتے تھے کہ جانے کون کون سے گناہ سرزد ہو گئے۔ جن کی سزا مل رہی ہے۔
عظمت خلیل سے بات کر کے وہ تینوں مطمئن تو نہیں ہوئی تھیں' البتہ خاموش ہو گئی تھیں۔ اگر اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی رومیلہ کو ایک اچھا رشتہ مل رہا تھا تو انہیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا۔
رومیلہ بھی خود کو بس یہی تسلی دیے جا رہی تھی' ورنہ اس طرح اچانک کسی شخص کا محض اس کے بھائی کے دوست ہونے کی وجہ سے شادی پر رضامند ہو جانا رومیلہ کی عزت نفس کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ گویا کہ اب وہ اتنی ارزاں ہو گئی ہے کہ لوگ اسے احسان کے طور پر اپنا رہے ہیں نا کہ اپنی خوشی سے۔ پتا نہیں اس کے گھر والوں کا کیا رد عمل ہو گا۔ وہ شخص تو چلو دوستی کا پاس رکھ رہا تھا۔ حالانکہ ابرار بھائی کی کسی شخص سے اتنی گہری دوستی بھی ہے کہ ضرورت پڑنے پر وہ اس حد تک کام آ سکتا ہے' اس کا اندازہ اسے ہرگز نہیں تھا' اس نے تو الیان نام کے کسی دوست کا ذکر تک کبھی نہیں سنا تھا۔
لیکن یہ ایسی بات نہیں تھی جس پر غور کیا جاتا' ابرار بھائی گھر میں اس قدر لیے دیے رہتے تھے کہ ان کے دوستوں سے واقفیت نہ ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔
اس لیے وہ اگر اتنی مشکل گھڑی میں کام آ رہا تھا تو ضرور وہ انتہاہی پر خلوص دوست ہو گا۔
مگر اس کے گھر والے اس ایمرجنسی کی شادی پر کیسا محسوس کر رہے ہوں گے۔ آج کل تو کم حیثیت کے لوگ بھی اتنے دھوم دھڑکے سے شادیاں کرتے ہیں کہ ساری زندگی ان شادیوں پر لیے قرض ہی اتارتے رہتے ہیں تو پھر وہ لوگ جو ایسی دس شادیاں با آسانی منعقد کرا سکتے ہیں' ان لوگوں کے کیا کیا ارمان نہ ہوں گے اور ساری خواہشوں کے جنازے کے ساتھ لائی گئی بارات آئندہ اس کی زندگی میں کتنی آسودگی لا سکے گی' اس کا اندازہ ان لوگوں سے ملے بغیر نہیں ہو سکتا تھا' کیا پتا وہ لوگ ان ساری چیزوں اور خواہشوں سے ماورا محض انسانیت اور خلوص پر یقین رکھنے والوں میں سے ہوں۔
رومیلہ صرف سوچ سکتی تھی' کوئی حتمی رائے وہ ان سے ملے بغیر نہیں دے سکتی تھی اور ملنے میں بھی کون سا ٹائم باقی تھا' دوپہر تو ہو ہی گئی تھی' آج رات تک وہ تمام افراد اس کے روبرو ہوں گے اور وہ اتنی چہرہ شناس تو ضرور

تھی کہ ان کے تاثرات دیکھتے ہی جان جاتی کہ یہ سب اپنی خوشی سے آئے ہیں یا سارے بندے زبردستی کے لائے گئے ہیں۔

الیان کی طرف سے تو اسے امید تھی کہ وہ اپنے فیصلے میں خود مختار ہے تو اس پر کوئی دباؤ نہیں ہوگا، مگر زندگی صرف ایک شخص کے ساتھ نہیں گزارنی ہوتی، پتا نہیں اس کے گھر والوں کا رویہ کیسا ہوگا۔

رومیلہ جیسی خوددار لڑکی کے لیے تو محض پیشانی پر پڑا ایک بل ہی برداشت کرنا بہت مشکل تھا، اسی لیے بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق کرتے ہوئے بھی ایک عجیب سی بے چینی نے اس کا احاطہ کر رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

بظاہر تو اس نے خود کو معمول کے مطابق ہی رکھا ہوا تھا۔ مگر ایک عجیب سی بے چینی کے ساتھ ساتھ انتہا کو پہنچی جھنجلاہٹ نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، جس کی ذمہ دار صرف اور صرف شگفتہ غفار تھیں۔

اتنی پریشانیوں اور الجھنوں میں بھی جانے انہیں کون کون سے ارمان یاد آرہے تھے جو انہوں نے الیان کی شادی میں پورے کرنے تھے۔

ایک طرف وہ اگر بریرہ کے لیے بری طرح فکر مند تھیں تو دوسری طرف الیان کے ساتھ ہوئی ناانصافی پر نالاں بھی تھیں، کتنی بار تو وہ ان لوگوں کی موجودگی میں ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان لوگوں کو لائن سے کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیں، جنہوں نے بیک وقت ان کی دونوں اولادوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔

الیان اور ریاض غفار بڑے تحمل سے ان کے پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہوتے رویے کو برداشت کر رہے تھے جو بے تحاشا رونے کے دوران ان لوگوں کو مسلسل کوسے جا رہی تھیں۔

بیچ بیچ میں انہیں دنیاداری کا خیال آجاتا تو الگ ہول اٹھنے لگتے۔

"تمہارے ماموں کو میں کیا کہوں گی، میں نے اس طرح اچانک الیان کی شادی کیوں کر دی اور کرنی ہی پڑ گئی تھی تو کسی کو بلایا کیوں نہیں۔ وہ سب گاؤں میں نہیں — شہر میں موجود ہیں، پھر آخر ایسا کیا ہو گیا۔" ان کے کوئی دسویں بار پوچھنے پر بھی الیان نے بڑے تحمل سے کہا۔

"آپ سارا الزام مجھ پر رکھ دیجیے گا اور کہہ دیجیے گا کہ مجھے خود کچھ پتا نہیں تھا۔" الیان کی بات پر وہ تنک کر بولیں۔

"وہ بھی میری ہی برائی ہے کہ اولاد کی تربیت میں نے ایسے کی ہے کہ وہ آج اپنی زندگی کے اہم فیصلوں میں بھی مجھے کوئی اہمیت نہیں دے رہی۔

اس کڈنیپر نے بھی تو بریرہ کی شادی میں تمہارے ولیمہ کے اعلان کی شرط رکھ دی، ورنہ تو ہم ابھی کسی سے ذکر ہی نہ کرتے۔" ان کی پریشانی میں ہر نئی سوچ کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا، ہر نیا خیال ان کے ذہن میں دس نئے سوال پیدا کر دیتا جو لوگ ان سے پوچھنے والے تھے اور جن میں سے ایک کا بھی تسلی بخش جواب شگفتہ غفار کے پاس نہیں تھا۔

اسی لیے وہ ان سوالوں کو الیان کے سامنے دوہرائے جا رہی تھیں کہ جیسے وہ ان کے مسئلے کو چٹکی بجاتے ہی حل کر دے گا۔

وہ یہ نہیں سوچ رہی تھیں کہ وہ خود ضبط کی کن منزلوں سے گزر رہا ہے، ایک طرف بہن کی زندگی اور عزت



...ہیں تھی تو دوسری طرف اپنا آپ اسے گروی رکھنا پڑ رہا تھا۔

پھر بھی وہ اپنی مضبوط قوت برداشت کے باعث اس کٹھن مرحلے میں بھی شگفتہ غفار کے احساسات کو سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آرہا تھا، بلکہ صرف وہی نہیں ریاض غفار بھی ایک دم چپ سادھے شگفتہ غفار کی دیوانگی کو برداشت کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی اور آنکھوں میں اٹھتے طوفان ان کی اندرونی کیفیت کو بخوبی ظاہر کر رہے تھے۔

ایسی ہی پریشانی اور تفکرات میں گھرے وہ تینوں پیلس ہوٹل پہنچ گئے۔

کڈنیپر نے انہیں تاکید کی تھی کہ انہیں اچھے حلیے میں ایسے ہی پہنچنا ہے جیسے بارات لے کر آرہے ہوں اور لڑکی کے گھر میں اس کے والد اور بھائی کے علاوہ سب پر یہی ظاہر کرنا ہے کہ اس رومیلہ نامی لڑکی کے بھائی ابرار کا دوست ہے۔

اس نے انہیں حتی الامکان کم سے کم بولنے کی ہدایت دی تھی۔ کسی سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور بے تکلف ہونے کی تو بالکل کوئی کوشش ہی نہ کی جائے، خاص طور پر شگفتہ غفار اپنی زبان پر قابو رکھیں، ورنہ نتائج کے ذمہ دار لوگ خود ہوں گے۔

اسی لیے گاڑی سے اترتے ہی ریاض غفار نے شگفتہ غفار کو بڑی سختی سے یاددہانی کرا دی تھی کہ انہیں بالکل خاموش رہنا ہے، ان کی ایک غلطی بریرہ کے لیے ناقابل تلافی نقصان کا سبب بن سکتی ہے۔

شگفتہ غفار لاکھ جذباتی سہی، مگر یہ لمحہ ایسا تھا کہ ان کی زبان خود بہ خود تالو سے چپک گئی۔

ہوٹل کے شاندار Entrance پر وہ تینوں کچھ دیر ساکت کھڑے رہے، جیسے سمجھ میں نہ آرہا ہو اندر جا کر کیا کرنا ہے، پتا نہیں کون اور کیسے لوگوں سے ان کا سامنا ہونے والا تھا۔

آخر سب سے پہلے الیان نے ہی گہرا سانس کھینچتے ہوئے قدم اندر کی طرف بڑھائے تو ریاض غفار اور شگفتہ غفار کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی الیان کی نظر سامنے اسٹینڈ پر رکھے بورڈ پر پڑی اور اس کے قدم وہیں جم گئے، حالانکہ بورڈ بالکل عام سا تھا ہوٹل میں اگر کوئی شادی منعقد ہوتی ہے تو اس کی تفصیل Entrance پر ہی لکھ کر لگا دی جاتی ہے کہ فلاں کی شادی یا ولیمہ ہوٹل کی فلاں جگہ پر ہو رہی ہے، تاکہ آنے والے مہمانوں کو دقت نہ ہو۔

مگر الیان کے ٹھٹکنے کی وجہ بورڈ پر لکھا اس کا نام تھا جو کہ بڑی تفصیل سے ریاض غفار کے بیٹے الیان غفار کے طور پر لکھا ہوا تھا۔

الیان کچھ دیر تو اپنے نام کے ساتھ لکھے رومیلہ کے نام کو دیکھتا رہا، پھر سر جھٹکتا آگے بڑھ گیا۔

بال روم کے دروازے پر پہنچتے ہی ایک شخص جو لوگوں کے استقبال کے لیے ہی کھڑا تھا اسے دیکھ کر چوکنا ہو گیا۔ اس نے اپنے پاس کھڑے ایک بوڑھے آدمی کے کان میں کچھ کہا تو وہ بھی چونک کر الیان کو دیکھنے لگا۔

بابا جانی کچھ لمحے تو ساکت کھڑے اپنی ہمت اکٹھا کرتے رہے، الیان اور اس کے والدین کے قریب جا کر ان سے بات کرنے کی پھر آخر ابرار بھائی نے ہی انہیں ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

"جائیں جا کر اسے اندر لے کر آئیں، اسے تھوڑی پتا ہے کہ یہ سب کون کر رہا ہے؟" ابرار بھائی بالکل اسی طرح دبی زبان سے بولے جس طرح تھوڑی دیر پہلے انہوں نے الیان کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس کے متعلق بتایا تھا۔

بابا جانی نے ایک نظر ابرار بھائی کو ایسے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اگر اسے نہیں پتا کہ یہ سب کون کر رہا ہے تو تم خود اس کے استقبال کے لیے آگے کیوں نہیں بڑھ جاتے۔

مگر وہ یہ بات کہہ نہیں سکے ' انہیں علم تھا ابرار بھائی دل میں چھپے چور کے سبب خود ہرگز منظر پر آنا نہیں چاہیں گے۔ بابا جانی تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھتے عین ان تینوں کے مقابل آ کھڑے ہوئے۔

"تم الیان ہو نا؟" الیان نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"میں رومیلہ کا والد ہوں۔" بابا جانی نے عجیب شرمندہ سے انداز میں کہا۔

"آپ؟" شگفتہ غفار بے ساختہ حیرت سے گویا ہوئیں ' الیان تو پھر بھی ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم کر چکا تھا اور وہ سب ریاض غفار اور شگفتہ غفار کے گوش گزار بھی کر چکا تھا۔ مگر شگفتہ غفار کو اپنے سامنے ایک سلجھے ہوئے سادہ سے بزرگ کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

وہ تو اپنے ذہن میں رومیلہ اور اس کے گھر والوں کا نہ جانے کیسا عجیب و غریب حلیہ بنا کر آئی تھیں ' جبکہ یہ تو ایک پڑھی لکھی باوقار فیملی لگ رہی تھی۔

"جی میں... آپ... آپ کھڑے کیوں ہیں۔ آئیں اندر آئیں نا۔" بابا جانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ان کے کہنے پر الیان اور ریاض غفار نے تو فوراً قدم آگے بڑھا دیے جبکہ شگفتہ غفار شش و پنج کے عالم میں انہیں دیکھنے لگیں۔

بے اختیار ان کا شدت سے دل چاہا تھا وہ ان سے پوچھیں کہ اس کٹ نہیو نے آپ کو اس شادی کے لیے کیسے مجبور کیا۔ مگر وہ صرف دل مسوس کر رہ گئیں۔

اندر داخل ہونے پر انہیں احساس ہوا کہ یہاں تو واقعی شادی کا سماں بندھا ہوا ہے ' رومیلہ کا پورا خاندان نا صرف موجود تھا ' بلکہ ان کا حلیہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ سب بھی کسی گری پڑی فیملی سے تعلق نہیں رکھتے ' سب بہت اچھے طریقے سے تیار ہو کر آئے تھے۔

ان کے مقابلے میں شگفتہ غفار کافی سادہ لگ رہی تھیں ' انہوں نے آج جو کچھ بھی پہنا تھا بڑے بجھے دل کے ساتھ محض اس کٹ نہیو کی دھمکی کی وجہ سے پہنا تھا ' حالانکہ الیان نے خاص طور پر تاکید کی تھی اسے ڈر تھا کہیں ان کی تیاری کو ناپسند کرتے ہوئے بریرہ کو اغوا کرنے والا کوئی اعتراض نہ کر دے۔

خود الیان نے بلیک تھری پیس سوٹ میں اپنی شان دار پرسنالٹی کے ساتھ سچ مچ کا دولہا لگ رہا تھا۔ اس پر اٹھنے والی ہر نظر پل بھر کے لیے اسی پر ٹھہر گئی تھی ' یہاں تک کہ رومیلہ کی بھابھی تو گنگ ہی رہ گئی تھیں۔

رومیلہ کی شادی اتنے ہینڈسم لڑکے سے ہوتی دیکھ کر انہیں تو بڑی بوریت ہوئی تھی ' وہ بے اختیار ابرار بھائی کے نزدیک جا کر برہمی سے بولیں۔

"ابرار یہ آپ کا کون سا دوست ہے ' اس سے پہلے تو کبھی ان موصوف سے ملاقات نہیں ہوئی۔" وہ اتنی زور سے بولی تھیں کہ الیان بھی رک کر انہیں دیکھنے لگا۔

ابرار بھائی کو بھی ان کا اس طرح آ کر بولنا سخت ناگوار گزرا تھا۔ وہ چاہ رہے تھے الیان پہلے اسٹیج پر جا کر بیٹھ جائے ' پھر وہ بھابھی کو ذرا سبھاؤ سے اپنی پرانی دوستی کی کہانی سنا دیں گے۔

مگر الیان تو ابھی اسٹیج کی پہلی سیڑھی ہی چڑھا تھا کہ بھابھی نے ابرار بھائی کو جا لیا۔

ابرار بھائی بے اختیار الیان کو دیکھنے لگے جو انہیں ایسے دیکھ رہا تھا جیسے جاننا چاہتا ہو کہ اب وہ کیا کہانی سناتے ہیں۔

"کیا ہوا ' یہی ہے نا دولہا جسے آپ اور بابا جانی دروازے سے لیتے ہوئے آ رہے ہیں۔ میں نے غلط اندازہ تو نہیں لگایا نا۔" بھابھی باری باری ان دونوں کو دیکھ کر بولیں. جو ایک دوسرے کو ہی دیکھ رہے تھے۔

"آں... ہاں... ہاں تمہارا اندازہ صحیح ہے ' یہی ہے الیان۔" ابرار بھائی خود کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے بولے تو





الیان بری طرح چونک اٹھا۔

اس آواز کو پہچاننے میں وہ ہرگز غلطی نہیں کر سکتا تھا ' جس آواز نے دو دنوں میں اس کی زندگی کا سکون و چین حرام کر دیا تھا ' اس آواز کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔

"لیکن میں تو آپ کے سارے دوستوں کو جانتی ہوں ' اسے تو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" بھابھی اب بھی حیران تھیں۔

"ارے بھئی تم میرے سارے دوستوں کو کہاں جانتی ہو میرے تو ہزاروں دوست ہیں ' تم تو بس دو ' چار سے ہی ملی ہو۔" ابرار بھائی خود پر جمی الیان کی نظروں سے گھبرا کر بری طرح چڑ کر بولے تو اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھابھی کو ان کا یہ لہجہ اپنی سبکی محسوس ہوا ' وہ ابرار بھائی پر ایک کھولتی ہوئی نظر ڈال کر ناراضی کے طور پر پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئیں جبکہ ابرار بھائی کے تایا زاد بھائی ان کے قریب آ کر پوچھنے لگے۔

"ابرار یہ سب کیا ہے تو گلفام نہیں ہے۔ باہر بورڈ پر گلفام کی بجائے الیان کا نام پڑھ کر میں سمجھا تھا شاید لکھنے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے ' مگر اب تو لگتا ہے جیسے معاملہ ہی کچھ اور ہے ' اس دن واقعی گلفام کے خاندان میں کسی بزرگ کا انتقال ہوا تھا یا کوئی اور ہی بات تھی۔" ان کا لہجہ تفکر اور تجسس سے پر تھا۔

الیان بڑے غور سے ان کی بات سن رہا تھا ' ریاض غفار اور شگفتہ غفار اسٹیج کے نزدیک اتنے لوگوں کو کھڑا دیکھ کر دور ہی رک گئے تھے ' چاروں طرف سے لوگوں کی نظریں ان تینوں پر جمی تھیں ' وہ اس عجیب و غریب انداز سے کی گئی شادی پر پہلے ہی شرمندہ تھے ' اب لوگوں کی ایکسرے لیتی نظریں انہیں اپنے آپ میں سمٹنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

اصل میں ابرار بھائی نے تو کسی کو کچھ بتایا نہیں تھا کہ شادی گلفام سے نہیں بلکہ کسی اور سے ہو رہی ہے ' لوگ تو آتے کے ساتھ ہی بورڈ پر لکھے نام کو دیکھ کر چونک اٹھے تھے ' کچھ لوگ تو ایسے تھے جو ریاض غفار اور شگفتہ غفار کو بھی جانتے تھے ' ان کے تو گویا پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے تھے کہ آخر یہ کیا ماجرہ ہے۔

دو دن پہلے جس طرح مہندی کا فنکشن انجام پایا تھا وہ پہلے ہی سب کو مشکوک کر گیا تھا ' اب تو بورڈ پڑھ کر جو بھی اندر داخل ہو رہا تھا چہ مگوئیاں کرتی محفل کا حصہ بن رہا تھا اور اب الیان کو دیکھ کر گویا سب ہی اپنے اپنے ذوق و شوق کے مطابق کہانی تراشنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

"آں میں... آپ کو بعد میں سب سمجھا دیتا ہوں۔" ابرار بھائی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس صورت حال کو کیسے سنبھالیں۔

گلفام کو سبق سکھانے کے لیے انہوں نے جو قدم اٹھا لیا تھا اس پر ثابت قدم تو انہیں رہنا ہی تھا۔ اخلاقی اور قانونی طور پر وہ ایک جرم کر چکے تھے۔ مگر ہر مجرم کی طرح وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کا جرم دنیا کی نظر سے چھپا رہے ' ساتھ ہی ساتھ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ اس قدر غیر فطری اور روایتی شادی بغیر کسی جگہ ہنسائی کے خوش اسلوبی سے طے پا جائے اس لیے وہ فوری طور پر انہیں کوئی جواب نہ دے سکے ' بلکہ انہیں نظر انداز کرتے الیان کے نزدیک چلے آئے۔

"ارے تم کھڑے کیوں ہو بیٹھو نا۔" ابرار بھائی نے بظاہر خود کو نارمل رکھتے ہوئے ایسے کہا جیسے وہ واقعی اسے مدتوں سے جانتے ہوں اور اب ان کے بیچ سالے اور بہنوئی والی بے تکلفی بھی موجود ہو۔

الیان انہیں جواب دینے کی بجائے یک ٹک دیکھتا رہا ' وہ اپنی جگہ سے بھی نہیں ہلا ' ابرار بھائی اس کا انداز دیکھ کر ٹھٹک گئے ' دل میں چور جو موجود تھا ' وہ کچھ پریشانی سے اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

"بیٹھو نا الیان۔ تم تو اکیلے ہو ' تمہارے خاندان والے یہاں موجود نہیں۔ لیکن ہمارے تو سارے رشتے دار

تمہاری ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہے ہیں' ان کے شک و شبہات کو اور بڑھاؤ نہیں۔"
"کیا یہ بھی دھمکی ہے۔" الیان نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔
"کیا مطلب؟" ابرار بھائی حقیقتاً "سمجھ نہیں سکے۔
"بریرہ تمہارے پاس ہے نا۔" الیان نے سوال نہیں کیا تھا۔ اس کے لب و لہجہ میں سو فیصد یقین موجود تھا' اتنا اعتماد کہ ابرار بھائی بوکھلا کر بغلیں جھانکنے لگے۔
"آں... آں میں... میں سمجھا نہیں... تم... تم کیا کہہ رہے ہو۔" وہ کوئی پیشہ ور مجرم نہیں تھے۔ بزنس کی دنیا میں ہیر پھیر کرنا اور بات ہے اور کسی کی بہن کو اٹھوا لینا اور کہانی ہے۔ ان سے تو گویا اپنی گھبراہٹ چھپانا مشکل ہو گیا تھا اور پھر ان کے سامنے الیان کھڑا تھا جو ان کے تاثرات دیکھ کر ایک ہی پل میں شک سے یقین کی منزل تک پہنچ گیا۔
"میں نے کہا تھا نا میں تمہیں بہت آسانی سے ٹریس کر سکتا ہوں۔" ابرار بھائی کو یہ اندازہ ضرور تھا کہ ہو سکتا ہے ایک نہ ایک دن الیان یا اس کے گھر والے یہ جان جائیں کہ بریرہ کے اغوا کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے' مگر الیان اتنی جلدی اس راز کو پالے گا یہ امید انہیں بالکل نہیں تھی' ورنہ وہ اس طرح منظر عام پر آتے ہی نہیں اور الیان سے ملے بغیر ہی رومیلہ کو اس کے ساتھ رخصت کر دیتے۔
انہیں تو اب خیال آیا تھا کہ انہیں فوراً "الیان کے سامنے آنا ہی نہیں چاہیے تھا' یہ فنکشن ان کے بغیر بھی انجام پا سکتا تھا' بلکہ زیادہ اچھا ہی تھا جو وہ یہاں نہ آتے' انہیں خاندان والوں کا سامنا بھی نہ کرنا پڑتا' الیان سے وہ بعد میں بھی تنہائی میں مل لیتے' تب وہ اسے کسی بھی طرح ٹال سکتے تھے اور اگر نہ بھی ٹال پاتے تو کم از کم بھرے مجمع میں تماشا تو نہ بنتا۔
ابرار بھائی بالکل سن کھڑے تھے' وہ تو سوچ رہے تھے یہاں ان کی موجودگی زیادہ ضروری ہے' کیونکہ اگر یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی یا الیان اور اس کے والدین نے اس کے خاندان والوں کے سامنے کسی قسم کی مجبوری یا اپنی بیٹی کے اغوا کا رونا رویا تو وہ صورت حال کو سنبھال لیں گے۔ ورنہ بابا جانی سے ایسی توقع رکھنا بے کار تھا۔ ان سے تو کوئی بعید نہیں تھی کہ وہ گھبرا کر کچھ الٹا سیدھا بول دیں۔ وہ خود یہاں موجود رہیں گے تو الیان کے گھر والوں کو صحیح طریقے سے قابو رکھ سکیں گے۔
مگر اب الیان کے اچانک پوچھنے پر ان کے تو حواس گم ہو گئے' الیان بغور ان کی پل پل بدلتی شکل کو دیکھتا رہا۔
الیان کی خاموشی نے جیسے انہیں سنبھلنے اور سوچنے کا موقع دے دیا۔ بالکل اچانک انہیں خیال آیا کہ بریرہ تو ابھی بھی ان کے قبضے میں ہے' اگر الیان یہ جان بھی گیا کہ یہ سب انہوں نے کیا ہے تب بھی ان کا بگاڑ ہی کیا سکتا ہے وہ' اسے اس کی بہن کی عزت کی خاطر زبان بند رکھنے اور ان کی بہن کو اپنانے پر بآسانی مجبور کر سکتے ہیں۔
اس خیال کے آتے ہی ان کا مجروح ہوتا اعتماد پھر بحال ہو گیا اور وہ خود کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے انجان بن کر کہنے لگے۔
"لگتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے الیان۔ تم کسی اور کے دھوکے میں مجھ سے بات کر رہے ہو' ورنہ ہم دونوں کے بیچ تو سرے سے کبھی کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے ٹریس کرنے کی دھمکیاں دینا۔" انہوں نے لفظ دھمکیاں کو کھینچ کر ادا کیا تاکہ الیان جو اچانک اپنے مجرم کو سامنے دیکھ کے یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا' دوبارہ اس حقیقت کو تسلیم کرلے۔
اور واقعی الیان کچھ ٹھٹک سا گیا' ابرار کا لب و لہجہ سن کر وہ کوئی بے وقوف نہیں تھا جو اس کی تنبیہہ کرتی آنکھوں کا مطلب نہ سمجھ پاتا۔

غصے کی ایک شدید لہر الیان کو اپنے پورے وجود میں اٹھتی محسوس ہوئی' دل تو چاہ رہا تھا آگے بڑھ کر ابھی اس شخص کا گلا دبا دے' مگر بریرہ کا معصوم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا تو الیان صرف خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ دوسری طرف الیان کی آنکھوں میں اپنے لیے شدید ترین نفرت اڈتی دیکھ کر پل بھر کے لیے ہی سہی ابرار کی آنکھوں کے سامنے بھی رومیلہ کا چہرہ ابھر آیا۔

صرف ایک پل کے لیے اس کے ضمیر نے پوچھا تھا۔

"کل کو الیان کا رویہ رومیلہ کے ساتھ کیسا ہوگا؟" مگر اگلے ہی پل ابرار نے یہ سوچتے ہوئے ضمیر کو خاموش کرا دیا۔

"رومیلہ بہت اچھی لڑکی ہے الیان کچھ ناراض رہنے کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔" اس سوچ نے ابرار کو ایک عجب سا سکون عطا کیا تھا' جس کے بعد اس کے سامنے صرف ایک ہی سوال رہ گیا کہ یہ سب جان کر بھلا گلفام کے کیا تاثرات ہوں گے۔

انہوں نے اتنی مغزماری گلفام کو نیچا دکھانے کے لیے کی تھی۔ چنانچہ وہ شکست کے بعد کے اس کے جھنجلائے ہوئے تاثرات اور رویہ دیکھنے کے لیے بری طرح بے چین تھے' جو کہ فی الوقت ممکن نہیں تھا تو بھی تصور کی آنکھ سے انہوں نے اس کی فرضی شکل دیکھتے ہوئے خود کو اتنا مسرور کر لیا کہ رومیلہ کی فکر کہیں کسی پس منظر میں چلی گئی' جس کے بعد انہوں نے رخصتی تک پورا فنکشن بڑے اعتماد کے ساتھ نہایت بے فکری سے اٹینڈ کیا' البتہ اس بات کا دھیان ضرور رکھا کہ الیان اور اس کے والدین کے پاس ان کے خاندان والے زیادہ نہ بھٹکیں' مبادلہ انہیں گلفام کے متعلق کچھ پتا چل جائے یا ان کے خاندان والوں کو الیان کے رویے سے کسی گڑبڑ کا احساس ہو جائے اور یہ اندازہ ہو جائے کہ انہیں زبردستی اس شادی کے لیے راضی کیا گیا ہے۔

یہ تو انہیں یقین تھا کہ الیان اور اس کے والدین اپنی بیٹی کو بدنامی سے بچانے کے لیے اس کے اغوا ہو جانے کے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے' مگر ان کی بے زاری بھی ظاہر نہیں ہونی چاہیے' اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے بابا جانی کو الیان کے ساتھ لگا دیا تھا یہ اور بات تھی کہ بابا جانی الیان کے ساتھ آکر گنگے بندھے بیٹھ گئے تھے' مگر مارے شرمندگی کے انہوں نے ایک بار بھی سر اٹھا کر ——— اس کی جانب دیکھنے یا اسے مخاطب کرنے کی جسارت نہیں کی تھی۔

حالانکہ انہیں یہ پتا بھی نہیں تھا کہ الیان ان کے بیٹے کی کرتوت کے بارے میں سب جان گیا ہے۔ ان کی شرمندہ ہونے کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ خود تو سب جانتے ہیں۔

الیان کی والدہ کو خاندان والوں اور مہمانوں سے زیادہ بات چیت کرنے سے روکنے کے لیے ابرار بھائی نے بھابھی کو ان پر نظر رکھنے کے لیے کہہ دیا تھا۔

انہوں نے بھابھی سے کہا تھا کہ الیان تو ان کی دوستی میں یہ قدم اٹھا رہا ہے' مگر اس کی والدہ اس افراتفری کی شادی پر زیادہ خوش نہیں ہیں' اس لیے کوشش کرنا کہ مہمان خواتین شگفتہ غفار سے زیادہ بے تکلف نہ ہو سکیں' ورنہ خوامخواہ وہ اپنے دل کا غبار مہمانوں کے سامنے نکال دیں گی۔

بھابھی کے لیے کسی پر نظر رکھنا یا کسی کو زبردستی ایک ہی جگہ پر بیٹھا رہنے پر مجبور کرتے ہوئے دوسرے سے کلام کرنے کا موقع نہ دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا' بلکہ یہ سب ان کے پسندیدہ عمل تھے' چنانچہ یہ ذمہ داری انہوں نے خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے بڑی خوش اسلوبی سے نبھا دی۔

جبکہ وہ خود ریاض غفار کے اردگرد منڈلاتے رہے' تاکہ کوئی ان سے کسی قسم کے سوال جواب نہ کر سکے۔

یہ اور بات تھی کہ اس کام میں انہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی' ریاض غفار اتنے افسردہ تھے کہ اگر کسی نے





انہیں مخاطب بھی کیا تو انہوں نے یا تو جواب نہیں دیا یا چند الفاظ ادا کر کے مختصر ترین جواب پر مقابل کو لاجواب کر کے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

☆ ☆ ☆

نمل اور سنبل بھی دیگر رشتے داروں کی طرح وقت مقرر پر شادی میں شرکت کرنے ہوٹل پہنچ گئیں' عظمت خلیل ہمیشہ کی طرح مصروف تھے۔ لہٰذا وہ دونوں رشیدہ کے ساتھ ان کا انتظار کیے بغیر ہی نکل گئی تھیں۔

رومیلہ نے سنبل کے والدین کو بھی مدعو کیا تھا اور وہ اپنی بیٹی کی بہترین دوست کی شادی میں شرکت کرنے آئے تھے' لیکن کیونکہ وہ تمام صورت حال سے واقف نہیں تھے' اس لیے ایک میز پر چند اپنے ہی جیسے کپلز کے ساتھ بیٹھ گئے تھے' جو رومیلہ کے دور کے رشتے دار تھے اور جوان ہی کی طرح ہر بات سے انجان تھے۔

رشیدہ بھی ان ہی کے ساتھ بیٹھ گئی تھیں' وہ رومیلہ کے مستقبل کی طرف سے فکر مند ضرور تھیں' مگر انہیں خوامخواہ کی کرید کی عادت نہیں تھی' جب سے نمل نے انہیں بتایا تھا کہ رومیلہ کی شادی اب ابرار کے ایک دوست کے ساتھ ہو رہی ہے وہ اسے رومیلہ کا نصیب گردانتے ہوئے اس کی خوش حال زندگی کے لیے دعا گو ہو گئی تھیں۔

البتہ نمل اور سنبل اس طرح ایک کونا سنبھال کر نہیں بیٹھ سکتی تھیں' انہوں نے جب الیان کو آتا دیکھا تو وہ تیزی سے اس کارپٹ کے کنارے پر آکھڑی ہوئیں جو شاندار دروازے سے شروع ہو کر اسٹیج کی سیڑھیوں تک بچھا ہوا تھا۔

وہ دونوں چپ چاپ کھڑی الیان اور اس کے والدین کو آتا دیکھتی رہیں۔

الیان پر نظر پڑتے ہی ان کی پریشانی میں خاطر خواہ کمی ہوئی تھی' البتہ اس کے ساتھ صرف دو افراد کو دیکھ کر وہ دونوں کچھ چپ سی ہو گئی تھیں۔

لیکن جب الیان ان کے پاس سے گزرتا اسٹیج پر چلا گیا تب نمل نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اس گلفام سے بھی زیادہ گڈ لکنگ ہے۔ جس سے میں کینیڈا میں ملی تھی۔" سنبل بے ساختہ نمل کو دیکھنے لگی۔

اس نے صاف محسوس کر لیا تھا کہ نمل اپنی اور اس کی طبیعت پر چھایا بوجھل پن کم کرنے کے لیے ایسا کہہ رہی ہے' ورنہ اس طرح بارات کے نام پر تین لوگوں کو دیکھ کر ان دونوں کو ہی فکر ہو گئی تھی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔" نمل خود پر اٹھیں سنبل کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"بالکل! تم سچ کہہ رہی ہو گی' مجھے تمہاری بات پر بغیر دیکھے یقین ہوتا ہے اور یہاں تو اتنا ڈیشنگ بندہ آنکھوں کے سامنے موجود ہے کہ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں رہتی۔ میں تو بس یہ سوچ رہی تھی کہ یہ تینوں کس قدر سنجیدہ لگ رہے ہیں۔

ٹھیک ہے یہ سب ایمرجنسی میں ہو رہا ہے' مگر ان کے چہروں سے تو ایسے لگ رہا ہے جیسے یہ یہاں زبردستی لائے گئے ہوں۔" سنبل نے الیان کی والدہ کو بغور دیکھتے ہوئے دبی زبان سے کہا تو فوری طور پر نمل کچھ بول نہ سکی' کیونکہ وہ خود بھی یہی سوچ رہی تھی' لیکن سنبل کے سامنے اس نے اپنے اندازے ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا کہ سنبل جو پہلے ہی اتنی فکر مند ہے نمل کو بھی شک و شبہات میں مبتلا دیکھ کر مزید پریشان ہو جائے گی۔

"ہو سکتا ہے وہ اس طرح جلد بازی میں کی گئی شادی کے خلاف ہوں' آج کل تو اوسط درجے کے لوگ بھی شادیوں میں لاکھوں روپے خرچ کر دیتے ہیں' یہ تو پھر اتنے امیر کبیر ہیں' یہ چاہ رہے ہوں گے کہ شادی آج ہی کرنے

کی بجائے خوب دھوم دھام سے کی جائے، مگر ابرار بھائی بضد ہوں کہ اسی دن بارات لانی ہے' تب ہی یہ اپنے رشتے داروں کے بغیر اکیلے ہی آ گئے۔" نمل کی بات غلط نہیں تھی' یہ اور بات تھی کہ جو نقطہ اس نے اٹھایا تھا اس کے ٹھیک ہونے پر وہ خود بھی بہت زیادہ پر امید نہیں تھی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" سنبل نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے گویا بحث کو سمیٹا اور اس سے پہلے کہ نمل کچھ کہتی دروازے سے داخل ہونے والے شخص پر نظر پڑتے ہی نمل چونک اٹھی۔

خرم اپنے تمام دوستوں کے ساتھ شان دار انٹرنس سے اندر داخل ہو رہا تھا۔

ان کی کلاس کی چند لڑکیاں جنہیں رومیلہ نے خود مدعو کیا تھا' خرم اور اس کے دوستوں کے ساتھ ایسے خوشی خوشی آ رہی تھیں جیسے خرم کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کرنا بڑے اعزاز کی بات ہو۔

نمل کی طرح خرم کی بھی سب سے پہلے نمل پر ہی نظر پڑی' اسے اس طرح استقبال کے لیے کھڑا دیکھ کر خرم کے چہرے پر بڑی دلکش مسکراہٹ نمودار ہو گئی' وہ شاہانہ چال چلتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بڑے ہی جان دار انداز میں اسے سلام کیا' جیسے وہ اسے دیکھ کر چونک اٹھے گی۔ نمل تو پہلے ہی اسے دیکھ رہی تھی' البتہ سنبل واقعی اچھل پڑی۔

"آ... آپ؟ آپ کو کس نے بلایا۔" سنبل بے تحاشا حیرانی کے عالم میں بے ساختہ بولی تو خرم نے اس سے بھی زیادہ حیران ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"کمال کرتی ہیں سالی صاحبہ آپ بھی۔ اول تو مجھے بلاوے کی ضرورت نہیں۔ اتنی قریبی رشتے داری میں یہ کارڈ وغیرہ دینے کی فارملیٹی بالکل غیر ضروری ہوتی ہے' پھر بھی جہاں تک سوال مجھے بلانے کا ہے تو آف کورس مجھے رومیلہ کے علاوہ اور کون انوائیٹ کر سکتا ہے۔" خرم نے اپنے مخصوص تپانے والے انداز میں کہا' نمل تو سر سے پیر تک جل کر خاک ہو گئی' اس کے قریبی رشتے داری کہنے پر مگر وہ اتنے سارے لوگوں کے ساتھ آیا تھا کہ نمل کوئی جرح کر کے اسے اپنے پیچھے نہیں لگانا چاہتی تھی' تب ہی اسے نظر انداز کر کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

جہاں سے نا صرف یونیورسٹی کے تمام لوگ اندر داخل ہو رہے تھے' بلکہ ہوٹل میں آنے جانے والے لوگ بھی گزرتے ہوئے نظر آ رہے تھے' کیونکہ سامنے ایک بڑا سا ڈائننگ ہال تھا' جس کے ارد گرد بڑی سی گلاس وال بنی ہوئی تھی' شیشے کی اس دیوار کے پار اندر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا' مختلف ٹیبلز پر بیٹھے مختلف افراد انواع و اقسام کے کھانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

نمل ایسے انہیں دیکھنے لگی جیسے اس سے زیادہ اسے اور کسی چیز میں دلچسپی نہ ہو' تب تک ان کی کلاس کی لڑکیاں بھی — نمل اور سنبل کے نزدیک چلی آئیں اور انہیں مبارک باد دینے لگیں۔

"مجھے تو اپنا آنا ممکن ہی نہیں لگ رہا تھا' میرا بھائی اس وقت گھر پر نہیں تھا' میں نے تو سوچ لیا تھا اب تو میں نہیں جا سکتی بھلا مجھے کون ڈراپ کرے گا۔

مگر خرم کے فون نے پورا پروگرام سیٹ کر دیا' جب اس نے کہا میں تمہیں اور تمہاری تمام دوستوں کو پک کر لیتا ہوں' تب میں نے جلدی جلدی یہ سوٹ نکال کر استری کیا۔" ان کی کلاس کی ایک لڑکی جس کا نام آسیہ تھا خرم کو تشکر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتی رہی۔

نمل کا تو دل چاہا ترخ کر کہہ دے کہ "اگر اتنے مسئلے تھے تو مت آتیں بھلا یہاں کون تمہارے انتظار میں سوکھ رہا تھا۔"

مگر وہ اتنے لوگوں کا لحاظ کرتے ہوئے ضبط کر گئی' سنبل تو حیران پریشان کھڑی انہیں سن رہی تھی' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا خرم اس طرح منہ اٹھا کر ان کے فنکشن میں کیوں آ گیا' وہ بھی اپنے فضول دوستوں کو لے کر۔





حالانکہ وہ سب بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آئے تھے۔ ان کی کلاس کی لڑکیاں تو چلو واقعی مدعو تھیں اس لیے ہاتھ میں گفٹ کا ڈبا بھی پکڑے ہوئے تھیں' مگر خرم اور اس کے دوست بھی ایسے آئے تھے' جیسے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کرنے آئے ہوں۔

خرم تو بلیک پینٹ شرٹ پر بلیک ہی کوٹ پہنے صرف کریم کلر کی ٹائی کے ساتھ دولہا یا دلہن میں سے کسی کا بھائی ہی لگ رہا تھا' اس پر اس کا شوخ اور خود اعتمادی سے بھرپور انداز' جیسے سب سے زیادہ اسی کو اس شادی کی خوشی ہو۔

اس کے دوست ہارون اور نادر بھی بڑے نک سک سے تیار ہو کر آئے تھے۔ مگر خاموشی سے ان سب سے پیچھے کھڑے تھے' البتہ حمید اور روکی پوری طرح سے ان دونوں کی طرف متوجہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر پر جوش ہو رہے تھے جیسے اچانک پہنچ کر انہوں نے کوئی بہت بڑا تیر مار دیا ہو۔

نمل اور سنبل دونوں ہی اس پریشان صورت حال میں مزید کسی محاذ پر لڑنے کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھیں' بلکہ وہ تو اپنی کلاس کی لڑکیوں کے سوالوں کا بھی صحیح طرح سے جواب نہیں دے پا رہی تھیں جو اسٹیج پر بیٹھے الیان کو دیکھ کر خاصی متاثر ہو گئی تھیں۔

"واؤ یار رومیلہ کا دولہا تو بہت ہینڈسم ہے۔"

"ہاں رومیلہ کو لا کر بٹھائیں گے تو پتا چلے گا۔ جوڑی کیسی لگ رہی ہے۔"

"نمل کیا ان دونوں کی لو میرج ہے؟" اگر یہ شادی عام طریقے سے ہو رہی ہوتی تو شاید نمل ان سوالوں اور تبصروں کا حصہ بن بھی جاتی' خرم کی موجودگی کو نظر انداز کر کے' مگر اس وقت تو اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔

خرم کو اس کی اس خاموشی میں مزا نہیں آ رہا تھا۔ تب ہی اس نے ایک ایسا تیر چھوڑا کہ نمل بولنے پر مجبور ہو جائے۔

"میرا نہیں خیال کہ رومیلہ لو میرج کر سکتی ہے' یہ کام تو میرے اور نمل کے ہی بس کا تھا۔" اس کا وار خالی نہیں گیا تھا' نمل ترخ کر بولی۔

"ہماری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی ہم کوئی لو میرج کر رہے ہیں اور تمہیں اور تمہارے دوستوں کو شرم آنی چاہیے رومیلہ کے انوائیٹ کیے بغیر بھوکے ننگے لوگوں کی طرح مانگے کے کپڑے پہن کر شادی کا کھانا کھانے آ گئے ہو۔" نمل کے اسے اس طرح ذلیل کرنے پر سنبل نے ہراساں ہو کر نمل کو اور پھر خرم کو دیکھا تھا۔

پہلے ہی یہ شادی نازک حالات میں ہو رہی تھی۔ اس میں اگر ان دونوں نے بھی کوئی تماشا کھڑا کر دیا تو کیا ہو گا' مگر اس وقت صرف سنبل کو ہی نہیں نمل سمیت تمام لوگوں کو شدید حیرت ہوئی' جب خرم اس کی بات پر چیخ پڑنے کی بجائے قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور دل کھول کر ہنسنے کے بعد ان لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"یار یہ بہت انا پرست ہے۔ سب کے سامنے میری محبت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی ایگو ہرٹ ہوتی ہے' ورنہ تم لوگوں کو نہیں معلوم ہم دونوں کی پہلی ملاقات کسی قدر ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی' بلکہ اسی ہوٹل میں ہی تو ہوئی تھی۔" خرم کے اچانک کہنے پر وہ سب چونک کر ان دونوں کو دیکھنے لگیں۔

"کیا مطلب؟ کیا تم دونوں یونیورسٹی میں آنے سے پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو۔" آسیہ کی حیرت دیدنی تھی۔

"آف کورس۔ یقین نہیں آتا تو سنبل اور رومیلہ سے بھی پوچھ سکتی ہو' یہ دونوں اور میرے سارے دوست بھی اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں' یہ جو سامنے ڈائننگ ہال نظر آ رہا ہے' یہیں تو ہم سب لنچ کرنے آئے تھے۔ جب ہم دونوں کا پہلی بار ٹکراؤ ہوا تھا۔" خرم کے کہنے کی دیر تھی کہ حمید نے وہ قصہ دس اضافی جھوٹ کے ساتھ چٹخارے لے لے کر سنانا شروع کر دیا۔

ان تمام لڑکیوں کو تو بہت ہی مزا آرہا تھا' وہ یہ بھول ہی گئی تھیں کہ وہ ابھی تک داخلی دروازے کے پاس ہی کھڑی ہیں اصل میں انہیں اندر آکر کرنا بھی کیا تھا' وہ وہاں صرف رومیلہ کو جانتی تھیں جو ابھی تک اسٹیج پر آئی نہیں تھی۔

اس کے برعکس یہاں وہ خرم کے ساتھ کھڑی تھیں جس کے ساتھ بات کرنا ہی ان جیسی لڑکیوں کے لیے کسی قارون کا خزانہ ہاتھ لگ جانے کے مترادف تھا' اس پر ایسی دلچسپ کہانی سننا جس میں سامعین کے لیے اتنا مرچ مسالا ڈال دیا تھا کہ منہ جلنے کی بجائے ہنسی کے فوارے پھوٹنے لگے تھے۔

البتہ نمل کا غصہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جارہا تھا' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ حمید کو تھپڑ مار کر چپ کرادے یا خود ہی یہاں سے چلی جائے' مگر وہ خود پر جبر کیے محض اس لیے کھڑی رہی کہ اس کے سچ اور جھوٹ کی پول کھول سکے' مگر اس نے جتنی بار بھی زبان کھولنے کی کوشش کی حمید اور روکی تو کیا ان لڑکیوں نے بھی اسے خاموش کرادیا' ان کے تو ہنس ہنس کر آنسو نکلنے شروع ہوگئے تھے۔

"خرم کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟ تم نے تو کبھی بتایا ہی نہیں۔" آسیہ ہنسی سے بے حال ہوتے ہوئے ایسے بے تکلفی سے بولی جیسے اس سے برسوں کی دوستی ہو' حالانکہ خرم نے ان سب کو کبھی گھاس نہیں ڈالی تھی' آج بھی وہ انہیں محض اپنے مطلب سے یہاں لے کر آیا تھا۔

وہ کوئی شادی میں کھانا کھانے نہیں آیا تھا جو چپکے سے گھس آتا' اسے تو نمل کے روبرو آکر کم از کم ایک گھنٹہ تو اسے پکانا تھا جو اسی وقت ممکن تھا' جب اس کے ساتھ یونیورسٹی کے دوسرے اسٹوڈنٹس بھی موجود ہوں یعنی کم نمل کی اپنی کلاس فیلوز' ورنہ تو نمل اس کی بات سنے بغیر ہی اسٹیج پر رومیلہ کے پاس یا کسی بزرگ خواتین کے جمگھٹے میں جاکر بیٹھ جاتی اور خرم کا یہاں تک آنا رائیگاں چلا جاتا۔

جب سے اس نے سنا تھا کہ وہ سمیر کے ساتھ کینٹین میں بیٹھی تھی' تب سے خرم پر اس کی اس حرکت کا جواب دینے کی دھن سوار تھی' وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا جو نمل کے اس اقدام کے پیچھے پوشیدہ سبب کو نہ سمجھتا۔

نمل اس قسم کی لڑکی نہیں تھی جو یونیورسٹی جاکر بلاوجہ لڑکوں سے بے تکلف ہوجاتی' اس نے اگر پہلی بار اس طرح کی کوئی حرکت کی تھی تو ضرور اس کے پیچھے صرف اور صرف خرم کو جلانا مقصود ہوگا۔

پہلے تو خرم نے حمید کی بات پر یقین ہی نہیں کیا' مگر جب نادر نے بھی آکر یہی بات کہی' بلکہ یہاں تک کہا کہ اس نے خود انہیں کینٹین کی طرف ساتھ جاتے دیکھا ہے' تب خرم اسے جھٹلا نہ سکا۔ نمل کے بارے میں ایسی بات سن کر فوری طور پر اسے اچھا خاصا شاک لگا تھا' مگر جیسے جیسے وہ اس شاک سے باہر آیا اس کا خون ابلنے لگا۔

گویا نمل اب اس سے بدلہ لینے کے لیے اس کے دشمن سے دوستی کرے گی' وہ بھی سمیر جیسے گھٹیا شخص سے۔

خرم کا دل چاہا پہلے تو جاکر سمیر کا ہی دماغ ٹھکانے لگادے' مگر وہ سمیر سے اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب اپنا ہی سکہ کھوٹا ہو تو دوسرے کو کیا مورد الزام ٹھہرانا اس وقت سمیر کے منہ لگانا اپنی ہی بے عزتی کرانا تھا' بلکہ خرم تو چاہ رہا تھا جب تک وہ نمل کی اس انتقامی کارروائی کا سدباب نہیں کرلیتا اس کا اور سمیر کا سامنا ہی نہ ہو' ورنہ خوامخواہ ہی سمیر کو اسے طعنے مارنے کا موقع مل جائے گا۔ دوسری طرف اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ ابھی اور اسی وقت نمل سے اپنی منگنی توڑ ڈالے تاکہ اس کے کسی بھی فعل سے خرم کی عزت نفس کو کوئی دھچکا نہ لگے' مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

یہی تو نمل چاہتی تھی' ایسا کرکے تو وہ نمل کو خوش کردے گا' اسے تو نمل کو اور جلانا اور تڑپانا چاہیے نہ کہ اسے اس کے مقصد میں کامیاب کردے۔

بس یہی سب سوچتے ہوئے اس نے بالکل اچانک رومیلہ کی شادی میں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ کوئی بھی ایسا





موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا' جس میں وہ نمل کو زچ کرسکے' چنانچہ اس وقت نمل کے چہرے پر پھیلی کوفت اور بیزاری دیکھ کر اس کی ہستی کا غرور بحال ہونے لگا تھا۔ اور اس میں بہت ہاتھ اس کے ساتھ آئی لڑکیوں کا تھا۔ اگر وہ قصہ کے سنائے ان کی پہلی ملاقات کے قصے پر حیرت و خوشی کا اظہار نہ کررہی ہوتیں تو نمل کے چہرے کے یہ تاثرات دیکھنے کو بھی نہ ملتے۔

آف وائٹ کلر کی خوب گھیر دار فراک اور چوڑی دار میں اس کی گلابی رنگت بالکل سرخ ہوچکی تھی' کیونکہ وہ لڑکیاں باتیں ہی ایسی کررہی تھیں۔

"کمال ہے خرم' کس قدر مہارت سے تم نے پیسے نکالے کہ نمل کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔"

"لیکن نمل تم خرم کے ساتھ شادی کے لیے کیسے تیار ہوگئیں۔" ایک لڑکی نے حیرانی سے پوچھا تو آسیہ فوراً" تنک کر بولی۔

"نمل کو تو تیار ہونا ہی تھا' یہ اکڑنا اور نخرے دکھانا اپنی ویلیو بڑھانے کی حد تک تو ٹھیک ہے' ورنہ خرم کو بھلا کوئی لڑکی کیسے انکار کرسکتی ہے۔" آسیہ کا لہجہ اور اس کی بات نمل کو سخت ناگوار گزری تھی' وہ سارا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے سختی سے بولی۔

"ایکسکیوزمی... میں ان میں سے نہیں ہوں جو بلاوجہ کی اکڑ اور نخرے دکھاتی ہیں' ہاں البتہ کسی کی شکل پر فدا ہوکر یا اس کی دولت سے متاثر ہوکر ایک انجان نامحرم کے آگے پیچھے پھرنے کو اگر تم سادہ لوحی کہتی ہو تو میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی سادگی اور ایسی لڑکیوں پر جو اپنی انا اور عزت نفس کی دھجیاں اڑا کر لڑکوں کے قدموں میں بکھر جاتی ہیں۔" نمل انگارے چبا رہی تھی' اس کی زبان سے نکلے شعلوں نے سنبل کو چھوڑ کر وہاں کھڑی ساری لڑکیوں کو بھسم کردیا تھا' البتہ خرم اور اس کے دوست اس صورت حال سے اچھی طرح لطف اندوز ہورہے تھے' خرم کو تو دلی مسرت حاصل ہورہی تھی انہیں اپنی ذات کی وجہ سے تکرار کرتا دیکھ کر' تب ہی خرم نے آسیہ کو پچکارتے ہوئے کہا جو نمل کو کوئی بہت ہی سخت بات کہنے والی تھی۔

"کم آن آسیہ! تم بھی ناحد کرتی ہو۔ ایک لڑکی کے سامنے تم اس کے منگیتر کی تعریف کررہی ہو' جبکہ اسی کے ساتھ اس قدر تیار ہوکر شادی اٹینڈ کرنے آئی ہو' پھر اس کی جلی کٹی سننے کے لیے تو تمہیں تیار رہنا چاہیے نا' اب اتنا تو حق بنتا ہے نا نمل کا کہ وہ خود کو ان سیکیور (غیر محفوظ) فیل کرے۔

دیکھو نا جس کے منگیتر پر ہر لڑکی فدا ہو اور جو کسی بھی لڑکی کے ساتھ آسانی سے فلرٹ کرسکتا ہو' اس لڑکی کے لیے اپنے منگیتر کو اتنی ساری لڑکیوں کے ساتھ آتا دیکھ کر انہیں برداشت کرنا ہے تو مشکل کام۔

یہ جو نمل کہہ رہی ہے ہم بغیر انویٹیشن کے آگئے' یہ سب اسی کا توری ایکشن ہے۔" خرم اپنی مخصوص دل جلانے والی مسکراہٹ چہرے پر سجائے تاک تاک کر نشانے لگا رہا تھا کہ نمل بلبلا اٹھے اور واقعی نمل نے خود پر بڑی مشکل سے ضبط کر رکھا تھا۔ پھر بھی جب وہ بولی تو اتنی برداشت کے باوجود اس کے لہجہ میں تلوار کی دھار سے بھی زیادہ کاٹ تھی۔

"تم اپنے آپ کو بہت بڑا ہیرو سمجھتے ہو نا' تمہارے خیال سے تم کسی بھی لڑکی کو بڑی آسانی سے امپریس کرسکتے ہو۔"

"میں سمجھتا نہیں ہوں میں جانتا ہوں۔" خرم نے بھرپور اعتماد کے ساتھ کہا تو نمل براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے چیلنجنگ انداز میں پوچھنے لگی۔

"کیا میں آزما کر دیکھ سکتی ہوں۔" خرم اس کی بات کا پس منظر تو نہیں سمجھا' لیکن اگر وہ کسی کام کے لیے چیلنج کررہی تھی تو بھلا خرم حسن کیسے پیچھے ہٹ سکتا تھا' وہ ہنوز اپنے سابقہ خود اعتماد لہجے میں بولا۔

"بالکل! جیسے چاہو آزمالو۔" سب لوگوں کو سانپ سونگھ گیا' سنبل سمیت وہ سب ان دونوں کو بے یقینی سے دیکھ رہے تھے' جب' نمل نے انگلی اٹھا کر بال روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہاں' جو پنک کلر کے کپڑوں میں لڑکی بیٹھی ہے کیا اس کا موبائل نمبر لا کر دکھا سکتے ہو۔" سنبل کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں' نمل کے اس قدر غیر مناسب مطالبے پر۔

ان سب نے ایک ساتھ گردن تھما کر نمل کی انگلی کے تعاقب میں دیکھا تو وہاں واقعی گلابی کپڑوں میں ملبوس ایک بلا کی حسین لڑکی تن تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔

خرم کی سمجھ میں نہ آیا' وہ اسے کیا جواب دے' تب ہی نمل دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے ایسے بولی جیسے دریا دلی کی حد کر دی ہو۔

"بڑا مشکل کام ہے نا' اتنے کم وقت کے اندر کسی لڑکی کا یوں کسی کو اپنا موبائل نمبر اٹھا کر دے دینا' بالکل ناممکن سی بات ہے۔

مگر جس شخص کو لیڈی کلر کہا جاتا ہو اس کے لیے تو اتنا مشکل نہیں' اگر وہ آدھے گھنٹے میں ایک لڑکی کا نمبر نہیں لا سکتا تو اس میں اور عام لڑکوں میں فرق ہی ۔۔۔ کیا رہ گیا۔" نمل کا لہجہ طنز سے بھرپور تھا۔

وہ سب اب ہال روم کی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی لڑکی کی بجائے تجسس بھری نظروں سے خرم کو دیکھ رہے تھے' جبکہ خرم بڑی سنجیدگی سے نمل کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ جو خرم کو اتنے سارے لوگوں کے بیچ کشمکش میں ڈال کر خوشی سے چمکنے کے ساتھ ساتھ بے پناہ سکون محسوس کرتے ہوئے خمار آلود ہو گئی تھیں۔

"نمل یہ ٹھیک نہیں ہے آدھا گھنٹہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔" خرم کو خاموش دیکھ کر آسیہ نے فوراً" اس کی حمایت کی۔

"ٹھیک ہے تو میں ٹائم بڑھا کر ایک گھنٹہ کر دیتی ہوں' ورنہ میں نے تو آدھا گھنٹہ تمہاری ہی بات سن کر کہہ دیا تھا کہ بھلا خرم کو کوئی لڑکی کیسے انکار کر سکتی ہے۔" نمل نے بظاہر معصومیت سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"اس انکار میں اور اس انکار میں بہت فرق ہے' کسی راہ چلتی لڑکی سے اس کا نمبر حاصل کرنا کوئی مذاق نہیں ہے یار۔ آدھا گھنٹہ تو کیا ایک گھنٹہ بھی اس کام کے لیے بہت کم ہیں۔" ان کی کلاس کی ایک اور لڑکی کو بھی اس زیادتی پر احتجاج ہوا تھا' البتہ خرم کے دوست بالکل خاموش تھے۔

حمید اور روکی تو اپنی فطرت کے مطابق اس انتظار میں تھے کہ خرم یہ چیلنج قبول کرلے۔ وہ اس لڑکی سے نمبر مانگنے جائے اور وہ لڑکی ٹکا سا جواب دے کر خرم کو سب کے سامنے بے عزت کردے۔

جبکہ نادر اور ہارون غیر جانبدار بنے کھڑے تھے' ایسے جیسے دیکھیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

"تو ٹھیک ہے میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا کہ پتا چلے خرم کتنے پانی میں ہے' لیکن اگر خرم کو یہ کام اپنے بس کا نہیں لگتا تو اس کے ساتھ کوئی زور زبردستی تو ہے نہیں' وہ منع کردے۔" نمل اب بھی پرسکون لہجے میں بظاہر خوش دلی سے بولی۔

سنبل بھی اب حیران ہونا چھوڑ کر دلچسپی سے خرم کی شکل دیکھنے لگی' جو بالکل جامد نظروں سے نمل کو دیکھ رہا تھا' پھر آخر وہ کچھ ٹھہرے ہوئے انداز میں بڑے ہی عجیب لہجے کے ساتھ بولا۔

"اگر میں آدھے گھنٹے میں اس کا نمبر لا کر دکھا دوں تو؟"

"تو؟" نمل نے اس کے لہجے اور سوال کو نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

"بھئی اگر تم شرط لگا رہی ہو تو یہ تو بتاؤ کہ شرط جیتنے کی صورت میں مجھے ملے گا کیا؟" خرم اب بھی بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔





نمل نے ایک نظر ان سب کو دیکھا جو سانس روکے ان دونوں کے رویوں اور جملوں کا مشاہدہ کر رہے تھے' پھر بھنویں اچکاتے ہوئے بولی۔

"جو تم شرط ہارنے کی صورت میں دے سکتے ہو وہی تمہیں شرط جیتنے کی صورت میں مل جائے گا۔"

"میں تو کچھ بھی دینے اور کرنے کے لیے تیار ہوں۔

In the other words (دوسرے لفظوں میں) تم جو کہو گی میں کروں گا۔" خرم کے سنجیدہ لہجے میں بلا کا استحکام تھا' اپنی بات ختم کرکے وہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا تو نمل اس کی بات سمجھتے ہوئے ہچکچائے بغیر رکے اس کی طرح مضبوط لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے' اگر یہ بات ہے تو میں بھی جو تم کہو گے کروں گی۔" سنبل نے غیر محسوس انداز میں بڑی آہستگی سے نمل کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ مگر نمل نے بھی غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

سنبل گردن گھما کر پریشان نظروں سے اپنے برابر میں کھڑی نمل کو دیکھنے لگی جسے اپنی بات کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا اور شاید اب اندازہ کر لینے کا فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ اتنے سارے لوگوں کے بیچ میں جو بات نمل کہہ چکی تھی وہ اس سے پھر نہیں ۔۔۔ سکتی تھی۔

اس کی بات پر خرم تو جوں کا توں کھڑا رہا البتہ باقی لوگوں کا ردِ عمل خاصا حیران کن تھا' لڑکیاں بڑی تجسس بھری نظروں سے کبھی نمل کو تو کبھی خرم کو دیکھ رہی تھیں۔

جبکہ حمید اور روکی تمسخر بھری نظروں سے خرم کو دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔

"اب آیا نا اونٹ پہاڑ کے نیچے' بڑے آئے کہیں کے ہیرو صاحب تیار ہو کر آگئے شادی اٹینڈ کرنے' بہت اچھا کیا جو نمل نے اتنے لوگوں کے بیچ یہ چیلنج کر دیا اب اسے ان سب کے سامنے ہارنے کی شرمندگی سے گزرنا پڑے گا اور اس کے بعد نمل بھی جرمانے کے طور پر نہ جانے کیا مانگ لے انہیں نمل سے کسی قسم کی بھلائی کی امید تو ویسے بھی نہیں تھی ان کی شدید خواہش تھی کہ نمل جیتنے کے بعد خرم کو اگلے دن بھری یونیورسٹی میں سب کے سامنے مرغا بننے کو کہہ دے۔

ہارون اور نادر نے صرف ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا تھا جیسے خرم کے اس چیلنج کو قبول کرتا دیکھ کر اس کی نادانی پر تھوڑی سی کوفت ہوئی ہو۔

البتہ سب سے بری حالت سنبل کی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ نمل کو ایک طرف لے جا کر اس کی اس حرکت پر اسے جھاڑ کر رکھ دے مگر وہ مصلحتاً" خاموش رہی یہ اور بات تھی کہ اس کے چہرے پر بے چینی واضح تھی۔

خرم' نمل کی بات سن کر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اپنے سابقہ سنجیدہ لہجے سے ہٹتے ہوئے ایک دم ہلکے پھلکے انداز میں کہنے لگا۔

"گڈ ویری گڈ۔ اب اپنی بات سے مکرنا نہیں۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یاد رکھنا تمہارے پاس صرف ایک گھنٹے کا ٹائم ہے۔" نمل نے یاد دہانی کراتے ہوئے کہا تو ایک پل کے لیے خرم کے دل میں آیا کہہ دے۔

"مجھے ایک گھنٹے کی ضرورت نہیں آدھا گھنٹہ ہی بہت ہے۔"

مگر دل کی اس خواہش کو دماغ نے بروقت دبا دیا ایک بالکل انجان لڑکی ہے' جا کر اس کا موبائل نمبر مانگنا کوئی مذاق نہیں تھا اس کام کے لیے ایک گھنٹہ بھی کم تھا۔

اسے لڑکی سے جھاڑ سننے کی تو کوئی خاص فکر نہیں تھی البتہ وہ نمل سے ہار کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا
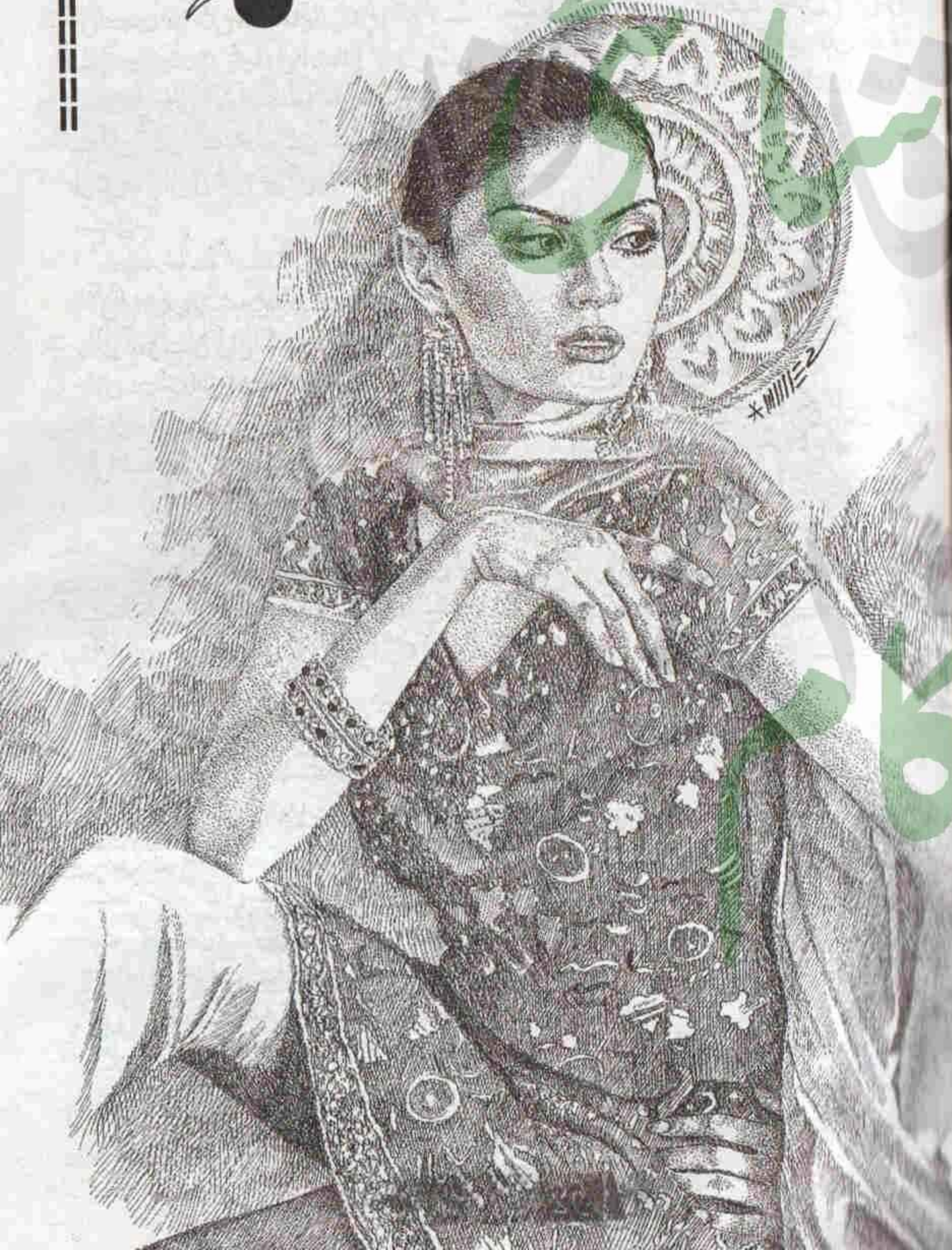
تھا وہ بھی اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں۔

چنانچہ وہ نمل کی بات کا جواب دیے بغیر بظاہر اپنے انداز میں لاپرواہی بھرتے ہوئے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالتا بال روم کی طرف پلٹ گیا۔

حمید نے فوراً "اس کے ساتھ قدم بڑھائے تو خرم نے ٹوک دیا۔

"تم سب دور کھڑے ہو کر تماشا دیکھو اگر کسی نے بھی انٹرفیر کرنے کی کوشش کی تو میں کھیل سے دو ڈراہو جاؤں گا۔" خرم نے فوراً" تنبیہ کی تو حمید ایک دم رک گیا۔

اتنا اندازہ تو اسے بھی تھا کہ یہ ایک بڑی مشکل شرط ہے وہ نہیں چاہتا تھا کہ خرم ہار سے بچنے کے لیے بغیر کھیلے ہی بہانہ بنا کر پیچھے ہٹ جائے البتہ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ سب ہی اپنی جگہ سے تھوڑا آگے بڑھ گئے۔

"آل دا بیسٹ۔" آسیہ ایسے جلدی سے بولی جیسے وہ کوئی بہت بڑی لڑائی لڑنے جا رہا ہو خرم سنی ان سنی کرتا آگے بڑھ گیا۔

نمل اور سنبل ان سب سے پیچھے قدرے فاصلے پر رہ گئیں تو سنبل نے بگڑ کر دبی زبان سے کہا۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا' جانتی ہو تم نے کیا کر دیا ہے؟"

"کیا کر دیا ہے؟" نمل مطمئن انداز میں الٹا اسی سے پوچھنے لگی تو سنبل تپ کر رہ گئی۔

خرم اس کا نمبر لے آیا تو جانتی ہو وہ جیتنے کی صورت میں تم سے کیا مانگے گا۔"

"ہاں جانتی ہوں۔ لیکن "اگر" خرم اس کا نمبر لے آیا تو۔" نمل نے لفظ "اگر" پر خاصا زور دیتے ہوئے کہا تو سنبل اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بھنا کر بولی۔

"ایسا کوئی مشکل بھی نہیں ہے کسی لڑکی کا نمبر حاصل کرنا کیا پتا وہ کس قسم کی لڑکی ہے اور کیا پتا خرم اس سے جا کر کیا کہہ دے کہ وہ نمبر دینے پر مجبور ہو جائے۔"

"خرم اس سے چاہے جو بھی کہہ دے نمبر تو وہ کبھی نہیں دے گی بلکہ وہ خرم کی بات سنے گی تو نمبر دینے کی نوبت آئے گی نہیں خرم جیسے ہی اسے مخاطب کرے گا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر چلی جائے گی۔" نمل بڑے اطمینان سے بول رہی تھی سنبل کچھ الجھ کر پہلے نمل کو اور پھر دور بیٹھی اس لڑکی کو دیکھنے لگی۔

"کون ہے یہ؟ کیا تم جانتی ہو اسے۔"

"تم نے پہچانا نہیں۔ کمال ہے میں تو ایک نظر میں پہچان گئی تھی۔ یاد نہیں ہمارے اسکول کی سب سے حسین لڑکی اور سب سے عجیب بھی، جس نے کبھی کسی لڑکی سے بات نہیں کی وہ بھلا ایک انجان لڑکے کو کیا لفٹ کرائے گی۔" نمل اب بھی بڑی پرسکون تھی، سنبل پہلے سے بھی زیادہ غور سے اسے دیکھنے لگی تو اسے واقعی وہ چہرہ بڑا جانا پہچانا لگا اور جیسے ایک دم اسے سب یاد آ گیا۔

"آ۔۔ اچھا۔۔ یہ وہ ہے نا سائیکو کیس۔ کیا نام تھا اس کا۔ آں۔۔ ارے ہاں یہ زوبیہ ہے نا۔"

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

14 فروری 2012ء بروز منگل

آج چودہ فروری ہے، محبت کرنے والوں کے لیے ملنے کا دن۔۔۔ اگر آج سے دس سال پہلے وہ مجھ سے آج کے دن ہی بچھڑی تھی۔ وہ جو آج بھی میری ذات کا ایک اہم حصہ ہے، میں اپنی تمام تر شدتوں کے باوجود بھی اسے روک نہیں سکا۔ میتھس میں ماسٹرز کرنے کے باوجود میرے پاس ایسا کوئی فارمولا یا تھیوری نہیں ہے، جو اس جدائی کا توڑ کرسکے! وہ کہاں ہے، کیسی ہے، ہے بھی یا نہیں، مجھے کچھ خبر نہیں ہے مگر وہ میرے دیار دل میں روز اول کی طرح آج بھی براجمان ہے اور ہمیشہ رہے گی۔"

معید رضا نے گرے کلر کی خوب صورت سی ڈائری کو بہت پیار سے دیکھا اور لکھے ہوئے پیراگراف پر دن تاریخ درج کی اور اسے بند کردیا، گزشتہ دس سالوں سے یہ ڈائری ان کی محبتوں کی امین تھی، وہ ہر سال چودہ فروری کو اس میں کچھ نا کچھ لکھتے اور پھر اگلے سال تک سنبھال کر رکھ دیتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میرب بیٹا سنا ہے تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔" داجی اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی، گلابی آنکھیں روتے رہنے کی چغلی کھا رہی تھیں۔

"یہ کیا ضد ہے بیٹا، تمہیں پتا ہے کہ تم جو ضد کررہی ہو وہ ہماری روایات کے خلاف ہے اور سردار ہونے کے ناتے قبیلے کی روایات کی پاس داری اگر ہم نہیں کریں گے تو لوگ ہماری بات کس طرح مانیں گے۔" حیدر آفندی نے اپنی پیاری سی بیٹی کو رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"داجی! پلیز آپ مجھے ایڈمیشن لینے کی اجازت دے دیں، میں آپ کے اعتبار اور عزت پر کبھی کوئی حرف نہیں آنے دوں گی، داجی مجھے اعلا تعلیم کا بہت شوق ہے، پتا ہے، جب شاوار لالہ باہر پڑھنے گئے تھے تو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی تھی، جب لڑکے تو لڑکیاں کیوں نہیں داجی۔" میرب نے حیدر آفندی کا جھریوں سے بھرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اس محاذ پر ہر صورت جیتنا چاہتی تھی۔

"مگر بیٹا ہمارے یہاں آج تک کسی لڑکی نے مخلوط تعلیم حاصل نہیں کی اور پھر شیر زمان کو یہ بات اچھی لگے یا نہیں، ہم اب تمہارے فیصلوں کو ان کی مشاورت کے بغیر نہیں کرسکتے۔" حیدر خان آفندی نے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا ورنہ اندر ہی اندر تو وہ بیٹی کے صبح سے بھوکا رہنے سے ہی کافی تکلیف میں تھے۔

"داجی بس آپ اجازت دے دیں، مجھے کسی اور سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور پھر مجھے پتا ہے کہ آپ کے فیصلے کے آگے کوئی کچھ نہیں کہتا۔" میرب نے سفید شلوار قمیص اور سیاہ واسکٹ میں ملبوس اپنے گریس فل سے داجی کو دیکھ کر مان سے کہا۔

"تم مانو گی نہیں، تمہاری مورے صحیح کہتی ہیں ضد کرنے اور اپنی بات منوانے میں تم بالکل مجھ پر گئی ہو، اچھا جاؤ تیاری کرو، میں خود تمہارا ایڈمیشن کروا کر آؤں گا، مگر جیسے ہی تمہاری تعلیم مکمل ہوگی تو ہم تمہاری شادی شیر زمان سے کردیں گے اور اب جلدی سے آکر کھانا کھاؤ، تمہاری مورے بے چینی سے تمہارا انتظار کررہی ہیں۔ انہوں نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

"ہرے داجی یو آر سو سویٹ۔" وہ یک دم ان کے گلے لگ گئی، خوشی سے اس کا گلابی چہرہ دمک اٹھا تھا، اس کی آنکھوں کی چمک میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ ان کی بیٹی شروع سے ہی بہت ذہین تھی اور پھر اس کی ایسی کون سی خواہش تھی جو حیدر آفندی نے پوری نہ کی ہو۔۔۔

☼ ☼ ☼

1 فروری 2001ء ہفتہ

سنا تھا محبت دھیرے سے چپکے سے قطرہ قطرہ من کے اندر انس کی پائل پہن کر اترتی ہے، تو یک لخت اندر کی ساری کائنات بدل جاتی ہے، مگر میرا تجربہ اس سے بالکل برعکس تھا، کبھی کبھی محبت طوفان کی طرح آتی ہے اور اپنے ساتھ ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح عشق جنون کی آندھی میں اڑا کر لے جاتی ہے، میرے ساتھ بھی محبت نے کچھ ایسا ہی جارحانہ رویہ روا رکھا تھا۔

"معید رضا" جس نے محض چند گھنٹے پہلے اسے دیکھا تھا، مگر رات کے اس پہر مجھے لگتا تھا کہ وہ انجان لڑکی میری رگ رگ میں لہو بن کر دوڑ رہی ہے۔ سفید اسکارف کے ہالے میں اناری چہرہ، جھکی پلکیں، شرمیلی مسکان اس کے بارے میں سوچتے سوچتے کب نیند سے بھرے بادل اس کے بے چین من پر برسے اور آنکھوں میں خوابوں کی ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ پڑیں۔

نئی صبح بڑی روشن اور چمکیلی تھی، گنگناتے ہوئے بالوں میں ہیر برش پھیرتے ہوئے، پرفیوم لگاتے، ناشتا کرتے معید رضا کی مسکراہٹ بہت گہری تھی، رات ہی رات میں محبت اس کے گرد ایک مضبوط حصار بنا چکی تھی، وہ خود کو کسی اور ہی دنیا کا باسی سمجھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے چھوٹے بھائی، آج کیا کوئی خاص دن ہے۔" پاپا کے ٹیبل سے اٹھتے ہی محب نے چائے کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے پوچھا۔

"بس بھائی ایسا ہی سمجھ لیں اور اسے خاص بنانے میں زرش بھابھی کے پاس جارہا ہوں، کیونکہ خوشی کے تانے بانے ان کے ارد گرد سے ہی ملتے ہیں، شام کو ساری تفصیلات بتاؤں گا، سی یو سون۔" وہ مسکراتا گنگناتا گاڑی کی چابی اٹھائے باہر نکل گیا اور محب نے اپنے چھوٹے بھائی کی دائمی خوشیوں کے لیے دل ہی دل میں دعا کی اور پورچ کی راہ لی، پاپا آفس جانے کے لیے اس کا انتظار کررہے تھے۔

☼ ☼ ☼

زاہد رضا کا شمار ملک کے مایہ ناز بزنس مین میں ہوتا تھا، آمنہ، زاہد سے ان کی شادی ان کی رضامندی سے ہوئی تھی۔ ان کے دو ہی بیٹے تھے، محب رضا اور معید رضا دونوں حسن اور ذہانت میں ماں، باپ دونوں کا پرتو تھے، بڑا بیٹا محب کچھ سنجیدہ مزاج اور ذمہ دار تھا۔ ایم بی اے کرنے کے بعد باپ کے ساتھ ہی بزنس کی دیکھ بھال کررہا تھا۔ پچھلے سال ہی اس کا نکاح زاہد صاحب کے دوست کی بیٹی زرش سے ہوا تھا جو معید کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی، اس رشتے میں بھی دونوں بچوں کی مرضی شامل تھی۔۔۔ ماں، باپ کا زیادہ لاڈلا بیٹا زندگی کے ایک ایک پل سے خوشی کشید کرنے والا زندہ دل معید رضا تھا جو پچھلے دنوں ہی پاکستان ٹور سے لوٹا تھا۔

"السلام علیکم بھابھی جی۔" زرش نے پلٹ کر دیکھا سامنے اس کا ہینڈسم اور شوخ و شریر سا دیور کھڑا تھا۔

"ارے معید تم آج اس طرف کیسے، خیر تو ہے خلاف توقع تمہارے بھیا نے کوئی چٹھی تو نہیں بھیج دی۔" زرش نے حیران ہوکر اس کی آمد کے بارے میں پوچھا۔

"ارے ایسے آپ کے نصیب کہاں کہ وہ دو اور دو چار کرنے والا بندہ محبت میں آہیں بھرے، خوشبو میں بسے خط لکھے، ہائے ہائے کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے آپ کی قسمت پر، اتنی پیاری لڑکی اور اتنا بور آدمی۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے تمہارے بھیا نے پچھلے مہینے میرے برتھ ڈے پر اتنا پیارا تحفہ دیا تھا اور ڈنر پر بھی لے کر گئے تھے اور۔۔۔ وہ بھی کہا تھا۔" زرش نے شرما کر کہا۔

"وہ کیا؟" معید نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ارے وہی جو ایک لڑکا اس موقع پر ایک لڑکی سے کہتا ہے۔"

"آئی لو یو۔" معید نے حیران ہوکر پوچھا۔

"نہیں ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔" زرش بھی ایک نمبر کی چالاک تھی، اسے اپنے نٹ کھٹ سے دیور کو ٹریٹ کرنا آتا تھا۔

"اوہو بھیا نامے میں آپ نے مجھے بھلا ہی دیا کہ صبح صبح میں نے آپ کے حضور حاضری کیوں دی ہے، وہ

دراصل کل آپ کے ڈپارٹمنٹ کے باہر ایک اپسرا کو دیکھا تھا' اسی کے بارے میں تھوڑی معلومات درکار ہے' باقی تفصیلات میں ملاقات کرکے خود حاصل کرلوں گا۔ میں نے پہلے اسے یہاں نہیں دیکھا' لگتا ہے نیو کمر ہے۔"

"او تو تم میرب خان آفندی کی بات کررہے ہو' پچھلے ہفتے ہی ایڈمیشن ہوا ہے' وہ الگ ٹائپ کی لڑکی ہے اور پھر پٹھان بھی' میرا نہیں خیال کہ دیور جی آپ کی دال یہاں گل جائے گی۔" زرش نے اسے تفصیلات دینے کے ساتھ ساتھ تنبیہ بھی کی۔

"ارے بھابھی جان! ایسی کون سی دال ہے جو معید رضا سے نہ گلے اور پھر مجھے وہ پسند بھی اس لیے آئی کہ وہ وکھری ٹائپ کی لڑکی ہے' قسم سے کل سے ابھی تک ایک لمحے کے لیے اس کا خیال دل و دماغ سے نہیں گیا۔ آئی ایم ویری سیریس آپ میری کسی طرح اس سے میٹنگ کروادیں' پھر دیکھیے اپنے دیور کے کمال۔" اس نے کالر جھاڑتے ہوئے ہو کہا۔

"اچھا پھر کچھ کرتے ہیں' کیا یاد کرو گے' ابھی تم جاؤ' ابھی میری کلاس کا ٹائم ہونے والا ہے۔" زرش سے بات کرکے معید پلٹا تو دل دھڑکنا بھول گیا' وہ سامنے سے آرہی تھی' سیاہ اسکارف میں قید سرخ و سفید چہرہ جھکی جھکی پلکیں۔ وہ اس کے دل میں اٹھنے والی ہلچل سے بے خبر اس کے قریب سے گزر کر اندر کلاس روم میں چلی گئی۔

معید کو لگا سارا منظر یک دم خالی خالی ہوگیا' وہ خود اپنی اس کیفیت پر حیران تھا۔ آج تک اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا' اس کی شان دار پرسنالٹی کے سبب صنف نازک ہمیشہ اس کی طرف مائل رہی' مگر اس نے کبھی کسی کی طرف قدم نہیں بڑھائے تھے۔ وہ اپنی موج مستی میں رہنے والا بندہ تھا' لیکن اب لگتا تھا محبت کی بساط پر اسے بڑی گہری مات ہونے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

میرب یونیورسٹی آکر بہت خوش تھی۔ اعلا تعلیم کا برسوں سے دیکھا اس کا خواب پورا ہورہا تھا۔

وہ اپنے قبیلے کی پہلی لڑکی تھی جو کسی ادارے میں مخلوط تعلیم حاصل کررہی تھی اور یہ سب اس کے داجی کی محبت اور اس کی ذات پر اعتماد تھا۔ کل ہی داجی اس سے ملنے آئے تھے۔ مورے نے اس کے لیے السی کے لڈو' باداموں اور گڑ کا حلوہ اور جانے کیا کیا بنا کر بھیجا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ محبتوں کے معاملے میں بڑی خوش نصیب ثابت ہوئی تھی۔ داجی' مورے' لالہ' تایا' تائی اور اس نے سنا تھا کہ شیر زمان سے رشتہ طے ہونے میں بھی اس کی پسند شامل ہے' وہ بہت کم گو اور روایتی پٹھانوں جیسا ہی تھا' اس نے سلام دعا کے علاوہ کبھی اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

لاہور میں سب اچھا تھا' یہاں کے لوگ بہت ملنسار تھے' مگر اسے کبھی کبھی پہاڑوں کے درمیان سبز بیلوں سے ڈھکا اپنا گھر یاد آتا تھا' اس کے کمرے کی پچھلی طرف جو کھڑکی کھلتی تھی وہاں آلوچے اور خوبانی کے باغات تھے' سیزن میں ان درختوں پر سفید اور سرخ پھولوں کی چادر سی بچھ جاتی تھی۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتی کھٹی میٹھی خوشبو اسے بہت پسند تھی' وہ اکثر کھڑکی کے پاس کھڑی اس مہک کو اپنے اندر اتارتی' مردان میں روز' روز موسم بھیگ جاتا' بادل ٹولیوں کی صورت میں ہوا سے اٹکھیلیاں کرتے' کن من پانی کی بوندیں میرب کی ہتھیلیوں کو گیلا کرتیں تو خوشی اندر تک اپنا راستہ بنالیتی تھی۔

یونیورسٹی میں ایک' دو لڑکیوں سے اس کی دوستی بھی ہوگئی تھی۔ زرش بھی ان میں سے ایک تھی' اس نے تو خود اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا' اس کا نکاح ہوچکا تھا' اچھی لڑکی تھی' سو میرب نے اس کی دوستی قبول کرلی' پڑھائی کے دوران باقی سب تو ٹھیک تھا' مگر جانے کیوں میرب کو لگتا وہ جہاں جاتی ہے کوئی بڑی خاموشی کے ساتھ اس کا پیچھا کرتا ہے' دو آنکھیں ہیں جو ہمہ وقت اسے دیکھتی رہتی ہیں' یہ حقیقت تھی یا وہم میرب نے زیادہ توجہ نہیں دی' کیونکہ وہ یہاں جس مقصد کے لیے آئی تھی وہ بخوبی پورا ہورہا تھا۔



☼ ☼ ☼

"السلام علیکم۔" وہ اور زرش لان میں بیٹھی کسی ٹاپک پر ڈسکس کررہی تھیں۔ کل ہی انہیں نیا پروجیکٹ ریڈی کرکے دینا تھا کہ معید چلا آیا.... زرش کا یہ دیور اکثر چلا آتا تھا۔ میرب اس کی موجودگی میں کچھ ان ایزی فیل کرتی تھی اور زرش بھی ہر وقت اپنے دیور معید رضا کے قصیدے پڑھتی رہتی تھی۔ ویسے تو معید کی پرسنالٹی شان دار تھی' اکیڈمک ریکارڈ بھی زبردست تھا' مگر اس کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا' اس لیے وہ ایکسکیوز کرتی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"زرش تم نے اس سے بات کی۔" معید نے اس کے جاتے ہی پوچھا' وہ چوکڑی مار کر وہیں بیٹھ گیا۔ جہاں سے کچھ دیر پہلے میرب اٹھ کر گئی تھی۔

"معید وہ اپنے بارے میں زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتی' اس لیے مجھے ہمت نہیں ہوتی کہ میں اس سے بات کرتی' وہ بہت زیادہ حساس لڑکی ہے' مجھے اس کے بارے میں زیادہ انفارمیشن نہیں ہے جو میں تمہیں دے سکوں' مگر اتنا اس نے بتایا ہے کہ یہاں آکر پڑھنے کی اجازت بہت مشکلوں سے ملی ہے۔ اس لیے وہ پڑھنے کے علاوہ نہ تو کچھ سوچ سکتی ہے اور نہ اسے اس کی اجازت ہے۔" زرش نے سنجیدگی سے اسے بتاتے ہوئے کہا۔

"یعنی آپ سے تو کچھ ہوگا نہیں' خود تو آپ نکاح کرواکر اپنی محبت کے منطقی انجام تک پہنچ گئیں' کسی بے قرار اور دکھی دل کا درد آپ کیا جانیں میں خود ہی کچھ کرتا ہوں! اوکے بائے اور ہاں بھائی نے میسج دیا ہے کہ دس دن بعد ایک اچھے سے ڈنر کے لیے تیار رہیے گا۔" وہ زرش کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ عمر میں اس سے چند ایک سال چھوٹی ہی تھی' وہ موڈ میں ہوتا تو اسے بھابھی جان کہتا' ورنہ زیادہ تر وہ اسے چھوٹی بہنوں کی طرح ہی ٹریٹ کرتا تھا۔

"معید دس دن بعد تمہارے لیے بھی ایک ٹیبل بک کروالیں۔" زرش نے اسے جاتے جاتے چھیڑا۔

"آئی ہوپ سو۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے مسکرایا۔

"اور ہاں بیسٹ آف لک اور ذرا سنبھل کر وہ غصے کی بھی بہت تیز ہے۔" وہ مسکراتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

13 فروری 2002ء جمعہ

کاش اسے معلوم ہو عدم<br>
وہ ہمیں زندگی سے پیارا ہے

رات کے اس پہر جب تارے بھی چاند کے گرد رقص کرکر کے تھک چکے تھے' کوئی تھا نیند جس کی آنکھوں سے روٹھی ہوئی تھی' وجہ وہ محبت کا خواب تھا جو اس نے دیکھنے کی بھول کرلی تھی' معید رضا نے سوچ لیا تھا کہ کل وہ میرب سے ضرور بات کرے گا۔ اس کی محبت اتنی شدید تر تھی کہ وہ اس میں نارسائی لفظ کی کوئی چیز قبول نہیں کرسکتا تھا' اسے لگتا تھا کہ اسے پہلے اس سے بات تو کرنی چاہیے' پھر اگلا لائحہ عمل اس کے جواب کی صورت میں طے کرلیا جائے گا اور اسے اپنی ذات پر اتنا زعم تو تھا کہ وہ کم از کم اس سے بات کرنے اور اس کی بات سننے سے انکاری نہیں ہوگی۔

پھر چودہ فروری بھی آئی' آکر گزر گئی' وہ میرب سے بات کرنے کی ہمت خود میں پیدا نہیں کرپایا تھا' محبت کے بیچ و چھوڑے کا ڈر آسن جمائے آن بیٹھا تھا "اگر اس نے انکار کردیا۔" اس سے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہیں پاتا تھا' چھ مہینے کا عرصہ گزر گیا' پہلے سمسٹر ہوگئے اور اب چند دن میں چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ آخر معید رضا نے ٹھان لی کہ آج وہ بات کرکے ہی رہے گا اور اسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا سفیدے کے درخت تک آن پہنچا' جس کے نیچے بیٹھ کر وہ اکثر اپنے اسائنمنٹ بنایا کرتی تھی۔

"ایکسکیوزمی مس میرب! کیا میں یہاں چند منٹ کے لیے بیٹھ سکتا ہوں۔" آج زرش یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔ وہ اکیلی بیٹھی نوٹس ریڈنگ کررہی تھی'

جب معید رضا اس کے سرپر آن کھڑا ہوا تھا۔

میرب نے سر اٹھا کر حیرت سے اس لمبے چوڑے شخص کو دیکھا۔ (اس کے بارے میں اس کے دل میں ایک اچھا تاثر تھا' اس نے اسے ہمیشہ عورت کی عزت کرتے دیکھا تھا۔)

"مجھے یہ سب پسند نہیں ہے' مگر آپ زرش کے رشتے دار ہیں' اس لیے آپ چند منٹ کے لیے یہاں بیٹھ سکتے ہیں اور وہ بات بھی کر سکتے ہیں جو آپ کرنے آئے ہیں۔ (اتنے عرصے کے بعد اسے یہ احساس تو ہو گیا تھا کہ اسے ہمہ وقت حصار میں لیے رکھنے والی دو آنکھیں کس کی ہیں۔) اس نے بہت اعتماد اور کچھ روکھے لہجے میں اسے بیٹھنے کی اجازت دے ڈالی تھی۔

چند لمحے خاموشی کے نذر ہو گئے۔ معید رضا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنے عشق کی داستان کہاں سے شروع کرے۔

"وہ دراصل مس میرب! میں آپ کو یہ بالکل نہیں بتاؤں گا کہ جس دن سے میں نے آپ کو دیکھا ہے' میری ہر رات کا خواب آپ کی یاد سے جڑا ہے' مجھے لگتا ہے کہ آپ کے بغیر میری ذات نامکمل ہے' اس لیے میں خود کو مکمل کرنا چاہتا ہوں' میں محبت میں باتوں اور ملاقاتوں کا قائل نہیں ہوں' سو آئی پرپوز یو' آپ اپنا ایڈریس دے دیں' میں مما اور پاپا کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔"

معید رضا نے چند منٹوں میں بڑی آسانی سے اپنا حال دل سنا دیا' اور اب وہ بالکل مطمئن سا اس کے جواب کا منتظر تھا۔

میرب کے سامنے معید رضا سر سے پیر تک انتظار اوڑھے بیٹھا تھا جس کا ایک عالم دیوانہ تھا' اس کی آنکھوں کی چمک یہ گواہی دے رہی تھی کہ اس کا حرف حرف سچا ہے' چند لمحوں تک اس نے خود کو سمیٹا' معید رضا نے اس سے کیا کہا اور اب اسے کیا کہنا تھا یہ سوچا اور اس سے مخاطب ہوئی۔

"معید رضا صاحب! شاید آپ کو پتا ہو کہ میں مردان سے تعلق رکھتی ہوں' میں اپنے قبیلے کی واحد لڑکی ہوں جس نے روایات اور رسموں کی بلند بالا دیواروں کو پھلانگ کر یہاں ایڈمیشن لیا ہے' میرا آج کا اٹھایا ہوا کوئی بھی غلط قدم میری آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے وہ سب دروازے بند کر دے گا جنہیں میں نے بڑی مشکل سے کھولا ہے۔

آپ کو پتا ہے معید صاحب! میری مورے کو پڑھنے کا بہت شوق تھا اور جب وہ پانچویں میں پڑھتی تھیں تو میرے دا جی کی چھوٹی پھوپھی اسکول سے بھاگ گئی تھیں اور پھر نانا نے اماں کو بھی اسکول سے اٹھوا لیا اور پھر تیس سالوں تک یہ فیصلہ نہیں بدلا حالانکہ ہمارے خاندان کے لڑکے اعلا تعلیم کے لیے بیرون ملک بھی جاتے رہے۔ میری ماں نے اپنا پھٹا ہوا بستہ اور اپنی بوسیدہ سی کتاب ابھی تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ انہوں نے آتے ہوئے اتنا ہی کہا تھا میرب خدارا محبت نہ کرنا کہ کل کوئی تمہارا رشتہ لے کر یہاں تک آئے اور ہمارے قبیلے کے مردوں کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ جو لڑکیاں اعلا تعلیم حاصل کرتی ہیں وہ یہ ہی سب کرنے وہاں جاتی ہیں' میں اپنی مورے کی بوسیدہ کتاب میں رکھی امیدوں کی تتلی کے پر مسل کر اپنی انگلیوں کی پوروں کو رنگین نہیں کر سکتی۔"

"مگر میرب! تم کوئی غلط قدم تو نہیں اٹھا رہیں' میں باعزت طریقے سے تمہیں ساری دنیا کے سامنے لینے آنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے دا جی جب پاپا سے ملیں گے تو ہماری فیملی بیک گراؤنڈ' میری نیک نامی' ہمارا بزنس' یہ سب باتیں انہیں ذات پات اور فرسودہ سوچوں کے دائرے سے باہر نکال دیں گی' پلیز میرب تم صرف قبیلے کی سوچ کی خاطر میری محبت کو قربان نہیں کر سکتیں۔"

معید رضا کو لگ رہا تھا سب کچھ اتنا ہی آسان ہے جتنا وہ سمجھ رہا ہے' اسے لگتا تھا محبت وہ کنجی ہے جو ہر تالے کو کھولتی چلی جائے گی' مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ زندگی کی بساط پر محبت کے مہرے کے ہاتھوں اسے مات ہونے والی ہے۔

"معید رضا صاحب! میرے دا جی چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکتے' کیونکہ میری منگنی اپنے تایا زاد کے ساتھ ہو چکی ہے اور ہمارے یہاں منگ نہیں چھوڑی جاتی' نہ زندہ' نہ مردہ' اس لیے آئی ایم رئیلی ویری سوری' آپ بہت اچھے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ کے لیے کاتب تقدیر نے کہیں کوئی بہت اچھی لڑکی لکھ رکھی ہو گی۔"

معید رضا نے سر اٹھا کر دیکھا' اس کی کرنچی آنکھوں میں یک دم کانچ سے چبھ گئے تھے۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے اسے اپنا بیگ اور فائل سمیٹ کر اٹھتے ہوئے دیکھا' اسے لگا اس کا محبت کا محل دھڑام سے فرش پر آ گرا ہو۔

"میرب!" اس کی پکار میں جانے کیا تھا' حسرت' محبت' دیوانگی یا پھر اداسی' وہ ایک لمحے کو رکی۔

"معید صاحب! آپ کے اور میرے رستے دو الگ منزلوں کی طرف جاتے ہیں' اس لیے پلیز آئندہ مجھے مت پکاریے گا' یہ میری آپ کو لاسٹ وارننگ ہے۔" اس نے سختی سے تنبیہ کی۔

وہ جانے کو پلٹ چکی تھی۔ چند قدم ہی چلی ہو گی کہ معید اس کے آگے آن کھڑا ہوا۔

"میرا ہر رستہ تم سے شروع ہو کر تم ہی پر ختم ہو جاتا ہے اور میں جانتا ہوں میری محبت تمہاری نگاہوں اور دل میں بنی سنگلاخ چٹانوں کو عبور کر کے اس روش تک جا پہنچے گی جہاں دو رویہ صرف پھول ہی پھول ہیں اور جس دن ایسا ہوا میں تمہارے دا جی کے سامنے جا کھڑا ہوں گا۔" اور پھر وہ رکا نہیں لمبے لمبے ڈگ بھرتا یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

سمسٹرز کے بعد چھٹیاں ہو گئیں اور وہ واپس مردان چلی گئی' دا جی' مورے اور اپنا گھر سب چیزوں نے مل کر اس کا دھیان بٹا دیا تھا۔ مورے اور تائی جی آج کل طرح طرح کے کھانے کھا کر پکار رہی تھیں۔ بقول ان کے وہاں رہ کر اور ہاسٹل کے کھانے کھا کھا کر ہماری بیٹی کتنی کمزور ہو گئی تھی۔ پھر چھٹیوں کے دن بھی پورے ہو گئے۔ دو مہینے کب گزرے پتا ہی نہیں چلا' کبھی کبھار زرش سے بات ہو جاتی تھی' وہ معید رضا کا ذکر کرنا چاہتی تو وہ بات بدل کر فون رکھ دیتی' آج وہ واپس لاہور جا رہی تھی' دا جی اور مورے بہت اداس تھے۔ لالہ تو پہلے ہی تعلیم کے سلسلے میں بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ اور اب وہ بھی پردیسی ہو گئی تھی۔ دا جی اسے خود چھوڑ کر گئے تھے۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے' اس لیے وہ یونیورسٹی نہیں گئی' اس کا سر ویسے ہی کچھ بھاری ہو رہا تھا' وہ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھی کب سے چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ ٹیبل پر رکھا کافی کا مگ بھی اس کی توجہ کے انتظار میں پڑا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اتنے میں موبائل پر میسج بیپ ہونے لگی' انجان نمبر تھا' اس نے اوپن کیا۔

تیرے مشورے کے خلوص پر مجھے ترک عشق قبول ہے۔

مگر یاد رکھنا ہم نشین میری زندگی کا سوال ہے

صرف اور صرف تمہارا معید رضا۔

اس نے اسی وقت زرش کو فون ملایا۔ وہ اس سے خوب لڑی تھی کہ اس نے معید رضا کو اس کا سیل نمبر کیوں دیا اور ویسے بھی آج کل اس کا دل ساری دنیا سے ہی ناراض رہنا چاہتا تھا۔ جانے کیوں اور کیا تھا وہ جاننے' ماننے اور نہ ماننے کی غلام گردش کے بیچ گھوم رہی تھی۔

پورے تین دن بعد وہ یونیورسٹی گئی تھی' زرش نے اس سے سوری کی تھی اور وہ مان بھی گئی تھی' سارا دن بہت مصروف گزرا تھا' تین دن کا کام مکمل کرتے کرتے اسے کافی دیر ہو گئی' زرش پہلے ہی جا چکی تھی' اس نے بھی اپنا بیگ سمیٹا اور باہر کی طرف چل دی' سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر وہ پوائنٹ کا انتظار کرنے لگی' اچانک ایک کاہی کلر کی پراڈو اس کے سامنے آ کر رکی' فرنٹ ڈور سے اتر کر معید رضا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ بڑھی ہوئی داڑھی' ملگجا سا شلوار قمیص' گلے میں پڑی براؤن شال' اجڑا اجڑا سادہ

ایک لمحے کے لیے پہچان ہی نہ پائی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو گزشتہ دو سال سے ویل ڈریسڈ مین آف ایئر کا ایوارڈ جیت رہا تھا۔

"میرب تم ایک بار اپنے فیصلے پر نظر ثانی تو کرو... پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔" لہجے میں بے بسی کا عنصر نمایاں تھا۔

"تمہاری کزن سے تمہاری منگنی میں تمہاری رضا شامل نہیں ہے وہ کسی سے بھی شادی کرلے گا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا تم ایک بار مجھے اپنے دا جی سے ملنے کی اجازت دے دو میں انہیں منالوں گا میں انہیں بتاؤں گا کہ میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔" اک اک لفظ میں التجا کا عکس نمایاں تھا۔

"اوہو... وہ دیکھو اس سال کے نئے اور ہٹ مجنوں اور لیلیٰ واؤ واٹ آ کپل۔" پاس سے گزرے دو لڑکوں نے انہیں دیکھ کر جملہ اچھالا معید رضا غصے سے بھرا ان کی طرف لپکا تو میرب نے روک لیا۔

"معید رضا کس کس کو روکیں گے جب آپ خود میری راہیں روک روک کر اپنی محبت کے پوسٹر لگائیں گے تو لوگ تو باتیں کریں گے تم آپ نے مجھ سے محبت کرکے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا جس کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں چند گھسے پٹے جملے بول کر آپ مجھے امپریس کرلیں گے۔ کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا اس لیے براہ مہربانی آئندہ میرے رستے میں آنے کی کوشش مت کیجیے گا آئی ایم ناٹ انٹرسٹڈ یو اینڈ یور فیلنگ۔" پوائنٹ آچکا تھا۔ وہ جلدی سے اس میں سوار ہو گئی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ معید رضا کھڑا ہے یا واپسی کے رستے کی طرف پلٹ گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

"تم خود کو کیا سمجھتی ہو تم بہت حسین ہو تم جیسا دنیا میں کوئی اور نہیں ہے کتنی آسان سے تم نے ایک بے لوث شخص کی محبت کا مذاق اڑایا تمہیں اپنی روایات اپنی آنے والی نسلوں کا مستقبل بہت عزیز ہے اگر واسطہ نہیں تو اس معصوم شخص کی محبت سے جو تمہارے خاطر موت اور زندگی کی دہلیز پر کھڑا ہے تم بہت خود غرض ہو میرب خان آفندی ایک بات یاد رکھنا اگر اسے کچھ ہو گیا تو تم خود کو بھی معاف نہیں کرپاؤ گی تم نے ہی کہا تھا نا کہ کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا تو جاؤ دیکھو اس نے تمہاری خاطر موت کو گلے لگا لیا تھا وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ محب کسی کام سے اس کے کمرے میں گئے اور انہیں پتا چل گیا کہ معید نے نیند کی گولیاں کھالی ہیں بروقت طبی امداد سے اس کی جان تو بچ گئی مگر اب بھی وہ نیم بے ہوشی میں صرف ایک ہی نام پکار رہا ہے اور مجھے بتانے کی ضرورت تو نہیں ہوگی کہ وہ نام کس کا ہے۔" وہ ابھی ہوسٹل آکر بستر پر لیٹی ہی تھی اس نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا تھا کہ دھاڑ سے دروازہ کھلا اور زرش آکر اس پر برسنے لگی...

پھر نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کیوں وہ زرش کے ساتھ معید رضا کے گھر چل دی اس نے اس کے گھر میں قدم رکھا تو اسے لگا گھر کا ہر کونا اس کی چاپ سے مانوس ہے اس کے نام اور نقش سے آشنا ہے معید کی مما سب کچھ جانتے ہوئے بھی بڑے پیار سے ملیں اور پھر زرش اسے معید کے کمرے میں لے گئی۔ بستر پر بے ہوشی کی حالت میں لیٹا ہوا شخص اس کا کچھ بھی نہیں تھا لیکن اس کی خاطر اپنی جان جیسی متاع لٹا کر بیٹھا تھا دو آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکے اور اس کے سیاہ اسکارف میں جذب ہو گئے۔

"میرب پلیز میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔" معید رضا کا کہا ہوا جملہ اس کے کانوں سے ٹکرایا یکدم اسے لگا معید رضا ابھی اٹھے گا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے ہمیشہ کے لیے روک لے گا ایک لمحے کے لیے آنکھوں کے سامنے سے دا جی مورے اور شیر زمان کے چہرے گزرے وہ دوڑتی ہوئی کمرے اور پھر گھر سے باہر نکل آئی زرش اسے آوازیں دیتی رہ گئی مگر اب اسے کسی آواز پر نہیں پلٹنا تھا ورنہ وہ شاید پتھر کی ہوجاتی۔

☼ ☼ ☼



معید کی طبیعت اب کافی حد تک سنبھل چکی تھی اور اسے زرش کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دشمن جاں اسے دیکھنے آئی تھی وہ اسی سرخوشی کے عالم میں دن گن رہا تھا کہ کب ڈاکٹر اسے بیڈ ریسٹ سے آزادی دیں اور وہ ان سخت چٹانوں کے اس پار پھولوں کی روش تک جا پہنچے بقول زرش کے اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے ہر قفل کھول دیا تھا بس اب دستک دینے کی دیر تھی تو پھر ہر در وا ہوتا چلا جانا تھا...

"السلام علیکم دیور جی۔" وہ یہ سب کچھ سوچ سوچ کر مسکرا رہا تھا کہ زرش کمرے میں داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں سرخ گلابوں کا ایک بوکے بھی تھا۔

"لگتا ہے ڈاکٹر کی دوائی سے زیادہ میری دی ہوئی اطلاع نے تمہاری صحت پر اچھے اثرات ڈالے ہیں اور اب جو میرے پاس تمہیں دینے کے لیے ہے اس کے بعد تو تمہیں ڈاکٹر کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"ارے بھابھی جی اپنے دیور کو دعا دیجیے کہ اس کی وجہ سے آپ کی یہاں انٹری اور روز روز دیدار یار کی حسرت پوری ہو گئی اور آپ یہ پھولوں کا سرخ گلدستہ لالہ کمرے میں لے آئی ہیں آج چودہ فروری ہے محبت کا دن اس لیے آپ یہ انہیں دے آئیے جن کے لیے لائی ہیں مجھ غریب کا تو صرف بہانہ ہے ہمارا کیا ہے ہم تو دواؤں سے بھی بہل جائیں گے اور اچھا ہوا آپ آگئیں میں سوچ رہا تھا کہ چھپ چھپا کر آج شام میرب سے مل آؤں پاپا اور ڈاکٹر انکل کو آپ اور بھیا سنبھال لینا۔" وہ بولتا ہی جا رہا تھا۔

"ویسے جناب یہ بوکے میں نہیں لائی یہ کسی نے آپ کے لیے بھیجا ہے اور ساتھ میں پیام محبت بھی شاید مگر اتنی آسانی سے آپ کو یہ سب نہیں ملے گا پہلے تم وعدہ کرو کہ تم ہمیں پی سی میں ایک شاندار ڈنر دو گے۔" زرش نے ہاتھ میں تھاما بوکے اور سفید لفافہ لہرایا۔ معید فٹ سے بستر سے اٹھ بیٹھا۔

"ارے بھابھی جان! آپ ڈنر کی بات کرتی ہیں آپ میرے لیے جو خوشی لائی ہیں اس کے صدقے بولیں تو پورا پی سی آپ کے نام کروادوں۔" وہ اس کے پاس آکر بولا مگر سارا دھیان زرش کے ہاتھوں کی طرف ہی تھا۔

"اچھا تم بیٹھو تو سہی دے رہی ہوں اور جا بھی رہی ہوں تاکہ تم تنہائی میں سکون سے پڑھ سکو۔" زرش اسے بٹھا کر اس کے سرہانے بوکے رکھ کر اور اسے لفافہ تھما کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"دا جی مجھے آکر لے جائیں!" وہ بس فون پر اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

"کیوں بیٹا جی خیر تو ہے ابھی تو تمہارے پیپرز ہونے میں تھوڑے ہی دن بچے ہیں۔"

"دا جی میرا دل یہاں نہیں لگتا اور بس یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے اور آپ کی اجازت کا شوق تھا وہ پورا کرلیا اور پھر اتنا پڑھ کر کیا کروں گی نوکری تو آپ کا بھتیجا کرنے نہیں دے گا۔" اپنوں سے اپنا آپ چھپانا کس قدر مشکل تھا اس کا اندازہ ریسیور تھامے میرب کو بخوبی ہو رہا تھا۔

"اچھا جیسے تمہاری مرضی تھوڑے دن ہمارے پاس رہ لینا پھر واپس چلی آنا تمہارا دل بہل جائے گا اور رہی بات میرے بھتیجے کی تو بیٹا وہ دل کا بہت اچھا ہے بس اس کا مزاج ذرا مختلف ہے مجھے امید ہے وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔"

☼ ☼ ☼

معید نے بوکے ہاتھوں میں لے کر اس کی مہک کو اپنے اندر اتارا بے تابی نے لفافہ چاک کرکے اس نے خط نکالا اور دل کی آنکھوں سے پڑھنے لگا...

معید رضا صاحب!

زندگی اتنی ارزاں چیز نہیں ہے کہ اسے کسی کی بھی خاطر داؤ پر لگا دیا جائے ہماری محبتوں سے زیادہ ہمارے ماں باپ کی وہ محبتیں معتبر ہوتی ہیں جو وہ تمام عمر ہم پر بے دریغ لٹاتے ہیں اس دن آپ کی مما کی سرخ روتی اور جاگی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے آپ پر بہت غصہ آیا تھا

محبتیں خود غرض تو نہیں ہوتیں اور صرف ملنا اور پالینا ہی محبتوں کی معراج نہیں ہوا کرتا جو محبتیں اتنی مضبوط ہوں کہ آپ ان کی خاطر موت کو گلے لگالیں وہ اتنی عام تو نہیں ہوتیں کہ ہجر کے موسم میں مرجھا جائیں۔۔۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ جس سے محبت کرتے ہیں اس سے اظہار کرسکتے ہیں مگر چند کم نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی خاموش محبت کو تمام عمر اپنے من کے مزار میں دفنا کر رکھتے ہیں' میں جارہی ہوں مگر اپنی محبت اور مان کے تحت آپ کو پابند کرکے جارہی ہوں کہ آپ کبھی ان رستوں کی طرف سفر نہیں کریں گے جہاں میں لوٹ رہی ہوں۔ اپنی تعلیم بھی ادھوری چھوڑ رہی ہو کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میں کسی کمزور لمحے کی زد میں آجاؤں کیونکہ مجھے اپنے داجی اور مورے کا مان از حد عزیز ہے مگر جانے سے پہلے ایک بات ضرور بتا کر جاؤں گی مجھے نہیں پتا آپ کو یہ بات خوشی دے گی یا دکھ مگر پھر بھی بتا رہی ہوں۔۔۔ معید رضا آپ نے سنگلاخ چٹانوں کا رستہ پار کرکے سرخ گلابوں کی روش کھوج لی ہے۔"

میرب خان آفندی

بوکے اور کاغذ وہیں پھینک کر وہ باہر کی طرف بھاگا وہ آخری بار صرف اور صرف ایک بار اس کی آنکھوں میں وہ دیے دیکھنا چاہتا تھا جو اس کی محبت سے روشن ہوئے تھے ایک بار اس پھولوں بھری روش میں قدم رکھنا چاہتا تھا اور صرف اس ایک لمحے پر وہ اپنی ساری زندگی گزار سکتا تھا فل اسپیڈ میں کاہی پراڈو بھگاتے ہوئے اسے خبر نہیں تھی کہ وہ دیر کرچکا ہے اور تقدیر کے فیصلے کی اسپیڈ اس کی اسپیڈ سے کہیں زیادہ تھی۔

٭ ٭ ٭

میرب اپنا سارا سامان پیک کرچکی تھی جب چوکیدار نے اسے آکر بتایا کہ بی بی آپ کو کوئی لینے آیا ہے وہ باہر کی طرف لپکی وہ داجی سے ملنے اور ان کی مضبوط پناہوں میں چھپ جانے کے لیے بے تاب تھی مگر گاڑی سے ٹیک لگائے سینے پر بازو باندھے سامنے شیر زمان کھڑا تھا۔

اس نے اس کے ساتھ مل کر سامان گاڑی میں رکھوایا اور چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"میرب تمہیں مجھے دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی۔" کافی دیر بعد شیر زمان کی بھاری آواز نے خاموشی کے پردے کو چاک کیا۔

"دراصل داجی نے مجھے تمہارے خیالات کے بارے میں بتایا تھا کہ تم مجھے ہٹلر سمجھتی ہو اور ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کبھی کبھی جذبوں کا اظہار کرنا ضروری ہوجاتا ہے تاکہ آپ کی زندگی میں آنے والا اس اظہار کی نرم اور ریشمی ڈوری سے چند سہانے خواب باندھ لے۔"

میرب نے حیران ہوکر شیر زمان کی طرف دیکھا اس نے زندگی میں پہلی بار اسے اتنا بولتے سنا تھا اور اس سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ کبھی کبھی جذبوں کے اظہار سے خوابوں کی ڈور رت جگوں کے ساتھ بھی بندھ جاتی ہے۔

"تمہیں پتا ہے میرب جب تم حویلی کے کچے آنگن میں گلابی فراک پہنے دو پونیاں باندھے ادھر سے ادھر بھاگتی پھرتی تھیں تو تمہارے ننھے ننھے قدم میرے دل کی دہلیز پر دھرے جاتے تھے جب شاوار تمہیں مارتا تھا تو میرا خون کھول اٹھتا تھا اور تمہارے انٹر کے بعد جب داجی اور بابا نے یہ فیصلہ کیا کہ تمہیں میری ہم سفر بنا دیا جائے گا تو مجھے یقین ہوگیا کہ ہتھیلیاں پھیلائے بنا دل ہی دل میں جو دعائیں مانگی جاتی ہیں وہ بھی پوری ہوجاتی ہیں۔ یہ سب باتیں میں نے آنے والے خوبصورت وقت کے لیے سنبھال کر رکھی تھیں تاکہ تمہیں سرپرائز دے سکوں مگر اب یہ بھی تو ثابت کرنا ہے کہ داجی کا بھتیجا ہٹلر نہیں بلکہ کئی سالوں سے تمہارا خاموش لور ہے۔

میرب کیا بات ہے تم بہت گم سم ہو تمہیں اچھا نہیں لگا میرا سب کچھ بتانا۔" بولتے بولتے شیر زمان کو احساس ہوا کہ وہ ہی بولے جارہا ہے مگر میرب کا دھیان اس کی باتوں کی طرف نہیں ہے۔



شیر زمان کا اظہار اسے شاید بہت اچھا لگتا مگر اب بیچ میں معید رضا آگیا تھا۔ جانے کب کیسے اسے معید رضا سے محبت ہوگئی تھی اس نے تو دل کے سب کواڑ بہت سختی سے بند کیے تھے مگر وہ تو خوشبو کے جھونکے کی طرح اس کی زندگی میں آگئی تھی جس کا رستہ کوئی دیوار در نہیں روک سکے تھے وہ اس شہر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جارہی تھی مگر اسے پتا تھا کہ اس کا وجود خزاں رسیدہ پتے کی طرح یہیں بکھرا رہے گا۔۔۔

گاڑی نے بہت سا فاصلہ پاٹ لیا تھا اب سنگلاخ پہاڑوں کی چوٹیوں نے سر اٹھا کر جھانکنا شروع کردیا تھا وہ انہی پہاڑوں کی بیٹی تھی جس نے اپنی روایتوں اور بزرگوں کی محبتوں کے قدموں میں اپنی محبت رکھ دی تھی۔ شیر زمان خاموشی سے ڈرائیونگ کررہا تھا اس نے سیٹ کے پیچھے گردن ٹکا کر آنکھیں موندلی تھیں کہ سفر ابھی کافی لمبا تھا۔

٭ ٭ ٭

14 فروری 2012ء بروز بدھ

تو بھی نہ مل سکا ہمیں عمر بھی رائیگاں گئی
تجھ سے تو خیر عشق تھا خود سے بڑے گلے رہے

"وقت سال بہ سال ریت کی طرح مٹھیوں سے پھسلتا جارہا ہے مگر محبت کے طاقچے پر دھرے چراغ کی لو مدھم نہیں ہوپائی ہے میری رات کا ہر خواب اب بھی اس کی یاد سے جڑا ہے۔۔۔"

"پاپا جی۔" معید رضا ابھی چند لائنیں ہی لکھ پائے تھے کہ نوال ان کی اسٹڈی میں انہیں آوازیں دیتی ہوئی داخل ہوئی انہوں نے ڈائری بند کرکے قلم کو اس پر چند لمحوں کے لیے رکھ دیا۔

"جی بیٹا جی۔"

پاپا جی مما کہہ رہی ہیں کہ آپ ہاف بریک تک میرے اسکول آجائیے گا لندن میں کوئی اسکولز لیول ایگزیبیشن ہے اور آرٹ پروجیکٹ کے لیے میرا نام سلیکٹ ہوا ہے اسی سلسلے میں پرنسپل نے آپ سے کچھ بات کرنی ہے او کے بائے اب میری وین آنے والی ہے ڈسٹرب کرنے کے لیے سوری۔"

وہ اس کے گال پر پیار کرتی جلدی سے باہر نکل گئی وائٹ یونیفارم اور میرون اسکارف میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی شکل صورت میں تو وہ اپنی ماں کا ہی پرتو تھی مگر کبھی کبھی معید کو لگتا اس کا کوئی نہ کوئی انداز کہیں نہ کہیں سے میرب سے ملتا ہے۔

معید رضا نے ڈائری لاکر میں رکھی اور اسٹڈی سے باہر آگئے ان کا رخ کچن کی طرف تھا انہیں پتا تھا وہ انہیں اس وقت وہیں ملے گی۔

"زرش۔" انہوں نے برتن ترتیب سے رکھتی زرش کو دھیرے سے پکارا۔

"تمہیں پتا ہے ناکہ میں نے سوشل لائف بالکل ختم کردی ہے اور نوال کہہ رہی تھی کہ تم نے اس سے کہا ہے کہ میں اس کے اسکول جلد جاؤں' آج کل تمہیں پتا ہے کہ اسکولوں کی ایڈمنسٹریشن کے کتنے نخرے ہوتے ہیں آئی کین ناٹ ہینڈل اٹ تم خود ہی چلی جانا۔"

"مجھے یہ سب معلوم ہے پر مجھے آج مسز احمد کی طرف کسی ضروری کام سے جانا ہے اس لیے آپ سے کہا ہے نوال کی پرنسپل کوئی نائس لیڈی ہوگی آپ کو کوئی پرابلم نہیں ہوگا اور پھر آپ اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے اتنا نہیں کرسکتے وہ بھی آپ کو دیکھ کر خوش ہوجائے گی۔"

٭ ٭ ٭

معید رضا اسکول کی بڑی سی پرشکوہ عمارت کے باہر کھڑے تھے یہاں ان کی بیٹی نوال فائیو اسٹینڈرز میں پڑھ رہی تھی اک اس کی ذات تھی جو انہیں دوبارہ زندگی کی طرف لائی تھی ورنہ محبت میں مات کے بعد انہیں لگتا تھا کہ زندگی جینے کو ان کے پاس اب کچھ باقی نہیں بچا چوکیدار سے پرنسپل کے آفس کا پوچھ کر وہ اس طرف چل دیئے تھے۔

ڈور ناک کرکے وہ آفس کے اندر داخل ہوئے تو انہیں لگا گویا کائنات تھم گئی ہو سامنے کرسی پر وہ متاع

جان بیٹھی تھی جس کی یاد کے نام وہ اپنا اک اک پل وار کرتے رہے تھے وقت نے اس پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا وہی سرخ وسپید چہرہ' وہی سیاہ اسکارف ویسی ہی جھکی ہوئی پلکیں بس ایک عدد گولڈن فریم والے چشمے کا اضافہ ہوگیا تھا معید رضا کو لگا شاید یہ ان کا وہم ہے' مگر ٹیبل پر رکھی میرب خان آفندی کی نیم پلیٹ انہیں یقین دلا رہی تھی کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔

دوسری طرف بھی کچھ ایسا ہی عالم تھا وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی' اس کے سامنے معید رضا کھڑا تھا' وہی معید رضا جسے وہ روایات اور دا جی اور مورے کے لیے چھوڑ آئی تھی' مگر دس سالوں میں وہ ایک پل کے لیے بھی اس سے جدا نہیں ہوا تھا۔

"آپ......"

"تم......" دونوں کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے کیا کہیں' پھر اچانک میرب کو خیال آیا کہ چند لمحے پہلے سیکریٹری نے انہیں بتایا تھا کہ نوال کے پاپا ملنے آئے ہیں! وہ اک لمحے میں خواب کے فسوں سے لوٹی' کیونکہ سامنے کھڑا شخص یونیورسٹی والا معید رضا نہیں' بلکہ ان کے اسکول کی ہونہار اسٹوڈنٹ نوال رضا کا باپ تھا۔

"آئیے بیٹھیے' مجھے نوال کے سلسلے میں آپ سے کچھ بات کرنی تھی' مجھے پتا نہیں تھا نوال آپ کی بیٹی ہے' بہت پیاری بچی ہے' لگتا ہے اپنی ماں پر گئی ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرب کے لہجے میں کچھ جتانے والی بات ضرور تھی۔

"ہاں تم نے پہچانا نہیں' اس کے نقش اپنی ماں زرش جیسے ہی ہیں۔"

"او آئی ایم سوری! محب بھائی کو کیا ہوا تھا۔" اس نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں تمہارا کیا پرابلم ہے' تم ہر کسی کو مارنے پر کیوں تلی رہتی ہو' پہلے تم نے مجھے جیتے جی مار ڈالا' پھر تم نے اپنی محبت کو مار ڈالا اور اب بے چارے' غریب میرے بھائی کو مارنے پر تلی ہوئی ہو' محب بھائی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں اور آج کل فارن ٹور پر گئے ہوئے ہیں۔ نوال' زرش اور محب بھائی کی اولاد ہے' مگر وہ بیٹی میری ہے' انہوں نے چھوٹے ہوتے ہی اسے میرے حوالے کردیا تھا شاید اس طرح میں تمہاری یادوں کے گھنے جنگلوں سے لوٹ آؤں اور نوال کی محبت اس کام میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئی ہے۔" کتنے سالوں بعد معید رضا وہی پرانی والی ٹون میں بول رہے تھے' ورنہ تو انہوں نے بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرب نے معید رضا کی طرف دیکھا' ان کی کرنجی آنکھوں میں آج بھی محبت کی تحریر اپنے پرانے نقش کی طرح قائم دائم تھی۔

"زرش مجھے بتا رہی تھی کہ لندن میں کوئی ایگزیبیشن ہو رہی ہے' مگر نوال تو ابھی کافی چھوٹی ہے۔" انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

"ایکسکیوزمی میرب! تم ابھی تک فارغ نہیں ہوئیں' اب چلو بھی' تمہیں پتا ہے ہمیشہ کی طرح آج بھی تمہاری ہی پسند کا گفٹ لینا ہے' تم جلدی سے نیچے آؤ میں گاڑی میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔" ابھی بات درمیان میں ہی تھی کہ بلیک تھری پیس میں ایک بہت ہی خوب صورت مرد اندر داخل ہوا اور جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی تیزی سے واپس بھی لوٹ گیا۔

"مس میرب آپ ابھی بے شک جائیے' میں پھر آجاؤں گا' نیچے شیر زمان آپ کا انتظار کررہا ہے' آج کے دن آپ کو آفس سے زیادہ اس کا خیال رکھنا چاہیے' ویسے بندہ ایسا ہے کہ اس کے لیے بہت کچھ چھوڑا جاسکے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی معید کے لہجے میں بھی طنز در آیا تھا۔

"مسٹر معید رضا! آپ کی خود سے مفروضے لگانے والی عادت آج تک نہیں گئی' یہ شیر زمان نہیں میرے لالہ شاوار ہیں اور وہ اپنی بیگم جو میری کزن اور دوست ہے کے لیے تحفہ ہمیشہ مجھ سے پسند کروا کر لیتے ہیں جو اسے ہمیشہ پسند آتا ہے۔" آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وضاحت دی۔

"جب میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لاہور گئی تھی تو بڑی مشکلوں سے میں نے سب کو سمجھایا کہ میں نے پڑھائی اپنی مرضی سے چھوڑی ہے اور پھر دا جی نے میری اور شیر زمان کی شادی کی تاریخ طے کردی کہ تایا اور تائی تو اس گھڑی کے کب سے منتظر تھے اور خود شیر زمان بھی...... اور پھر جس دن میرا مایوں تھا میں زرد جوڑا پہنے ہاتھوں میں شیر زمان کے نام کی مہندی لگانے بیٹھی تھی تو زمینوں سے آتے ہوئے شیر زمان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا' اس کی گاڑی کھائی میں جاگری۔ میں نے کبھی اس کے لیے بددعا نہیں کی تھی' اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو اپنے جذبوں میں سچا تھا' مگر شاید کاتب تقدیر کے یہاں اس کا اتنا ہی وقت لکھا تھا اور پھر پہلی بار مجھے اپنے رواجوں پر پیار آیا' ہمارے رواجوں کے مطابق کسی کے نام کی منگ اس کے مرنے کے بعد بھی کسی اور سے شادی نہیں کرسکتی تھی' اس طرح کم از کم میرے وجود' میرے دل' میری محبت کو بانٹنے کی نوبت نہیں آئی' پھر میں نے پرائیویٹ اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ جوڑا' پہلے ایم اے اور پھر ایم فل کیا' پچھلے سال لالہ کی پوسٹنگ لاہور ہوئی تو ان کے ساتھ یہاں آنا پڑا' مورے تو اب ہم میں نہیں رہیں' مگر دا جی ہیں' مگر زیادہ چل نہیں سکتے' بس ان کی خدمت کرتے وقت گزر جاتا ہے' وہ اب بھی مجھے کہتے ہیں کہ میرب وہ کون تھا' وہ جس کے لیے تم اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ آئیں' مجھے ملواؤ آج سے دس سال پہلے تم نے روایتوں کے مان پر اپنی محبت قربان کردی تھی اور آج میں تمہاری خوشی کے لیے رواج قربان کرنے کو خوشی راضی ہوں۔ مگر دل ہی نہیں مانتا۔" میرب بھی شاید بہت عرصے بعد اتنا بولی تھی۔

"اچھا چلتی ہوں لالہ نیچے میرا انتظار کررہے ہوں گے۔" وہ بیگ اٹھا کر جانے کے لیے تیار ہوئی تو معید رضا نے پکار لیا۔

"میرب انتظار تو میں نے بھی تمہارا بہت کیا ہے' کیا اب بھی تم مجھے سرخ گلابوں کی روش میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دو گی' اگر تم کہو تو میں شام کو دا جی سے ملنے آجاؤں۔" لہجے میں وہی حسرت' التجا اور محبت تھی اور اب کی بار وہ انہیں خالی ہاتھ لوٹانا نہیں چاہتی تھی کہ ان کے بغیر اس کے پاس بھی تو کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

"معید آپ شام کو دا جی سے ملنے آجائیے گا' میں آپ کا انتظار کروں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے اتنا کہہ کر باہر نکل گئی اور معید رضا کو لگا آج محبت کے دن ان کی محبت اور وہ دونوں سرخرو ہوگئے ہیں اور آنے والا وقت بڑا روشن اور خوب صورت ہوگا۔

☼ ☼

شہزادی عباس

"میں تے میرا دلبر جانی... اوہو..." میٹھی مسکان لبوں پر سجائے دھیرے دھیرے گنگناتے ہوئے وہ مسلسل پنڈولم کی طرح دائیں سے بائیں جھول رہی تھی۔ جھومتے جھومتے پنڈولم لحظہ بھر کو رکا اور دماغ کی کیسٹ فارورڈ کرتے ہوئے پھر چلنے لگی۔

"پیارے پیارے... تھارے بنا لاگے ناہیں مارا جیارے۔" اچانک ہی ٹون بدلی تھی' ایک ہی جست میں نور جہاں سے نصرت فتح علی خان تک چھلانگ لگائی گئی مگر عالم مدہوشی میں چنداں فرق نہ آیا تھا بلکہ اب تو سرور کی شدت سے جھولنے کے ساتھ ساتھ سر کو کبھی دائیں جانب پھینکتی کبھی بائیں جانب' بند آنکھیں بیچ بیچ میں کھلتیں تو گمان ہوتا گویا درجنوں "بوتلیں" چڑھا کے بیٹھی ہو۔

عالم استغراق اس پر کسی اور ہی دنیا کے در وا کیے ہوئے تھا۔ گھر کے صحن کے بیچوں بیچ بچھے تخت پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھے آنکھیں موندے وہ پرستان کی حسین دنیا میں محو سفر تھی۔ دونوں ہاتھ اطراف میں جمائے وہ ارد گرد سے بے گانہ طلسماتی تخت پر پرواز کر رہی تھی۔

مختصر سے صحن کے سامنے والی دیوار اب غائب ہو چکی تھی۔ صرف دیوار ہی نہیں بلکہ سامنے والی خالہ رشیدہ کے ڈبل اسٹوری گھر کا بڑا سا سیاہ و سفید روغن والا گیٹ' ماربل لگی دیواریں' کھڑکیاں دریچے' آس پڑوس کے بڑے بڑے دو تین منزلہ مکانات یوں چوپٹ ہو چکے تھے جیسے ایل ڈی اے والوں نے بلڈوزر پھیر کر زمین برابر کر دی ہو یا نائی نے سر پر تیز دھار استرا پھیر کے "ملکیت" کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس تاحد نگاہ پھیلے میدان میں سبزہ اپنی چھب دکھلانے لگا' رنگا رنگ پھول اگ آئے' شبنم کی اوس سے بھیگی بھیگی مسحور کن فضا جگہ کو مزید حسین بنا رہی تھی۔ ادھر سے ادھر اڑتی رنگ برنگ چڑیوں کی چہچہاہٹ اور کوئلوں کی کوک نے ماحول کو مزید رومان پرور کر ڈالا' ہوا کی سرمستی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور اس کی دائیں بائیں جھولتی شدت میں بھی...

نیچے بہتی ٹھنڈی آبشار میں پاؤں لٹکائے وہ ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھی مدھر مسکان کے ساتھ من پسند گیت گنگنانے میں محو تھی...

کوئل کی کوک کسی "بیک گراؤنڈ میوزک" کا سا تاثر دے رہی تھی۔ اطراف میں پھیلے ست رنگی پھولوں میں سے کچھ توڑ کر جھولی میں بھرے بیٹھی ان میں انگلیاں چلا رہی تھی۔

"دھک... دھک... دھک... ماراجی گھبرا وے۔" گانے کا اگلا حصہ بڑے جذب سے گایا گیا۔ "سن رے بانسریا..." تان ذرا لمبی ہوئی۔

"منی..."

"یہ کوئل کی کوک میں چنگھاڑ کہاں سے آ گئی؟" بڑے ہی تعجب سے سوچتے ہوئے بند آنکھوں کو پورا زور لگا کر تھوڑا سا کھول کے چنگھاڑ کا ماخذ دریافت کرنے کی کوشش کی۔

"اوہ تیری خیر..." پنڈولم جہاں کا تہاں رہ گیا۔ بیرونی دروازے سے گھر میں داخل ہوتی اماں کے جارحانہ تیوروں نے پل میں پرستان کو ہوا کر ڈالا تھا۔

جھٹکے سے نیلے یعنی تخت سے اٹھی اور گود میں دھری دال سے بھری ٹرے زمین پر آ رہی جس میں دال چن کر انگلیاں چلائی جا رہی تھیں وہ دال چننے کے لیے اماں اسے تھما کر پڑوس تک گئی تھیں۔

صحن میں ہی رکھی مشین میں پانی بھرنے کے لیے جو پائپ لگا کر وہ بیٹھی تھی اس نے مشین سمیت پورے صحن کو ڈبو دیا تھا اور چنے کی دال اب اس پانی میں غوطے کھاتی دکھائی دے رہی تھی۔ جس میں پاؤں ڈبوئے آبشار تصور کیے کسی "نادیدہ محبوب" کا راگ الاپنے میں مگن تھی۔

کچھ بعید نہ تھا کہ قریب پہنچتے ہی اماں کی جوتی ہوتی اور اس کا سر مگر وہ محض ایک خونخوار نظر اس پر ڈال کر نل بند کرنے چل پڑیں پھر اوندھی پڑی ٹرے اٹھا کر ڈبکیاں کھاتی دال کو افسوس سے دیکھتے ہوئے سر ہلاتی کچن میں چلی گئیں۔ ٹرے رکھ کر واپس پلٹیں۔ بھرپور قسم کی عزت افزائی شروع ہوا چاہتی تھی۔

"تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے کیا منی۔۔۔؟؟" پھٹکار کا آغاز ہوا۔

"لیکن اماں گھاس تو گدھا کھاتا ہے۔" اس پریشان کن صورتحال میں بھی اس کی زبان پر کھجلی ہوئی۔

"ہاں تو گدھے میں اور تجھ میں فرق تھوڑی ہے۔۔۔ لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی ہے مگر تیرا یہ بچپنا جانے کا نام ہی نہیں لے رہا' تیری عمر میں بیٹیاں پورا گھر سنبھالتی ہیں' سمجھ داری' سگھڑاپے میں لوہا منواتی ہیں مگر تیری ان حرکتوں سے میں تو تنگ آگئی ہوں۔۔۔" وہ سانس لینے کو رکیں۔

"ہک ہا۔۔۔ ایک ہی اولاد دی رب نے وہ بھی ایسی عقل سے پیدل۔" ٹھنڈی آہ بھر کے وہ واپس کچن میں چلی گئیں۔

اس کا منہ پھول گیا آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر گئے اور وہ پانی میں پیر پٹخ کے چھپ چھپ کرتی کمرے میں جا گھسی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی' اب ناراضی کا یہ پروگرام شام کو ابا کی آمد تک چلتا۔ اپنی غلطی کا احساس کرنے کی بجائے ڈانٹ ڈپٹ پر ٹھنک کے سر منہ لپیٹ کے پڑ جانا اس نے اپنی عادت بنالی تھی لیکن ماں باپ کی جان بھی اسی میں تھی۔ لاابالی' نٹ کھٹ سی اور کچھ حد سے زیادہ تصوراتی دنیا کی باسی دلاری بٹیا ان کے گھر کی رونق تھی۔

بہت چھوٹی عمر میں جب اس نے چیزوں کو سمجھنا شروع کیا تو اسے قدرتی مناظر اپنی جانب کھینچنے لگے۔ وہ ہر شام ابا کے ساتھ نزدیکی پارک جانے کی ضد کرتی وہاں ابا اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے رہتے اور منتہیٰ پورے پارک میں بھاگتی دوڑتی رہتی' اپنی خم دار پلکوں والی گہری سنہری سی آنکھوں سے پھولوں پر بیٹھی تتلیوں کے خوبصورت رنگوں والے پروں کو تعجب سے دیکھتی' کبھی پکڑنے کی کوشش میں ان کا تعاقب کرتی۔

یہ کھیل اسے بڑے مزے کا لگتا' اسے کبھی ہم عمر دوست کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ کسی ہرے بھرے پیڑ پودے کے پاس کھڑے ہو کر اسے چھوتی یا اوس میں بھیگے پتوں کو ہوا سے ہلتا دیکھتی تو عجیب سی مسرت اس کے دل میں بھر جاتی۔

وہ گھومنے پھرنے کی شیدائی تھی' جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی یہ شوق اور بھی جڑ پکڑتا گیا۔ مگر حالات نے پلٹا کھایا تو انہیں وہ بڑا گھر چھوڑ کر دوسرے علاقے میں قدرے چھوٹا گھر لینا پڑا۔ گھر کی تبدیلی کے ساتھ ہی وہ پارک بھی چھن گیا اور ذرا دیر کی وہ تفریح بھی۔۔۔

کچھ عرصہ تو منی بے حد اداس رہی مگر پھر یوں ہوا کہ وہ پرانے دنوں کو یاد کرتے کرتے اس کے تصور میں گم ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ اس کا تخیل اتنا مضبوط ہو گیا کہ وہ اس چھوٹے سے گھر کے صحن میں ہی پارک بنا لیتی۔

پھر دیواروں کی حد بندیاں نہ رہتیں بلکہ صحن یکدم بہت کشادہ ہو جاتا' دور دور تک ہریالی چھب دکھلانے لگتی پھولوں کی بھینی خوشبوئیں سانس میں اترنے لگتیں' ہوائیں رقص کرتیں اور وہ جھومے جاتی۔۔۔

شروع شروع میں اماں اس کے یوں گم سم ہو جانے پر پریشان ہوا کرتیں' پھر جز بز اور اب اکتا گئی تھیں۔ لیکن منی کے پاس اس کا بھی جواب ہوتا۔

"دیکھیں اماں' جیسے ہر انسان کے اپنے اپنے شوق و مشغلے اور دلچسپیاں ہوتی ہیں ویسے ہی میری بھی یہ ہے کہ میں گھر بیٹھے بیٹھے پوری دنیا گھوم لیتی ہوں بلکہ کبھی کبھی تو دنیا سے باہر پرستان اور کبھی چاند پر بھی چلی جاتی ہوں۔۔۔ وہ بھی بنا ٹکٹ کے۔۔۔" وہ ہنستے ہنستے اماں کو اپنی رنگین دلچسپی سے آگاہ کرتی تو وہ اس کی عقل پر ماتم کرتی رہ جاتیں جبکہ ابا اس کے سر پر چپت لگا کر ہنسنے لگتے۔ وہ جانتے تھے ان کی بیٹی بہت معصوم ہے دنیا کی تلخ حقیقتوں سے کبھی اس کا واسطہ نہیں پڑا۔ وہ منی کی کھلکھلاہٹوں اور عجب مضحکہ خیز باتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے مزید استفسار کرتے۔

"ارے ابا! آپ کو بتاؤں' رات کو جب میں پرستان گئی تو وہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں اور رنگ برنگ پریاں اڑتی پھر رہی تھیں' کوئی تقریب تھی شاید۔" ابا زوردار قہقہہ لگاتے اور منی "دکھی کھی" کرتی کن انکھیوں سے اماں کو جز بز





ہوتے دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھتی۔

"اور پتا ہے ابا' وہاں ایک نیلے رنگ کا جھرنا بھی بہتا ہے اس میں سات رنگوں والی مچھلیاں بھی ہیں۔"

اماں کی برداشت کا پیمانہ چھلک پڑتا اور وہ باپ بیٹی کی بے تکی بے سروپا باتوں پر چڑ کر اٹھ جاتیں اور دونوں کا مشترکہ قہقہہ دور تک ان کا پیچھا کرتا۔

٭ ٭ ٭

تعلیم پوری کرنے کے بعد اماں نے اسے امور خانہ داری میں طاق کرنے کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگا دیا بقول ان کے صحیح عمر میں لڑکی کی شادی نہ ہو تو وہ نفسیاتی مریضہ بن جاتی ہے' اس لیے منتہیٰ کو ٹھیک بلکہ قبل از وقت ہی اپنے گھر کا کرنے میں ہلکان رہتی تھیں لیکن نیا پار تو اس وقت لگے جب منی بیگم نامعقولیت کو چھوڑتے ہوئے پورے حواسوں میں رہ کر "حقیقی دنیا" کو دیکھنے اور سمجھنے کی سعی کریں۔

بہرکیف اماں کی محنت کہیں کہیں رنگ لانے لگی تھی۔ کہ گھر کی صفائی ستھرائی وہ بڑی دلجمعی سے انجام دیتی بس کھانا بنانے سے اس کی جان جاتی تھی اور اگر کوئی اس کی تصوراتی دنیا میں مخل ہونے کی جسارت کرتا تو اس کا پارہ ساتویں آسمان کو چھونے میں لمحے بھر کی تاخیر بھی نہ کرتا تھا۔

وہ پورے گھر کی رگڑ رگڑ کے صفائی کرنے کے بعد صحن میں لگے جھولے پر آ کر فرصت سے بیٹھی تھی۔ جھولے کی زنجیر کو ہاتھ سے تھام کر اس پہ سر ٹکائے آنکھیں موندے وہ خوش رنگ' دلفریب نگری کی سیر کو نکل چکی تھی۔

ٹھٹھرتے دنوں میں سرما کی نرم گرم دھوپ جسم کو تراوٹ بخش رہی تھی۔۔۔ سرسبز وادی کے بیچ جھولے پر بیٹھے وہ سکون سے تقریباً "نیند کے سمندر میں اترنے ہی والی تھی جب اماں کی آواز نے ہمیشہ کی طرح اس کے تخیل کے بلبلے کو بے رحمی سے پتھر مار کے پھوڑا تھا۔

"منی دیکھ تو کون آیا ہے؟" اماں نے بڑے ڈرامائی انداز میں اسے نووارد کی جانب متوجہ کرنا چاہا۔

جھولتے جھولے کو یک لخت روک کر اس نے دنیا جہاں کی بے زاری کے ساتھ سامنے دیکھا۔ شکل قطعی اجنبی تھی۔

"بیٹی یہ تمہارے فرید تایا کا چھوٹا بیٹا ہے حنان' فیصل آباد سے آیا ہے ادھر اس کی نوکری لگ گئی ہے نا۔ ماشاءاللہ۔" اماں نے تفصیلی تعارف کے ساتھ ہی اس کی بلائیں لے ڈالی تھیں۔ جو سفری بیگ کندھے پر لٹکائے نہایت حیرت سے اٹھ جانے والی گلابی آنکھوں والی "منی" کو جماہیوں پہ جماہیاں روکتے دیکھ رہا تھا۔

"سلام۔" زوردار جماہی کو روکتے ہوئے اسی ہاتھ سے اشارے کے ساتھ سلام کر کے جواب سننے کا تکلف کیے بغیر اٹھ کر اندر چلی گئی۔

"آؤ بیٹا اندر بیٹھو۔۔۔ سفر سے تھک گئے ہو گے میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتی ہوں۔" قدرے شرمندہ سی چچی اماں اسے لے کر برآمدے میں چلی گئیں جو ٹی وی لاؤنج کا کام بھی دیتا تھا۔

فرید نیاز اور معین نیاز دو ہی بھائی تھے' بہن کوئی تھی نہیں' کچھ سال قبل فرید نیاز کے کپڑے کا کاروبار چل پڑا تو وہ اپنے تین بچوں سرمد' نائمہ اور حنان کے ساتھ فیصل آباد منتقل ہو گئے۔ اس عرصے کے دوران زبیدہ تائی اور فرید بارہا لاہور آچکے تھے مگر بچے پڑھائی میں مصروف ہونے کی وجہ سے مشکل ہی ساتھ آتے۔

سرمد اور نائمہ کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ زبیدہ تائی بہت مہربان خاتون تھیں۔ اور منتہیٰ کو اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتی تھیں۔

حنان نے ایم بی اے کیا تو لاہور کی ایک اچھی کمپنی میں جاب مل گئی' اور اسی سلسلے میں اس کی آمد کے حوالے سے تذکرہ بہت دن سے ہو رہا تھا۔ جب تک بندوبست نہ ہو جاتا اسے وہیں رہنا تھا۔ کل تین کمروں پر مشتمل گھر میں ایک اماں ابا اور دوسرا منی کے تصرف میں تھا۔ تیسرا کمرہ بطور ڈرائنگ روم استعمال ہوتا تھا۔ جو اب حنان کے لیے وقف ہو چکا تھا۔ کھانا پکنے سے لے کر کپڑے دھونے' استری کرنے' سلیقے اور

نفاست سے کھانا چننے میں، چائے وغیرہ میں حنان کی پسند ناپسند کا خیال رکھا جاتا، اس قدر وی آئی پی پروٹوکول پر منتہی جزبز تو بہت ہوتی مگر کر کچھ نہ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سوئی گائے! میرے اور چچا ابا کے لیے اسٹرانگ سی چائے بنا کر لے آؤ فٹافٹ۔" کچن میں جھانک کر شان سے آرڈر دیا گیا جیسے یہ بیرا خاص اس کی مدارات کے لیے رکھا ہو منی کی تلملاہٹ میں اضافہ ہو تا گیا۔

"ہونہہ۔" منی منہ پھیر کے کڑھائی سے چپس نکالنے لگی جو موصوف کے بے وقت کی فرمائش پر بن رہے تھے۔ آفس سے آکر پالک گوشت سے سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد بڑے دلار سے ٹھنکتے ہوئے اماں سے کہا گیا۔

"چچی اماں آج فرنچ فرائز کا بڑا دل کر رہا ہے۔"

"میں صدقے اپنے پتر کے۔ منی۔ او منی۔" وہ بوتل کے جن کی مانند حاضر ہونا تو نہیں چاہتی تھی مگر چاروناچار ہونا پڑا۔

"جا منی! حنان کے لیے وہ آلو کے قتلے تل کر لا۔" اماں نے فرنچ فرائز کا اپنی آسان ترین زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ حنان دانت نکوسے اس کی تلملاہٹ کو دیکھے گیا۔

منی کا دل تو بہت کیا اس ڈھٹائی پہ دو تین سنا دے اور سالم آلو مار کے اس کے چمچماتے سفید خوبصورت دانت توڑ کر رکھ دے۔ مگر نظروں ہی نظروں میں کی گئی اماں کی تنبیہ کو دیکھ کر صبر کے گھونٹ پیتی کچن میں چل پڑی اور آلو کاٹنے پر انگلی پر کٹ بھی لگوا بیٹھی تھی، وہ جیسے تیسے تیار ہوئے اور اب چائے کے آرڈر آگئے۔

وہ حنان کی چالاکیوں کو سمجھ گئی تھی۔ آفس سے آتے ہی اماں ابا کے ڈھیروں کام بھاگ بھاگ کے نبٹاتا پھر ان کے ساتھ بیٹھا لاڈ اٹھواتا رہتا۔ ساری توجہ اپنی جانب مبذول کروا کر وہ منی کو چڑاتا اور اماں تو اس کی ناز برداری ..... کے چکر میں منی کو بھی گھن چکر بنا ڈالتیں۔ علاوہ ازیں وہ منی کے تصوراتی رنگین مشغلے میں بھی ہمہ وقت روڑے اٹکانے کا باعث بنتا۔

"یہ لیں چائے اور فرنچ فرائز۔ ٹھونسیں۔" جملے کا آخری لفظ اتنی آہستگی سے کہا گیا تھا کہ صرف وہی سن سکا تھا اور ہمیشہ کی طرح مسکرا کر جلتی پر تیل چھڑکا۔

چائے پیتے ہوئے ابا اور حنان کوئی حالات حاضرہ کا پروگرام دیکھنے میں محو تھے جس پر وقتاً "فوقتاً" وہ تبصرہ بھی کرتا جاتا۔ منی کاغذ قلم لے کر ان سے کچھ پرے برآمدے میں ہی بیٹھ گئی۔

خاکے لائنیں کھینچتے کھینچتے اس کی ڈرائنگ بہت اچھی ہو گئی تھی مگر آج تو اس میں بھی دل نہ لگ رہا تھا، پوری روٹین ڈسٹرب ہو چکی تھی۔ اس کے خیالوں کی دنیا میں ہر وقت خلل ڈالنے کو حنان آٹپکتا۔ منتہی نے دیوار گیر گھڑی پر تیسری بار نظر ڈالی اور دوسری نظر ٹی وی اسکرین پر چلتے خشک سے مباحثے پر، یہ اس کے فیورٹ ڈرامے کا وقت تھا مگر یہ حنان۔

"اف۔" اس نے بے بسی کی انتہا پر خود کو محسوس کیا۔ جانے کیا شرارت سوجھی اس نے سامنے صوفے پر بیٹھے حنان کی تصویر بنانی شروع کر دی۔ پنسل سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے صوفہ، اس پر براجمان وجود اور ہاتھ میں تھامی گئی چائے کی پیالی بنانے کے بعد مزید نوک پلک سنوارنے کے لیے اس نے سر پر دو سینگوں کا اضافہ کر دیا اور اگلے دو دانت باہر نکال دیے۔ تراش خراش قابل دید تھی۔ اپنی اس شاہکار تصویر کشی میں گم وہ دبی دبی سی ہنسی ہنسے جا رہی تھی۔

حنان نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جو بڑے انہماک سے کاغذ پر کچھ بنانے میں مصروف تھی، آنکھوں میں شرارتی رنگ بڑا واضح تھا۔ صفحہ کے ایک جانب ترشول کا اضافہ کیا گیا تھا اور صوفے کے پچھلی جانب بے ہنگم سی لکیریں کھینچ کر آگ کی لپٹوں کا سا تاثر دیا گیا تھا۔

مکمل کرنے کے بعد اس نے صفحہ دور کر کے بہ نظر عمیق جائزہ لیا۔ کچھ مایوسی ہوئی تصویر اتنی جاندار نہ تھی، کارنس پر پڑی رنگوں کی ڈبیا اٹھا لائی۔ حنان کی [illegible] میں "کھنا" رنگ بھر کر تصویر کو رنگین بلکہ [illegible] بنایا۔ آگ کی لپٹوں میں سرخ و زرد رنگ [illegible] میں پکڑی چائے کی پیالی میں تیز سرخ رنگ [illegible] تیر کے نشان کے ساتھ بریکٹ میں "خونی جام" [illegible] حنان کے پاس "ندیدہ جلاد" لکھ دیا۔ "لیبلڈ ڈایا گرام" تیار تھی۔ ابا سونے کے لیے جاچکے تھے۔ [illegible] سے گزر کر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے حنان نے سرسری سا جائزہ لیا۔ اور عجیب و غریب سی ڈرائنگ دیکھ کر جھٹکے سے صفحہ کھینچ کر غور سے دیکھنے لگا۔

اس اچانک حملے پر منی بری طرح سٹپٹائی تھی۔

"اوہ۔" حنان کے منہ سے نکلا۔

تصویر پر سرسری نظر ہی اسے سب سمجھانے کے لیے کافی تھی۔ یہ تو پھر لیبلڈ ڈایا گرام تھی۔ سر پر موجود [illegible] اور لمبے لمبے ڈریکولا نما دانتوں سمیت پاس بنا ترشول اسے ابلیس بنانے کی تمام شرائط پوری کر رہا تھا۔

کچھ لمحے ہونٹ بھینچے وہ تصویر کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک زوردار قہقہے نے درودیوار ہلا ڈالے تھے۔ ایک ہاتھ [illegible] پر دوسرے میں صفحہ پکڑے وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ گھبراہٹ بھول کر منی بھی ان چھت پھاڑ قہقہوں میں شامل ہو چکی تھی۔

---

ابتدا میں منتہی کی حنان سے جو ٹھن گئی تھی اس کی کڑواہٹ رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی۔ حنان عمر میں اس سے پورے پانچ سال بڑا تھا مگر نٹ کھٹ اور شریر اسی کی طرح تھا۔ چنانچہ دونوں کی خوب نبھنے لگی۔ [illegible] کی آمد سے گھر میں رونق سی رہنے لگی تھی ورنہ [illegible] جب خیالی دنیا میں محو پرواز ہوتی تب پورا گھر سائیں سائیں کرتا۔ حنان کے آنے سے منی میں [illegible] تبدیلی آئی تھی کہ اب وہ بیٹھے بیٹھے یوں گم [illegible] ہوتی بلکہ اس کے ساتھ کھیل تماشوں میں مصروف رہتی۔ اماں نے بے ساختہ سکھ کا سانس بھرا [illegible] رات کے کھانے کے بعد دونوں واک کے لیے [illegible] جاتے۔ گلی تو اتنی کشادہ نہ تھی مگر دو تین گلیاں چھوڑ کر کشادہ سڑک تھی۔ جس کے گرد درخت لگے تھے۔ اس پر رات کے وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہوتی۔ کیونکہ لوگ عموماً "بڑی سڑک کو استعمال کرتے تھے۔

ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ سڑک پر آگئے۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ منتہی نے شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا۔ ہلکی ہلکی سرد ہوا چلتی تو اطراف میں سرو قد کھڑے درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ ماحول کے یخ سناٹے کو توڑتی۔

"اے منی۔" حنان نے چپ چاپ سی منی کو پکارا۔

"میرا نام منتہی ہے محترم۔" رعب سے جواب آیا۔

"اوہ اچھا اچھا تو۔ منتہی جی آپ کے مشاغل کیا ہیں؟ دن بھر چارپائی توڑنے کے سوا؟" سوال کا آخری حصہ قدرے شرارت سے کہا گیا۔

"اب تو میں اتنا کام کرتی ہوں، آرام کہاں اپنی قسمت میں۔ مجال ہے جو اماں ذرا بھی ٹک کے بیٹھنے دیں، حنان کے لیے کھانا لے آؤ، چائے بنا دے، میرے پتر کے کپڑے استری کر دے۔" اماں کی اتاری گئی نقل پر حنان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"دیکھو بی بی۔ یہ سگھڑ لڑکیوں کے کام ہوتے ہیں جو بھاگ بھاگ کے کام نبٹاتی ہیں، تمہاری جیسی پھوہڑ کو تو گراں ہی گزریں گے۔" بڑی خطرناک بات کر کے دوسری جانب سے رد عمل نہ آیا تو حنان نے پھر سابقہ موضوع پر چھلانگ لگائی۔

"مشاغل نہیں بتائے تم نے۔"

"خوب سیر کرنا۔ گھومنا پھرنا، نئی نئی جگہیں دیکھنا۔" بڑی مسرت سے جواب آیا۔

"ہیں؟۔ لیکن لڑکی تم تو کہیں بھی نہیں جاتیں۔"

"بتاؤ بھلا۔ سیر کرنے کے لیے بھی کبھی کہیں جانے کی ضرورت پڑتی ہے؟" عجیب سی بات حنان کے سر پر سے "چیں چیں" کرتے گزر گئی۔

منتہی چند قدم آگے بڑھی اور آسمان کی جانب دیکھتے

ہوئے ہولے سے مسکرائی۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر آنکھیں موندیں اور آہستہ آہستہ گول گول گھومنے لگی۔

"یہ برف تھوڑی ہی دیر میں پوری سڑک کو ڈھک دے گی۔" اس کے مسکراتے لبوں سے آہستگی سے فقرہ ادا ہوا تھا۔

"برف؟" حنان نے بڑے تعجب سے آسمان کی جانب دیکھا اور پھر اپنی ہی عقل پر ماتم کیا۔ بھلا لاہور میں برف باری ہو سکتی ہے۔ منتہی نے رک کر آنکھیں کھولیں اور حنان کے متعجب چہرے پر شرارت بھری نظر ڈال کے زور سے ہنس پڑی۔

"سنکی لڑکی... مجھے پریشان ہی کر دیا تھا۔" دونوں ایک بار پھر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کچھ دور چلنے کے بعد پھر ایک سوال کیا گیا۔

"یہ محبت کیا ہوتی ہے حنان؟؟؟"

"محبت...؟" حنان نے اس کے چہرے کو کھوجنے کی کوشش کی مگر وہاں معصومیت اور سادگی کے سوا کچھ نہ تھا۔

"محبت دو دلوں کے' دو روحوں کے ملاپ کا نام ہے... کیا تمہیں کسی سے محبت ہے؟" روڈ لائٹ کی مدھم سی روشنی میں اس نے منتہی کی ٹھہری سنہری رنگ آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں..." بے ساختہ اعتراف پر حنان نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے حنان' اگر دنیا میں چاند نہ ہوتا تو کیا دنیا اتنی ہی حسین ہوتی؟؟" چاند پر اپنی بھوری آنکھیں ٹکائے اس نے پوچھا۔

"شاید نہیں..." جواب آیا۔

"ہاں مجھے بھی ایسا لگتا ہے' اگر زمین پر چاند' سورج' ہریالی' پیڑ پودے' بارش' شبنم' سمندر نہ ہوتے تو دنیا کیسی بے رونق سی ہوتی... بے رنگ پھیکی سی... مجھے ان سب سے محبت ہے۔ مجھے انہیں سوچنا بڑا اچھا لگتا ہے۔" حنان اس کی سادہ سی باتوں پر دھیرے سے مسکرایا۔

چلتے چلتے وہ ایک گھنے سے پیڑ کے پاس رکی۔

"اس درخت پر برف پڑتی جا رہی ہے' تھوڑی ہی دیر میں یہ ہرا بھرا درخت سفید ہو جائے گا' شاخوں پر نکلے ایک ایک پتے سے برف لپٹ جائے گی... یہ محبت ہی ہوئی نا حنان' جس میں اس کا اصل چھپ جاتا ہے اور اس کے محبوب کا رنگ چڑھ جاتا ہے... لیکن یہ محبت تو بڑے قلیل عرصے کی ہوتی ہے' جیسے ہی سورج نکلے گا یہ برف پگھل جائے گی۔ اور درخت سے تنہا کھڑا رہ جائے گا۔" وہ یک ٹک تاریکی میں ڈوبے گھنے پیڑ پر نگاہ جمائے ہوئے تھی' حنان نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر شرارت کی رمق ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہاں گہری سنجیدگی تھی اور کہی جانے والی بات اس سے بھی گہری...

"کیا محبت اتنی ہی ظالم ہوتی ہے حنان... یونہی چھوڑ جاتی ہے؟؟" حنان گنگ سا اسے دیکھے گیا اور سوچے گیا کہ منتہی کے لاشعور میں ایسا خوف کیوں ہے جو اس انداز میں باہر آ رہا ہے۔

"اف لڑکی! کیوں بھتنیوں کی طرح ڈرا رہی ہو' آؤ واپس چلیں..." اس نے ہاتھ پکڑ کے گھسیٹا۔

"محبت بدگمان نہیں ہوتی بھولی لڑکی... اس کے پیڑ پر ہمیشہ بہار رہتی ہے... محبت کا پودا خوش گمانی کے خوشنما پھولوں سے مہکا رہتا ہے۔" حنان نے اس کی پریشان صورت دیکھ کر کہا مگر جانے اس نے سنایا نہیں۔

"میں چچی اماں سے کہتا ہوں اپنی چڑیل کے لیے کوئی جن ڈھونڈ لیں پھر یہ دونوں مل کر راہ گیروں کو ڈرایا کریں گے۔" گہری سنجیدگی مٹانے کی خاطر اس نے مذاق کا سہارا لیا اور کامیاب بھی ہوا تھا۔

"ہاں اور سب سے پہلے ہم آپ کا ہی خون پی جائیں گے۔" وہ ہنسی۔ حنان نے بے ساختہ سکون کا سانس بھرا۔

گلی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے چاند پر الوداعی نظر ڈالی۔ اور کچھ خیال آنے پر بولی۔

"آپ کو پتا ہے حنان... یہ جو چاند ہے نا اس میں



ایک بڑا سا جھولا لگا ہے' جس پر رنگ برنگ پریاں ہر وقت جھولا جھولتی رہتی ہیں۔" بتاتے ہی دونوں ہاتھ پھیلا کر "بڑا سا" کی وضاحت بھی کی گئی۔

"میں اکثر وہاں جاتی ہوں جھولا جھولنے... آپ بھی میرے ساتھ چلو گے؟؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں بھئی۔" حنان کے ہامی بھرنے پر وہ بچوں کی سی مسرت سے کھلکھلا کر ہنسی۔

"پکا؟" ہتھیلی سامنے پھیلائی۔

"بالکل پکا۔" حنان نے اپنا ہاتھ اس کی نرم ہتھیلی پر رکھ دیا وہ ہنستے ہوئے دروازہ پار کر کے گھر میں داخل ہو گئی۔

"پگلی۔" زیر لب کہہ کر اس نے ایک مسکراتی نگاہ چاند پر ڈالی... دل نے بے ساختہ ایسی سادہ و بے ریا لڑکی کی خواہش کی تھی۔ جو محبت سے بدگمانی کی حد تک خوف زدہ تھی۔

☼ ☼ ☼

آج صبح سے ہی اماں کچن میں مصروف تھیں' اکلوتی بیٹی کی سالگرہ جو تھی چنانچہ آج منتہی کی پسند کے کھانے بن رہے تھے۔ ہر سال یہ دن تینوں اہتمام کے ساتھ مناتے تھے۔ اماں اسے کوئی سوٹ سلوا دیتیں تو ابا کوئی کتاب یا پینٹنگ کے مختلف رنگ لا دیتے جس سے وہ اپنی ڈرائنگ کا شوق پورا کرتی' اب کی بار حنان بھی ان کے ساتھ شامل تھا۔ رات کا کھانا بڑا پر تکلف تھا۔ مزے دار بریانی' قورمہ اور منتہی کا من پسند انڈوں کا حلوہ سب نے پیٹ بھر کر کھایا پھر حنان کا لایا گیا کیک کاٹا گیا... دونوں کی ہلکی پھلکی نوک جھوک میں یہ چھوٹا سا اہتمام اختتام پذیر ہوا۔ اماں عشاء پڑھنے اٹھ گئیں تو ابا بھی مسجد چلے گئے۔ منتہی میز پر رکھے برتن سمیٹ کر کچن میں لے جانے لگی تو صوفے پر بیٹھے حنان نے آواز دی۔

"اے لڑکی ادھر آؤ۔"

"ہوں؟؟" اس طرز مخاطب پر منی کی آنکھیں کھل گئیں۔

"اوفوہ... منی جی ادھر آئیں بات سن لیں۔"

"میرا نام منتہی ہے... کیا منی منی کی رٹ لگائے رکھتے ہیں سب اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔"

"جی پتا ہے اب آپ اتنی بڑی ہو گئی ہیں کہ آپ کی شادی کی عمر بھی نکلتی جا رہی ہے۔" حنان نے چھیڑا۔

"ہونہہ..." ناک چڑھا کر منتہی جانے کے لیے مڑی۔

"رکو تو سہی۔" وہ جھٹکے سے اٹھ کر پاس آیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹول کے چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور ہتھیلی پر رکھ کر اس کے سامنے کی۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ... آپ کا برتھ ڈے گفٹ ہے محترمہ۔" منی نے جھٹ سے برتنوں والی ٹرے واپس ٹیبل پر رکھی اور ڈبیا اٹھا کے بے صبری سے کھولی۔ خوبصورت سی انگوٹھی میں سنہری نگینہ چمک رہا تھا۔

"اللہ کتنی پیاری لگ رہی ہے نا۔" فوراً پہن کر اس نے ہاتھ سامنے کیا۔ حنان کی نظریں اس کے چہرے کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔

"ہاں اب پیاری لگ رہی ہے۔" دیکھے بنا ہی وہ جانتا تھا کہ اس کے دودھیا ہاتھ کی مخروطی انگلیوں میں انگوٹھی بہت سج رہی ہو گی۔ خوشی خوشی ٹرے اٹھاتے ہوئے وہ جانے کو مڑی تو حنان نے اس کا بازو تھام لیا۔

"انگوٹھی کا مطلب سمجھتی ہو تم؟ خصوصاً تب جب ایک لڑکا لڑکی کو دیتا ہے؟" شریر لہجے میں وہ بولا۔ منتہی ہونق بنی اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"ایسے مت دیکھو لڑکی ورنہ میں بری طرح تمہارا اسیر ہو جاؤں گا۔" وہ چہکا تو منی نے جلدی سے آنکھیں جھکا لیں۔

"یہ صرف انگوٹھی نہیں ہے... میری خواہش ہے... جو تمہیں بدگمانی سے خوش گمانی کی جانب انگلی پکڑ کر لے جائے گی۔ اس کا بہت خیال رکھنا۔" اس کے لہجے میں کوئی جذبہ بہت شدت سے ہلکورے لے رہا تھا کہ منتہی سے وہاں کھڑے رہنا محال ہو گیا۔ پلکوں کی لرزش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحے اس کے معصوم چہرے کو دیکھنے کے بعد آگے بڑھ گیا۔

ڈولتے اعتماد کو تھامے دھڑ دھڑ کرتے دل کو

سنبھالے وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔

بستر پر گرتے ہی وہ منظر چھم سے اس کے ذہن کے پردے پر روشن ہو گیا۔ بے چین ہو کر اس نے کروٹ بدلی۔

اور سرہانے پر دھرے ہاتھ کی تیسری انگلی میں چمکتے سرخ نگ کو دیکھنے لگی۔

"یہ تمہیں بدگمانی سے خوش گمانی تک انگلی پکڑ کر لے جائے گی۔" اس نے آنکھیں موند لیں۔ اور شفاف دل کے آئینہ پر قطرہ در قطرہ محبت کی اوس کو گرتے محسوس کرتی رہی۔

جانے نیند کی دیوی اس پر کب مہربان ہوئی اگلی صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ حنان اور ابا آفس جا چکے تھے، وہ اماں کے ساتھ مل کر معمول کے کام نبٹانے لگی۔ شام کو آفس سے لوٹتے ہی حنان نے مژدہ سنایا تھا۔

"چچی اماں کمپنی نے میری پوسٹنگ فیصل آباد کے آفس میں ہی کر دی ہے، مجھے آج رات کو ہی نکلنا ہو گا۔" وہ خوشی خوشی بتا رہا تھا۔

"ارے بیٹا اس قدر اچانک کیوں؟؟" اماں پریشان ہوئیں۔

"چچی اماں میں کافی دنوں سے اس کے لیے کوشش کر رہا تھا، اب کب تک یہاں رہوں گا۔"

"غیروں والی بات مت کر حنان، یہ تیرا ہی گھر ہے۔" اماں اداس سی ہو گئیں۔ حنان کی نگاہ منی کے بجھے چہرے پڑ گئی تو خود بھی افسردہ ہو گیا۔

اس نے اماں کے ساتھ مل کر سامان پیک کروایا دیا۔ سب سے مل کر اماں کی دعائیں سمیٹ کر جاتے سمے ایک لمحہ مڑ کر حنان نے اس پگلی کی طرف دیکھا۔ ان نظروں میں تسلی دیتا خوش آئند دنوں کی مسرتیں لیے ایک جگنو تھا جو وہ منتہیٰ کی اداس شہد رنگ آنکھوں کو تھما کے پلٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

دن یکدم سے بہت بے رنگ ہو گئے تھے۔ زندگی اچانک ہی بہت بے مقصد بے کار سی لگنے لگی تھی۔ اب وہ اپنے من پسند مشغلے سے بھی دل نہ بہلا پاتی کہ کچی عمر میں کوئی وجود دھڑلے سے آبسا تھا۔ وہ بچپنا جس میں وہ بات بات پر دل کھول کر قہقہے لگایا کرتی تھی وہ کہیں جا سویا تھا۔ یوں لگا جیسے وہ بچپنے سے چھلانگ لگا کر ادھیڑ عمری میں داخل ہو گئی ہو۔

بیٹھے بیٹھے وہ گم اب بھی ہوتی تھی مگر اب ساتھ میں کسی اور کا سایہ بھی ہوتا تھا۔

"بھلا ایسی فلمی سچویشن ہونے کی تک کیا تھی، اچھی بھلی میں اپنی دنیا میں مگن تھی خوش تھی مگر اس حنان نے آ کر بے وجہ ہی مجھے پریشان کر ڈالا ہے۔" کبھی کبھی بری طرح زچ ہو کر وہ بلبلاتی۔

منہ زور جذبوں نے اس کے دل کی چوکھٹ پر دھڑا دھڑ دستک دے ڈالی تھی۔ در اس نے وا کرنا ہی تھا کہ خود کی بھی منشا یہی تھی۔ اسے اداسیاں بے چینیاں سونپ کر حنان تو ایسا پلٹا تھا کہ ایک بار بھی خبر نہیں لی... نہ کوئی رابطہ نہ کوئی فون، اس کا دل بدگمان ہونے لگا۔

ایسے ہی بے کیف دنوں کی ایک دوپہر میں فیصل آباد سے تائی اماں کا فون آ گیا۔ منتہیٰ نے فون اٹھایا اماں گھر پر نہ تھیں۔ منی نے سلام کر کے خوش دلی سے مہربان سی تائی اماں کی خیریت کے ساتھ ساتھ فردا" فردا" سب کے حال احوال دریافت کیے۔

"ہاں بیٹا سب ٹھیک ہیں... بس سمجھو اپنے آخری فرض سے بھی سبکدوش ہونے کی تیاریوں میں ہوں، حنان کے لیے لڑکی پسند کر لی ہے، اس کے آفس میں ہی کام کرتی ہے رباب، ماشاءاللہ بڑی پیاری بچی ہے۔" تائی اماں کے لہجے میں شفقت سی گھلی ہوئی تھی۔

"رباب۔" اسے اپنا سانس اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔

"اے ہاں ایک دن حنان کے ساتھ ہی آئی تھی، مجھے تو بڑی پسند آئی، سوچ رہی ہوں ان کے گھر باقاعدہ رشتہ دے آؤں جا کر... ایسی موہنی صورت ہے کہ فوزیہ کے بھی دل کو لگی ہے۔" انہوں نے اپنی بہو کا نام لیا۔

منتہیٰ کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔



"لو حنان بھی آ گیا... سلام دعا کر لو، منی ہے۔" ریسیور اسے پکڑا کے اطلاع دی۔

"ہیلو السلام علیکم... ہیلو... منتہیٰ آواز آ رہی ہے۔؟؟" حنان نے دو تین بار پکارا۔

"جی... کیسے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں... تم کیسی ہو کٹ کھنی بلی۔" ہنستے ہوئے سوال آیا۔

"میری خیر ہے... آپ فکر مند نہ ہوں اور رباب کے ساتھ آنے والی زندگی بہت بہت مبارک ہو۔" بہت مشکل سے وہ اپنی بات پوری کر پائی تھی۔ نمی گھلی آواز اتنی دھیمی تھی کہ حنان مشکل سے سن پایا۔

"رباب؟" حنان کے بولنے سے قبل ہی وہ ریسیور رکھ چکی تھی۔ صوفے کی ہتھی پر ہاتھ جمائے وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی جیسے میلوں بھاگ کر آئی ہو۔ دل میں کوئی نوکیلی سی چیز کھب گئی تھی جہاں سے اٹھتا درد بہت تیزی سے پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ کچی عمر کے سہانے خواب ریزہ ریزہ ہوتے نظر آئے۔

"کیا محبت اتنی ظالم ہوتی ہے کہ یوں چھوڑ جائے۔" حنان سے پوچھا گیا اسے اپنا سوال یاد آیا۔

چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ حنان کی مصروفیت کے بہانے اور بے اعتباری نے جہاں بدگمانی کی آندھی کو زور پکڑنے میں معاونت دی تھی وہیں تائی اماں کے منہ سے بات پکی کرنے کی بات ایک آخری جھٹکا ثابت ہوئی تھی۔ بھربھری مٹی کی طرح وہ سسکتا وجود صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ شفاف اجلے من میں پہلا عکس جب اترتا ہے تو سطح سے تہ تک اسی کی روشنی بھر جاتی ہے، اسی کی ٹھنڈک دل کے آئینہ پر جم کر سکون اور خوش رنگ شبیہ بناتی چلی جاتی ہے، اس کے ساتھ ہی ایسے ہی ہوا تھا۔

اوائل مدھر خوابوں کو سینت سینت کر رکھنے والی لڑکی جب انہیں کاجل کی سلائی کی مانند آنکھوں میں بھر لیتی ہے تو ہمہ وقت اس کے قائم و دائم رہنے کے لیے دعا گو رہتی ہے کہ محبت ہو یا کاجل دونوں ہی اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیتے ہیں، اس کی تکمیل کر دیتے ہیں... لیکن اگر من مندر میں بسنے والے شخص کی جانب سے ہلکی سی بھی ٹھیس پہنچے تو انسانی وجود ٹوٹ کر بکھرتا محسوس ہوتا ہے...

محبت میں بدگمانی سے خوش گمانی کا جو سفر اس نے لمحہ لمحہ طے کیا تھا وہ ایک جھٹکے میں واپس اسی جگہ پر جا پہنچی تھی۔

☼ ☼ ☼

فون کٹتے ہی حنان کو پریشانی نے آ گھیرا۔

"رباب" وہ حیرت سے زیر لب بولا۔

کہیں کچھ غلط ہو جانے کا احساس بڑا زور آور تھا۔ اگلے ہی دن آفس سے واپسی پہ وہ سیدھا امی کے پاس پہنچا... ایک گھنٹے بعد وہ مختصرا" سامان کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔

سفری بیگ کندھے پر لٹکائے وہ رات کے ابتدائی پہر دروازے پر کھڑا دستک دے رہا تھا۔ چند ثانیے کے بعد دروازہ کھلا اور توقع کے عین مطابق دروازہ کھولنے والے چچا ابا ہی تھے۔ اچانک حنان کی آمد پر خوشی سے ان کا چہرہ جگمگانے لگا۔

"ارے میرا بیٹا آیا ہے۔" سینے سے لگا کر ماتھا چوما۔

"بس چچا ابا مصروفیت ہی اتنی بڑھ گئی تھی کہ میں آ نہ سکا، جیسے ہی فراغت ملی میں فورا" چلا آیا۔" صحن سے گزرتے ہوئے وہ کمرے میں چلے آئے۔

"ارے بھلیے لوکے اٹھ کے دیکھ تو کون آیا ہے؟"

"نہیں چچا انہیں مت جگائیں، میں صبح مل لوں گا۔"

"اچھا پتر کھانا تو گرم کروا دوں تیرے لیے، رک میں منی کو اٹھاتا ہوں۔"

"دوست بھی ساتھ ہی لاہور آیا تھا تو ہم کھانا کھا کر ہی آئے ہیں، آپ فکر مت کریں، آرام سے لیٹیں، میں سامان کمرے میں رکھ دوں۔" حنان بیگ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں ہاں بیٹا تو آرام کر، سفر سے تھک گیا ہو گا۔"

حنان نے ڈرائنگ روم میں آ کر بیگ تپائی پر رکھا اور دیوار کے ساتھ بچھے پلنگ کے نرم گرم بستر میں دبکنے کی خواہش سر ابھارنے لگی، مگر پھر دشمن جان کا خیال آیا۔

"جس کے لیے بھاگا بھاگا آیا ہوں اسے تو ایک نظر دیکھ لوں۔" ڈرائنگ روم سے نکل کر کچن سے ملحقہ منتہی کے کمرے میں جھانکا، مگر کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ وہ برآمدے سے ہوتا ہوا صحن میں آگیا۔ نظر صحن سے اوپر جاتی سیڑھیوں پر تھی، وہ بے اختیاری میں قدم دھرتا اوپر چلا گیا۔

چھت پر بچھی چارپائی پر وہ بیٹھی تھی، اس کی پشت سیڑھیوں کی جانب تھی۔ اتنی ٹھنڈ میں اسے بیٹھے دیکھ کر حنان کی روح تک کپکپا اٹھی۔

گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ٹھوڑی ٹکائے وہ کچھ گنگنا رہی تھی۔

تجھ سے ناراض نہیں زندگی حیران ہوں میں
تیرے معصوم سوالوں سے پریشان ہوں میں

وہ دبے قدموں چلتا ہوا اس کے پاس آگیا۔

"جینے کے لیے سوچا ہی نہیں، درد سنبھالنے ہوں گے۔" کپکپاتی ہوئی بھیگی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی، جس میں نمی سی گھلی تھی۔

"مسکراؤں تو مسکرانے کے قرض اتارنے ہوں گے۔" سیاہ ملبوس میں ہم رنگ شال شانوں پر لپیٹے وہ کسی برف کی سل کی مانند منجمد تھی۔

"مسکراؤں کبھی تو لگتا ہے....." آنسوؤں کا گولہ اس کے گلے میں اٹک گیا تھا اور رندھے ہوئے گلے نے باقی الفاظ نگل لیے تھے۔

بند آنکھوں کے پیچھے اس کا تخیل اسے پرستان میں موجود نیلے جھرنے کے کنارے بٹھائے ہوئے تھا، جس میں سات رنگ کی مچھلیاں اچھل کر کبھی سطح پر آتیں، کبھی تہ میں چلی جاتیں۔ پانی اس قدر شفاف تھا کہ وہ با آسانی ان رنگین مچھلیوں کی نقل و حرکت دیکھ سکتی تھی۔ مگر اسے اب ان میں بھی کوئی دلچسپی دکھائی نہ دیتی تھی۔ ہاں مگر وہ مچھلیاں اس کے جذبات کی رازداں تھیں، کسی پکی سہیلی کی طرح۔

منتہی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کوئی اس کے پاس کھڑا ایک ٹک اسے دیکھ رہا ہے۔

گھٹنے پر دھری ٹھوڑی کے نیچے رکھے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں حنان کی دی ہوئی انگوٹھی چاندنی رات میں جگمگا رہی تھی۔

سفید روئی کے سے گالوں پر سجی دو بڑی بڑی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ڈھلک کر اس کی گال پر بہہ رہے تھے۔ چودھویں رات کی روشنی میں وہ اس کے کرب کو با آسانی دیکھ سکتا تھا، اس کے دل کو کچھ ہوا۔

محض ایک غلط فہمی کی بنا پر وہ اس ننھی لڑکی کے شفاف دل کو ٹھیس پہنچانے کا موجب بنا تھا۔ وہ اس کے سامنے نیچے زمین پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے بھیگے چہرے پر نظر جمائے وہ دھیرے سے گویا ہوا۔

تمہاری انگشتری کے نگ میں
میری محبت چمک رہی ہے
اگر کبھی یہ گمان بھی گزرے
کہ میں تمہیں بھولنے لگا ہوں
تو اس نگینے کو دیکھ لینا
میری نگاہوں کی جگمگاہٹ
تمہاری آنکھوں سے یہ کہے گی
سنو محبت تو خوش گمان ہے

اس آواز کو منتہی نے اپنے تخیل میں سنا تھا، اب بھی وہ اسے اپنا وہم ہی لگا۔ ہاں مگر دل میں اٹھتے درد میں اضافہ ہو چلا تھا۔ حنان حسرت بن کر اس کے دل میں پلنے لگا۔

اگر کوئی بغض دل کا مارا
نظر سے ٹوٹا ہوا ستارا
تمہارے سینے میں وسوسوں کے
کسیلے خنجر اتارتا ہو
کہ وہ جو دل پھینک و بے وفا ہے
کہ وہ جو سب پر فریفتہ ہے
کہ وہ جو پردیس جا بسا ہے
تمہیں بھنور بیچ چھوڑ دے گا
وفا کے سب قول توڑ دے گا

منتہی کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر روانی سے ہاتھ پر گرنے لگے، حنان نے نظم جاری رکھی۔



تو اس سے پہلے کہ رو پڑو تم
تو اس سے پہلے کہ جل بجھو تم
تو اس سے پہلے کہ یہ کہو تم
وہ عہد و پیمان سب غلط تھے
وفا کے عنوان سب غلط تھے
سحر کے امکان سب غلط تھے
تم اپنی انگشت دلربا پر
گلاب چہرہ جھکا کے کہنا
سنو وہ سچ مچ ہی بے وفا ہے؟

اس بھولی سی لڑکی کو دی گئی اذیت پر حنان نے اپنا دل کسی مٹھی میں جکڑا محسوس کیا۔ آنکھوں کی سطح ہلکی سی نم ہو گئی۔ یک لحظہ رک کر مسکراتے ہوئے اس نے نظم کا آخری حصہ پڑھا۔

تمہارا روتا سوال سن کر
یہ شوخ نگ مسکرا پڑے گا
محبتوں کے سفیر بن کے
یہ سرخ نگ اور حسین انگوٹھی
میری نمائندگی کریں گے
تمہارے چہرے سے چھیڑ کرتے
تمہاری آنکھوں کے رنگ پڑھتے
تمہارے بالوں پہ ہاتھ رکھ کے
تمہارے گالوں کو تھپتھپا کے
حسین انگشتری کہے گی
سنو محبت تو خوش گماں ہے

حنان کے چپ ہوتے ہی گہرا سکوت چھا گیا
اسے منتہی کے ہونٹوں پر بھیگی مسکراہٹ کی اک لکیر کا گمان ہوا، آنکھیں مستقل بند تھیں۔ آہستگی سے اس نے اپنا ہاتھ اس کے یخ ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا۔ ایک جھٹکے سے آنکھیں کھلی تھیں۔ الوژن حقیقت میں ڈھل گیا تھا۔ محبت مجسم صورت میں اس کے سامنے تھی۔ منتہی گنگ سی اس کی صورت تکنے لگی، جیسے یہ اس کی نظروں کا دھوکہ ہو۔ لاتعداد سوال تھے۔ بے شمار شکوے تھے، مگر لفظ تو جانے کہاں کھو گئے تھے۔ حنان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گالوں پر پھسلتے آنسو پونچھ دیے۔

"ایسے تھوڑی روتے ہیں پگلی۔ امی کو غلط فہمی ہو گئی تھی یار..... پھر جب میں نے تمہارا بتایا تو وہ بہت خوش ہو گئیں وہ کل آ رہے ہیں امی ابو۔ اس اچھی پر تھوڑی پاگل لڑکی کو میرے لیے مانگنے۔" ایک جملے نے اس کی ساری اذیت مٹا دی تھی۔ بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"اور وہ رباب؟" گلے میں لفظ پھر اٹکا۔

"ہاہاہا..... اس کو ہم مل کر پرستان کی پچھلی طرف موجود کھائی میں دھکا دے دیں گے۔" منتہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بچوں کی سی معصوم ہنسی یک دم لوٹ آئی تھی۔ حنان نے بغور اس کے دمکتے چہرے کو دیکھا۔

"اچھا تو تمہیں یہ ندیدہ جلاد زندگی بھر کے لیے قبول ہے؟" بھرپور شرارت سے پوچھا گیا۔ بنا کوئی لفظ کہے بڑی زور، زور سے سر اثبات میں ہلا کر اقرار کیا گیا تھا۔ شرم و حیا سے وہ قطعی ناواقف تھی۔ اس کے بچکانہ انداز پر حنان کو ہنسی آگئی۔

"پھر یوں کرتے ہیں کہ شادی کے بعد ہنی مون چاند پر ہی منانے چلتے ہیں اور جھول جھول کر وہ بڑا سا جھولا توڑ کر آتے ہیں۔" حنان نے "بڑا سا" کے لیے منتہی ہی کی طرح ہاتھ پھیلاتے ہوئے نقل اتاری۔

اور منتہی نے گلنار چہرے کے ساتھ آسمان پر نگاہ ڈالی۔ نئے سال کا پہلا چودھویں کا چاند دونوں کے ملن پر مسکراتا ہوا روشنی بکھیر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اب سے خوابوں کی نگری میں کھونے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ خواب حقیقت ہو گئے تھے۔ اس کا تصور مجسم صورت میں سامنے تھا۔ نیلے جھرنے کی ست رنگی مچھلیاں خوشی سے ناچتی سطح پر آتیں، کبھی اچھل کر واپس پانی میں چلی جاتیں۔ کائنات کی ہر شے اس سادہ بے ریا لڑکی کی خوشیوں میں باہم رقصاں تھی۔ جس کا اس بات پر ایمان ہو چلا تھا کہ محبت واقعی خوش گمان ہے۔

☼ ☼

آسیہ اکبر

"اے خدا کس گناہ کے بدلے یہ سانولی میرے گھر پیدا ہوگئی۔" اماں ہاتھ سر پر رکھے کامران کو سانولی کی کارگزاریاں بتائے جارہی تھیں' ساتھ ساتھ سامنے پودوں کی کیاری کو صاف کرتے سانولی کو گھورے بھی جارہی تھیں۔

کامران ہنسی دبائے ایسے فرماں بردار بنا بیٹھا تھا جیسے خالہ کے دکھ کو دل و جان سے محسوس کررہا ہو۔ سانولی نے زور سے کھرپی کیاری میں پھینکی' ہاتھ کمر پر جمائے ناک کی سیدھ میں چلتے ہوئے اماں کے پاس آئی اور آہستہ سے جھک کر فرماں برداری سے پوچھا۔

"اماں جی ایک گھنٹہ مسلسل بولنے سے آپ کا سر تو یقیناً" دکھ رہا ہوگا" آپ کے لیے چائے بنا لاؤں؟" کامران کے لیے اس کے اس جارحانہ و معصومانہ انداز پر ہنسی کو روکنا ناممکن ہوگیا۔

"ہاں جاؤ اور کامی بیٹے کے لیے بھی بنالو بے چارہ کب سے میری سنے جارہا ہے۔" اماں کا لہجہ ایک دم مٹھاس بھرا ہوگیا۔ سانولی دو انگلیوں سے وکٹری کا نشان کامران کو دکھاتے ہوئے کچن میں گھس گئی۔

یہ گھرانہ سانولی کے والد صاحب عرفان نجمی کا ہے جو ریلوے میں اعلا عہدے پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ چار عدد بیٹیوں کے باپ بھی ہیں۔ بڑی بیٹی زارا جو ایم ایس سی کے بعد دو سالوں سے مقامی کالج میں لیکچرار کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہے۔ اس سے چھوٹی ندا جو میڈیکل کے چوتھے سال میں ہے۔ تیسرے نمبر پر فضا صاحبہ جو باقی بہنوں کی نسبت سانولی رنگت ہونے کی وجہ سے سانولی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ بی اے کی انگلش میں دوبار کمپارٹ آنے کے باوجود بھی گھر والوں نے ہمت نہیں ہاری اور تیسری بار بھی داخلہ فیس جمع کروادی' حالانکہ سانولی نے بہت جدوجہد کی کہ اس کا نقطہ نظر سمجھا جائے کہ بچوں کو ہمیشہ وہ کرنے دیا جائے جو وہ چاہتے ہیں۔ مگر نجمی صاحب اس کی ہر دلیل ماننے کو تیار نہیں' کیونکہ انہیں سانولی کے شوق کا بخوبی علم ہے۔ یہ ہی کہ مہینے بھر میں چھپنے والے تمام خواتین کے رسالے و میگزین پڑھنا ہندی فلمیں دیکھنا اور تمام چینلز کے ڈرامے ذوق و شوق سے نا صرف دیکھنا بلکہ رسالوں میں بیان کی گئی ہیروئن کے انداز و اطوار بمعہ گیٹ اپ کے بدلتے رہنا بہر حال جو بھی تھا نجمی صاحب کے آشیانہ کی رونق اسی چڑیا کے دم سے تھی اور چوتھے نمبر پر شزا تھی جو آج کل میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں مصروف تھی۔

☼ ☼ ☼

"پلیز زارا آپی بتادو نا کہ لائٹ اور ڈارک پرپل سوٹ پر وائٹ اور ریڈ امبر ائڈری کا کنٹراسٹ کیسا لگے گا۔" سانولی زارا کے پیچھے سوٹ کا ان سلا کپڑا اٹھائے گھوم رہی تھی۔

"سانولی کی بچی تمہیں کیوں سمجھ نہیں آتی کہ یہ سوٹ بنانے کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے خالہ صغری (محلے بھر کی خالہ جو لنڈے کے کپڑے بیچتی ہیں) سے اس طرح کی ورائٹی ضرور مل جائے گی۔ سانولی تم غور تو کرو یہ کنٹراسٹ کتنا احمقانہ لگے گا۔" زارا نے جھنجلاتے ہوئے سانولی کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔



"زارا آپی تم دیکھنا جب یہ سوٹ بنے گا تو کتنا زبردست لگے گا' تم نے زری صاحبہ کی اس بار لکھی ہوئی اسٹوری نہیں پڑھی' جب ان کی کہانی کی ہیروئن اسی طرح سوٹ پہن کر روم سے باہر نکلتی ہے تو مت پوچھیں ہیرو بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔" سانولی نے آنکھیں بند کرکے سوٹ کو اس طرح بھینچتے ہوئے کہا کہ زارا کی ہنسی نکل گئی۔

"اوہ ہو... تو اس گھر میں کامران کے سوا اور آتا ہی کون ہے' ٹھہر جاؤ میں اماں کو بتا کر آتی ہوں کہ آپ کی لائق فائق قابل ہونہار سانولی صاحبہ نے ہیرو ڈھونڈ لیا۔" زارا باہر کی طرف لپکی تو سانولی نے دوڑ کر اس کا دوپٹہ کھینچا۔

"خبردار جو اس عینکو ڈاکٹر کو میرا ہیرو کہا۔ ہیرو میں پائی جانے والی ہزاروں خوبیوں میں سے ایک خوبی جو ہو

اور آج تک میں نے ہزاروں ناول ناولٹ پڑھے چند ایک کے سوا کسی میں بھی ہیرو ڈاکٹر نہیں تھا اور فلموں اور ڈراموں میں بھی ماسوائے راحت کاظمی صاحب جو "دھوپ کنارے" میں ہیرو بنے کسی اور ہیرو نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ ہونہہ کامران بھائی اور وہ بھی میرے ہیرو بو نگے عینکو۔"

☼ ☼ ☼

"زارا کے ابا' میں تو کہتی ہوں بڑی تینوں کی ذمہ داری سے ایک ساتھ سبکدوش ہو جائیں۔ زارا کی بہت فکر تھی کہ خاندان میں اس کی عمر اور معیار کا کوئی لڑکا نظر نہیں آتا تھا' مگر اللہ نے اپنا کرم کیا شہباز کا رشتہ بے شک باہر کا ہے مگر ماشاء اللہ زارا کے لیے بہت مناسب ہے۔

یونیورسٹی میں پروفیسر ہے ہم مزاج بھی لگ رہا تھا۔ ندا کے لیے رضیہ بہن نے حمزہ کے لیے کہا ہے دونوں کا شعبہ بھی ایک اور مزاج تو بہت ملتے ہیں اپنی سانولی کے لیے رضیہ نے کامران کا کہا ہے ماشاء اللہ کامران سنجیدہ طبیعت کا سلجھا ہوا ہے۔" اماں نے مہینے بھر کے راشن کی فہرست بناتے ہوئے نجمی صاحب سے مشورہ لیا۔

"مگر مجھے اپنی سانولی کی بہت فکر ہے ہر وقت ڈرامے' فلم اور کہانیاں اس کے دماغ میں گھسی رہتی ہیں۔"

"ارے بیگم ہماری سانولی ہیرا ہے رضیہ کو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے ایسا قیمتی ہیرا۔" نجمی صاحب نے اخبار کو بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

"ہرگز نہیں میں مر بھی جاؤں تو بھی یہ نہیں ہونے دوں گی۔"

"ہائے سچ کب کے ارادے ہیں مگر پلیز سانولی اپنی پلاننگ ایک ہفتہ پہلے ضرور بتانا آخر ہیروئن کی بہن ہونے کے ناتے مجھے اپنی ڈریسنگ بھی ٹھیک ٹھاک دکھانا ہو گی نا۔" ندا نے سانولی کے زخموں پر نمک چھڑکا۔

"ہاں... ہاں بھلا میری کسی کو کیا پروا مگر میں اپنے لیے آواز ضرور بلند کروں گی' آخر مجھ سے پوچھا تو جاتا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ بھا... بھاں... ں... بھو..." سانولی رونے کے ساتھ ساتھ با آواز بلند تقریر بھی کیے جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ کسی ٹی وی ٹاک شو کی طرح بریک بھی لے رہی تھی اور دوران بریک پیٹ پوجا بھی جا رہی تھی' کیونکہ بقول سانولی کے آج کل کے جدید دور میں کوئی بھی ہیروئن بھوک ہڑتال نہیں کرتی' کیونکہ اس سے چہرے کی دلکشی کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

"پلیز سانولی کسی نااہل ہیروئن کی طرح اوور ری ایکٹ تو مت کرو' اتنے دن بعد کوئی ہمارے گھر بھی فن ہونے والا ہے۔" ندا نے الماری میں کپڑے ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں تمہیں تو فن لگے گا' آخر تمہاری مرضی بھی پوچھی گئی اور حمزہ بھی تمہارے جیسا ہے' تم تو ضرور خوشیاں مناؤ گی نا۔" سانولی نے چہرے کے سامنے آئینہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میری آنکھیں بھی سوج گئی ہیں' مگر مجال ہے جو اس ظالم سماج کے سر پر جوں تک رینگی ہو۔"

"او کے تم بتاؤ کیا تمہیں کوئی اور لڑکا پسند ہے یا کوئی لو شو کا چکر' تو میں ابو کو کہہ دیتی ہوں کہ تم وہاں شادی کرنا چاہتی ہو' مگر تمہارے پاس کوئی انکار کی معقول وجہ بھی نہیں' صرف اس کے کہ کامی بھائی کسی فلمی ہیرو کی طرح رومینٹک نہیں' ویسے ڈائیلاگ نہیں بولتے' شکل سے بہت پڑھاکو ٹائپ لگتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔"

"جی جی تم لوگوں کے لیے یہ کوئی بڑی وجہ نہیں' تمہیں پتا ہے انہیں میری خوب صورت آنکھوں میں ہر وقت یرقان جیسی پیلاہٹ نظر آتی ہے۔ پتا ہے کیا فرما رہے تھے کہ سانولی تمہاری آنکھیں پیلی پیلی سی لگ رہی ہیں' کسی دن تفصیل سے چیک اپ کروں گا' ہوں... اور' اور اماں سے اس دن کہہ رہے تھے کہ خیال کہیں بچپن میں سانولی سیڑھیوں سے تو نہیں گری تھی یا کسی سخت چیز سے تو سر نہیں ٹکرایا تھا' کیونکہ بعض اوقات بچپن میں سر پر لگی چوٹوں کا اثر بیس سال کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔" سانولی کی آنکھوں سے پھر ساون برسات کے آنسوؤں کی جھڑی شروع ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"سانولی' سانولی بیٹا کدھر ہو' دیکھو تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟" ابو نے شاپر میز پر رکھتے ہوئے اپنی چہیتی بیٹی کو ڈھونڈتی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"جی ابو جی کیا لائے ہیں؟" سانولی نے شاپر میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"لال دین کے گرما گرم مزے دار سموسے۔" ابو نے چٹخارے لیتے ہوئے سانولی کے انداز میں نقل اتاری۔

"ابو آپ بھی نا بس۔" سانولی لاڈ سے ان کے ساتھ لگتے ہوئے بولی۔

"بس میری سانولی ہمیشہ خوش رہے' چاہے مجھے فلمی ہیروئن کے باپ کی طرح ساری زندگی ایکٹنگ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔" عرفان صاحب نے آنکھوں کے ساتھ بھنوؤں کو بھی جنبش دی۔

آخر اتنے دنوں بعد سانولی کا احتجاج ختم ہوا تھا' عرفان نجمی صاحب جانتے تھے ان کی لاڈلی بیٹی جب عملی زندگی میں آئے گی تو بچپنا خود بخود ختم ہو جائے گا۔

"تمہاری ماں کدھر ہے' نظر نہیں آ رہی۔"

"ابو وہ درزن کی طرف گئی ہیں' خالہ جی کے کپڑے لینے' ابو آپ بیٹھیے آپ کے لیے گرم چائے لاتی ہوں' پھر مل کر سموسوں کا خاتمہ کریں گے۔" سانولی نے مسکراتے ہوئے کہا اور کچن کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم خالہ جان۔" کامران نے برآمدے میں بچھے تخت پر سبزی بناتی خالہ کو سلام کیا۔

"آؤ آؤ بیٹا خیریت سے ہو' تمہاری ماں کی طبیعت اب کیسی ہے' بلڈ پریشر ٹھیک ہوا کہ نہیں' رات کو بات ہوئی تو بتا رہی تھی کہ تھوڑا سا بڑھا ہوا ہے۔" صفیہ بیگم نے محبت سے بھانجے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بہن کی خیریت پوچھی۔

"جی خالہ جان اب تو ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ خالہ! امی نے بھیجا ہے کہ ان کے کپڑے اگر سل گئے ہیں تو وہ دے دیں' آج میرا ڈے آف تھا تو سوچا لے لوں۔"

"ہاں سل گئے تم اندر جا کر بیٹھو' میں اٹھا لاتی ہوں' ادھر تو گرمی لگ رہی ہے۔" کامران جیسے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا سانولی صاحبہ سلمان خان اور کرینہ کپور کی فلم دیکھنے میں مگن پائی گئی۔

"کامران بھا..." (ابھی عادت نہیں گئی کامران کے ساتھ بھائی ہٹا کر بولنے کی۔)

"آپ ٹھیک ہیں۔" ہکلاہٹ پر فوراً" قابو پایا گیا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک' یہ اپنی سانولی صاحبہ کیا دیکھ رہی ہیں۔" کامران نے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے سامنے ٹی وی کی طرف دیکھا۔ سامنے سلمان خان اور کرینہ کا رومینٹک سین چل رہا تھا۔ نظروں نے آواز کی بھنبھناہٹ کی طرف تعاقب کیا تو پتا چلا کہ سانولی سین دیکھنے کے ساتھ ساتھ دعا میں مصروف و مشغول تھی۔

"اللہ کرے — کرینہ' سلمان کو بتا دے کہ وہ اس سے پیار کرتی ہے' اللہ — پلیز پلیز۔" وہ دعا مانگتے ہوئے کتنی معصوم لگ رہی تھی' شاید آج پہلی بار کامران نے اسے کسی اور نظر سے دیکھا تھا' رشتہ جڑنے کے بعد احساسات ایک دم سے بدلے ہوئے محسوس ہوئے' اس نے پہلے کبھی سانولی رنگت پر سرخ رنگ کے لباس کو اتنا جچتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ کامران کا دل چاہا وہ جو ہل ہل کر دعا مانگنے میں مگن تھی اس کی معصومیت کو دیکھتا رہے' مگر...

"یہ لو بیٹا۔" صفیہ بیگم نے کپڑوں کا بیگ کامران کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"اور اپنی ماں سے کہنا اب مجھ سے روز' روز درزن کے ہاں چکر نہیں لگتے' خود بھی وقت نکال لیا کرے' بس گھر کی ہو کر رہ گئی ہے۔"

"خالہ جان آج میں نے آپ کے ہاتھ سے بنی چائے پینی ہے۔" شاید اس کا دل سانولی کے ساتھ مزید کچھ دیر بیٹھنے کو چاہا یا اس کے انہماک کو توڑنے کا دل نہیں چاہا۔

"کیوں نہیں' میں اپنے بیٹے کو خود بنا کر دیتی ہوں۔" اماں نے جاتے جاتے سانولی کو آنکھوں آنکھوں میں ٹھیک سے بیٹھنے کا اشارہ کیا جو تکیہ گود میں رکھے دونوں ہاتھوں سے ہونٹوں کو دبائے دعا میں مگن تھی۔

"اوہ شٹ یہ کمرشل بریک بھی اب آنا تھا' پتا نہیں آگے کیا ہوگا' پتا نہیں کرینہ اظہار کرے گی بھی یا نہیں۔" اس کی بے چینی عروج پر تھی۔ اسی پل کامران کے سیل فون کی بیل ہوئی' اس نے سانولی کو والیوم کم کرنے کا اشارہ کیا۔

"جی سر' مگر میرا تو ڈے آف تھا' سر رحمان تو آج ڈیوٹی پر موجود تھے۔

کیا زیادہ اسٹاف کی ضرورت ہے' ایمرجنسی ہے' اوکے آئی ایم کمنگ۔" کامران نے کھڑے ہوتے ہوئے خالہ کو آواز دی۔

"خالہ جان مجھے ایمرجنسی میں اسپتال جانا پڑ رہا ہے' ان شاء اللہ چائے پھر کبھی۔"

"ارے بیٹا بس لا رہی ہوں۔"

"نہیں خالہ جان جلدی جانا ہے۔" کامران نے کپڑوں کا بیگ اٹھاتے ہوئے خالہ کے سامنے سر کیا۔ انہوں نے شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے سانولی سے گیٹ بند کرنے کو کہا۔ سانولی جلدی جلدی چپل پاؤں میں اڑستے گیٹ بند کرنے کے لیے کامران کے پیچھے بھاگی "ہائے کہیں سین نہ گزر جائے" کامران دروازہ کھولتے ہوئے اچانک پیچھے کھڑی سانولی کی طرف مڑا' تھوڑا سا جھکتے ہوئے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"مجھے ایس ایم ایس کر کے ضرور بتانا' کرینہ نے اظہار کیا یا نہیں؟" سانولی اس اچانک آفت پر ہڑبڑا اٹھی۔

"اور اب گیٹ یاد سے بند کر دینا۔" کامران نے اس کے ماتھے پر پیار سے انگلی ٹکاتے ہوئے مدھم آواز سے کہا۔

"اف میرے خدا یہ کامران بھی نا۔" وہ گیٹ بند کرتے ہوئے بڑبڑائی' دل کی دھڑکن پہلی بار جو پریکٹیکلی دھڑکی تھی اور اسے اس پاگل دھڑکن کو سنبھالنا اچھا بھی تو لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اتنی پیاری غزل شہباز نے ایس ایم ایس کی ہے۔" زارا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مختلف کاموں میں مصروف تینوں بہنوں کو اطلاع پہنچائی۔

"زارا آپی' شہباز بھائی کتنے کیئرنگ اور رومینٹک ہیں' انہیں فرینڈ شپ ڈے یاد تھا' اس لیے آپ کو وش کیا ہے۔" شزا نے اپنے بیڈ کی چادر درست کرتے ہوئے رائے سے نوازا۔

"زارا آپی تم کتنی خوش قسمت ہو اور ایک کامران جی ہیں۔" سانولی نے کسی اسٹار پلس کی ہیروئن کی طرح جی کا صیغہ لگایا۔

"اس عینکو ڈاکٹر کو بھی کوئی بتا دیتا کہ آج کون سا دن ہے۔"

"سنیے سنیے خواتین ایک ضروری اعلان' حمزہ نے بھی نہ جانے کتنے ڈھیر سارے ایس ایم ایس کر کے وش کیا ہے' میرا سیل فون سائلینٹ پر تھا تو پتا بھی نہیں چلا ابھی دیکھے ہیں۔" ندا نے باتھ روم سے نکلتے ہوئے ایک ہاتھ سے تولیہ سنبھالا ہوا تھا اور دوسرے سے میسیجز پڑھتے ہوئے بتایا۔

"دیکھا شہباز بھائی اور حمزہ کتنے عظیم انسان ہیں' انہیں تم دونوں کا کتنا خیال ہے اور میرے نصیب میں یہ ہی سائنسی پیس لکھا ہوا تھا۔" سانولی کے درد جاگ اٹھے تھے' ندا اور زارا نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور چہروں پر مصنوعی آزردگی لانے کی کوشش کی۔

"جاؤ شزا دوڑ کر ٹھنڈا یخ پانی سانولی کو پلاؤ' کہیں بے ہوش ہی نہ ہو جائے۔" ندا نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے ہمدردی کا اظہار کیا۔

"ندا اور زارا آپی آپ لوگ سن لیجیے ایک دن سانولی آپی کو صبر کا پھل ضرور ملے گا۔" پانی دیتے ہوئے شزا نے اظہار رائے کیا۔

☼ ☼ ☼

"سانولی' سانولی کدھر ہو' تمہارے سیل فون پر میسیج کی ٹون کب سے بجے جا رہی ہے' دیکھ تو لو' شاید کامران ہی کا کوئی میسیج ہو۔" زارا نے نیند میں کسمساتے ہوئے سانولی کو ٹوکا۔

"آگ لگاتی ہوں سیل کو' صبح سے سہ پہر ہو گئی ہر ٹون پر یہ ہی سمجھا کہ شاید ان کا میسیج ہو' مگر بھلا عینکو جی کو کیا پتا ان حسین رومینٹک دنوں اور مواقع کا۔" سانولی کا دل غم و درد میں ڈوبا ہوا تھا' اب مزید حوصلہ نہیں تھا۔

"ان کا' جن کا' کن کا شزا۔" نے سانولی کی نقل اتاری۔

"شٹ اپ چھٹکی' اپنی لمٹ میں رہو' مجھے مزید اریٹیٹ مت کرو۔"

"مجھے تو لگ رہا ہے اس بار اپنی سانولی ضرور بی اے کی انگلش میں ٹاپ کرے گی۔" اس کے تواتر سے بولے گئے انگلش الفاظ پر حملہ ہوا۔ ندا نے حمزہ کے بھیجے گئے پھولوں کے بکے کو سونگھتے ہوئے کہا۔

"ویسے سانولی تمہارے ساتھ واقعی بہت بڑا ظلم ہوا ہے' دیکھو نا کہاں ہماری نازک اندام بہنا جو ہر ہندوانہ انگریزانہ تہوار کو بڑے جوش و خروش سے مناتی ہے اور کہاں وہ صاحب جن کو علم بھی نہیں ان دنوں کا کیوں نہ اس ناانصافی پر لانگ مارچ کرتے ہوئے خالہ جان کے گھر پلہ بول لیں۔"

"ہوں لانگ مارچ۔" سانولی نے خود پر چادر لیتے ہوئے منہ پر تکیہ رکھ دیا۔

یقیناً "اب اپنی قسمت کی ستم ظریفی پر آنسو بہانے کا لمبا پروگرام کیا جائے گا۔

☼ ☼ ☼

"سانولی فٹافٹ میرے ساتھ چلو۔" کامران نے رسالے میں غرق اس کے سر پر بم بلاسٹ کیا۔

"بھلا ان کو کیا ایمرجنسی آن پڑی۔" اس نے سر پر دوپٹہ جماتے ہوئے دل میں سوچا۔

"کدھر جانا ہے اور آپ اتنی جلدی میں کیوں ہیں؟"

"بس سوال جواب کا وقت نہیں' تم میرے ساتھ گھر چل رہی ہو' ایک گھنٹے تک چھوڑ جاؤں گا' امی نے کچھ شاپنگ کی ہے' ندا تو کالج میں ہے' تم چل کر دیکھ لو' ورنہ ساری رات وہ ہم سے نہ خود سوئیں گی' نہ ہمیں سونے دیں گی۔"

"اچھا آپ چلیے میں اماں سے پوچھ کر آتی ہوں۔"

"تم گاڑی میں بیٹھو میں نے خالہ جان سے پوچھ لیا ہے۔ تمہیں چھوڑ کر مجھے اسپتال بھی چکر لگانا ہے۔"

"ہوں اسپتال جانا ہے' اسپتال اور مریض اہم' میرے جذبات کی کوئی پروا نہ قدر' اف اس غیر رومانوی بندے سے پوری زندگی کیسے بورنگ گزرے گی' ہائے گوری' کتنی خوش نصیب ہے جسے شاہ رخ جیسا رومینٹک ہیرو ملا ہے اور اپنی کترینہ بھی کتنی لکی ہو گی اگر سلو سے اس کی شادی ہو گئی۔" اس کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"اف میرے خدا شنزا کی بچی وہ بیج کدھر ہے' جس پر میں نے شاہ رخ خان کے ڈھیر سارے ڈائیلاگ نوٹ کیے تھے۔ ایک نظر تو ڈال لوں۔" کامران جھنجلاہٹ میں ادھر سے ادھر پورے کمرے میں چکرا رہا تھا۔ شنزا بھی چادر' تکیہ' سائیڈ ٹیبل کی دراز سب کو ٹٹول رہی تھی۔

"یہ لیجیے شکر ہے مل گیا' پلیز بھائی آرام سے حوصلے اور اعتماد سے' یہ کوئی میڈیکل کا وائیوا تو نہیں جو آپ اتنا گھبرا رہے ہیں۔"

"ارے شنزا رانی وہ تو بچوں کا کھیل تھا اور یہ کام کے ٹو کے سر کرنے سے بھی زیادہ مشکل کہ سانولی صاحبہ کے سامنے خود کو اس دنیا کا سب سے بڑا رومینٹک ہیرو ثابت کیا جاتا ہے۔"

"کامران جی اوپر ٹیرس والا دروازہ مجھ سے نہیں کھل رہا اور باقی سب گھر والے کدھر ہیں؟" سانولی نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کامران سے پوچھا۔

"تم تو چلو۔" کامران نے بڑے اسٹائل سے دروازہ کھول کر ہاتھ کے اشارے سے اسے اندر چلنے کا کہا۔

"اف.... نہیں' یہ سب کیا ہے۔" سانولی نے ٹیرس کے فرش پر گرل پر لٹکے مختلف رنگوں کے غباروں جن پر مختلف سلوگنز کے ساتھ ساتھ سانولی کا نام جگمگا رہا تھا دیکھا وہ خوشی سے بے ہوش ہوتے ہوئے بچی ایک ہاتھ سے اسے تھامتے اور دوسرے ہاتھ سے سرخ گلاب کا پھول دیتے ہوئے کامران نے سانولی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"سنو.... تم نے کبھی پھولوں کی سرسراہٹ کو سنا ہے نہیں سنا تو میرے دل کی دھڑکن کو سنو جو ایک ہی نام پکار رہی ہے' انجلی' انجلی۔" سانولی کی آنکھیں جو نشے سے بند ہونے لگی تھیں پٹاخ کر کے کھلیں۔

"تمہارے بغیر میری زندگی خالی مکان کی طرح نامکمل ہے رادھا۔" آنکھیں باہر نکلنے کو تیار ہو گئیں۔

"تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا سنجنا' سنا تم نے سنجنا' آئی لو یو۔" شاید شنزا نے ڈائیلاگ میں ہیروئنز کے نام بھی لکھ دیے تھے۔

"چھوڑیے مجھے یہ کون منحوس شکلیں ہیں جن کے نام آپ لے رہے تھے۔" سانولی نے کامران کے بازو کو جھٹک کر آزاد ہوتے ہوئے کہا' وہی عورتوں والی حسد کی خصلت جاگی۔

"سنو تو یہ سب شنزا کی بچی نے مجھے بولنے کو کہا تھا۔ یہ اس کا آئیڈیا تھا کہ ہم بھی ایک دن منائیں' جس کا نام سرپرائزنگ ڈے ہو' جس میں تمہیں حیران کیا جائے۔" اسے کامران کی گڑبڑائی شکل پر جو صفائیاں دیے جا رہا تھا بہت پیار آیا' اس کے ہاتھ سے پھول لیتے ہوئے شرما کر بولی۔

"آپ بے شک مجھے انجلی' رادھا' سنجنا' ریٹا کچھ بھی بولیں' بس اس طرح اچھی باتیں ضرور کیا کریں' مجھے اچھا لگتا ہے نا اور آپ بھی تھوڑا سا ہیرو' ہیرو لگتے ہیں۔"

"او ہو' او ہو' یہاں کون سی فلم کا کون سا سین چل رہا ہے۔" باقی تمام تینوں بہنیں بمعہ حمزہ کے آن دھمکیں' سانولی کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ یہ سرپرائزنگ ڈے اس کے خوابوں' خیالوں کی طرح بہت پیارا جو تھا۔

☼ ☼

زیادہ عرصے پرانی بات نہیں ہے' پانچ چھ سال پہلے کی بات ہوگی' میں اور میرے شوہر ایک شادی میں شرکت کرکے واپس آرہے تھے۔

"یہ پہلی شادی میں نے اٹینڈ کی ہے' جس میں ہر کام کارڈ میں لکھے وقت کے مطابق ہوا۔" راستے میں میرے شوہر عبدالرحمان شمسی نے کہا۔

"بارات جلدی آگئی تھی نا اصل میں۔" میں نے بھی تائید کی۔

"اسی لیے کام بھی سارے جلدی ہوگئے' اور ہم جلدی بھی اسی لیے فارغ ہوگئے۔"

"ایسی ہی شادیاں اچھی لگتی ہیں بھئی۔" عبدالرحمان نے کہا۔

"اب بس جلدی سے بچوں کو نانی کے یہاں سے لیں گے۔ اور گھر پہنچتے ہی سو جائیں گے۔ صبح آفس بھی جانا ہے۔" عبدالرحمان نے تو جیسے ساری پلاننگ کرلی تھی اور میں ان کے انداز پہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ عبدالرحمان اب خاموشی سے ڈرائیونگ کررہے تھے۔ انہوں نے گاڑی امی کے گھر جانے والی سروس روڈ کی طرف موڑلی۔ اور سروس روڈ تھوڑا آگے جاکر لوگوں کے بے تحاشا ہجوم کی وجہ سے بلاک ہوگئی تھی اور گاڑیوں کی طرح عبدالرحمان کو بھی گاڑی روکنی پڑگئی۔

"اف... کیا مشکل ہے۔" چند منٹ مستقل ہارن پہ ہاتھ رکھے رہنے کے بعد عبدالرحمان نے جھنجلا کر ہارن سے ہاتھ ہٹایا۔

"دیکھ کر آتا ہوں کہ کیا مصیبت ہوئی ہے؟" جھنجلا کر کہتے ہوئے وہ گاڑی سے اترے اور لوگوں کے ہجوم میں' میں نے انہیں شامل ہوتا دیکھا۔

"سچویشن کچھ اچھی نہیں ہے۔" خلافِ توقع عبدالرحمان کی واپسی جلدی ہوگئی تھی' سو انہوں نے بتایا۔

"بلکہ میرے حساب سے نہایت تکلیف دہ اور افسردہ کردینے والی صورت حال ہے۔"

"کیوں... کیا ہوا؟" تعجب سے میں نے سوال کیا۔

"آؤ تم بھی نیچے اتر آؤ۔" انہوں نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا۔

"یہ معاملہ اتنی جلدی نبٹنے والا نہیں ہے۔" میں ان کے کہنے پہ چپ چاپ گاڑی سے اتر گئی۔

گاڑیوں کی لمبی قطار کو عبور کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ اس سروس روڈ کے دائیں جانب لائن سے دو تین شادی ہالز بنے ہوئے ہیں اور واقعی کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ اصل میں بھیڑ ان شادی ہالز میں سے ایک کے باہر لگی ہے۔ بھیڑ میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں تھی' میں اور عبدالرحمان بھی خاموشی سے مجمع میں شامل ہوگئے۔

"نہیں... آپ لوگوں نے وعدہ خلافی کی ہے۔" آف وائٹ' گولڈن کام والی شیروانی اور آف وائٹ چوڑی دار پانجامے میں ملبوس دولہا کہہ رہا تھا۔

"جب آپ لوگوں نے کہا تھا کہ نکاح سے پہلے پہلے گاڑی کی چابی میرے ہاتھ میں دے دی جائے گی' تو پھر ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔"

"اچھا بیٹے تم اندر تو چلو۔" ایک سفید داڑھی' جھکے ہوئے شانوں' مسکین چہرے والے سفید سادہ شلوار قمیص میں ملبوس بزرگ نے لجاجت سے کہا تھا۔

"اندر چل کر بات کرتے ہیں۔ یہاں تو لحظہ بہ لحظہ ہجوم بڑھ رہا ہے۔"

"تو میں کیا کروں' اگر ہجوم بڑھ رہا ہے۔" دولہا نے ناگواری سے کہا۔

"بیٹے اتنے لوگوں کے سامنے میری عزت کا تماشا مت بناؤ۔" باریش بزرگ نے بے بسی سے کہا اور ان کی بے بسی پہ میرا اپنا دل پسیج گیا۔ اس لمحے میرا دل چاہا کہ کہیں سے جادو کی چھڑی ہاتھ آجائے' جسے گھماؤں تو ہجوم بالکل غائب ہوجائے۔ اور وہ... اب دولہا کے برابر کھڑی زرق برق جوڑے میں ملبوس ادھیڑ عمر خاتون سے مخاطب تھے۔ جو غالباً" دولہا کی ماں تھی۔

"بہن جی... آپ ہی کچھ سمجھائیں۔"

"کیا سمجھاؤں بھائی صاحب۔" نہایت پھوہڑ پن سے انہوں نے جواب دیا تھا۔



"ٹھیک تو کہہ رہا ہے میرا بیٹا۔ آپ لوگوں سے ہم نے جہیز کا مطالبہ کیا... نہیں نا... صرف ایک چیز کا کہا تھا۔ وہ بھی بھاری لگی آپ کو؟ حالانکہ آج کل تو گاڑی خریدنا کوئی مشکل کام ہی نہیں ہے' بینک فنانس کردیتا ہے۔"

"جی... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بہن جی۔" لڑکی کے والد نے لجاجت سے تائید کی۔

"بس تھوڑی مہلت..."

"مہلت..." دولہا کی ماں نے روکھے انداز میں دہرایا۔

"مزید مہلت' کیسی مہلت؟ آپ لوگوں نے ہم سے سال بھر کا وقت مانگا تھا نا؟ وہ ہم نے دیا۔ اب مزید کتنی مہلت چاہتے ہیں آپ؟"

"بہن جی... میری... مالی حیثیت کا... آپ کو... اندازہ... تھا۔" لڑکی کے والد کی آواز ٹوٹ ٹوٹ کر نکلی تھی۔ ظاہر ہے بھرے پرے مجمع میں اپنا گھٹنا کھولنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ ان کی بے بسی پہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"بیٹے بس گاڑی کے لیے تم نے کہا تھا... اسے کوئی بینک میری تنخواہ پر فنانس کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر... پھر... شادی کی تیاریاں... ہال کا انتظام' کھانے کا خرچہ' زیور' پہناونیاں؟" ان کی آواز رندھ گئی تھی۔

"بیٹے... تمہارا جوڑا۔"

"میرے جوڑے اور جوتوں کی آپ بات مت کریں۔" لڑکی کے والد کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دولہا نے بھڑک کر کہا۔

"وہ تو لڑکی والوں کی ہی ذمہ داری ہوتی ہے... انہیں کرنا بھی چاہیے۔" دولہا کے لہجے میں زعم تھا۔

اس لمحے میرا دل چاہا کہ دولہا سے سوال کروں اور لڑکے والوں کو کیا کرنا چاہیے؟ وہی جو تم کررہے ہو؟ لڑکی والوں کی عزت کا تماشا بنا رہے ہو' اچھا کررہے ہو۔ مگر میں بھی کچھ نہ بول سکی' شاید میں گونگی ہوگئی تھی' مجمع میں کھڑے تمام لوگوں کی طرح میں بھی بے حس اور بزدل تھی اور لڑکی کے والد دولہا کی ماں کے برابر میں کھڑے بہترین تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس صاحب سے ہم کلام تھے۔

"بھائی صاحب... آپ ہی..."

"مجھے... اس معاملے سے الگ ہی رکھا جائے۔" لڑکی کے والد کی بات کاٹ کر انہوں نے قطعیت سے کہا۔ غالباً" وہ دولہا کا باپ تھا۔

"یہ آپ لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے' خود ہی طے کیجیے۔" اور وہ... اب ایک بنی سنوری' بھاری کامدار ساڑھی پہنے لڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے' جس کی گود میں دو ڈھائی سالہ بچہ بھی تھا۔

"ماموں مجھے یوں مت دیکھیں۔" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"میں تو بھائی کی ہی سائیڈ لوں گی اور وہ غلط کیا کہہ رہے ہیں؟" اور مجھے اندازہ ہوا' یہ لڑکی دولہا کی بہن تھی' مجھے بے تحاشا دکھ اور افسوس نے آلیا۔ یہ ہی خیال آیا کہ اس سے کہوں۔

"تم تو خود شادی شدہ بچے والی بھی ہو' کسی اپنے ہی جیسی لڑکی کے والد کی مجبوری کا ذرا خیال کرو۔" مگر میری زبان پر بدستور تالے پڑے ہوئے تھے۔

"ہاں... جی... کہہ تو سب ٹھیک ہی رہے ہیں۔" ایک فربہی مائل خاتون' جنہوں نے کس کے جوڑا بنا رکھا تھا اور سادہ سی فیروزی رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی نے کلس کر کہا۔

"ایسا کرو تم لوگ' ہم لڑکی والوں کو تل کر کھا جاؤ' بلکہ تلنے کی بھی کیا ضرورت ہے' سالم نگل جاؤ۔"

"خالہ جی' میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ رشتہ داروں میں سے کوئی بیچ میں مداخلت نہیں کرے گا۔" دولہا نے سر جھٹک کر' خاصا چیخ کر کہا تھا۔

"یہ ہمارا معاملہ ہے' اسے ہمارے ہی درمیان رہنے دیں۔" خالہ جی نے جھلس کر شعلہ بار نگاہ دولہا پہ ڈالی اور یکے بعد دیگرے دولہا کے دیگر رشتہ داروں پر جلتی' سلگتی نگاہ پھینکنے کے بعد مجمع کو چیرتی ہوئی شادی لان کی جانب روانہ ہوگئیں۔

"میرا خیال ہے معاملہ تو ہاتھ سے نکل چکا ہے۔" دولہا کی ماں نے خاموشی سے کہا۔

"فیصلہ کرلیا جائے۔"

"فیصلہ تو ہو چکا۔" سرد اور سفاک لہجے میں دولہا کا جواب آیا تھا۔

"گاڑی کی چابی میرے ہاتھ میں آئے گی تو نکاح ہوگا.... ورنہ بارات واپس جائے گی۔" اس نے اپنی بات کہہ کر ایک نظر ششدر کھڑے لڑکی کے والد پہ ڈالی اور دوسری نظر لوگوں کی بھیڑ پر' پھر بات جاری رکھی تھی۔

"ویسے بھی یہاں ہجوم لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا ہے۔ اسے سمیٹنے کا یہ ہی ایک واحد طریقہ ہو سکتا ہے۔"

"نہیں دیکھو بیٹے یہ فیصلہ ٹھیک نہیں۔" یہ غالباً مولوی صاحب تھے' جو اپنی سفید شلوار قمیص' سفید ٹوپی' لمبی سے سفید داڑھی اور موٹے شیشوں کی عینک کے باعث صاف پہچانے جا رہے تھے۔ بے چینی سے اپنی جگہ پہلو بدلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"مذاکرات سے سب مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔" دولہا نے سکون سے کہا۔

"پھر.... کیا آپ مجھے گاڑی دے رہے ہیں۔" مولوی صاحب اس سوال پر صمٌ بکمٌ ہو گئے۔

"میں.... میں۔" وہ ہکلانے لگے۔

"لیجیے.... بات ختم ہو گئی۔" دولہا نے لاتعلقی سے کندھے اچکائے۔

"اب مذاکرات کس سے کروں؟"

"چلو جی' چلو پھر یہاں ٹھہرنا وقت ہی ضائع کرنا ہے۔" دولہا کی ماں نے کہا۔

"ہم بارات لے جا رہے ہیں۔"

"یہ آپ لوگ ٹھیک نہیں کر رہے۔" مجمع میں سے ایک معزز نظر آنے والے صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔

"بارات واپس گئی تو اس سے لڑکی کی بدنامی ہوگی۔" میں نے دل میں شکر کیا کہ چلو کسی کو تو حق بات کہنے کی جرات ہوئی۔

"اور.... کیا؟" ایک اور باریش بزرگ نے تائید کی۔

"ابھی ان بزرگوار نے بتایا کہ ان کی دو بیٹیاں اور ہیں۔ ایک بیٹی کی بارات واپس گئی تو دوسری بیٹیوں پر بھی اثر پڑے گا۔"

"ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔" تیسرے صاحب نے بھرے مجمع کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے اضافہ کیا۔

"بیٹیوں کی عزت سانجھی ہوتی ہے۔"

"وقت اور موقع سے فائدہ اٹھانا کہاں کی انسانیت ہے؟" ایک اور آواز آئی۔

"بالکل...."

"کسی کی مجبوری کا کچھ تو خیال کرنا چاہیے۔"

"سچ ہے...." مختلف سمتوں سے مختلف آوازیں سنائی دینے لگیں' مجھے خوشی ہوئی کہ چلو.... سب مل کر دولہا والوں پر دباؤ ڈالیں گے تو کچھ نہ کچھ بہتری کی امید پیدا ہو ہی جائے گی' مگر....

"ایک منٹ۔" دولہا گونجیلی آواز میں دھاڑا تھا۔ اور مجمع پر یک لخت سکوت طاری ہو گیا تھا۔

"آپ لوگ ایک انٹرسٹنگ شو (دلچسپ تماشا) دیکھ رہے تھے نا.... سو دیکھتے رہیے' خوامخواہ ثالثی کا کردار ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں...." دولہا کی ماں نے لہک کر کہا۔

"اگر ایسا ہی لڑکی والوں سے ہمدردی کا بخار چڑھ رہا ہے تو آپ لوگوں میں سے کوئی یہ مطالبہ پورا کردے۔" دولہا کی ماں کی تجویز پر مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ جسے دیکھ کر انہوں نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ معنی خیز انداز میں آنکھیں مٹکائیں' گویا کہتی ہوں باتیں بنانا بڑا آسان ہے اور عمل کرنا اتنا ہی مشکل۔

میری نظر اس لمحے دلہن کے والد پہ پڑی' جو کسی سنگی مجسمے کی مانند کھڑے تھے۔ چہرے کا رنگ بالکل اسی سفید شلوار قمیص کی طرح ہو رہا تھا' جو اس وقت



انہوں نے پہن رکھی تھی' لاچاری' مجبوری' بے بسی' حسرت' بے چارگی' شکست خوردگی' تکلیف' آزردگی' کون سی ایسی کیفیت نہیں تھی' جو اس وقت ان کے چہرے پہ رقم نہیں تھی۔

اس لمحے مجھے ایسا لگا جیسے سرحد پار کی کوئی مووی دیکھ رہی ہوں' جس میں جہیز نہ دینے پر لڑکے والے بارات واپس لے جاتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے یہ کوئی مووی نہ تھی' بلکہ ایسا حقیقت میں ہو رہا تھا۔ تب مجھے اندازہ ہوا فلمیں بھی کچھ نہ کچھ حقیقت کو دیکھ کر بنائی جاتی ہوں گی' میرا دل غم' دکھ' تکلیف' رنج سے پھٹنے لگا۔ میں نے عبدالرحمان کی قمیص کی آستین آہستگی سے پکڑ کر کھینچ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

"عبدالرحمان ادھر سے چلیں۔" میری سرگوشی نما آواز کسی کراہ سے مشابہ تھی۔

"جب ہم ایک بے بس لاچار باپ کی مدد نہیں کرسکتے تو ہمیں یہ حق بھی نہیں ہے کہ کھڑے کھڑے اس کی بے بسی کا تماشا دیکھیں۔"

عبدالرحمان میری بات کا جواب دینے کے بجائے۔ غائب دماغی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے میری بات سنی نہیں ہے۔ تو سمجھ میں آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی بات ان کو سمجھانے کی کوشش کرتی' میں نے دولہا کو کہتے سنا۔

"آپ لوگ گاڑیوں میں چل کر بیٹھیں۔" غالباً اب وہ باراتیوں سے مخاطب تھا۔ اور اس کے کہنے پر ہجوم قدرے چھٹنے لگا۔ غالباً" باراتیوں کی روانگی رفتہ رفتہ عمل میں آنے لگی تھی۔

"ایک منٹ...." چھٹتے ہوئے مجمع میں سے اچانک ایک خوش پوش اور خوش شکل نوجوان نکل کر سامنے آگیا تھا۔

"یہ لیجیے۔" کرسٹل کی' کی چین میں لگی سیاہ دستے والی چمکتی ہوئی دھات کی بالکل نئی چابی اس کی طرف بڑھائی تھی۔ اور دولہا کو اب سانپ سونگھ گیا تھا۔ تاہم جلدی سے سنبھالا لے کر بے زاری سے اس نے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"چابی ہے۔" خوش پوش اور خوش شکل نوجوان کا اطمینان بھرا جواب آیا تھا۔

"وہ مجھے بھی نظر آ رہی ہے۔" دولہا نے تندی سے اطلاع دی۔

"کیا کروں اس کا؟"

"آپ کو گاڑی چاہیے تھی نا۔" نوجوان نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"گاڑی حاضر ہے۔" اس نے سامنے کھڑی چمکتی دمکتی شاندار سیاہ ٹویوٹا کرولا کی طرف اشارہ کیا۔

"کل ہی شوروم سے فل پے منٹ کرکے اٹھائی ہے۔ ابھی اس کی رجسٹریشن بھی نہیں ہوئی۔ Applied for registration کا بورڈ بھی آپ دیکھ رہے ہوں گے۔ زیرو میٹر تو نہیں ہے۔ مگر کل سے لے کر اب تک چند ہی کلومیٹر چلی ہوگی۔ یہ اس گاڑی کی چابی ہے۔" اس نے چابی ایک بار پھر دولہا کی جانب بڑھائی۔

"پلیز یہ لیجیے اور بارات واپس مت لے کر جائیں۔"

"او بھائی تم کون ہو؟" دولہا نے چابی لینے کے بجائے شک بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"اور کدھر سے آ گئے؟"

"میں...." نوجوان مسکرایا تو مزید دلکش لگنے لگا۔

"کہیں سے نہیں.... آفس سے گھر واپس جا رہا تھا۔ یہ سروس روڈ میرے گھر کے راستے میں پڑتی ہے۔ یہاں بے حد ہجوم دیکھا تو رک گیا۔ پھر ہجوم کی وجہ بھی پتا چلی۔ گاڑی کا مطالبہ سامنے آیا اور جب بارات واپس لے جانے کا فیصلہ معلوم ہوا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ اس لیے پلیز میری گاڑی لے لیجیے اور اپنا فیصلہ تبدیل کردیجیے۔"

"او.... بھئی.... میں اپنا فیصلہ تبدیل کروں یا وہی رکھوں' تو بیچ میں دخل اندازی کرنے والا کون ہے؟" دولہا نے خاصے جاہلانہ انداز میں کہا تھا۔

”میں بے شک کوئی نہیں ہوں۔“ نوجوان نے تحمل سے جواب دیا۔

”صرف آپ کا مسئلہ حل کرنا چاہ رہا ہوں۔“

”تو... میرے مسئلے کو چھوڑ۔“ دولہا اب بدتمیزی پر اتر آیا تھا۔

”اپنا مسئلہ بتا‘ تجھے آخر اس معاملے سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟“

”مجھے دلچسپی نہیں ہے‘ ہمدردی ہے۔“ نوجوان نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

”میں بھی بہنوں والا ہوں اور مجھے پتا ہے کہ کسی لڑکی کی بارات دروازے پہ آ کر کسی وجہ کے تحت واپس لوٹ جائے تو اس لڑکی پہ عمر بھر کے لیے لیبل لگ جاتا ہے۔“

”او... تو تجھے اس لڑکی سے کس حساب سے ہمدردی ہو رہی ہے؟“ دولہا نے اسی شکی لہجے میں سوال کیا۔

”کون لگتی ہے وہ تیری؟ اور تو کون لگتا ہے اس کا؟“

”دیکھیے‘ آپ بات کو غلط رخ پر لے جا رہے ہیں۔“ نوجوان کو ایک دم صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا‘ لہٰذا فوراً ”الرٹ“ ہو کر کہا۔

”میں بات جس رخ پہ لے جا رہا ہوں مجھے پتا ہے۔“ دولہا نے دانت کچکچائے۔

”کب سے جانتے ہو اس لڑکی کو۔“

”میں...“ پہلی بار نوجوان سٹپٹایا۔

”میں کیوں جاننے لگا اس لڑکی کو؟“

”تو... یہ لاکھوں کی قربانی انسانی ہمدردی کے تحت دے رہے ہو؟“ دولہا نے ترشی سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ نوجوان نے اب کی بار بلا جھجک کہا تھا۔

”مجھے پتا تھا تمہارا جواب یہ ہی ہو گا۔“ دولہا نے برفیلے لہجے میں اطلاع دی۔

”مگر مجھے لگتا ہے بات اصل میں کچھ اور ہے‘ صاف کیوں نہیں کہتے کہ اس لڑکی کے پرانے واقف کار ہو تم۔“

”یہ مجھ پہ الزام ہے۔“ نوجوان بلبلایا۔

”یہ لوگ اور وہ لڑکی میرے لیے اجنبی ہیں۔ میں ان لوگوں کو نہیں جانتا۔“

”ہاں... ہاں... یہ بالکل سچ ہے۔“ لڑکی کے والد نے جلدی سے کہا۔

”ہم نے ان کو آج ہی دیکھا ہے‘ یہ ہمارے لیے قطعاً ”اجنبی ہیں۔“

”ہونہہ... مہربان اجنبی... یا نامہربان آشنا۔“ دولہا نے حقارت سے کہتے ہوئے دلہن کے والد کو دیکھا۔

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ کے پاس بیٹی کو دینے کے لیے اگر مال اسباب نہیں ہے‘ تو کم از کم کردار اور پارسائی تو ہو گی۔ اب پتا چلا اس کے پاس تو وہ بھی نہیں ہے۔ ایسے ہلکے کردار کی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ کم سے کم میں تو نہیں کر رہا۔“

”نہیں... نہیں۔“ لڑکی کے والد حواس باختہ نظر آنے لگے۔

”میری بیٹی کے کردار میں کوئی کمی نہیں‘ وہ باعصمت اور عفت ما آب لڑکی ہے۔“

”جی ہاں... وہ تو نظر آ ہی رہا ہے“ دولہا نے سر سے لے کر پیر تک اس نوجوان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس کریں۔“ نوجوان نے بپھر کر اس بار کہا۔

”یہ مستقل الزام تراشی کا سلسلہ بند کریں۔“

”اللہ سے توبہ کرو بیٹے۔“ مولوی صاحب نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”کسی پاک باز عورت پہ بہتان تراشنا گناہ کبیرہ ہے۔“

”رک کر غلطی کر دی خوامخواہ۔“ دولہا نے ان دونوں کی بات کا جواب دینے کے بجائے حقارت سے سر جھٹک کر کہا۔

”اب پتا چلا بارات واپس لے جانے کا فیصلہ کس قدر ٹھیک تھا۔“ دولہا نے گلے میں پڑے گلاب کے پھولوں کے اکلوتے ہار کو جھٹکے سے نوچ کر پھینکا اور سلیم شاہی جوتوں تلے اسے روندتے ہوئے اپنی سجی سجائی گاڑی کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کو راستہ دینے کے لیے مجمع بالکل کائی کی طرح چھٹ گیا۔ دیکھتے ہی



دیکھتے دولہا کی گاڑی کے پیچھے دوسری گاڑیوں کا قافلہ روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہال سے رونے پیٹنے‘ بین کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجمع میں کھڑے کچھ لوگ بھی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے تھے۔ مگر ہم جیسے کچھ لوگ جو ابھی تک شاک میں تھے بدستور کھڑے تھے‘ بالکل ہونقوں کی طرح منہ کھولے‘ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے۔

میں نے لڑکی کے والد کو سر پکڑ کر وہیں سڑک پہ بیٹھتے دیکھا۔

”حوصلہ کریں صاحب۔“ مجمع میں سے اسی باریش صاحب نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا اور اس کے ساتھ ہی مجمع میں کھڑے دیگر افراد جن میں رشتہ دار اور تماش بین دونوں تھے۔ اپنی اپنی زبان میں تسلی کے الفاظ کہنے لگے۔

”ایسے لالچی کمینے‘ کم ظرف اور کم بخت لوگوں کو بیٹی دینے سے بہتر اس کا کنوارہ ہونا ہی ہے۔“ ایک صاحب نے بے لچک لہجے میں خیال آرائی کی۔ لڑکی کے والد پتھرائی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھے گئے۔

”ہاں... شکر کرو علی احمد ان لوگوں کا اصل کردار شادی سے پہلے ہی کھل کر سامنے آ گیا۔“ ان خالہ جی نے اپنی پاٹ دار آواز میں کتھے سے مزین انگلیوں والے ہاتھ چلا کر کہا۔

”اگر اس چھچھورے لڑکے سے شادی ہو گئی ہوتی نہیں تو ہماری بھانجی کے تو نصیب ہی پھوٹ گئے ہوتے۔“

”تو ابھی نصیب پھوٹنے میں کون سی کمی رہ گئی۔“ ایک اور بوڑھی خاتون آبدیدہ ہو گئیں۔

”اب کون اس سے شادی کرے گا۔“

”اس پر... ان عورتوں نے اور مصیبت کر رکھی ہے۔“ خالہ جی نے ناگواری سے کہا۔

”ارے بارات ہی واپس گئی ہے نا‘ اللہ سلامت رکھے‘ کسی کی وفات تو نہیں ہوئی۔“

”علی احمد صاحب مجھے افسوس ہے۔“ مولوی صاحب نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

”اور آپ سے بے حد ہمدردی بھی... مگر مجھے اب اجازت دیجیے۔“

”ہاں... اب آپ رک کر کریں گے بھی کیا۔“ علی احمد صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ایک منٹ مولوی صاحب۔“ اچانک اسی نوجوان کی آواز ایک بار پھر آئی تھی۔ جس کی موجودگی کو دوسرے لوگ (ہم سمیت) فراموش کر بیٹھے تھے۔

”نکاح نہیں پڑھائیں گے آپ؟“

”نکاح۔“ مولوی صاحب نے استعجاب سے دہرایا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی دیگر تمام لوگ بھی چونک کر اس نوجوان کو دیکھنے لگے۔

”جی ہاں‘ میرا اور ان کی بیٹی کا نکاح۔“ نوجوان اس سارے عرصے میں دوسری بار مسکرایا تھا اور اس کے ان الفاظ کے ساتھ علی احمد بے یقینی سے اسے دیکھنے لگے۔

”آپ... آپ۔“ ہکلانے لگے۔

”جی ہاں۔“ نوجوان نے متانت سے جواب دیا۔

”مگر... اس سے بھی پہلے میری آپ سے ایک درخواست ہے۔“ علی احمد سے فوری طور سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے نوجوان کو دیکھنے لگے۔

”بس مجھے اتنی مہلت دے دیں کہ اپنے گھر والوں کو لے آؤں‘ تاکہ رسمی اور غیر رسمی معاملات وہی طے کر لیں۔“ نوجوان نے صاف اور واضح آواز میں کہا تھا۔

”کیا آپ مجھ پر تھوڑا سا اعتبار کر سکیں گے؟ آدھے پون گھنٹے تک میرا انتظار کر سکیں گے؟“ علی احمد نے منہ سے تو کچھ نہ کہا‘ خفیف سی سر کو جنبش دی۔

”اور آپ لوگ پلیز‘ اندر چلیں۔“ روانہ ہونے سے پہلے اس نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا تھا اور اس کے انداز میں عجیب سی اتھارٹی تھی۔

”پہلے ہی کافی تماشا ہو چکا ہے۔“ نوجوان کے روانہ
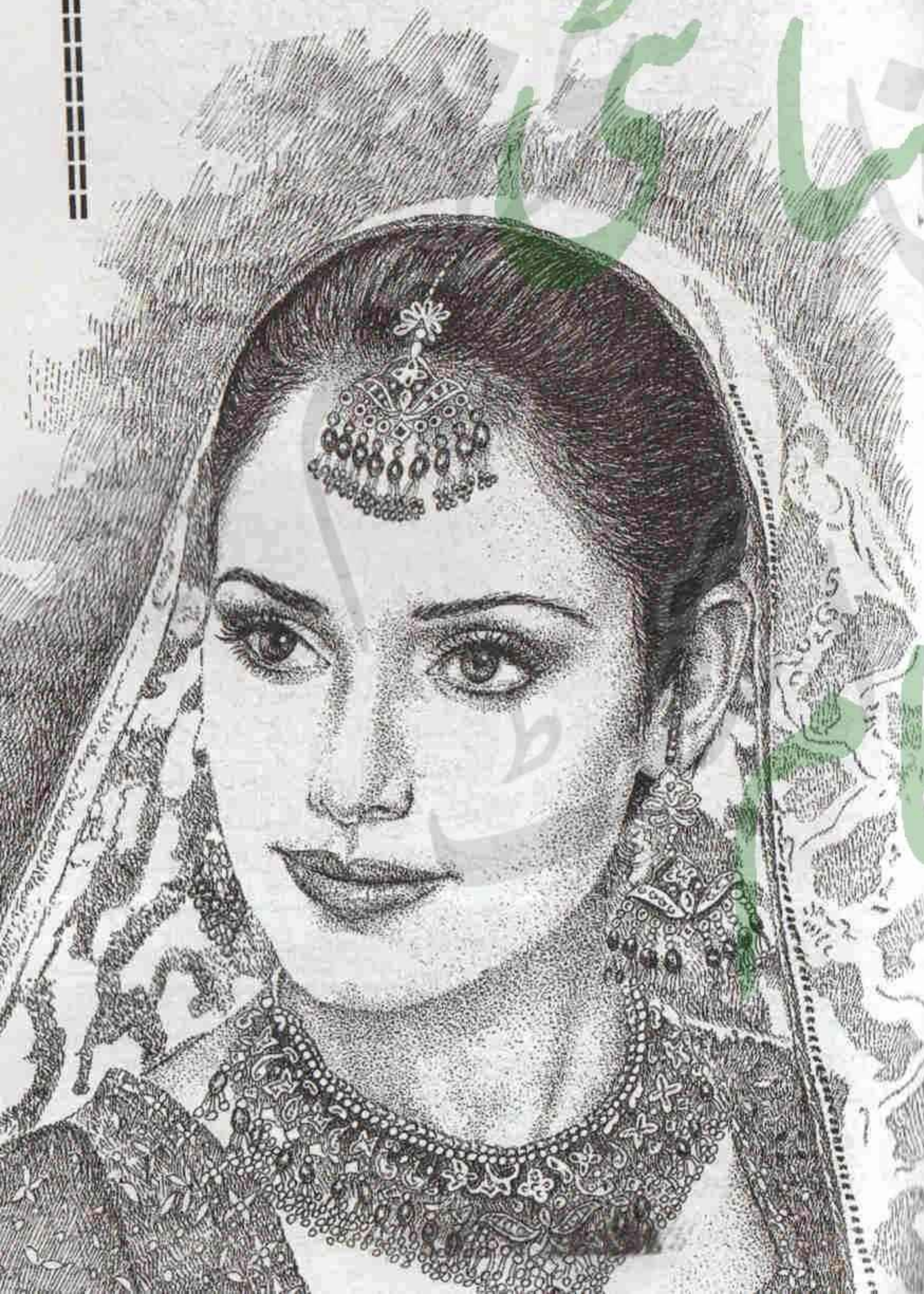
ہوتے ہی ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام تماش بین بھی اپنی اپنی راہ ہو لیتے۔ مگر چونکہ لوگ پہلے محض دلچسپی اور شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ اب اس میں تجسس بھی شامل ہو گیا تھا۔ بدستور باہر ہی کھڑے سب منتظر تھے کہ نوجوان واپس آتا بھی ہے یا نہیں۔ اپنے گھر والوں کو لاتا بھی ہے یا نہیں۔ پندرہ منٹ گزر گئے۔ آدھا گھنٹہ گزرا۔ پون گھنٹہ بھی گزر گیا۔ نوجوان کی لی ہوئی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ محسوس ایسا ہی ہوتا تھا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا' اب وہ آنے والا نہیں۔

پھر اسی وقت دو گاڑیاں ہماری آنکھوں کے سامنے آکر رکیں' سات افراد ان میں سے اترے' تین خواتین' چار حضرات' اور سب سے نمایاں وہ نوجوان تھا سب کے سب بے حد سادے حلیے میں تھے۔ مگر دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ خوش حال خاندان کے افراد ہیں۔ نوجوان نے لڑکی کے والد کا تعارف کروایا۔

"معاف کیجیے گا' آپ لوگوں کو انتظار کی زحمت کرنی پڑی۔" ادھیڑ عمر کی باوقار سی خاتون نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"میرے بیٹے مشہود نے فون پر بتا تو سب کچھ دیا تھا۔ مگر بیٹی کو سسرال سے آنے میں دیر ہو گئی۔"

"میرا خیال ہے باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔" شلوار قمیص میں ملبوس' مشہود نامی نوجوان سے بے حد مشابہت رکھنے والے صاحب نے کہا۔ تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ مشہود کے والد ہیں اور جو مزید کہہ رہے تھے۔

"نکاح میں دیر ہو رہی ہے۔" پھر نکاح ہوا' اور اس کے بعد کھانا کھل گیا۔ ہال میں انتظامات سے لے کر کھانے تک کو دیکھ کر لگتا تھا کہ علی احمد نے بڑی مشکل سے سب جمع جوڑ کیا ہو گا۔ پھر ظاہر ہے ایسے میں بھلا دولہا کا مطالبہ کیسے پورا ہوتا۔ مگر بہرحال وہ گاڑی جو وجہ تنازعہ بنی تھی۔ اسی گاڑی میں بیٹھ کر دلہن سادگی سے رخصت ہو گئی تھی۔ اور اس لمحے ہر آنکھ نم تھی' مگر ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔

"ساری نصیب کی بات ہوتی ہے۔" عبدالرحمان نے گاڑی میں بیٹھ کر مجھ سے کہا تھا۔

"دراصل اس لڑکی کے نصیب میں مشہود ہی لکھا تھا' اس لیے تو معمولی سی بات بھی رشتہ ٹوٹنے کا بہانہ بن گئی۔"

"آپ نے دلہن کو دیکھا تھا؟" میں نے بڑی سنجیدگی سے عبدالرحمان سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ میرے سوال پر حیران ہوئے۔

"تم نے دیکھا؟"

"جی۔" میں نے سرہلایا۔

"اور یقین کریں اس نوجوان کا پرائز بانڈ نکل آیا ہے' دلہن بے حد حسین ہے اور جس طرح وہ اپنی نقاہت زدہ ماں اور آفت زدہ باپ کا خیال رکھ رہی تھی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یقیناً "کیئرنگ بھی ہو گی ضرور۔" عبدالرحمان نے میری طرف ایک نظر دیکھا اور ایک دم ہنس دیے' میں الجھن زدہ نظروں سے انہیں دیکھے گئی۔

"دیکھو' اس نے اپنی طرف سے نیکی کرنی چاہی تھی' مگر وہ نیکی الٹا اس کے گلے پڑ گئی وہ چاہتا تو پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ مگر ڈٹا رہا اور دیکھو صلہ بھی فوراً پالیا۔ اب وہ جب اپنی بیوی کو دیکھے گا' ساری زندگی اس لمحے پہ رشک کرے گا' جب اس نے یہ فیصلہ کیا۔"

میں عبدالرحمان کی بات سن کر مسکرا دی۔ اسی وقت ایک فقیر بانسری پہ ایک مشہور پاکستانی گانے کی دھن بجاتا ہوا گزرا۔

کسی مہرباں نے آکے میری زندگی سجا دی
میرے دل کی دھڑکنوں میں نئی آرزو جگا دی
میرے لب خود بخود گنگنانے لگے۔

نہ بڑا نہ کوئی چھوٹا' سب ہی ایک ہیں جہاں میں
ہے وہی عظیم جس نے نئی شمع اک جلا دی

یہ کوئی زیادہ عرصے پرانی بات نہیں ہے۔ پانچ چھ سال پہلے کی ہی بات ہو گی۔ مگر اس مشہود نامی نوجوان کی جلائی ہوئی شمع آج بھی میری نگاہوں کے سامنے روشن ہے۔ اور منتظر ہے کہ دیکھیں اور کون آگے آتا ہے۔ نئی شمع جلاتا ہے' تاکہ تاریکیاں دور ہو سکیں۔

"میں شادی کرنے کے لیے تیار ہوں اور اسی وقت نکاح کے لیے تیار ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔"

سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ دراصل وہ پہلو بدل رہے تھے اور اسے گھور رہے تھے اگر وہ اتنے برے وقت میں گھر نہ آیا ہوتا تو کچھ اسے کچا ہی چبا جاتے اور کچھ اسے دیکھنا بھی پسند نہ کرتے۔

رامین سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔

"خاندان اتنا بھی کمزور نہیں ہوا تھا کہ بڑوں کے فیصلے نہ مانے جائیں' جاذب کتنی ہی شرطیں کیوں نہ رکھے اسے ان سب کی بات ماننا ہی پڑے گی' اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی اور وہ جانتی تھی کہ اس کی وجہ وہی ہے..... اس بار ضرور وہ یہ نکاح کرے گا۔"

"جو الزام اس نے مجھ پر لگایا تھا اس الزام کی سچائی اسے بتانی ہوگی۔" آج سے سات سال پہلے اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی آج اس کی آواز میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا۔ آج بھی وہاں وہی لوگ تھے جو اسے پسند نہیں کرتے تھے' جو اسے سننا نہیں چاہتے تھے۔

اس بار رامین نے حیرت سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اسی لیے یہ چاہتا تھا کہ سب کے ساتھ رامین کو بھی بٹھایا جائے اور پھر نکاح کی بات کی جائے۔ رامین کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں ..... اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے سوگوار ماحول اور سوگوار لوگوں کے غم کو نظرانداز کر کے وہ اپنی بات کرے گا' سالوں پہلے کی بات ..... رامین کے اندازے ہمیشہ سے غلط رہے تھے۔

اس کا باپ وقت سے پہلے بوڑھا ہو چکا تھا' جوان بڑے بیٹے کی موت کے علاوہ بھی کچھ تھا جو اندر ہی اندر انہیں روز مار رہا ہوگا۔

"اس موقع پر تمہیں اتنی پرانی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا..... جو ہوا اسے بھول جاؤ۔" بولنے میں پہل تایا جی نے کی' کبھی کسی زمانے میں وہ اس سے پیار کیا کرتے تھے۔ وہ ان کا ہونہار بیٹا تھا..... لیکن کبھی کسی زمانے میں۔

"جو ہوا اسے بھول جاتا اگر میرے ساتھ نہ ہوا ہوتا۔" اس ماتم زدہ گھر میں بھی لوگوں کی نظروں نے یہی کہا۔

"یہ وہی ہے۔"

"اسے دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ یہ آج بھی ویسا ہی ہے۔" رامین سر جھکائے سوچ رہی تھی۔

"تمہیں اپنے ماں باپ کا' ہم سب کا دکھ کم کرنا چاہیے' تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔" تایا جی شاید اپنا غصہ دبا رہے تھے۔

"میں انہیں دکھ دینا بھی نہیں چاہتا' انہی کے دکھ کم کر رہا ہوں' سالوں ان کے دل جلتے رہے ہیں یہ سوچ کر کہ ان کا بیٹا بدکردار ہے اور خاندان والے اسے منہ لگانا پسند نہیں کرتے۔"

"تم رامین کی مجبوری کا فائدہ اٹھا رہے ہو۔" یہ جاذب کے بہنوئی تھے جن کی آنکھوں میں آج بھی طنز ہی تھا..... شاید وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ "تم ایک بار پھر رامین کا فائدہ اٹھا رہے ہو۔"

"جب ہم سب کچھ بھول کر یہ سب کر سکتے ہیں تو تم بھی بھول جاؤ۔"

"میں کسی کی مجبوری کا فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے' یہاں کوئی مجبور ہے بھی نہیں' میں سچ کو سامنے لانے کا تقاضا کر رہا ہوں..... یہ سچ بول دے میں نکاح کر لوں گا۔"

"اگر بتانے کو کچھ ہو ہی نہ تو....." بڑے پھوپھا بولے۔

"ان باتوں سے اب صرف بدمزگی ہی پیدا ہوگی' وقت کا تقاضا سمجھو۔"

"اگر بتانے کو کچھ نہیں ہے اور سب کچھ وہی ہے ویسا ہی ہے جیسا آپ لوگ سمجھتے ہیں تو رامین کو ایک بدکردار انسان سے شادی نہیں کرنی چاہیے' میرے بھائی کے بچوں کو ایک برے انسان کے زیر سایہ پرورش نہیں پانی چاہیے اور آپ سب کو بھی مجھ سے ایسا نہیں کہنا چاہیے' شریف خاندانوں میں شرافت ہی اثاثہ سمجھی جاتی ہے' آپ نے ہی کہا تھا نا تایا جی'



آپ کو مجھ جیسے شخص کو اپنے خاندان میں جگہ نہیں دینی چاہیے۔"

"جاذب..... تم وقت کا غلط استعمال کر رہے ہو۔"

سب اپنی اپنی جگہ پر پہلو بدل رہے تھے' وہ ان سب کی مجبوری کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

"فائقہ اور احسن کا سوچو' تمہارا خون ہیں' تم سے بڑھ کر ان کی سرپرستی کون بہتر کر سکتا ہے؟"

"میں ان کی سرپرستی کے لیے تیار ہوں' مجھے وہ اتنے ہی پیارے ہیں جتنے وہ میرے بھائی کو تھے' لیکن میں لوگوں کی طنزیہ نظروں اور خود پر لگائے گئے الزام کے ساتھ ان کی کیا اپنے بچوں کی پرورش نہیں کر سکتا۔"

رامین کے لیے خود پر قابو رکھنا مشکل تھا..... سات سالوں میں بھی وہ بدلا نہیں تھا' وہی ضدی انداز' وہی کرخت رویہ' لیکن وہ جانتی تھی اس بار یہ نکاح ہوگا ..... ضرور ہوگا۔ جاذب کو یہ نکاح کرنا ہی پڑے گا..... خاندان سے بے دخل انسان خاندان میں آنے کے لیے تڑپ رہا ہوگا' اپنی ماں' اپنے گھر کے لیے جاذب بہت اداس رہا ہوگا..... انسان کتنا بھی مضبوط ہو اسے وقت کے ساتھ نرم ہونا ہی پڑتا ہے۔

"دیکھو جاذب بیٹا! یہ ہمارے گھر کی عزت ہے' تمہیں بھی اس عزت کا پاس رکھنا ہے' اگر کہنے سننے میں اونچ نیچ ہو بھی گئی تھی تو اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں' انسان وہی ہے' جو ماضی کو فراموش کر کے حال میں زندہ رہے۔" چھوٹے چچا ہمیشہ سے نرم مزاج رہے تھے لیکن وہ جاذب کے حق میں کبھی بھی نہیں رہے تھے' بس وہ وقت پر گدھے کو باپ بنا رہے تھے۔

"میں عزت کا ہی تو پاس رکھنا چاہ رہا ہوں' عزت ہی تو چاہیے مجھے۔"

"وقت کا تقاضا سمجھتے ہوئے رامین تمہارے حق میں بھی بول سکتی ہے۔"

"رامین وہی کہے گی جو سچ ہے' جو اسے اور مجھے معلوم ہے' وہ سچ میں جانتا ہوں اور میں چاہتا ہوں آپ سب بھی جانیں؟"

"تم ایک مجبور عورت کی مجبوری کا فائدہ اٹھا رہے ہو۔"

"یہ بیوہ ضرور ہے مجبور نہیں' مجبور یہ کبھی بھی نہیں رہی' ہر فیصلہ ہمیشہ سے اس کے ہاتھ میں رہا ہے' آپ اس کی شادی کسی اور سے کر دیں' اس کی شادی کسی کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے..... خاندان میں کہیں بھی۔"

"نہ اس کی شادی کسی سے بھی ہو سکتی ہے اور نہ بچوں کو باپ مل سکتا ہے' تمہارا خون تم سے بہتر کون پالے گا؟" آج بھی تایا جی کے لہجے میں وہی جلال تھا۔

"جب تک میرا اپنا خون گندا ہے میں کسی کے خون کو کیسے پال سکتا ہوں' کل کو یہی بچے مجھ سے سوال کریں گے۔"

"تم ہمیشہ کی طرح آج بھی نالائق ہی ہو' تم جانتے ہو اچھی طرح کہ تمہاری وجہ سے کم از کم خاندان میں تو کوئی رامین سے شادی نہیں کرے گا۔"

اس کی ماں سسکتے سسکتے رونے لگی' کتنے سال انہیں جاذب کے لیے اتنی باتیں سننی پڑیں' تنہائی میں کتنی ہی بار وہ اس کے سامنے منتیں کر چکی تھیں کہ وہ یہ شادی کر لے ..... وہ اسے دور رکھنا نہیں چاہتی تھیں۔

"صحیح کہا آپ نے پھوپھا جان' نالائق نہ ہوتا تو آج یہاں اس طرح نہ بیٹھا ہوتا' آپ کو اس نالائق کے سامنے اتنا مجبور نہیں ہونا چاہیے' آپ رامین کی شادی کریں یا نہ کریں میں اس نکاح کے لیے راضی نہیں ہوں گا۔"

رامین ضرورت سے زیادہ مظلوم نظر آنے لگی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور وہ کانپ رہی تھی۔

"یہاں پر میری ماں ہے باپ ہے' رامین ہے اور آپ سب وہی لوگ ہیں جو پہلے بھی تھے..... جو سچ ہے وہ رامین آپ سب کے سامنے کہہ دے۔ ورنہ میں آج کی ہی فلائٹ سے واپس چلا جاؤں گا۔"

رامین نے جاذب کی طرف دیکھا..... اس کی نظر

میں التجا تھی کہ وہ یہ سب نہ کہے‘ نہ دہرائے وقت کو اور سب کچھ بھول جائے..... وہ اسے سات سال بعد دیکھ رہی تھی۔ ایک لمبا انتظار کیا تھا اس نے جاذب کا..... تڑپ تڑپ کا روتی رہی تھی وہ اس کے لیے..... یہ وہی شخص تھا جو لمحوں کے لیے بھی او جھل نہیں ہوا تھا اس کے دل و دماغ سے‘ یہ وہی شخص تھا اور یہ جا رہا تھا..... یہ چلا جائے گا اسے روک ہی کون سکتا تھا..... کون روک سکتا تھا..... یہ سوال اس کے دماغ میں بجنے لگا‘ یہ چلا جائے گا..... یہ کسی اور سے شادی کرے گا یہ کسی اور کا ہو جائے گا۔ سات سال پہلے کی طرح یہ چلا جائے گا اور پھر کبھی نہیں آئے گا۔

کمرے میں موجود ہر شخص یہ جانتا تھا کہ وہ چلا جائے گا‘ وہ سات سال خاندان سے دور رہا تھا اب وہ باقی زندگی بھی رہ سکتا تھا‘ خاندان کے بڑوں‘ خاندان کے معاملات سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا‘ مہینوں سے باری باری آکر اسے منایا جا رہا تھا۔

مجبوری رامین کی تھی‘ شادی اسے کرنی تھی..... جاذب کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا..... وہ التجاؤں سے اسے مجبور بھی نہیں کر سکتے تھے یہ خاندان کا سب سے ڈھیٹ اور ضدی لڑکا ہے..... نالائق اور ڈھیٹ.....

رامین نے سب کے چہروں کی طرف دیکھا‘ وہاں صاف لکھا تھا کہ اس نالائق کی اب وہ اور منت نہیں کریں گے‘ یہ لڑکا ہمیشہ سے ان کے اختیار سے باہر رہا تھا۔

پہلے وہ سسکنے لگی پھر آہستہ آہستہ رونے لگی‘ چھوٹی چچی تڑپ کر اس کے گلے سے جا لگیں..... جوان بیٹی بیوہ ہو گئی تھی اور کیسے تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی اب سب چاہتے تھے کہ وہ جلد سے جلد یہاں سے دفع ہو جائے‘ سب کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا..... وہ ایک بیوہ کے غم میں اور اضافہ کر رہا تھا۔

”مجھے معاف کر دو جاذب۔“ رامین کی گھٹی گھٹی آواز کمرے میں گونجی۔

”کیا کہہ رہی ہو رامین..... کس بات کے لیے معافی مانگ رہی ہو‘ تم اتنی بھی مجبور نہیں ہو کہ تم جاذب سے معافی مانگو تاکہ وہ تمہارے بچوں کا سرپرست بن جائے ہم سب ہیں تمہارے ساتھ اکیلی نہیں ہو تم یہ زندگی گزارنے کے لیے۔“ وہ چلا جائے گا..... اسے کون روکے گا..... ایک ہی سوال تھا رامین کے لیے اسے وہ چاہیے تھا..... ”وہ۔“

”وہ غلطی میری ہی تھی..... میں نے سچ چھپایا..... انجانے میں..... میں نے ہی وہ سب کہا تھا..... جاذب کے لیے میں نے جھوٹ بولا تھا۔“

رامین کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اسی طرح رو رہی تھی جیسے آج سے سات سال پہلے رو رہی تھی‘ ہچکیاں‘ آنسو‘ آنسو اور آنسو لرزتے ہونٹ‘ کانپتا وجود.....

سب خاموش تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دونوں میں سے ایک سچا اور ایک جھوٹا ہے لیکن وہ چاہتے تھے سچ وہی ہو جسے وہ سمجھتے رہے تھے..... سب خاموش ہی رہنا چاہتے تھے۔ اب انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس پر کیا الزام لگائیں۔

جاذب جانتا تھا کہ اس بار وہ ضرور بولے گی اور وہ سچ ہی ہو گا‘ اس بار سوچنے کے لیے اسے سات سال ملے تھے‘ اس نے سات سال سوچا ہو گا کہ وہ سچ بول دے..... کاش۔

جاذب بے حد سنجیدہ تھا..... وہ اپنے بھائی کی بیوہ کی طرف نہیں اس عورت کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے اسے سخت نفرت تھی۔

رامین روئے جا رہی تھی اسے رونا ہی تھا اس وقت تک جب تک وہ ایک بار پھر سے مظلوم نہ بن جائے اس کی حالت کو دیکھ کر لوگ تڑپ نہ اٹھیں اس کی غلطی کو لوگ نادانی سمجھ کر اسے گلے سے نہ لگا لیں‘ جب تک ہر آنکھ اس کے غم پر اشکبار نہ ہو جائے..... جب

✵ ✵ ✵

تک اس کی غلطی بھلا نہ دی جائے۔

”میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں‘ کتنی بار ہاتھ جوڑ چکی ہوں‘ تم مان کیوں نہیں جاتے‘ ہر بار مجھے ذلیل کرتے ہو..... میں امید لیے پھر آ جاتی ہوں۔“

”کس نے کہا خود کو ذلیل کرنے کو‘ کیوں آتی ہو میرے پاس بار بار تم سمجھتی ہو کہ تمہارے بار بار کہنے سے میں مان جاؤں گا۔“

”ہاں مجھے یقین ہے کہ میرے بار بار کہنے سے تمہیں میری محبت سے محبت ہو جائے گی۔“

”تمہارا یقین غلط ہے۔“

”مجھے اس یقین پر مان ہے۔“

”تمہارا یہ مان جلد ختم ہو جائے گا۔“

”میں اسے ختم نہیں ہونے دوں گی۔“

”بھول جاؤ کہ ایسا کچھ ہو گا۔“

”آخر تم مجھے پسند کیوں نہیں کرتے۔“ وہ حسبِ عادت رونے لگی۔

پہلے وہ جاذب سے بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی اب جاذب کو اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔

”یہ آنسو میرے سامنے بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تمہیں یہ سب مذاق لگتا ہے۔“

”میرے لیے یہ ایک گھٹیا حرکت ہے انسلٹ ہے میری۔“

”انسلٹ تو تم میری کرتے ہو۔“

”تو کیوں کرواتی ہو؟“

”کیونکہ میں مر جاؤں گی تمہارے بغیر..... تم سمجھتے کیوں نہیں۔“

”افسوس مجھے خود پر ہے..... میری کس بات‘ کس انداز سے تمہیں یہ لگا کہ میں تمہارا ساتھ دوں گا‘ تم میرے لیے صرف میرے چچا کی بیٹی ہو یا پھر میرے بھائی کی منگیتر۔“ وہ تھک چکا تھا اسے سمجھا سمجھا کر۔

”رامین تم سمجھتی کیوں نہیں ہو‘ کتنی بار تمہیں سمجھایا ہے‘ رشتوں میں کھوٹ ٹھیک نہیں‘ دل میں کھوٹ بھی ٹھیک نہیں‘ میں صاف گو ہوں اور جھوٹ نہیں بول رہا تمہیں اپنے دل میں فائق کو جگہ دینا ہے۔ تم میرے لیے بہن ہو سکتی ہو‘ میری بھابھی ہو اور کچھ بھی نہیں..... یاد رکھنا کبھی بھی کچھ بھی نہیں۔“

”بھابھی..... نفرت ہے مجھے اس لفظ سے..... تمہارے علاوہ مجھے نفرت ہے سب سے‘ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے..... میں جانتی ہوں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا‘ میں سب کچھ سنبھال لوں گی‘ سب کو منا لوں گی۔“

”مجھے اعتراض ہے اور اعتراض تم ہو..... تمہیں فائق نہیں پسند تو یہ تمہارا حق ہے کہ تم انکار کر دو۔“

”نہیں پسند مجھے فائق کتنی بار کہا ہے کہ کوئی نہیں پسند تمہارے علاوہ۔“

”مجھے تم نہیں پسند۔“ جاذب نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”نکل جاؤ میرے کمرے سے اور بہانے بہانے سے یہاں آنا چھوڑ دو..... تم میرے لیے وہ کبھی نہیں ہو سکتیں جو تم ہونا چاہتی ہو۔“ وہ پھر رونے لگی۔

”کیوں؟ آخر کمی کیا ہے مجھ میں..... تم میری محبت کا جواب محبت سے کیوں نہیں دے سکتے۔“

”کیونکہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے..... کتنی بار سنو گی‘ جانتی تو ہو‘ بار بار پوچھنے سے جواب نہیں بدل جائے گا۔“

”کیوں نہیں کر سکتے..... زویا کے لیے؟“

”اگر زویا نہ بھی ہوتی رامین تو بھی تم نے نہیں ہونا تھا..... فائق تم سے اتنی محبت کرتا ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں‘ میرے لیے تم ہمیشہ سے اس کی منگیتر اس کی محبت ہی رہی ہو‘ رشتوں کو سمجھو رامین‘ میرے پاس بار بار آ کر خود کو میری نظروں میں مت گراؤ۔“

”محبت پر کسی کا زور تو نہیں نا جاذب۔“

”اب سچ کہہ ہی دیا ہے تو اسے سمجھ بھی لو..... میں زویا سے محبت کرتا ہوں اور میرا بھائی تم سے..... تم فائق سے شادی کرو یا نہ کرو میرے پاس نہ آنا۔“

”میں تمہارے پاس آؤں گی‘ بار بار آؤں گی‘ اس وقت تک آؤں گی جب تک تم مان نہیں جاتے۔“ غصے سے وہ کمرے سے نکلی۔

✵ ✵ ✵

”تم تب جھوٹ بول رہی تھیں یا اب بول رہی

ہو۔" پہل تایا جی نے سوال پوچھ کر کی۔
"باربار کی دھتکار نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔" سب رامین کو گھور رہے تھے..... آغاز کچھ بھی رہا ہو..... انجام ان کے سامنے تھا۔

وہ فائق سے منگنی کس بل پر توڑتی' فائق سے نہ ہوتی' کہیں اور ہو ہی جاتی۔

کافی سالوں سے مختلف بہانوں سے وہ شادی ٹالتی رہی تھی' ایک لمبے انتظار کے بعد تو جاذب لاہور سے آتا تھا اور آنے پر بھی اس کا سامنا نہیں کرتا تھا۔

تایا جی نے خود ہی تاریخ طے کر دی۔ خاندان بھر میں دونوں کی شادی کی تیاری ہونے لگی۔

وہ کتنی بار جاذب کے پاس گئی ہر بار جاتی اور آکر پھر جاتی۔

"تم اتنا گر جاؤ گی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔" نفرت سے جاذب نے اسے دھتکار دیا۔

"کس بل پر مجھے بہکانے آئی ہو..... افسوس کہ تم نے اپنے لیے میرے دل میں موجود عزت بھی کھو دی۔"

"مجھے نہیں چاہیے ایسی نام نہاد عزت....." اس نے چیخ کر کہا۔

"لعنت ہے ایسی محبت پر جو انسان کو اتنا ذلیل کرواتی ہے' کتنا شریف ہے فائق اور کتنی محبت کرتا ہے تم سے..... اسی کی عزت بننے جا رہی ہو۔"

"نہیں بننا مجھے اس کی عزت۔"

"کس نے کہا بنو..... نہ بنو' نہ کرو فائق سے شادی اپنی عزت کی نیلامی تو نہ کرو..... فائق کے لیے تم سے بڑھ کر کوئی آزمائش نہیں ہوگی' جاؤ پلیز یہاں سے۔"

"چلی جاؤں گی تمہیں نہیں جانے دوں گی..... تم کیسے سکھی رہو گے میری محبت ٹھکرا کر۔" شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی وہ پاگل ہو گئی تھی۔

"تمہیں لحاظ ہے اپنی محبت کا' نہ کرو کسی سے بھی شادی' جوگ لے لو..... کتنا سمجھایا ہے تمہیں' تم سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔"

"لحاظ ہے محبت کا اسی لیے تو آئی ہوں تمہارے پاس' جس سے محبت نہیں' کیسے رہ لوں اس کے ساتھ"

"مجھے بھی تم سے محبت نہیں میں کیسے مان جاؤں"

"تمہیں ماننا پڑے گا' زویا سے تمہارے شادی کبھی نہیں ہو گی۔"

"تم روکو گی ہماری شادی کو۔"

"میں روک بھی سکتی ہوں اور توڑ بھی سکتی ہوں۔"

"تم اپنا رشتہ فائق کے ساتھ توڑ سکتی ہو میرا نہیں۔"

"رشتہ صرف تمہارا اور میرا بنے گا' میں سب کو بتا دوں گی کہ ہم دونوں محبت کرتے ہیں' فائق خود ہی پیچھے ہٹ جائے گا' تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہی پڑے گی"

"کر لو جو کرنا ہے..... میری طرف سے مر جاؤ۔ مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

☼ ☼ ☼

رات گئے اس کا فون بجنے لگا۔

"تم نے کہا تھا نا کہ مر جاؤ' آ گئی ہوں مرنے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو۔"

"بکواس نہیں کر رہی..... جب اسٹیشن سے میری لاش ملے گی تو تمہیں یقین آئے گا' دنیا کو بھی پتا چلے گا کوئی محبت میں مر بھی سکتا ہے..... دیکھ لو جاذب میں تمہارے لیے یہاں مرنے آ گئی ہوں' بچانا چاہتے ہو تو بچا لو..... مگر پھر مجھ سے شادی بھی کرنی پڑے گی۔ ورنہ ٹرین کے آنے میں تھوڑا سا ہی وقت رہ گیا ہے۔"

وہ اتنا حواس باختہ ہوا کہ بائیک کو کک لگاتے ہی منٹوں میں اسٹیشن پہنچ گیا وہ جانتا تھا..... رامین پاگل ہے اور پاگل کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

"تم جیسی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے۔" اسٹیشن پر جہلم کے اکا دکا لوگوں میں وہ اکیلی چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔



"تم پر مرمٹی ہوں کافی نہیں ہے۔" وہ مسکرانے لگی کچھ تو تھا اس کی مسکراہٹ میں جو بہت دلفریب تھا۔

"بکواس بند کرو اور چلو یہاں سے' میں آج جاتے ہی سب کو سب کچھ بتا دوں گا' بہت کر لیا تمہاری عزت کا لحاظ۔"

"جانے کے لیے نہیں آئی۔" وہ اور مسکرانے لگی۔

"بتا دینا سب کو سب کچھ' میں بھی تو یہی چاہتی ہوں کہ تم سب کو بتا دو۔"

وہ تاسف سے اس کی طرف دیکھنے لگا رات کے بارہ بجے اس جیسی لڑکی ہی یہ حرکت کر سکتی تھی۔

"اتنا دھتکارنے پر بھی اگر عورت باز نہ آئے تو اس کی ذات بدل جاتی ہے۔"

"مجھے ذات سے کوئی سروکار نہیں وہ کوئی بھی ہو۔"

"چلو یہاں سے..... دس دن بعد تمہاری شادی ہے کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو ساری عمر کنواری ہی رہو گی۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"چلو....." جاذب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا اکا دکا لوگ بھی انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے اٹھا سکتا' رامین نے اپنا منہ چادر میں چھپا لیا' وہ حیران ہو رہا تھا۔

"جاذب....." تایا جی کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

فائق' رامین کے ابو اور اس کے چچا' اس کا پھوپھی زاد کزن فاخر اور تایا جی..... سب تھے وہاں۔

"تایا جی آپ....." وہ بے انتہا حیران ہوا۔

"انہیں کس نے بتایا' رامین تو بتانے سے رہی۔"

فائق کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں' اس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی اکثر بری خبر سن کر ہو جایا کرتی تھی..... وہ لڑکا تھا لیکن اس کا دل اپنی ماں پر گیا تھا' بات بات پر رونے والا۔

"عزت کا جنازہ ہی نکالنا تھا تو ذرا ڈھنگ سے نکالتے۔"

"تایا جی..... کیا سمجھ رہے ہیں آپ..... یہ۔" اس نے رامین کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ یہاں مرنے آئی تھی۔" اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کہے کیا۔

"مار تو تم دونوں نے ہمیں دیا ہے۔" چھوٹے چچا بھڑک اٹھے۔

جاذب نے رامین کی طرف غصے سے دیکھا..... اس کے پاس ہی چھوٹا سا کپڑوں کا بیگ رکھا تھا وہ چادر اوڑھے بیٹھی تھی اور ٹرین آنے ہی والی تھی۔

"مجھے اس نے فون کیا کہ یہ خودکشی کرنے لگی ہے' مرنے لگی ہے ٹرین کے نیچے آکر' آپ میرا فون چیک کر لیں اس نے مجھے فون کیا تھا۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے خودکشی کرنے کی' جھوٹ مت بولو' جاذب۔" رامین لڑکی سے کالی جادوگرنی بن گئی۔

"جھوٹ تو تم بول رہی ہو' خاندان کا اور اپنی عزت کا تماشا بناتے تمہیں شرم آنی چاہیے۔" جاذب کے لیے یہ سب اس کی سوچ سے بڑھ کر تھا۔

"رامین کو کیا ضرورت ہے خودکشی کرنے کی' دس دن بعد اس کی شادی ہے۔"

"یہ بات چچا جان آپ اس سے پوچھیے..... اپنی لاڈلی بیٹی سے۔"

"اس سے پوچھوں یا تم سے پوچھوں' آدھی رات کو یہ اسٹیشن مرنے کے لیے آئی تھی مرنا ہی ہوتا تو گھر میں مر جاتی۔" چھوٹے چچا کو غصے سے زیادہ رنج تھا۔

"مرنا ہی ہوتا تو مرتی نہ..... اس سے پوچھیے یہ اسٹیشن کیوں آئی تھی؟"

"میں آئی تھی یا تم لے کر آئے تھے' تمہارے ساتھ ہی تو آئی تھی۔"

"مجھے کیا ضرورت تھی تمہیں لے کر آنے کی۔" جاذب کا بس نہیں چل رہا تھا اس کا منہ توڑ ڈالے رامین پھر ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں موجود اور لوگ بھی رو رہے تھے' اس کی ماں' رامین کی ماں' آپا اور شاید فائق بھی۔

"جاذب' رامین کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" تایا جی گرجے' سب کچھ ان کی سمجھ سے بڑھ کر تھا۔ ان کی آواز لرزنے لگی۔

"کیونکہ یہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔" جاذب نے اس بار فائق کا خیال نہیں کیا۔

"تو پچھلے دو گھنٹوں سے وہ بھی یہی کہہ رہی ہے کہ تم اسے لاہور لے کر جا رہے تھے' نکاح کے لیے۔" غصے سے تایا جی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"یہ اس کا کہنا ہے..... آپ میری بھی تو سنیے' مجھے کیا ضرورت ہے اس سے نکاح کرنے کی' میں آپ کو بتا تو چکا ہوں کہ اس نے مجھے کتنا تنگ کر رکھا تھا..... آپ کے اسٹیشن آنے سے کچھ دیر پہلے ہی میں وہاں پہنچا تھا اور میں اسے لینے گیا تھا' لے کر نہیں گیا تھا۔" وہ جتنی اونچی آواز میں بول سکتا تھا بولا۔

"اگر تم اسے لینے ہی گئے تھے تو تم اکیلے کیوں گئے' فائق کو ہی بتا دیتے' اپنی ماں کو' اپنی بہن کو کسی کو تو بتاتے۔"

"یہی میری غلطی ہے..... اپنے گھر کی عزت اور اس کی جان کا سوچ کر میں فوراً" اسٹیشن کی طرف بھاگا' میرے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ..... یہ سب کرے گی۔"

"میرے بھی گمان میں نہیں تھا کہ تم ایسے بدل جاؤ گے' اسی نے مجھے گھر کے باہر سے اپنی بائیک پر بٹھایا' ہم دونوں ساتھ اسٹیشن گئے' اسی نے وہاں مجھے اپنا آئی ڈی کارڈ دیا کہ میں اسے سنبھال کر بیگ میں رکھ لوں۔" رامین نے بیگ میں سے آئی ڈی کارڈ نکال کر دکھایا۔

جاذب کو پتا بھی نہیں تھا کہ کب اس کے والٹ میں سے اس کا آئی ڈی کارڈ نکالا گیا۔ ہر شخص اسے گھور رہا تھا اس کا باپ بھی..... رامین اتنی گہری چال بھی چلے گی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"آپ سب اس سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ مجھے کیا ضرورت ہے یہ سب کرنے کی' یہ فائق کی منگیتر ہے میں یہ بات بچپن سے جانتا ہوں۔"

"اسی لیے تو تم نے مجھے کسی سے بات کرنے نہیں دی' یہ کہتا تھا کہ کوئی نہیں مانے گا' کوئی یہ منگنی نہیں توڑنے دے گا' ہم نکاح کر کے سب کو بتا دیں گے۔"

"شادی سے دس دن پہلے ہی مجھے تم سے نکاح کرنا تھا' اور اتنی رات کو ہی لے کر نکلنا تھا تمہیں..... تمہیں تمہارے گھر کے باہر سے بائیک پر بٹھایا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی؟"

"اس سے کیا پوچھ رہے ہو' تم بتاؤ' تم اس کے ساتھ کرنے کیا جا رہے تھے۔" پہلا مکمل ووٹ رامین کے حق میں چچا جان نے دیا..... بیٹی کے باپ تھے بیٹی کو روتا ہوا اور اتنے سارے لوگوں میں ذلیل ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"نکاح کے نام پر کہاں لے کر جا رہے تھے"

"مجھے کیا ضرورت ہے اسے کہیں لے کر جانے کی' بدکردار نہیں ہوں' بھابھی بننے والی تھی یہ میری' میرے چچا کی بیٹی ہے۔"

"لحاظ ہے تمہیں اتنے رشتوں کا۔"

"جی چچا جان' لحاظ ہی تھا ورنہ اسے یہ ڈرامہ نہ کرنا پڑتا۔"

"تم ہی اسے اسٹیشن لے کر گئے' اتنی ہمت نہیں ہے اس کی کہ یہ اکیلی جائے وہاں۔"

"کتنی بار آپ سب کو بتا چکا ہوں' میں اسے لے کر نہیں گیا' مجھے کیا ضرورت تھی۔"

"تمہارے سامنے ہی ہم نے اسٹیشن پر لوگوں سے پوچھا تھا نا' انہوں نے بھی یہی کہا کہ تم ہی رامین کے ساتھ آئے تھے..... تم دونوں کو ساتھ دیکھا تھا انہوں نے۔"

"انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ لڑکے کی شکل نہیں دیکھی انہوں نے' صرف ایک لڑکے کو ہی دیکھا تھا اس کے ساتھ..... یہ جانتی ہے کون ہے وہ۔"

"اور وہ لڑکا تم تھے۔" چچا جان بھڑک اٹھے۔

"وہ' وہ تھا جس کے ساتھ یہ اسٹیشن گئی ہو گی' اس سے پوچھیے۔"

"میں کس کے ساتھ جاؤں گی' الزام مت لگاؤ' مجھ سے تم نے ہی چھپ کر نکاح کے لیے کہا تھا..... پہلے اپنی محبت کا یقین دلاتے رہتے تھے۔" رامین پھر رونے لگی۔ "اب صاف پیچھے ہٹ گئے ہو۔"

"اتنی رات کو یہ کس کے ساتھ جائے گی۔"

"جو لڑکی اپنے خاندان' اپنے گھر والوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر اسٹیشن جا سکتی ہے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے..... ساتھ ساتھ ہی گھر ہیں نا ہم سب کے' کسی کو کانوں کان خبر ہونے دی اس نے۔"

"کانوں کان تو تم نے خبر نہ ہونے دی' کچھ بھی کر سکتے تھے تم' اگر اس کی سہیلی فون کر کے نہ بتاتی تو تم تو لے گئے تھے اسے۔"

"سب ڈراما ہے اس کا..... سہیلی نے بھی عین وقت پر ہی فون کرنا تھا۔ پہلے کیوں نہیں بتایا اس نے کہ رامین بھاگ کر نکاح کر رہی ہے۔"

رامین کا رونا اور تیز ہو گیا ہے۔

"میں نے اسٹیشن پہنچ کر اسے کال کی تھی کہ ہم دونوں نکاح کرنے جا رہے ہیں' مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ سب کو بتا دے گی۔" رامین ہر سوال کے لیے تیار تھی' ہر شخص خاموش تھا..... لیکن بہرحال وہ ابھی صرف سن ہی سکتے تھے۔

جاذب نے فائق کی طرف دیکھا' اسے سب سے زیادہ فکر فائق کی تھی' یہ اس کا وہ بھائی تھا جو رامین سے بے حد محبت کرتا تھا' اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے' دس دن بعد اس کی بیوی بننے والی لڑکی اس کے چھوٹے بھائی کے ساتھ چھپ کر نکاح کرنے جا رہی تھی۔

"رامین تمہیں یہ سب کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا' تم کتنا بھی جھوٹ بولو میں تمہاری بات نہیں مانوں گا۔" جاذب ڈرا ہوا ضرور تھا مگر وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔

"میں نے تمہاری بات مانی..... تمہارے کہنے پر تمہارے ساتھ گئی اب تم مجھے الزام دے رہے ہو' دھوکا کر رہے ہو۔" رو رو کر رامین کی آنکھیں سوج گئی تھیں' اس کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی اور وہ سب سے زیادہ بے بس نظر آ رہی تھی۔

"جاذب اب تم کیا چاہتے ہو؟" تایا جی کافی دیر سے سب کو صرف سن ہی رہے تھے۔

"میں چاہتا ہوں یہ سچ بولے۔"

"تو تم سچ بول دو۔"

"میں سچ ہی بول رہا ہوں۔" اس نے دو ٹوک جواب دیا' ڈرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔

"اس کا بھی کہنا ہے کہ یہ سچ بول رہی ہے۔"

"اس کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ سچ بول رہی ہے۔"

"تم اپنا ثبوت دے دو۔"

تایا جی کی اس آخری بات نے کہانی پر آخری کیل ٹھونک دی تھی جاذب خاموش ہو گیا' وہ سب کے چہرے پڑھ سکتا تھا کہ اس پر کتنا یقین کیا گیا ہے۔ فائق خاموش تھا لیکن وہ رونا چاہتا تھا۔

کچھ اسے صرف گھور رہے تھے اور کچھ جان سے مار دینا چاہتے تھے۔

"صبح ہوتے ہی تم دونوں کا نکاح پڑھوا دیا جائے گا' جہاں مرضی رہنا جا کر' اس خاندان میں تم دونوں کے لیے جگہ نہیں ہے۔"

فیصلہ تایا جی نے ہی کرنا تھا..... کر دیا۔

"نکاح اس سے' اس ذلیل عورت سے میں مر جاؤں گا مگر اس سے نکاح نہیں کروں گا۔" جاذب تڑپ اٹھا۔

"خبردار جو میری بیٹی کو ذلیل کہا' ذلیل تو تم ہو' ذلیل تم نے اسے کیا ہے۔ لاہور جا کر پتا نہیں کیا کیا گل کھلائے ہوں گے۔"

"میرے کردار پر کیچڑ مت اچھالیں۔ چچا جان..... آپ کو معلوم ہی نہیں ہے کہ آپ کس کے حق میں بول رہے ہیں۔"

"تم بدکردار ہو..... تم بدکردار ہو..... جس نے اپنے بھائی اور خاندان کے ساتھ یہ سب کیا۔"

"مجھے الزام دینے سے پہلے اپنی بیٹی کے بارے میں

سوچیے جو آدھی رات کو اکیلی اسٹیشن پر موجود تھی...... اس کا کردار کیا ہے؟"

"وہ تمہارے ورغلانے پر گئی تھی۔"

"خاندان اور خاندان سے باہر کون کرے گا اس سے شادی...... جاذب کچھ تو خیال کرو خاندان کی عزت کا۔" چھوٹی چچی رونے لگیں۔

رامین کو غشی کے دورے پڑنے لگے۔

"تمہیں اپنی بدنامی کو سنبھالنا ہی پڑے گا' ورنہ میں تم دونوں کو مار ڈالوں گا۔"

"میں مرنے کے لیے تیار ہوں..... نکاح میں صرف زویا سے کروں گا۔"

"زویا کا نام مت لانا اپنی زبان پر..... خاندان کی کسی لڑکی کا نام مت لینا۔" تایا جی غصے میں آگ بگولا ہو گئے۔

کوئی رو رہا تھا' کوئی بول رہا تھا..... کوئی صرف سن رہا تھا' اس کی ماں بے حد غم زدہ تھی..... کئی گھنٹوں سے تماشا لگا ہوا تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا جاذب۔" فائق کی آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔

"نکاح تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔" ان سے اپنی بیٹی دیکھی نہیں جا رہی تھی' کیسے بلک بلک کر رو رہی تھی رامین۔

"یہ مجھ پر حرام ہے..... نہ مجھے اس سے نکاح کرنا تھا اور نہ میں کروں گا۔" جاذب نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی اس کی اس وقت نہیں سنے گا' اس خاندان میں اس کی کم ہی سنی اور سمجھی جاتی تھی۔

"پھر کہاں لے کر جا رہے تھے؟"

"کسی بھی مقصد کے لیے مجھے اسے کہیں بھی لے کر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"ایسی ہی باتیں کر کے تم نے رامین کو ورغلایا ہو گا' بڑا مان تھا تمہارے باپ کو تم پر..... پوزیشن ہولڈر بیٹے کے کرتوت دیکھو..... خاندان کی ناک کٹوا دی۔"

"ابو کو کچھ مت کہیے وہ آپ کے بھائی بھی ہیں۔"

"بھائی تو تم بھی ہو فائق کے..... یہی تعلیم لیتے رہے ہو لاہور سے' اسی لیے اتنا پیسہ لگا تا رہا ہے تمہارا باپ تم پر..... تمہارے باپ کو سننی پڑیں گی اب یہ باتیں۔"

وہ اپنے خاندان میں بڑبولا مشہور تھا' منہ پھٹ بدتمیز کسی کی نہ ماننے والا فلسفی' اپنی تعلیم اپنی روشن خیالی کی وجہ سے وہ کافر سمجھا جاتا تھا' پڑھا لکھا کافر..... روشن خیال کافر......

اس کی باتوں پر طنز کیے جاتے تھے' اس کے کزنز احساس کمتری کا شکار رہتے تھے اس کے سامنے' وہ کوئی موقع نہیں جانے دیتے تھے اسے نیچا دکھانے کا' اس کی باتوں کو بلاوجہ رد کیا جاتا تھا کیونکہ انہیں کہنے والا جاذب ہوتا تھا..... وہ ایک عرصہ سے سب کا مجرم تھا..... جب سے اس نے من گھڑت مذہبی عقائد کو جھٹلانا شروع کیا تھا۔ وہ اس وقت بھی مجرم ہی تھا..... اس نے رامین کو ورغلایا تھا' وہ رامین کی طرح رو نہیں سکتا تھا' بے ہوش نہیں ہو سکتا تھا..... وہ سچا تھا لیکن لگ نہیں سکتا تھا وہ کمرے میں موجود ہر شخص کی آنکھیں پڑھ سکتا تھا' انہیں سچائی دکھا نہیں سکتا تھا اس سے ان آنکھوں میں اپنے لیے حقارت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

وہ رامین کو صرف پاگل اور بے وقوف سمجھتا رہا تھا' اسے یقین تھا شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا..... فائق اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن یہ صرف اس کا خیال تھا' رامین اس کے خیال سے بھی آگے تھی۔ اس کے باپ کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور ماں رو رہی تھی..... انسان کے پاس اپنی ایک ہی تو دولت ہوتی ہے۔ "عزت۔"

"رامین۔" اس نے اسے براہ راست مخاطب کیا۔ اس کی ماں اسے پانی پلا رہی تھی وہ بار بار ڈوپٹے سے اس کے آنسو صاف کر رہی تھی۔

"تم جانتی ہو سچ کیا ہے..... میں بھی جانتا ہوں۔ میں تم سے اسی وقت نکاح کروں گا..... تم سب کے سامنے سچ بول دو۔"

رامین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اسے تو تو‌قع نہیں تھی کہ وہ یہ سب کہے گا' اب تک سب کچھ اس کی توقع کے مطابق ہی ہو رہا تھا اسے اندازہ تھا آگے بھی ہوتا رہے گا۔

"تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لیے یہی وقت ہے اسی وقت سچ بول دو' میں اپنے کہے سے نہیں پھروں گا..... میں تمہیں برداشت کر سکتا ہوں خود پر لگائے گئے الزام کو نہیں' میں نہیں چاہتا کہ میرے باپ کو میری تعلیم کے طعنے سننے پڑیں..... اور میری ماں کا سر جھکا رہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ خاندان میں کم گو مشہور تھی' اپنے کام سے کام رکھنے والی' کچھ کے لیے نک چڑھی' کچھ کے لیے لاپروا' کبھی غصہ ور اور کبھی بے حد چڑچڑی' خاندان کے بڑے اسے بہت پسند کرتے تھے' صوم و صلوۃ کی پابند مذہبی اجلاس میں جھوم جھوم کر حمد و ثنا کرنے والی' نہ وہ محفل کی جان تھی نہ خاندان کی رونق' خاموشی سے کئی کئی گھنٹے گزار دیتی تھی' بڑوں کی ہاں میں ملاتی تھی دوسروں کی طرح ہنگامہ نہیں کرتی تھی۔

اس جیسا لاپروا بندہ محبت تو کر سکتا ہے' ہنگامہ نہیں کر سکتا مجھے یہ چاہیے' ایسا ہی چاہیے' یہ سب وہ کم ہی کہتی تھی۔

جس ڈرامے کو رچائے وہ اس کمرے میں بیٹھی تھی' اس جیسا شخص یہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس ڈرامے کا اختتام نہیں کر سکتی تھی..... وہ جانتی تھی جاذب کو اس سے نکاح کرنا ہی پڑے گا..... یہ اسی کا ہے..... اس کے اندازے کبھی غلط نہیں ہوئے تھے جس طرح وہ اسٹیشن بھاگا چلا آیا..... اسی طرح یہ نکاح بھی کرے گا۔

"جاذب مجھے لاہور نکاح کے لیے لے جا رہا تھا۔" رامین نے اپنی لرزتی آواز میں بول دیا فائق کی آخری امید کی کرن بھی ختم ہو گئی' وہ چکرا کر گر گیا' بچپن کی بیماریوں نے اسے جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور بنا دیا تھا' اس کا دل بچے جیسا تھا جو بکرے کو ذبح ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتا..... فائق کے لیے یہ زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا۔

فائق کے نارمل ہوتے ہی وہ لاہور چلا گیا۔ اس کا دوبارہ آنے تک پتا نہیں کون کون اسے ڈھونڈنے لاہور آتا رہا۔

وہ جانتا تھا اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی فائق رامین سے شادی ضرور کرے گا' وہ اس کی محبت تھی اور مظلوم بھی۔

☼ ☼ ☼

"تم اسٹیشن کس کے ساتھ گئی تھیں۔" جاذب نے پوچھا۔

"قدسیہ کے منگیتر کے ساتھ۔" رامین نے باری باری سب کو دیکھنے کے بعد کہا' اس کے باپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ لیکن وہ کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے..... کہنے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔

"میں پاگل تھی مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہی لرزتی آواز۔

"تم نے جو کرنا تھا کر دیا..... اب وقت گزر گیا ہے۔"

جتنی برہمی آج سے سات سال پہلے تھی وہ آج وہاں نہیں تھی۔ سننے والوں کو یقین آیا تھا یا نہیں لیکن وہ اب کسی کو الزام نہیں دے سکتے تھے ان سب کی ناک کے نیچے کیا کیا ہوتا رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں..... میں بے وقوف تھی..... ناسمجھ تھی۔" اس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی سات سال پہلے تھی' دکھی' مظلوم' تڑپتی ہوئی' بے چین۔

"ثریا' رامین کو اندر لے جاؤ۔" تایا جی بہرحال اسے اتنا روتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"میں رات کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں۔" اس سے پہلے کہ رامین کمرے سے چلی جاتی..... جاذب نے اسے سنا دیا۔

رامین سچ میں بے ہوش ہونے والی ہو گئی......

"کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے وعدہ کیا ہے نکاح کا..... رامین نے اپنی غلطی مان لی ہے اب تم اپنا آپ مت دکھاؤ۔" چھوٹے چچا بمشکل بولے۔

"سات سال بعد..... جب سب کچھ تباہ ہو گیا..... میرا دل اجڑ گیا۔ آپ سب نے زویا کی شادی کہیں اور کر دی' میرا بھائی مر گیا..... سات سال مجھے اس گھر

سے دور رہنا پڑا..... سات سال بعد بھی اس نے سودا ہی کیا نا..... اس سے پہلے اس کے اندر کا انسان کبھی نہیں جاگا۔

ایک ڈرامہ اس نے کیا تھا ایک میں نے کر دیا۔ خود پر لگی تہمت مٹانے کا، یہ مجھ پر کل بھی حرام تھی آج بھی ہے۔

ارادہ تو میرا نکاح کر کے طلاق دینے کا تھا، لیکن سوچا رامین سے پوچھ لوں، بیوگی کے ساتھ ساتھ طلاق کا دھبا سنبھال لے گی۔"

رامین کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ اس کے اندازے ہمیشہ سے غلط رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے بین کرے۔

"اتر آئے نا پھر اپنی کمینگی پر۔"

"حیرت ہے چچا جان سب کچھ جان کر بھی آپ مجھے یہ سب کہہ رہے ہیں۔"

"معاف کرنے میں عظمت ہے جاذب۔ جو کچھ ہوا وہ اس کی بے وقوفی تھی۔" تایا جی بولے۔

"اس کی بے وقوفی نے میری زندگی میں کرب بھر دیا، دکھ اور تہمت دی، لوگوں کو صفائیاں دیتے دیتے میں تھک گیا، میرا اپنا بھائی نفرت کرنے لگا تھا مجھ سے..... کتنی حقارت دی آپ سب نے مجھے، اس کی وجہ سے، اس سے پوچھیے کہ جب عورت اس جیسی ہو جاتی ہے تو وہ کیا کیا کرتی ہے۔"

"اور کیا سننا چاہتے ہو۔" تایا جی کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

"بس کرو جاذب..... اتنا بوجھ نہ ڈالو ہم سب پر..... تم ہی لوگوں کی نادانی....."

"رامین ابھی بھی بہت کچھ بتا سکتی ہے آپ کو..... یہ آپ کو بتا سکتی ہے کہ اس نے سات سال فائق کے ساتھ کیسے گزارے..... کتنا آسودہ رکھا اسے۔"

"الزام مت لگاؤ، میری بچی پر....." چچی تڑپ اٹھیں۔

"بکواس بند کرو اپنی، تم ہمیشہ سے ایسے ہی تھے، نالائق اور بدزبان۔" چچا جان اس الزام پر تڑپ اٹھے۔

"پوچھیے رامین سے کیا کیا کہتی رہی ہے یہ فائق سے پہلے وہ سمجھتا تھا کہ میں نے ہی رامین کے ساتھ ٹھیک نہیں کیا، لیکن اس نے خود فائق کو سب کچھ بتایا اپنے شوہر کو اس کے بھائی کے ساتھ اپنے عشق کے قصے سنایا کرتی تھی، اور آپ کہتے ہیں وہ بیمار تھا، اسے بیمار ہی رہنا تھا ایسی بیویوں کے شوہر بیمار ہی رہتے ہیں، اتنا حساس تھا کہ اس نے میری منت کی کہ میں اس سے شادی کر لوں..... اتنی محبت کرتا تھا وہ اس سے۔"

اس کا باپ اسے اشارہ کر رہا تھا کہ وہ خاموش ہو جائے۔

"اب اس نے اپنی غلطی مان لی ہے تو جو چاہو اس پر الزام لگاتے رہو۔ اب سارے گناہ تم اس کے حساب میں ڈال دو..... ایک بیمار کی خدمت کرتی رہی، اس کے ساتھ گزارا کیا اور یہ صلہ ملا۔" چچا جان ابھی بھی وہی تھے، رامین کے حق میں۔

کسی نے یقین کیا یا نہیں جاذب کو فرق نہیں پڑتا تھا..... وہ جانتا تھا ان سب کے لیے سچ بھی جھوٹ ہی ہے..... وہ نالائق تھا اور نالائق سب کے لیے نالائق ہی رہے گا۔

"جن خواہشات کی تکمیل کے لیے غلط راستے چنے جائیں ان کی تکمیل کبھی نہیں ہوتی۔" اس نے تایا جی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں آج رات کی فلائٹ سے جا رہا ہوں، یہاں رہ کر میں اور مسئلے بنانا نہیں چاہتا..... فائق کے بچے میرے ہیں، وہ میری ذمہ داری ہیں۔" جاذب نے ٹھہر کر سب کی طرف دیکھا۔

رامین نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ کمرے سے جا چکا تھا..... اسے جانا ہی تھا۔

ایسی خواہشات جن کے لیے انسانیت سے گرنا پڑے صرف دکھ کا ہی باعث بنتی ہیں۔ زندگی کی ڈور تو سیدھی ہی ہے انسان ہی اسے الجھا دیتا ہے۔

رامین ایسے گم سم بیٹھی تھی جیسے اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔

وہ بھرم بھی گیا جو خاندان میں بنائے بیٹھی تھی.....

بات تو معمولی سی تھی لیکن جانے کیسے ثنا جیسی سمجھ دار لڑکی نے اسے اتنا بڑھا دیا جیسے رائی کا پہاڑ۔ اور پھر ذرا ذرا باتوں کو بڑھا کر اپنا مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنا ثنا کی زندگی کا حصہ بنتا چلا گیا اور محض اپنی ”انا کی تسکین“ کے لیے اس کھیل میں اسے دن بہ دن مزا آنے لگا۔

ثنا کی شادی کو تقریباً چھ ماہ ہو چکے تھے۔ اس کا سسرالی گھر دو فلورز پر مشتمل تھا، نیچے والے فلور پر ثنا اپنے شوہر اور ساس کے ساتھ رہائش پذیر تھی جبکہ اوپر ثنا کی جٹھانی مائرہ جیٹھ جاوید اور ان کے دو عدد بچے صبا اور زیرک رہائش پذیر تھے۔ مائرہ ظاہری طور پر ایک نہایت ہی خوش اخلاق خاتون تھیں اور اس نے ان چند ماہ میں ہی ثنا کو اپنا دیوانہ بنا لیا تھا اور ثنا جو کہ اکلوتی ہونے کے سبب شروع سے ہی بہن کے پیار کو ترسی ہوئی تھی مائرہ کو اپنی بہن سمجھنے لگی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی یہ دوستی مثالی ہوتی گئی یہاں تک کہ شادی کے چند ہی دنوں بعد ثنا کا یہ معمول بن گیا کہ وہ جیسے ہی نیچے کا کام ختم کرتی اوپر ”بڑی بھابھی“ یعنی مائرہ کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور پھر مزے سے ساری دوپہر وہاں گزار کر شام تقریباً پانچ بجے تک نیچے آتی اور پھر جاذب کے آنے تک کھانا بنانے کا کام نبٹاتی۔

حسب معمول آج بھی اس نے جلدی جلدی کام ختم کیا۔ امی کو کھانا دیا خود بھی جیسے تیسے کھایا اور برتن سمیٹ کر سنک میں رکھ کر فوراً ہی اوپر چلی آئی جہاں پھیلا سناٹا واضح کر رہا تھا کہ بچے اسکول سے آکر اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں اور ”بھابھی“ یقیناً اس وقت اپنے کمرے میں ہوں گی کیونکہ یہ وقت ان کے اسٹار پلس کے ڈراموں کا ہوتا تھا جبکہ نیچے ان کے ہاں کیبل ہی موجود نہ تھا کیونکہ اس کی ساس کو انڈین ڈرامے سخت ناپسند تھے اس کے علاوہ بھی شاید وہ ٹی وی دیکھنا وقت کا ضیاع سمجھتی تھیں اور ثنا کو کیبل کی ضرورت اس لیے نہ پڑی کہ وہ جب سے بیاہ کر آئی تھی اوپر بھابھی کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی اس وقت بھی اس نے آگے بڑھ کر آہستہ سے ان کے بیڈ روم کا دروازہ کھولا تو اے سی کی خنکی کے ساتھ ساتھ موتیا کی دلفریب خوشبو بھی اس کی نتھنوں سے ٹکرائی اور مائرہ جو بڑی دل جمعی کے ساتھ ڈرامہ دیکھنے میں مشغول تھی دروازے کی آواز سن کر ذرا سا پلٹی اور ایک ناقدانہ نگاہ پنک اور میرون سوٹ میں ملبوس ثنا پر ڈالی جس کی سرخ و سفید رنگت پر یہ سوٹ اور اس کا کلر خوب کھل رہا تھا۔

”آجاؤ...“ انہوں نے مسکراتے ہوئے بیڈ پر ذرا سا پرے کھسک کر ثنا کے لیے جگہ بنائی۔

”آج تو آپ کے روم سے بڑی اچھی خوشبو آرہی ہے۔“ ثنا نے موتیا کی خوشبو کو سانس کے ذریعے اندر اتارتے ہوئے کہا۔

”ہاں دراصل جاوید روزانہ رات میں گھر آتے ہوئے میرے لیے گجرے لازمی لاتے ہیں ویسے تو میں فریج میں رکھ دیتی ہوں لیکن آج اے سی کے پاس رکھے تو دیکھو کتنی اچھی خوشبو آرہی ہے۔“ بڑی بھابھی نے ریموٹ سے چینل تبدیل کرتے ہوئے اک نگاہ طائرانہ پھر سے ثنا کے سراپے پر ڈالی اور بظاہر سرسری سے لہجہ میں جواب دیا۔

”تمہیں پھول نہیں اچھے لگتے؟“ سوال پوچھ کر وہ پھر سے چینل سرچنگ میں مصروف ہو گئیں۔

”نہیں نہیں آپ سے کس نے کہا؟ مجھے تو پھول بے حد پسند ہیں۔“ ثنا نے دھیرے سے جواب دیا۔

”اچھا میں تو سمجھی شاید...“ بات کو دانستہ ادھورا چھوڑ کر انہوں نے ثنا کی جانب تکا جو پوری توجہ سے ان کی بات کے مکمل ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

”دراصل میں نے کبھی تمہیں گجرے، پھول پہنے نہیں دیکھا یہاں تک کہ کبھی تمہارے روم میں بھی کوئی پھول نہیں ہوتا اس لیے میں سمجھی کہ شاید... ورنہ شادی کے شروع کے دنوں میں تو پھول، خوشبو اور موسم سب بہت خوبصورت لگتے ہیں۔“ بھابھی نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

”بس ویسے ہی مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا۔“ شرمندگی خود بخود اس کے لہجہ میں در آئی۔

”بہرحال یہ خیال تو جاذب کو رکھنا چاہیے کہ تمہیں باہر جاتے ہوئے کم از کم گجرے تو لے دیا کرے اب جاوید ہی کو دیکھو ہماری شادی کو تقریباً دس سال ہو چکے ہیں لیکن آج بھی پہلے دن کی طرح روزانہ میرے لیے پھول لانا کبھی نہیں بھولے۔“ وہ ذرا سا سانس لینے کو رکیں اور ثنا پر ایک نگاہ ڈالی۔

”ہو سکتا ہے کہ اس کی ایک وجہ ہماری پسند کی شادی ہو، تم تو جانتی ہی ہو کہ جاوید شادی سے پہلے بھی میرے اتنے ہی دیوانے تھے اور آج تک ہیں، اور اللہ ہمیشہ انہیں ایسا ہی رکھے۔“ بات کرتے کرتے ان کا لہجہ فخریہ سا ہو گیا۔

”دوسری بات میں کہنا تو نہیں چاہتی لیکن جاذب ذرا روکھے مزاج کا نوجوان ہے جبکہ جاوید تو خاصے زندہ دل اور خوش مزاج ہیں۔ صحیح کہہ رہی ہوں نا میں۔“ بات کے اختتام پر انہوں نے ثنا سے رائے لینا ضروری سمجھا۔

”جی...“ ثنا کی مری مری سی آواز نکلی۔

”ویسے ایک مشورہ دوں اگر تم برا نہ مانو تو۔“

”ارے ضرور دیں بھلا میں آپ کی بات کا برا مان سکتی ہوں۔“

”دیکھو ثنا اگر تمہیں پھول پسند ہیں تو اپنی یہ پسندیدگی جاذب کے علم میں لاؤ تاکہ اسے احساس ہو کیونکہ یہ ہی وہ وقت ہے جب اسے علم ہونا چاہیے کہ تمہیں کیا پسند ہے اور کیا ناپسند اور اگر آج تم نے اسے اپنی پسند اور ناپسند کا احساس نہ دلایا تو ہمیشہ ایک روکھی پھیکی زندگی گزارتی رہ جاؤ گی۔“

ثنا کو ہمدردی اور پیار سے مشورہ دیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور ذرا سی دیر میں جوس کا گلاس اور بسکٹس کی پلیٹ لا کر اس کے سامنے رکھ دی لیکن جانے کیوں آج ثنا کا کچھ بھی کھانے کو ذرا بھی دل نہ چاہا یہاں تک کہ جوس کا ایک ایک گھونٹ بھی اس کے حلق سے پھنس پھنس کر اترا اور اس کے دماغ کی سوئی گجرے، موتیا، خوشبو، پسند اور ناپسند کے درمیان اٹک سی گئی اور جب تک اپنی اس فرمائش کو اس نے جاذب تک نہ پہنچایا اسے سکون حاصل نہ ہوا اور پھر روزانہ نہ چاہتے ہوئے بھی گجرے لانا جاذب کی روٹین میں شامل ہو گیا اور اپنی اس ایک بات کے مانے جانے سے ثنا کی ہمت مزید بڑھ گئی اسے احساس ہوا کہ وہ اگر کوشش کرے تو اپنی زندگی میں کئی نئی چیزوں کو با آسانی شامل کر سکتی ہے۔

بس اسی احساس کے زیر اثر معمولی معمولی باتوں پر ایشو کھڑا کرنا اور ہر حال میں اپنی بات منوانا ثنا کے معمولات میں شامل ہوتا گیا اور اپنے اس عمل سے وہ دوسروں کی نظروں میں اپنا وقار اور حیثیت کس طرح کم کر رہی ہے اس کا اسے ذرا برابر بھی احساس نہ تھا اپنے ٹی وی پر کیبل لگوانا ثنا کی دوسری بڑی کامیابی تھی حالانکہ کیبل کے سلسلے میں جاذب کو تو شروع سے ہی کوئی اعتراض نہ تھا لیکن چونکہ اس کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی تھی اس لیے اس نے دھیان ہی نہ دیا اب جو ثنا نے ضرورت کا احساس دلایا جاذب نے اگلے دن ہی کیبل لگوا دیا لیکن کم عقل ثنا نے اسے بھی اپنی ایک کامیابی تصور کیا اب کم از کم بڑی بھابھی کے سامنے وہ بھی فخریہ بتا سکتی تھی کہ جاذب اس کی بات کس قدر مانتے ہیں اپنے ہر مسئلے کو وہ سب سے پہلے بڑی بھابھی سے ہی ڈسکس کرتی کیونکہ اس کے نزدیک ساری دنیا میں اگر کوئی اس کا سچا ہمدرد تھا تو وہ یقیناً ”مائرہ بھابھی“ ہی تھیں یہ ہی وجہ تھی کہ کچھ عرصہ میں ثنا کی حیثیت ایک ایسے ٹی وی جیسی ہو گئی جس کا ریموٹ ہمہ وقت بڑی بھابھی کے ہاتھ میں رہتا بڑی بھابھی کی ہدایات اس کی زندگی کا لازمی جزو بن گئیں۔

”ثنا تم لپ اسٹک کا کلر اتنا لائٹ کیوں لگاتی ہو۔“

”ثنا تم شام میں تیار کیوں نہیں ہوتیں، میں تو شروع سے ہی جاوید کے گھر آنے سے قبل ہی خوب تیار ہو جاتی تھی، یہ ہی وجہ ہے کہ جاوید آج تک میرے اتنے دیوانے ہیں۔“ ثنا بھی آہستہ آہستہ بنا سوچے

سمجھے ان ہی کے رنگ میں رنگتی گئی' جاذب کو کیا پسند ہے؟ اس سے اسے کوئی غرض نہ تھا' اگر کوئی غرض تھا تو صرف اس بات سے کہ بڑی بھابھی کے نزدیک کامیاب زندگی گزارنے کا نسخہ کیا ہے؟ بس اسی نسخہ کے حصول کے لیے وہ ہمہ وقت بڑی بھابھی کی ہدایات پر جی جان سے عمل کرنا اپنا فرض سمجھتی' اس کے نزدیک زندگی کوئی فلم یا افسانہ تھی۔ جس میں اس کا رول ایک ہیروئن کا تھا اور بس زندگی کی حقیقت' رشتے ناتے آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کھوتے چلے گئے۔ اگر اس کی کوئی تمنا تھی تو صرف اتنی کہ جاذب ہر وقت اس کے گرد کسی دیوانے کی طرح گھومتا رہے اس کے حسن کے قصیدے پڑھے' اس کے فراق میں شعر کہے اور جانے کیا کیا اور یہ سب کچھ اس کے دماغ میں لاشعوری طور پر مائرہ بھابھی نے ہی منتقل کیا تھا۔ جس کا ثنا کو ذرا بھی احساس نہ تھا' وہ تو بس کٹھ پتلی کی مانند مقابلے کی اس دوڑ میں شامل ہو چکی تھی۔

جس میں مائرہ بھابھی اس سے آگے تھیں اور اس مقابلے کا اصل مقصد صرف اتنا تھا کہ آپ کا جیون ساتھی آپ سے کس قدر محبت کرتا ہے؟ اور آپ اپنی کیا کیا بات منوا سکتی ہیں اور بس۔ اور پھر ایک دن تو مزید غضب ہی ہو گیا' ثنا کھانا کھا کر لاؤنج میں ہی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی' جبکہ جاذب کا کوئی آفس ڈنر تھا' جس کے سبب اس کی واپسی دیر سے متوقع تھی۔ ثنا کی ساس عشاء کی نماز پڑھ کر سو جانے کی عادی تھیں' کیونکہ پھر انہیں تہجد کے لیے اٹھنا ہوتا تھا۔ اوپر بھی اس وقت جاوید بھائی آجاتے تھے۔ لہٰذا وہ اکیلی ہی ٹی وی کے ذریعے اپنی بوریت دور کر رہی تھی کہ اچانک ہی بڑی بھابھی لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں' خوب تیار اور خوشبوؤں سے مہکی ہوئی' اتنی گرمی میں ان کی اس قدر تیاری اور وہ بھی رات کے تقریباً" دس بجے ثنا کو حیران کر گئی۔

"آپ کہیں جا رہی ہیں؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"ہاں ذرا سی ویو جا رہی ہوں۔" اک ادا سے جواب آیا۔

"اس وقت۔" ثنا نے بے اختیار گھڑی کی جانب نگاہ کی' جو دس بج کر پندرہ منٹ کا اشارہ دے رہی تھی۔

"میں اور جاوید تو اس سے بھی دیر سے جاتے تھے۔ دراصل جاوید کو بہت پسند ہے رات کے سناٹے میں میرے ساتھ ساحل پر واک کرنا۔" بات کرتے کرتے انہوں نے اک نگاہ ثنا پر بھی ڈالی اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جب سے کراچی کے حالات خراب ہوئے ہیں رات کے اندھیرے میں باہر نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو گیا ہے۔ بس اسی لیے آج اتنے دنوں بعد پھر پرانی یادیں تازہ کرنے جا رہے ہیں اور اب تو ان شاء اللہ ہر ویک اینڈ پر ہی جائیں گے۔" وہ ذرا سا سانس لینے کو رکیں۔

"بچے بھی جا رہے ہیں؟"

"نہیں وہ ٹی وی دیکھ رہے ہیں' پھر خود ہی سو جائیں گے' تم پلیز ایک گھنٹہ تک اوپر جا کر انہیں دیکھ لینا' میں تم سے یہ ہی کہنے آئی تھی۔"

"او کے۔" ثنا نے مری مری آواز میں کہا اور بھابھی بڑی ادا سے پلٹ کر باہر کی جانب چل دیں' یہ جانے بغیر کہ ان کی باتوں نے ثنا کو کس قدر بے چین کر ڈالا ہے۔

اور اس کی یہ بے چینی جاذب کے آنے کے بعد ایک زبردست لڑائی پر ختم ہوئی' اب اسے بھی اعتراض تھا کہ جاذب' جاوید بھائی کی طرح کیوں اس کے ساتھ رات میں باہر نہیں جاتا؟ جبکہ جاذب کا کہنا تھا کہ اسے یہ سب کچھ پسند نہیں ہے اور جواباً" دونوں کے درمیان خوب جنگ ہوئی اور نتیجتاً" تقریباً" ایک ہفتہ دونوں کے درمیان بات چیت بھی بند رہی اور بالآخر ثنا ہی کی جیت ہوئی اور جاذب ہر ویک اینڈ پر ثنا کو گھر سے باہر بلکہ سی ویو لے جانے پر رضامند ہو ہی گیا۔

جیسے جیسے جاذب کسی غیر متوقع لڑائی جھگڑے سے بچنے کے لیے ثنا کی باتیں مانتا گیا ویسے ویسے ثنا میں ضد اور خودسری عروج پکڑتی گئی۔ اس کے لیے مائرہ بھابھی



ایک رول ماڈل کی سی حیثیت اختیار کر گئیں۔ اور اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ جیسی خوب صورت' خوش گوار ازدواجی زندگی بھابھی گزار رہی ہیں ایسی ہی وہ بھی گزارے اور اسی خواہش نے اس میں مزید خود پسندی کو فروغ دیا اور پھر ایک خواہش کی تکمیل کے بعد مزید نئی خواہش اور تمنا اس کی منتظر ہوتی اور پھر وہ اس کے حصول میں ہلکان ہو جاتی' وہ کسی بھی معاملے میں ماریہ بھابھی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی اور اس کی اسی کمزوری نے اسے ماریہ بھابھی کے لیے ایک کھلونا بنا دیا تھا' جس سے وہ اپنی مرضی سے کھیلتی اور لطف اندوز ہوتیں اور اپنے اس کھیلے جانے کا احساس ثنا کو ذرا برابر بھی نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

خلافِ توقع آج جاذب جلدی گھر آ گیا تھا' امی کو سلام کر کے جیسے ہی وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا ٹھٹک کر رک گیا' اپنی روٹین کے برعکس آج ثنا اپنے بیڈ پر موجود ٹی وی دیکھنے میں مشغول تھی۔

"خیریت ہے' آج آپ اوپر نہیں گئیں؟ نصیب دشمناں اوپر والوں سے کوئی لڑائی تو نہیں ہو گئی؟" جاذب کا اشارہ یقیناً" بڑی بھابھی کی سمت تھا۔ ثنا نے بنا کوئی جواب دیے ایک ترچھی نگاہ جاذب پر ڈالی جو تولیہ اٹھا کر باتھ روم میں داخل ہو رہا تھا اور پھر خاموشی سے دوبارہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئی' جب جاذب نہا کر باہر نکلا تو وہ ابھی تک اپنی سابقہ پوزیشن میں ہی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی' بالکل اس طرح جیسے اسے جاذب کی کمرے میں موجودگی کا علم ہی نہ ہو' ایسے میں جاذب کی شامت قسمت کہ وہ اسے پھر چھیڑ بیٹھا' بیڈ کے کنارے بیٹھ کر جگ سے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے وہ ازراہ مذاق بول اٹھا۔

"کیا بات ہے' آج کیا واقعی تمہاری بھابھی سے کوئی ناراضی ہو گئی ہے کیا؟"

"کیوں؟ آپ کو ایسا کیسے محسوس ہوا؟" ثنا نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

"بھئی دیکھو نا اس وقت تم ہمیشہ اوپر بھابھی کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے کی عادی ہو' اسی لیے میں حیران ہوں کہ آج کایا کیسے پلٹ گئی کہ تم اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی ہو' جبکہ بھابھی تو یقیناً" اس وقت گھر پر ہی ہوتی ہیں۔"

"دراصل آج مائرہ بھابھی اور جاوید بھابھی کی شادی کی سالگرہ ہے۔" ریموٹ کو بے دلی سے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"اوہو! مجھے تو یاد ہی نہیں رہا' ورنہ میں کوئی گفٹ ہی لے آتا۔"

"رہنے دیں آپ' وہ اپنی شادی کی سالگرہ ہجوم کے ساتھ نہیں منا رہے' بلکہ ابھی جاوید بھائی' مائرہ بھابھی کو شاپنگ کروانے لے کر گئے ہیں' پھر گھر آ کر تیار ہو کر انہوں نے ڈنر کرنے کے لیے پی سی جانا ہے' جہاں جاوید بھائی نے کیک بھی آرڈر کر رکھا ہے۔" اور گھونٹ گھونٹ پانی حلق سے اتارتے جاذب کو اچھو سا لگ گیا۔

"مطلب کہ جاوید بھائی اور بھابھی اپنی سالگرہ پی سی میں منا رہے ہیں۔"

"جی ہاں!" جواب دے کر ثنا اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے بال لپیٹتی باہر نکل گئی' یہ جانے بغیر کہ جاذب کی پریشانی میں کس قدر اضافہ ہو چکا ہے' کیونکہ چند ہی دنوں بعد ان کی بھی ویڈنگ اینورسری تھی اور وہ بھی پہلی جو کہ وہ گھر پر ہی اپنی ماں کو شامل کر کے منانا چاہتا تھا' لیکن اب اسے لگا کہ ایسا ہونا شاید ناممکن ہو اور پھر وہ ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔

آج ستائیس ستمبر تھا' اس کی شادی ٹھیک ایک سال قبل اسی تاریخ کو ہوئی تھی' غیر شعوری طور پر ثنا منتظر تھی کہ وہ اس کے ساتھ آج کے اس اہم دن کا پلان سیٹ کرے' لیکن خلافِ توقع جاذب کی طرف سے پائی جانے والی مکمل خاموشی نے اسے بھی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جاذب کو آج کا یہ دن یاد بھی ہے کہ نہیں' یہی وجہ تھی کہ صبح آفس جاتے ہوئے بھی اس نے جاذب کو کچھ یاد نہ دلایا' جبکہ جاذب

اس کی خفگی کو محسوس کرکے دل ہی دل میں مسکرا دیا' کیونکہ اسے نا صرف آج کا دن یاد تھا' بلکہ وہ اسے بھرپور طور پر منانا بھی چاہتا تھا' یہی وجہ تھی کہ وہ آفس سے جلدی ہی نکل گیا۔ بازار جاکر اس نے سب سے پہلے جیولر سے وہ رنگ لی جو وہ کچھ عرصہ قبل ہی پسند کرچکا تھا' پھر بکے اور ثنا کی پسند کا کیک لیتا ہوا وہ بڑی خوشی خوشی گھر پہنچا' راستہ میں وہ کھانے کا آرڈر بھی دیتا آیا تھا' لیکن گھر آتے ہی اس کی تمام خوشی ہوا ہو گئی' وہ جو امید کررہا تھا کہ جس طرح اس نے ثنا کو سرپرائز دیا تھا وہ بھی اسے سرپرائز دینے کے لیے تیار ملے گی' اس کی تیاری کے خوب صورت احساس نے جاذب کو خوب سرشار کررکھا تھا' لیکن جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا سامنے بیڈ پر گھر کے ملگجے لباس میں ملبوس ثنا کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا' لیکن اپنی حیرت پر جلد ہی قابو پاکر وہ آگے بڑھا اور ہاتھ میں موجود بکے اس کے پاس دھرتے ہوئے وہیں بیٹھ گیا۔

"شادی کی پہلی سالگرہ مبارک ہو۔" کیک وہ باہر ہی لاؤنج میں رکھے ڈائننگ ٹیبل پر رکھ آیا تھا' اس نے آہستہ سے کہتے ہوئے ثنا کا ہاتھ تھام لیا' جبکہ وہ بنا کسی تاثر کے نہایت خاموشی سے اس کی جانب تکتی رہی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو' نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟" جاذب نے شوخی سے کہتے ہوئے اپنی شرٹ سے خوب صورت کیس نکال کر اس میں موجود نازک سی رنگ ثنا کے بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں پہنادی۔

"اس رنگ سے تو اچھا تھا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ لے جاکر کسی اچھی سی بوتیک سے سوٹ لے دیتے۔" مائرہ بھابھی کا بوتیک کا سوٹ ابھی بھی اس کے حواسوں پر سوار تھا' جاذب جو کہ کسی خوشگوار حیرت اور خوب صورت جملے کا منتظر تھا' محض ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا' لیکن کوئی بھی تلخ بات کرکے وہ آج کے دن کی اس خوب صورتی کو زائل نہ کرنا چاہتا تھا' اس لیے ہلکے پھلکے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے' لیکن خاتون سوٹ تو آپ کے پاس بے شمار ہیں اور پھر محبت سے دیے گئے تحفہ کی قدر کرتے ہیں۔"

"رنگ بھی میرے پاس بے شمار ہیں۔" جاذب کی آخری بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ لاپروائی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بکے پر سرسری سی نظر ڈالتی کمرے سے باہر نکل گئی' اس کی ناراضی نے جاذب کو احساس دلا دیا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ اس کی یہ خواہش کہ اپنی پہلی سالگرہ گھر پر اپنی ماں کے ساتھ منائے' ایک دم ہی ختم ہو گئی' گھر کے ماحول کو مزید خراب ہونے سے بچانے کے لیے ضروری تھا کہ ثنا کی بات خاموشی سے مان لی جائے' بے شک اس نے خود سے کچھ نہ کہا تھا' لیکن اس کا انداز جاذب کو بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

لہٰذا وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور گاڑی کی چابی لیتا ہوا ثنا کے پیچھے کچن میں آگیا جہاں وہ غالباً" چائے بنانے کی تیاری کررہی تھی۔

"جلدی سے اچھا سا تیار ہو جاؤ' ہم ڈنر کے لیے باہر جارہے ہیں۔" خود پر جبر کرتے ہوئے اپنے لہجہ میں بشاشت سموتا ہوا وہ بولا' جبکہ ہوٹلوں کا کھانا اسے قطعی ناپسند تھا اور پھر آج اس اہم موقع پر اپنی ماں کو نظرانداز کرنا بھی اسے اچھا نہ لگ رہا تھا' اسے یاد تھا کہ جاوید بھائی نے نا صرف اپنی پہلی سالگرہ گھر پر منائی تھی' بلکہ انہوں نے اپنی اکلوتی بہن جاذبیہ کو بھی فیملی سمیت انوائٹ کیا تھا اور اس سالگرہ کا ہلا گلا آج بھی جاذب کو یاد تھا' جبکہ اس کی اپنی سالگرہ صرف اور صرف ثنا کی انتہاپسندی کی نذر ہوچکی تھی اور یہی بات اس کے دل کو دکھا رہی تھی' جس کا ذرا برابر بھی احساس اس کی نصف بہتر کو نہ تھا' اس کے لیے تو صرف یہ تصور ہی خوش کن تھا کہ بنا کہے ہی جاذب اس کی دلی کیفیت کو جان چکا تھا۔

"بس آپ گاڑی نکالیں میں ابھی تیار ہو کر پانچ منٹ میں آرہی ہوں۔" وہ تیزی سے چولہا بند کرکے اندر کی جانب لپکی۔

"بات سنو' امی کا کھانا بنادیا ہے؟" نہ چاہتے ہوئے بھی جاذب کو دریافت کرنا پڑا۔

"رہنے دو بیٹا! آج رات کا کھانا میرا جاوید کی طرف ہے' مائرہ نے میری پسند کے قیمہ کریلے اور ماش کی دال بنائی ہے۔" ثنا کے جواب دینے سے قبل ہی امی بول پڑیں' جو غالباً" ابھی ابھی مغرب کی نماز پڑھ کر اپنے کمرے سے باہر آئی تھیں اور ان کے اس جواب نے جہاں جاذب کو یک دم شرمندگی کے احساس سے دوچار کردیا وہیں ثنا نے ایک اطمینان بھری سانس لے کر دل ہی دل میں مائرہ بھابھی کو ڈھیروں ڈھیر دعاؤں سے نوازا' جن کی بدولت وہ اس وقت امی کے لیے تیار کرنے والے ممکنہ ڈنر سے بچ گئی تھی۔

"مائرہ بھابھی ہمیشہ میرے کام آتی ہیں۔" دل ہی دل میں سوچتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی' جبکہ امی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ خالہ امی کی واحد اور اکلوتی بہن تھیں' ان کی بیٹی کی منگنی کی رسم تھی' جس میں شرکت کی دعوت وہ خود گھر آکر دے کر گئیں' ان کا کہنا تھا کہ تمام خواتین منگنی سے ایک دن قبل آجائیں' کیونکہ اس دن انہوں نے محفل میلاد کا اہتمام کیا تھا۔ لازمی سی بات تھی کہ میلاد میں تو جاذب اور جاوید نے شریک نہیں ہونا تھا' لیکن منگنی میں ان کی شرکت لازمی تھی' چونکہ ثنا کی شادی کے بعد یہ ان کے خاندان کی پہلی تقریب تھی جس کے لیے اس نے جی جان سے تیاری کی' میلاد شریف اور منگنی دونوں تقریبات کے لیے اس نے نئے سوٹ بنائے' میچنگ جیولری اور دیگر شاپنگ اس نے بڑی بھابھی کے ساتھ جاکر کی۔ اسی ذوق و شوق سے وہ محفل میلاد کے لیے تیار ہوئی اور پھر خوب نفاست سے سجی سنوری خوب صورت سی ثنا خاندان کی سب ہی خواتین کو بہت اچھی لگی' جامنی اور فیروزی جامہ وار کے قیمتی سوٹ اور میچنگ جیولری کے ساتھ وہ نظر لگ جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔ جس کا خراج اس نے وہاں موجود ہر خاتون سے وصول کیا۔ اتفاق کی بات تھی کہ جیسے ہی یہ بابرکت محفل اپنے اختتام کو پہنچی لائٹ چلی گئی۔ جنریٹر آن کرکے کھانا کھایا گیا اور پھر کچھ دیر بعد ہی لائٹ آکر جو دوبارہ گئی تو صبح تک نہ آئی' شومئی قسمت جو جنریٹر ایک دفعہ چل کر بند ہوا تو دوبارہ اس نے اسٹارٹ ہو کر ہی نہ دیا۔

صبح ہونے تک تمام مہمان خوب نڈھال ہوچکے تھے۔ خاص طور پر وہ جن کے ساتھ چھوٹے بچے بھی تھے' لیکن جانے کیوں بڑی بھابھی کا موڈ بالکل ہی آف تھا' حالانکہ رات وہ چھت پر سوئی تھیں' جہاں اچھی خاصی ہوا چل رہی تھی' پھر بھی جانے کیوں وہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی تھیں یا شاید ثنا کو ہی محسوس ہوا اس سے قبل کہ ثنا کوئی سوال کرتی وہ خود ہی بول اٹھیں۔

"میں تو ابھی جاوید کو فون کرتی ہوں' مجھے اور بچوں کو آکر لے جائیں۔"

"کیوں' آپ منگنی تک نہیں رکیں گی؟" ثنا نے حیرت سے سوال کیا۔

"بھاڑ میں گئی منگنی' مرجاؤں گی میں اگر اتنی گرمی میں ایک دن اور یہاں رک گئی' بس اب کل سیدھی ہوٹل میں ہی آجاؤں گی' ضروری ہے جو دو دن یہاں پڑاؤ ڈال کر پڑی رہوں۔" نخوت سے جواب دیتی ہوئی وہ جاوید بھائی کا نمبر ملاتی باہر نکل گئیں اور پھر تقریباً" چار بجے تک جاوید بھائی آن موجود ہوئے۔

"اللہ رے اتنی فرماں برداری؟" ثنا نے بے اختیار سوچا اور فوراً" ہی بنا سوچے سمجھے جاذب کا نمبر ملا ڈالا۔ حالانکہ اگر وہ ذرا سا بھی دماغ کا استعمال کرتی تو جاوید کے ساتھ بھی گھر واپس جاسکتی تھی۔

"جاذب کہاں ہیں آپ؟" رابطہ ہوتے ہی اس نے بے قراری سے سوال کیا۔

"ابھی ابھی آفس سے گھر جانے کے لیے نکلا ہوں' کیوں خیریت؟"

"میری طبیعت بہت خراب ہے' مجھے آکر لے جائیں۔" ثنا کی آواز خود بخود بھرا سی گئی۔

"کیا طبیعت خراب ہو گئی ہے؟" جاذب نے ایک آہ بھرتے ہوئے سوال کیا۔

"بس میرا دل بہت گھبرا رہا ہے اور مجھے واپس گھر جانا ہے۔" ثنا نے اپنے لہجہ میں ممکنہ حد تک ضد کو

شامل کرتے ہوئے جواب دیا۔
"لیکن یار میں ابھی ابھی آفس سے تھکا ہارا نکلا ہوں ایسے میں اتنی دور تک آنا....."
"مجھے کچھ نہیں پتا اگر آپ ایک گھنٹہ تک نہ پہنچے تو میں ٹیکسی کر کے خود ہی گھر آجاؤں گی۔"
جاذب کی بات کو کاٹتی ہوئی ثنا نے تیزی سے جواب دے کر فون بند کردیا کیونکہ اسے پتا تھا کہ اس کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوگی کلفٹن سے یونیورسٹی روڈ تک کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ جاذب اس کا ٹیکسی میں تنہا سفر کبھی بھی پسند نہ کرتا اور پھر تقریباً" پینتالیس منٹ میں ہی جاذب وہاں پہنچ گیا جب وہ آیا تو جاوید بھائی وہیں بیٹھے چائے پی رہے تھے انہیں دیکھ کر جاذب کی سمجھ میں سب کچھ آگیا لیکن وہ بولا کچھ نہیں اور ابھی اسے بیٹھے بمشکل پانچ سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ ثنا اپنا بیگ تھامے آگئی۔
"ارے یہ تم کہاں جارہی ہو؟" اس کے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر زیبا بیگم (جاذب کی امی) نے حیرت سے سوال کیا۔
"گھر....."
"کیوں خیریت ہے؟ کیا ہوا تمہیں؟ کیوں گھر جانا ہے؟" وہاں موجود سب لوگوں نے ہی حیرت سے دریافت کیا۔
"بس میری طبیعت خراب ہورہی ہے؟"
اور پھر سب نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن ثنا نے مان کر نہ دیا جبکہ جاذب اس سارے عمل کے دوران بالکل خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا اور پھر گھر واپس آکر ثنا نے رات تقریباً" ایک بجے تک بڑی بھابھی کا بڑی بے قراری سے انتظار کیا لیکن سیڑھیوں پر طاری مسلسل اندھیرا ان کی غیر موجودگی کا اعلان کرتا رہا یہاں تک کہ جاوید بھائی بھی ایک بجے تک گھر نہ آئے تھے کیونکہ پورچ ان کی گاڑی سے خالی تھا۔
ساری رات ہی ماریہ بھابھی کے خیال نے ثنا کو بے چین کیے رکھا اور صبح اٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے باہر پورچ میں جھانکا باہر جاوید بھائی کی گاڑی اپنی جگہ پر موجود تھی اس کا مطلب یہ ہوا کہ مائرہ بھابھی گھر آچکی ہیں یہ خیال ہی ثنا کے لیے بڑا تسکین آمیز تھا وہ بھاگم بھاگ اوپر گئی۔
"مائرہ بھابھی! مائرہ بھابھی۔" کچن میں ہونے والی کھٹ پٹ سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ اس وقت کچن میں ہی ہوں گی لیکن یہ کیا وہاں تو اکیلے جاوید بھائی کھڑے اپنے لیے چائے تیار کررہے تھے۔
"ارے ثنا ذرا جلدی سے مجھے کپ میں چائے ڈال دو آفس کو دیر ہورہی ہے۔" اس سے قبل کہ وہ واپس پلٹ جاتی جاوید بھائی نے اسے آواز دے کر روک لیا اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انہیں ناشتا بنا کر دے اس نے ناشتا تیار کر کے کچن میں موجود ٹیبل پر رکھ دیا اور خاموشی سے نیچے آگئی۔ اس کا دل ہی نہ چاہا کہ وہ جاوید بھائی سے مائرہ بابھی کی بابت دریافت کرتی لیکن جانے کیوں آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کا دل مائرہ بھابھی کے گھر نہ آنے پر بھر سا آیا اور اسے اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا جو اس نے جاذب کے ہمراہ گھر آکر کی تھی اور اپنی جلد بازی اور ضد کا خمیازہ بھی اسے شام میں اس وقت بھگتنا پڑا جب جاذب نے منگنی کے لیے اسے ہوٹل لے جانے سے انکار کردیا۔
"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم اگر خود اکیلی جاسکتی ہو تو بے شک چلی جاؤ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" جاذب کے دوٹوک رویے نے ثنا کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا اسے اپنی غلطی کا احساس تو پہلے ہی ہوچکا تھا اب وہ مزید کوئی بحث و مباحثہ کر کے بات کو طول نہ دینا چاہتی تھی اور یہ شاید پہلا دن تھا کہ صبح سے لے کر رات تک کا وقت ثنا نے ایک عجیب سے پچھتاوے میں گھر کر گزارا اسے رہ رہ کر یہ احساس ستاتا رہا کہ وہ واپس کیوں آئی؟ اور ساتھ ہی شاید اسے پہلی بار بڑی بھابھی پر خوب غصہ آیا۔
"مجھے تو واپس بھیج دیا اور خود مزے سے وہاں بیٹھی ہیں خوب پاگل بنایا مجھے توبہ ہے میری جو آئندہ ان کی باتوں میں آؤں۔" وہ رات دل ہی دل میں یہ عہد کر کے جانے کس وقت سوئی لیکن صبح بھابھی سے ملتے ہی اس کا رات والا عہد خود خود ٹوٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

رات جانے امی کس وقت آئی تھیں صبح اٹھ کر دیکھا تو وہ اپنے کمرے میں بے خبر سو رہی تھیں جبکہ باہر پورچ میں موجود جاوید بھائی کی گاڑی بھی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ ابھی تک اوپر موجود ہیں۔ ثنا خاموشی سے کچن میں جا کر ناشتا تیار کرنے لگی اور پھر جاذب کے گھر سے جانے کے بعد بھی اس کا دل ہی نہ چاہا کہ وہ امی سے تقریب کا کوئی حال دریافت کرتی خاموشی سے اپنا کام ختم کرتی رہی جبکہ امی نے خود بھی کوئی بات نہ کی۔ ثنا جان بوجھ کر گھر کے کاموں میں مصروف رہی کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ضرور اوپر جا کر مائرہ بھابھی سے حال احوال لیتی لیکن آج وہ دوپہر میں بھی اوپر نہ گئی یہاں تک کہ شام ہوگئی جاذب نے گھر آکر یہ تبدیلی نوٹ ضرور کی لیکن بولا کچھ نہیں جاذب کے آتے ہی امی بھی ان ہی کے بیڈ روم میں آگئیں اور اب وہ جاذب کو منگنی کا حال احوال سنا رہی تھیں جسے سن سن کر وہ کلس رہی تھی ایسے میں اچانک ہی بڑی بھابھی نے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔
"امی آپ کی مٹھائی کچن میں رکھ دوں۔"
"جاؤ ثنا بیٹا مٹھائی لے کر رکھ لو۔" اور نہ چاہتے ہوئے بھی ثنا کو اٹھنا پڑا مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ خاموشی سے اٹھی باہر آکر بھابھی سے مٹھائی کی پلیٹ پکڑی اور کچن کی جانب چل دی بھابھی بھی اس کی تقلید میں کچن کے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی جبکہ اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو اور خاموشی سے ریک سے پلیٹیں اتار کر مٹھائی نکالنے لگی۔
"اچھا ہوا ثنا تم واپس آگئیں سچ پوچھو تو میں اس قدر بور ہوئی کہ کیا بتاؤں۔" بھابھی نے بنا کچھ پوچھے ہی وضاحت دینی چاہی جبکہ ثنا نے ایک ناراض نظر ان پر ڈالی اور خاموشی سے پلیٹیں دھونے لگی۔
"اصل میں جاوید کی ایک عادت بہت خراب ہے اگر کسی بات پر اڑ جائیں تو الامان پھر تو کسی کی نہیں سنتے

اور چونکہ ایسا دورہ انہیں کبھی کبھی پڑتا ہے' یہی وجہ ہے کہ جب بھی کبھی یہ ایسی حرکت کرتے ہیں میں بلاچون وچرا ان کی ہر بات مان لیتی ہوں' اب اس دن تمہارے سامنے ہی مجھے لینے آئے تھے' لیکن میرے سامان پیک کرنے تک امی نے جانے کیا کیا کان میں پھونکا کہ ہتھے سے ہی اکھڑ گئے' کہنے لگے کہ پہلے ہی ثنا چلی گئی ہے' اب جو تم بھی واپس چلی گئیں تو جانتی ہو خالہ کا دل کتنا برا ہوگا' بس اب کچھ بھی ہو جائے تم منگنی تک یہاں ہی رہو گی اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی بہتری اسی میں نظر آئی کہ جاوید کی بات مان لوں اور ایک تو ویسے بھی میں ان کی حکم عدولی کا سوچ نہیں سکتی اور دوسرے......" بھابھی ذرا کی ذرا سانس لینے کو رکیں اور ایک نظر ثنا کے چہرے پر ڈالی۔

"اگر تم جاذب کے ساتھ واپس نہ آتیں تو میں ضرور آجاتی' لیکن خود سوچو بیک وقت ہم دونوں کی واپسی خاندان والوں پر کتنا برا تاثر قائم کرتی' سب یہ سمجھتے کہ ہم دونوں نے خاص منصوبہ بندی کے تحت جاذب اور جاوید کو بلوایا ہے۔" پلیٹیں واپس لیتے لیتے بڑی بھابھی نے تفصیلی وضاحت کی اور اوپر کی جانب بڑھ گئیں' جبکہ ثنا اپنی جگہ پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور اسے اب احساس ہوا کہ اس دن بڑی بھابھی کا واپس نہ آنا ان کی کوئی چالاکی نہ تھی' بلکہ ایک طرح کی معاملہ فہمی تھی' حقیقت یہی تھی کہ دونوں بہوؤں کا اپنی ساس کو چھوڑ کر گھر واپس آنا طرح طرح کی باتوں کا سبب بنتا' "واقعی مائرہ بھابھی کافی عقل مند ہیں" ان کی اس خوبی کا اعتراف ثنا نے دل ہی دل میں کافی فراخ دلی سے کیا۔

☼ ☼ ☼

ان کی نند جاذبیہ کے بڑے بیٹے اویس نے انٹر کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی' جس کی خوشی میں جاذبیہ نے اپنے گھر میں ایک فنکشن کا اہتمام کیا' امی جان اپنے نواسے کی اس کامیابی پر بے حد خوش تھیں اور اسی خوشی میں انہوں نے جاذبیہ اور اس کے میاں کا جوڑا بنوایا اور اویس کو خود ساتھ لے کر جا کر شاپنگ کرائی تھی' اب ظاہر ہے یہ تو نانی کے تحائف تھے' جبکہ ماموؤں کی ذمہ داری اپنی جگہ باقی تھی' اسی سلسلے میں جاذب نے ثنا سے مشورہ کیا' جبکہ حسب عادت اور روایت ثنا نے اس سے بڑی بھابھی سے مشورہ کرنے کا وقت لیا۔ جاذب اس ایک سال میں ثنا کی عادات جان چکا تھا اور اسے پتا تھا کہ ثنا وہی مشورہ دے گی جو بڑی بھابھی اسے دیں گی' اس لیے خاموش ہو گیا اور اسی شام ثنا مشورہ کے لیے اوپر چلی گئی۔

"بھابھی آپ اویس کو کیا تحفہ دے رہی ہیں؟" کچن میں مصروف بھابھی سے جاتے ہی ثنا نے سوال کیا۔

"کس بات کا تحفہ؟" بڑی بھابھی کی معصومیت دیدنی تھی۔

"ارے اس کے پاس ہونے کی خوشی میں' جاذبیہ باجی نے جو تقریب کا اہتمام کیا اس میں آپ کوئی تحفہ نہیں لے کر جائیں گی؟" ثنا کی حیرانی بجا تھی' کیونکہ اس کا اپنا ذاتی خیال تھا کہ اس موقع پر اویس کو تحفہ دینا اس کا حق بنتا ہے۔

"ایک بات بتاؤ ثنا۔" بھابھی نے چولہے کی آگ مدھم کرتے ہوئے ثنا کی جانب دیکھا جو ان ہی کی طرف متوجہ تھی۔

"آؤ اندر چل کر بات کرتے ہیں' یہاں گرمی بہت ہے۔" وہ خاموشی سے ان کے پیچھے پیچھے چلتی لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی' جبکہ بھابھی قریب ہی رکھے فلور کشن پر بیٹھ چکی تھیں۔

"یہ جو اس تقریب کے لیے امی نے اتنی شان دار شاپنگ جاذبیہ کو کروائی ہے اس کے پیسے کہاں سے آئے؟" تھوڑی دیر کے وقفہ کے بعد انہوں نے اپنی بات کو دوبارہ شروع کیا۔

"ظاہر ہے جاوید اور جاذب نے ہی یہ رقم امی کو دی ہوگی' تاکہ وہ اتنے عالی شان ملبوسات خرید سکیں۔" اس نکتہ پر تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا' اب جو بھابھی نے سمجھایا تو وہ خود بھی حیران رہ گئی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟" بات ختم کر کے بھابھی نے جواب طلب انداز سے اس کی جانب دیکھا۔

"جی ہاں......"

"تو پھر جب ہم نے امی کو اتنا پیسہ دے دیا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی بیٹی کو عالی شان شاپنگ کروا دیں تو پھر ہمارا تحفہ کس بات کا؟ اب اگر تم اپنی طرف سے کچھ دینا ہو تو تمہاری مرضی' فی الحال ہمارا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے' اس منگائی کے زمانے میں الگ الگ تحائف دینا' میرا خیال ہے کہ جاوید تو افورڈ نہیں کر سکتے' باقی تم لوگوں کا میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

اس رات اس نے بڑی بھابھی کے ان الفاظ کو من وعن اپنے لفظوں میں ڈھال کر جاذب کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کی بات سن کر جاذب نے بڑے صبر وتحمل کے ساتھ اسے سمجھانے کی کوشش کی' لیکن ثنا کے ساتھ اصل مسئلہ یہ تھا کہ جب اس کے دماغ میں بڑی بھابھی کی سمجھائی ہوئی کوئی بات بیٹھ جاتی تھی تو اسے نکالنا اتنا آسان نہ ہوتا جتنا جاذب نے سمجھ لیا تھا اور پھر جاذب کی لاکھ کوشش کے باوجود ثنا نے مان کر ہی نہ دیا' دونوں کے درمیان بحث مباحثہ باقاعدہ لڑائی کی شکل اختیار کر گیا' جس کے بعد دونوں کے درمیان بات چیت مکمل طور پر بند ہو گئی اور ایسا شاید پہلی دفعہ ہوا تھا اور آخر کار دونوں میاں' بیوی کے درمیان موجود ٹینشن کو ختم کرنے کے لیے امی کو ہی آگے آنا پڑا اور انہوں نے جاذب کو سمجھا بجھا کر اس معاملہ کو رفع دفع کروایا اور اس دفعہ بھی جاذب کو ہی ہار ماننا پڑی اور دل کے لاکھ چاہنے کے باوجود وہ اپنے بھانجے کے لیے اپنی مرضی کا کوئی تحفہ نہ لے سکا۔

☼ ☼ ☼

جاذبیہ کے گھر منعقد ہونے والے فنکشن کی تیاری ثنا نے بڑے دل سے کی' آج کی اس تقریب میں وہ سب سے نمایاں لگنا چاہتی تھی اور جب وہ وہاں پہنچی تو ایک ساڑھی اور سلور جیولری میں بے حد خوب صورت لگ رہی تھی' تقریباً" تمام ہی مہمان آ چکے تھے' سوائے مائرہ بھابھی اور جاوید بھائی کے' جبکہ وہ گھر سے ان کے ساتھ ہی نکلے تھے۔

"نہ جانے کہاں رہ گئے ہیں وہ لوگ۔" ثنا نے سوچتے ہوئے ایک بار پھر ان کا نمبر ملایا' لیکن جانے کیوں مسلسل فون آف جا رہا تھا' آخر اس سے رہا نہ گیا اور وہ جاذب کے قریب چلی آئی۔

"آپ جاوید بھائی کو فون کر کے پوچھیں کہ وہ کہاں رہ گئے ہیں؟"

"ابھی تو نو ہی بجے ہیں' آجائیں گے۔" جاذب جواب دے کر پھر سے اپنے کسی کزن سے باتوں میں مشغول ہو گیا' ثنا کچھ دیر تو کھڑی دیکھتی رہی' پھر پلٹ کر امی کی طرف آگئی جو اپنی کسی رشتہ دار سے باتوں میں مشغول تھیں' لیکن مائرہ بھابھی کے بغیر ثنا کو اس تقریب میں کوئی مزا نہیں آرہا تھا' آخر اللہ اللہ کر کے دس بجے کے قریب مائرہ بھی اپنے میاں اور بچوں کے

ہمراہ گیٹ سے اندر آتی دکھائی دیں، انہیں دیکھتے ہی ثنا کھل اٹھی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے ان کی جانب بڑھی۔

"شکر ہے آپ آگئیں، میں تو اکیلی بور ہی ہو گئی تھی۔" بھابھی کی ہدایات کے عین مطابق اس نے کبھی جاذبیہ اور اس کی بیٹی ـــ سے گھلنے ملنے کی کوشش ہی نہ کی تھی، بھابھی کا کہنا تھا کہ جاذبیہ بہت گھنی عورت ہے اور اس کے بھائی جو بھی کچھ کرتے ہیں بہن کی ہدایات کے عین مطابق ہوتا ہے، یہی وجہ تھی کہ ثنا کے دل میں شروع سے ہی جاذبیہ کی طرف سے ایک گرہ سی پڑ چکی تھی جو باوجود کوشش کے کھلنے نہ پائی تھی اور اسی گرہ کے سبب آج کی اس تقریب میں وہ خود کو مائرہ بھابھی کے بغیر بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔

"بس کیا بتاؤں جاوید کو کچھ کام پڑ گیا تھا، اسی لیے دیر ہو گئی۔" مائرہ نے ذرا کی ذرا رک کر ثنا کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے سیاسی بیان دیا اور پھر بڑی تیزی سے جاذبیہ کی جانب بڑھ گئی، نہایت ہی گرم جوشی سے گلے لگ کر اسے مبارک باد دی، اویس کو بھرپور طریقہ سے پیار کیا، یہ سب دیکھ کر ایسا محسوس ہی نہ ہو رہا تھا کہ مائرہ کے دل میں جاذبیہ کی طرف سے کبھی کوئی خلش بھی ہو گی، اتنی دیر میں جاوید بھائی بھی ان کے قریب پہنچ چکے تھے اور اسی گرم جوشی سے بہن اور بہنوئی سے مل رہے تھے، جس کا عملی مظاہرہ کچھ دیر قبل ان کی زوجہ محترمہ دے چکی تھیں، جبکہ ثنا کو ابھی تک یقین نہ آ رہا تھا کہ کچھ دیر قبل دیکھے گئے منظر میں مائرہ بھابھی بھی موجود تھیں، کسی کا تیزی سے بدلتا روپ اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا یا شاید اسے محسوس آج پہلی بار ہوا تھا، ابھی وہ کھڑی حیران پریشان ہی ہو رہی تھی کہ دفعتاً" مائرہ بھابھی نے اپنے ہینڈ بیگ کی زپ کھول کر اس میں سے ایک پیکٹ برآمد کیا، جسے دیکھ کر ثنا کو اپنا سانس بند ہوتا محسوس ہوا۔

"یہ تمہارے لیے ہے؟" بڑی محبت سے اسے اویس کے حوالے کیا گیا۔

"یہ کیا ہے؟" اویس نے حیرانی سے دریافت کیا۔

"ارے بیٹا تمہارے پاس ہونے کا تحفہ۔" مائرہ نے اپنے لہجے میں دنیا جہان کا پیار سموتے ہوئے کہا۔

"تم چاہو تو ابھی کھول کر دیکھ سکتے ہو اس میں تمہاری پسند کا تحفہ ہے۔" "یہ یقیناً" جاوید بھائی تھے جو اپنی بیوی کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔

"او میرا فیورٹ موبائل۔" ریپر کھولتے ہی اویس نے چیخ کر کہا' تقریباً" تمام لوگ ہی ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے قیمتی موبائل اویس کے ہاتھ میں اپنی شان دکھا رہا تھا۔

"تھینک یو مامی جان' تھینک یو سو مچ۔"

ناصرف اویس بلکہ جاذبیہ کی خوشی بھی دیدنی تھی اپنے بھائی اور بھابھی کی طرف سے بیٹے کو دی جانے والی اس اہمیت نے سسرال کے سامنے اس کی گردن کو فخر سے تان دیا تھا اور ثنا تو اپنی جگہ سن کھڑی تھی اس کے کانوں میں ابھی بھی مائرہ بھابھی کے وہ تنفر بھرے الفاظ گونج رہے تھے جو وہ اکثر و بیشتر جاذبیہ کے لیے استعمال کرتی تھیں۔

"اصل میں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں تمہیں کیا تحفہ دوں یہ تو تمہاری مامی کا ہی مشورہ تھا جو میں تمہاری پسند کا تحفہ لینے میں کامیاب ہو سکا۔" جاوید بھائی نے محبت پاش نظروں سے اپنی بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مائرہ ناصرف سمجھ دار بہو اور بھابھی تھی بلکہ آج تو یہ سمجھ دار مامی کا ٹائٹل بھی جیت گئی۔"

امی جان نے پیار سے مائرہ کو خود سے لپٹاتے ہوئے کہا اور ایسے میں پاس کھڑی ثنا دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر جاذب کی جانب دیکھا جو اس تمام منظر کو بڑی بے دلی سے دیکھنے کے بعد ثنا پر نظر ڈالتے ہوئے پھر سے اپنے اس کزن سے محو گفتگو ہو چکا تھا لیکن اس کی اس ایک نظر میں جانے کیا تھا کہ ثنا



[illegible] ہی گڑ گئی وہ خود کو اس ماحول میں بالکل مس [illegible] کر رہی تھی۔

[illegible] جاوید کی حرکت میرے منع کرنے کے باوجود [illegible] موبائل لے آئے بھانجے کو تحفہ دینے کے [illegible] میں تو آ ہی نہ رہی تھی بڑی مشکلوں سے منت [illegible] کر کے لے کر آئے ہیں اب ذرا گھر چلیں میں [illegible] کو سیدھا کرتی ہوں۔"

[illegible] جانے کب مائرہ بھابھی اس کے پاس آ کھڑی ہوں [illegible] کی طرح وضاحت دیتیں لیکن آج ثنا کا دماغ اس [illegible] سے نکل چکا تھا جس کا شکار وہ پچھلے ایک سال [illegible] تھی اس نے پلٹ کر ایک نظر نک سک سے تیار بھابھی پر ڈالی جن کے ہشاش بشاش چہرے پر کسی بھی ایسی ٹینشن کے آثار نہ تھے جس کا ذکر وہ اپنی زبان سے کر رہی ہیں۔

"مجھے تو لگتا ہے جاوید کو یہ سب کچھ یقیناً" امی نے ہی سکھایا ہو گا کہ بیوی سے چھپا کر تحفہ لے آؤ یا پھر یقیناً" یہ کام جاذبیہ کا ہو گا' میں نے تو پہلے ہی بتایا ہے کہ۔۔۔" جانے وہ اپنی صفائی میں کیا کچھ کہہ رہی تھیں لیکن ثنا کو کچھ سنائی نہ دے رہا تھا اس کا ذہن وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہ تھا وہ تو اس وقت پل صراط سے گزر رہی تھی اسے آج احساس ہوا بڑی بھابھی کو اپنا آئیڈیل مانتے ہوئے اس نے زندگی میں کتنی فاش غلطیاں کیں۔ صرف ایک مائرہ بھابھی کی خوشی کو ہی اپنی خوشی مانا اور ان کی مانتے ہوئے وہ ناصرف دوسرے رشتوں سے دور ہوئی بلکہ اس نے جاذب کو بھی خود سے دور کر دیا اسے احساس ہوا کہ آج ہی وقت ہے اگر وہ کچھ کر سکتی ہے تو کر لے ورنہ آج کے بعد اس خاندان میں اس کی عزت دو کوڑی کی بھی نہ رہے گی اور اس خیال کے آتے ہی اس کی ذہنی کشمکش ختم ہو گئی وہ فوری طور پر ایک فیصلہ پر پہنچ گئی۔

"ایک منٹ بھابھی میں آتی ہوں۔"

بھابھی کی بلا تکان گفتگو کو بریک لگوا کر وہ تیزی سے جاذب کی جانب بڑھی اور اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ایک منٹ جاذب ذرا یہاں آ کر میری بات سنیں۔" جاذب نے ایک نظر اس کے جوش سے تمتماتے چہرے پر ڈالی اور خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ ذرا فاصلہ پر آ کھڑا ہوا۔

"ہاں بولو کیا بات ہے؟" ثنا نے کوئی جواب نہ دیا وہ خاموشی سے اپنے ہینڈ بیگ کی زپ کھولے اس میں سے کچھ تلاش کر رہی تھی اور پھر اس کے ہاتھ وہ مطلوبہ شے آ ہی گئی۔

"یہ لیں۔" ایک نہایت خوبصورت کیس جو غالباً" کسی گھڑی کا تھا اس نے جاذب کی جانب بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" جاذب نے حیرت سے دریافت کیا۔

"اویس کا تحفہ۔" جاذب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ خالی خالی نظروں سے ثنا کی جانب تک رہا تھا جو کیس ہاتھ میں پکڑے بڑی مان طلب نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی ایسی نگاہوں سے جن میں مان کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی تھی۔

"دراصل پچھلے جمعہ جب بھائی جان دوبئی سے آئے تو انہوں نے دیگر تحائف کے ساتھ یہ گھڑی بھی آپ کے لیے دی تھی جو میں نے چھپا کر رکھ لی اس نیت کے ساتھ کہ آپ کی آنے والی برتھ ڈے پر آپ کو گفٹ کروں گی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں خوبصورت اور قیمتی گھڑیاں آپ کی کمزوری ہیں لیکن چونکہ آپ کی برتھ ڈے میں تو پورے پندرہ دن باقی ہیں لہٰذا اب یہ گھڑی اویس کی ہوئی۔" اپنی بات کا اختتام اس نے بے حد ہلکے پھلکے انداز سے کیا جبکہ اس دوران جاذب اس کے ہاتھ سے کیس لے کر کھول چکا تھا جہاں بیش قیمت گھڑی موجود تھی۔

"سوچ لو تحفہ ناصرف بہت قیمتی بلکہ تمہارے بھائی صاحب کا دیا ہوا بھی ہے۔" جاذب کے لہجہ میں ہلکی سی خفگی موجود تھی۔

"محبت سے بڑھ کر کسی چیز کی قیمت نہیں۔" یہ ثنا کہہ رہی تھی کچھ دیر تو جاذب کو یقین ہی نہ آیا۔

”پھر سے کہنا جو تم نے ابھی کہا؟“

”محبت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز قیمتی نہیں ہو سکتی۔“ ثنا نے اپنے الفاظ کو تھوڑے سے رد و بدل کے بعد پھر سے دہرایا اور ان الفاظ نے جاذب کی روح کو اندر تک سرشار کر دیا اسے یقین آ گیا کہ ثنا کا یہ بدلا ہوا روپ یقیناً“ دائمی ہے خود سر اور ضدی ثنا کی جگہ ایک نئی ثنا جنم لے چکی تھی جو بڑے استحقاق سے جاذب کے سامنے کھڑی تھی یقیناً“ کوئی بھی شخص برا نہیں ہوتا بری تو اس کی سوچ ہوتی ہے جسے اگر ذرا سا تبدیل کر لیا جائے تو آپ ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہیں یہ ہی سوچتے ہوئے جاذب نے ثنا کا ہاتھ تھاما اور اسے ساتھ لیے ہوئے جاذبیہ کے سامنے جا کھڑا ہوا جو امی سے کچھ بات کر رہی تھیں غالباً“ کھانا شروع ہونے والا تھا اور اسی کے سلسلے میں مشورہ کیا جا رہا تھا۔

”اویس کہاں ہے؟“ جاذب نے بہن کے پاس جا کر دریافت کیا۔

اویس ذرا فاصلہ پر اپنے دوستوں کے ساتھ موجود تھا جاذبیہ نے سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے جاذب کی توجہ اس سمت مبذول کروائی اور پھر اویس اپنی ماں کے پکارنے پر ان کے قریب ہی آ کھڑا ہوا۔

”یار یہ تمہاری چھوٹی مامی نے تمہارے لیے دوبئی سے گفٹ منگوایا تھا ہم سمجھے کہ شاید تمہارا تحفہ گھر ہی رہ گیا ہے بس یہ ہی سوچ کر میرا موڈ بھی خراب تھا

لیکن اتفاق دیکھو گفٹ ہینڈ بیگ میں ہی موجود تھا اور انہیں خبر ہی نہ تھی۔“ اتنی دیر سے تحفہ دینے کی وضاحت بڑی خوبصورتی سے کرتے ہوئے جاذب نے کیس اویس کی جانب بڑھایا۔

”بہر حال یہ تحفہ خالصتاً“ تمہاری مامی کی جانب سے ہے۔“ ثنا کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ کر اسے خود سے قریب کرتے ہوئے جاذب کے ان لفظوں نے اس کی عزت میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے تحفے تحائف آپ کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت کو کس قدر بڑھاتے ہیں یہ آج ثنا کو پتا چلا۔

”اتنی قیمتی گھڑی.....“

”واؤ میرا فیورٹ سلور کلر۔“

غرض سب نے ہی اپنی حیرت اور خوشی کا اظہار خوبصورت لفظوں سے کیا اور عین اس وقت جب جاذب بے انتہا خوش و خرم نہایت مسرور سا اس کے ساتھ کھڑا تھا اس نے ذرا کی ذرا ایک ترچھی نظر خود سے کچھ فاصلہ پر کھڑی مائرہ بھابھی پر ڈالی اور ان کے چہرے پر چھائے ہوئے تاثرات نے ثنا کو خوب لطف دیا اس کا مزا دوبالا ہو گیا سیر کو سوا سیر والا محاورہ آج صحیح معنوں میں اس کی سمجھ میں آیا وہ سبک خرامی سے چلتی ہوئی بڑی بھابھی کے پاس آ کھڑی ہوئی بڑے پیار سے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

”دیکھ لیں بھابھی آخر جاذب بھی جاوید ہی کے بھائی نکلے میں تو بالکل نہیں چاہتی تھی کہ اتنا قیمتی تحفہ دیا جائے لیکن مجال ہے جو ذرا میری بات مانی ہو کب سے موڈ آف کر کے بیٹھے تھے پھر میں نے سوچا اگر آپ اپنے میاں کے لیے یہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہیں تو پھر تھوڑی سی قربانی میرا بھی حق بنتی ہے ویسے ظلم تو یہ ہے کہ یہ تحفہ میرے بھائی نے دوبئی سے لا کر دیا تھا بہر حال اب گھر چل کر آج ان دونوں بھائیوں کی خیر نہیں ہے میں بھی اب انہیں گھر جا کر ہی سیدھا کروں گی۔“ اور پھر یہ سب کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں بلکہ بڑی تیزی کے ساتھ چلتی ہوئی جاذب کے ساتھ رکھی خالی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔

اور بڑی بھابھی اپنی جگہ ساکت و صامت کھڑی کئی دیر تک ثنا کے کہے گئے الفاظ پر غور کرتی رہیں انہیں یقین ہی نہ آیا کہ یہ جو کچھ ابھی کہا ہے وہ ثنا کے الفاظ تھے ثنا نے لفاظی کا یہ فن کہاں سے سیکھا؟ وہ تو ثنا کو گیلی اور کچی مٹی کی مانند سمجھتی تھیں جسے اپنی مرضی کے سانچہ میں ڈھالنا انہیں خوب لطف دیتا تھا لیکن آج ثنا کے رد عمل اور الفاظ نے بڑی بھابھی کو سمجھا دیا تھا کہ وقت سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے اور یہ ثنا جیسے لوگوں کو بھی بہت کچھ سمجھا دیتا ہے یقیناً“ وقت ایک بہترین استاد ہے بشرطیکہ آپ اس سے کچھ سیکھنا چاہیں۔

شادی کے پورے چار سال بعد آج میں اپنے وطن عزیز پاک سرزمین پہ قدم رکھنے والی تھی۔ میرے جذبات عجیب سے ہو رہے تھے۔ ایک طرف تو چار سال بعد اپنے ملک لوٹنے کی مسرت اور دوسری طرف میکے والوں سے ملنے کی خوشی' ہر لمحے بعد میرے خون کو سیروں کے حساب سے بڑھا رہی تھی۔

امی ابو' میرا پیارا چھوٹا سا نٹ کھٹ بھائی ابرار اور سامیہ آپی..... کتنے خوب صورت اٹوٹ رشتے تھے۔ جو میں یہیں چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ پر میں اپنی خوشی سے ان سے کب دور ہوئی تھی۔ وہ تو شادی کا بندھن ہی ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان سے جڑ کر باقیوں سے آہستہ آہستہ کنارہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر میں اپنے دیس میں ہوتی تو شاید دوریاں اس قدر نہ ہوتیں۔ پر کیا کیا جاتا۔ عامر اور ان کی فیملی برسوں سے شارجہ میں سیٹل تھی۔ سو ناچار مجھے رخصت ہو کر اتنی دور جانا پڑا۔

پی آئی اے کی پرواز نے جونہی قائداعظم ایئرپورٹ پر لینڈ ہونا چاہا میں بے اختیار اپنے خیالوں سے چونک پڑی۔ معاذ جو کچھ دیر قبل میری گود میں سر رکھ کر سو چکا تھا۔ میں نے فوراً" اسے جگایا۔

"نانو کا گھر آگیا مما؟" اس نے خوشی سے چہکتے ہوئے پوچھا تو مجھے اس کی معصومیت پہ ہنسی آگئی۔

"نہیں ابھی تو ہم کراچی پہنچنے والے ہیں۔ نانو کا گھر حیدر آباد میں ہے۔ پہلے ہم آپ کی سامیہ خالہ کے ہاں جائیں گے پھر شام کو وہاں ابرار ماموں آئیں گے اور اگلے دن ہم ان کے ساتھ نانو کے گھر جائیں گے۔" میں اتنی ایکسائٹڈ تھی کہ پوری تفصیل بتانے بیٹھ گئی۔ یہ خیال کیے بغیر کہ شارجہ میں پیدا ہونے والے تین سالہ معاذ کو بھلا پاکستان کی جغرافیائی حدود کا علم کہاں؟ پھر وہ تو نانو سے ملنے کے لیے بے تاب تھا اسے کیا پتا کہ وہ کہاں رہتی ہیں اور کہاں نہیں؟

ایئرپورٹ پہ ہمیں سامیہ آپی اپنے شوہر کے ساتھ ریسیو کرنے آئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر میں ششدر رہ گئی بلکہ مجھ سے تو پہچانا ہی نہ گیا کہ یہ میری وہی دھان پان سی خوب صورت سامیہ آپی ہیں۔

"سچ سامیہ آپی ان چار سالوں نے تمہیں بہت دھندلا دیا ہے۔ ذرا بھی ویسی نہیں رہیں تم۔" مجھ سے رہا نہ گیا تو اپنی حیرانی کا اظہار کر ہی ڈالا۔ وہ ہنس دیں۔

"وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ تبدیلی تو زندگی کا نام ہے۔" انہوں نے سادہ سے لہجے میں کہا اور معاذ کو گود میں لے کر پیار کرنے لگیں۔

"ماشاء اللہ کتنا پیارا بچہ ہے۔" انہوں نے معاذ کو پیار کیا۔

"تمہارے بچے کہاں ہیں؟ نہیں آئے کیا ساتھ؟" میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر پوچھا۔

"اتنی صبح کہاں اٹھتے ہیں وہ۔ سو رہے تھے اس لیے دادی کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔" ہم دونوں پارکنگ ایریا کی طرف بڑھنے لگے۔ جہاں نعمان بھائی گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے ان سے سلام دعا کی تو وہ بھی بڑے خلوص سے ملے۔

"ارے بھئی عامر میاں کیوں ادھر ہی رہ گئے۔ وہ بھی ساتھ ہی آجاتے۔" ہم گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ انہوں نے گاڑی کے شیشے میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اگر میں ان کے ساتھ آنے کا ارادہ کرتی تو اگلے دس سال مزید انتظار میں نکل جاتے تب بھی انہیں فرصت نہ ملتی میں نے تو کہہ دیا بس بھئی بہت ہو گیا چار سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ اب تو میں پاکستان جا کر ہی رہوں گی۔" میں ہنستے ہوئے انہیں اپنی داستان بے قراری سنانے لگی۔ راستہ بہت سکون سے سمٹ گیا۔ ہمیں گھر چھوڑ کر نعمان بھائی آفس کے لیے نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

سامیہ آپی کا گھر تین کمروں' ایک ہال اور ایک ڈرائنگ روم پر مشتمل تھا۔ تین کمروں میں ایک بیڈ روم سامیہ آپی کا' ایک ان کے چھوٹے دیور کا اور ایک ان کی ساس کا تھا۔

ڈرائنگ روم اور کمروں کا فرنیچر زیادہ مہنگا نہیں تھا اور نا ہی ان کی سجاوٹ اور ترتیب سے سلیقہ مندی جھلک رہی تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں پہ پڑے پردے کئی دفعہ دھلنے کی وجہ سے بے رنگ ہو چکے تھے۔ ڈرائنگ روم کے کونے میں پڑی سلائی مشین اور سامیہ آپی کے کمرے میں۔ ڈیوائیڈر اور بیڈ کی پٹی پر جا بجا فیڈر' دوائیں' موزے' پیمپرز' گھڑی' کتابیں' پین اور وزیٹنگ کارڈ کے ڈھیر دیکھ کر مجھے ایک دم ہی سامیہ آپی کی سلیقہ مندی مشکوک نظر آئی۔ ان کی ساس کافی عمر رسیدہ تھیں۔ گھٹنوں کے درد کی وجہ سے ایک جگہ بیٹھی رہتی تھیں..... سامیہ آپی نے مجھے وہیں بٹھایا اور خود کچن میں ناشتے کا انتظام کرنے چل پڑیں۔ ان کے بچے عمیر اور کرن ابھی دادی کے پاس ہی سو رہے تھے۔

شاید اس لیے معاذ بور سا ہو گیا۔

"آؤ میں آپ کے کپڑے چینج کروا دیتی ہوں۔" اس سے پہلے کہ معاذ کی بسوری شکل زور و شور سے رونے میں مشغول ہو جاتی میں نے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے بیگ کی زپ کھولی۔ معاذ نئے نئے کپڑے پہننے کا شوقین تھا اس لیے اس آئیڈیے سے بہل گیا۔

"چلو بچو اب تم بھی اٹھ جاؤ۔" سامیہ آپی ناشتا تیار کر کے ٹیبل پہ لگا چکی تھیں۔

"دیکھو تو کون آیا ہے؟" انہوں نے تین سالہ عمیر کو اٹھا کر میری گود میں ڈالتے ہوئے خوشگواریت سے پوچھا۔ تو وہ شرما کر سر جھکا گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس کی مشحون آئی ہوں۔

"ارے..... رے یہ تو لڑکیوں کی طرح شرما رہا ہے۔" میں نے اس کے ماتھے پہ پیار کر کے گلے سے لگا لیا۔ کچھ دیر بعد اس کی اور معاذ کی بہت اچھی دوستی ہو گئی۔

ناشتے کے بعد سامیہ آپی پھر سے کچن میں چلی گئیں اور میں ان کی ساس کے ساتھ بیٹھی سوچتی ہی رہ گئی کہ میری وہ آپی کہاں ہے جس کے ساتھ میں ڈھیروں باتیں کرنے کا سوچ کے آئی تھی۔

گزرے ماہ و سال میں آپ بیتی اور جگ بیتی کے حوالے سے کئی ایسے واقعے تھے جو میں ان سے شیئر کرنا چاہتی تھی اور ان کے اندر سرائیت کر کے ان کے تجربوں اور واقعات زندگی کو سننا چاہتی تھی پر میری وہ سہیلی وہ ہمراز بہن نہ جانے کہاں کھو گئی تھی یہ تو کوئی اور ہی سامیہ تھی۔ جو گھر بھر کی ذمہ داریوں کے مدار میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب میں ان کی ساس سے باتیں کر کر کے اکتاہٹ کا شکار ہو گئی تو اٹھ کے سامیہ آپی کے پاس کچن میں آگئی۔ وہ کچن میں کھڑی دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں اور ساتھ میں کمروں کی صفائی کرتی ماسی کو ہدایات بھی دے رہی تھیں۔

"کیا بنا رہی ہو؟" میں نے پیاز کے ساتھ چھری کو نبرد آزما دیکھ کر برائے بات پوچھا۔ اصل میں تو میں کچھ وقت آپ کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔

"قورمہ بنا رہی ہوں۔ تم کیوں یہاں اتنی گرمی میں آکر کھڑی ہو گئی ہو؟ چلو اندر جا کے پنکھے کے نیچے بیٹھو۔" ان کا پورا وجود پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ کافی دیر چولہے کے سامنے کھڑی رہی تھیں۔

"میں پنکھے کے نیچے بیٹھنے نہیں آئی۔ یہاں میں ایک دن اسی لیے ٹھہری ہوں تاکہ پورا دن آپ کے ساتھ گزار سکوں۔ کل تو میں نے ویسے بھی حیدر آباد چلے جانا ہے۔ پر کیا کیا جائے آپ کے پاس تو میرے لیے وقت ہی نہیں ہے۔" نا چاہتے ہوئے بھی شکوہ میرے لبوں پہ آہی گیا۔

"وقت؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"وقت نے تو مجھے اپنا باندی بنا لیا ہے۔" انہوں نے کھوئے کھوئے مگر تبسم سے انداز میں کہا۔ میں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"آپ خوش تو ہیں سامیہ آپی؟ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے....." میں کہتے کہتے رک گئی۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"سب کو خوش رکھ کے میں خوش ہو جاتی ہوں۔" ان کے ہونٹوں میں لکیر سی ابھری۔ وہ مسکراہٹ ہرگز

نہیں ہو سکتی تھی۔ اتنی پھیکی اور بے رونق مسکراہٹ؟

"تم تو خوش ہو نا؟" انہوں نے بات ٹالتے ہوئے پوچھا۔ میں ہنس دی۔

"بہت زیادہ خوش ہوں۔ عامر بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ سچ مجھے تو پتا ہی نہ تھا کہ وہ اتنا پیار کریں گے مجھ سے۔" میں نے جتاتے ہوئے کہا۔ نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں حسرت سی جاگی تھی۔ وہ جو چار سال پہلے ان کی آنکھوں میں محبت کا فخر ہوا کرتا تھا وہ اب معدوم ہو چکا تھا۔ میں ڈر گئی ان کی آنکھوں میں بے بسی، پچھتاوا اور نہ جانے کیا کیا نظر آیا میں نے کچھ نہ پوچھا۔ میں ان کے بھرم کو توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام کو جب میں نے وہاں ابرار کو دیکھا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب میں یہاں سے بیاہ کر گئی تھی تو وہ ساڑھے سترہ برس کا دبلا پتلا سا لڑکا تھا اور اب ماشاء اللہ سے بائیس سال کے بھرپور نوجوان کے روپ میں ابھر کر سامنے آیا تھا۔

اس کے چہرے پر سنجیدگی، بردباری اور گھنی مونچھوں کے اضافے نے جہاں مجھے حیران کیا تھا وہیں بے پناہ خوشی بھی۔

میں تو خوشی کے مارے اس سے لپٹ گئی۔ میرے لیے تو وہی میرا چھوٹا بھائی باری تھا جس کو چڑانے کے لیے میں اس کی ناک کھینچا کرتی تھی۔

"ابرار اتنے خوبرو کب سے ہو گئے تم؟" میں نے فرط مسرت میں اس کی پیشانی بھی چوم لی۔

"تمہارا ہی رنگ چڑایا ہے۔" وہ بدل تو گیا تھا۔ پر عادت نہ بدلی تھی مسکا لگانے والی میں اس کا ہاتھ تھام کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ اور اس سے امی اور ابو سے متعلق باتیں کرنے لگی۔

"باری دل کر رہا ہے ابھی اڑ کے حیدر آباد پہنچوں اور امی ابو سے جی بھر کے ملوں۔" میں نے آنکھیں میچ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا میں صبح میں ہی آ جاؤں گا پھر دوپہر کے بعد نکلیں گے حیدر آباد کے لیے پر تمہیں ہی شوق چڑایا تھا کراچی میں رت جگا کرنے کا۔"

"کہاں کا رت جگا۔ سامیہ آپی بے چاری دن بھر کی تھکی ہوئی ہیں۔ رات کو میں ان کا آرام تھوڑی خراب کروں گی۔" میں نے فکر مندی اور بہنوں والے پیار کا اظہار کیا۔

"ہاں صحیح سامیہ آپی تو بے چاری گھن چکر بن کر رہ گئی ہیں۔ آپ نے ان کی شکل دیکھی ہے؟ کیسی یکدم ہی وہ بوڑھی سی ہو گئی ہیں پتا ہے کچھ عرصہ وہ انشورنس کمپنی میں جاب بھی کرتی رہی ہیں۔" ابرار نے میری حیرت میں اضافہ کیا۔

"کیا سامیہ آپی اور جاب؟" میں نے حیرانی سے دہرایا۔

"ہاں، نعمان بھائی کے حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ انہیں اپنے شوہر کا سہارا بننا پڑا۔ ان پر بہنوں کی شادی کا بوجھ تھا اس میں بھی سامیہ آپی نے ان کی مدد کی۔ ان کی ساس معذور ہیں اور ساری دیکھ بھال سامیہ آپی کرتی ہیں۔ ان کی بیٹیاں تو بس مہمانوں کی طرح حال چال معلوم کر کے چلی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی انسان اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں نے بہت کم سامیہ آپی کو خوش دیکھا ہے۔ نعمان بھائی کے پاس تو شاید ان کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا اور جب کسی بہت اپنے کی طرف سے توجہ میسر نہ ہو تو انسان اپنی ذات کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ شاید سامیہ آپی بھی وہی کر رہی ہیں۔" ابرار کی باتیں سن کر میں بھونچکی رہ گئی۔ ایک لفظ جس پر میرے ذہن کی سوئی اٹک گئی وہ سمجھوتہ تھا۔

میں چپ ہو گئی پھر وہ ہی باتیں کرنے لگا۔ رات میں نعمان بھائی گھر آئے۔ اور میں نے لاشعوری طور پر محسوس کیا وہ اور سامیہ آپی کھنچے کھنچے سے تھے۔ ان کے مابین وہ بے تکلفی اور محبت کا اظہار دیکھنے کو نہیں ملا جو میرے اور عامر کے درمیان تھی۔ شاید دونوں ہی

اپنی اپنی دنیاؤں میں کھوئے ہوئے تھے۔
سب نے مل کر کھانا کھایا۔ سامیہ آپی نے بریانی بنائی تھی۔ معاذ اب کچھ کچھ سب سے مانوس ہونے لگا تھا۔ رات کو جب میں بستر پہ آئی تو میرے ذہن میں ابرار کی باتیں گھومنے لگیں۔ نا چاہتے ہوئے بھی میرا ذہن چار سال پہلے یادوں کی بھیڑ میں بھٹکنے لگا۔

☼ ☼ ☼

باہر تیز بارش ہو رہی تھی اور شاید لائٹ بھی گئی ہوئی تھی۔ اس لیے پورے گھر میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا میری آنکھ کھلی تھی۔
پیاس سے میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ یا پھر کوئی غیر معمولی بات تھی۔ نہ جانے کس طلب کے احساس نے یوں آدھی رات کے اس پہر مجھے جگا دیا تھا۔
میں اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگی کہ اچانک مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ یہ سسکیاں سامیہ آپی کی تھیں۔
"کیا ہوا سامیہ آپی رو کیوں رہی ہیں؟" اندھیرے میں مجھے ان کا ہیولا ہی دکھائی دیا۔۔۔ وہ ٹھنڈے فرش پہ بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے سسک رہی تھیں۔
"یوں مت روئیں آپی پلیز ورنہ میرے دل کی دھڑکنیں رک جائیں گی۔" مجھے واقعی اس کے رونے سے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ صبح سے تو کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی جو ان کے رونے کا سبب بنی ہو۔ بلکہ آج کی صبح تو ان کے لیے نوید لائی تھی۔ سامیہ کے لیے ابو کے دوست کے بیٹے کا پرپوزل آیا تھا۔ لڑکا شارجہ میں سیٹل تھا۔ اچھی نوکری، اچھی شخصیت، اچھی فیملی اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے تھا۔ امی ابو بہت خوش تھے۔ مگر سامیہ کے یہ آنسو۔۔۔۔
"سامیہ آپی۔۔۔ کیا ہوا؟" میں دوبارہ ان پر جھک گئی تو انہوں نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا۔
"مشحون تمہیں پتا ہے محبت اور سمجھوتے میں کیا فرق ہوتا ہے؟" اندھیرے کی وجہ سے میں ان کا چہرہ، آنکھیں اور تاثرات کچھ بھی نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ البتہ ان کی بھیگی آواز میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ میں چونک گئی۔
"بتاؤ نا مشحون میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" انہوں نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔
"یہ کیسا سوال ہے سامیہ آپی؟" میں نے الجھن آمیز انداز میں کہا۔
"ہاں تمہارے لیے یہ سوال بہت عجیب ہو گا کیونکہ تم نے محبت نہیں کی۔ تم اس جذبے کی حقیقت اور اس کی لافانی حیثیت سے ناواقف ہو۔ تم پہ آشکار ہی نہیں ہوا کہ لفظ محبت کے حصار میں قید ہونا کیا ہوتا ہے۔ اس کی خوشبو کو سانسوں میں اتارنا کیا ہوتا ہے۔ تمہیں پتا ہی نہیں کہ جب پیار ہوتا ہے تو دل کی حالت کیا ہوتی ہے اور ذہن پر من چاہی شخصیت کے اثر کا جادو کیونکر؟ مشحون تم واقف ہی نہیں ہو کہ محبت کا وجود پہلے خود کو منواتا ہے اور اپنا اسیر کر لیتا ہے۔" وہ لفظ محبت کی تشہیر کرتے کرتے نہ جانے کہاں پہنچ چکی تھیں۔ میں گم سم سی انہیں سنے گئی۔
"مشحون محبت انسان کو بدل دیتی ہے۔ ایک بار دل میں اس کا بسیرا ہو جائے تو یہ خود بخود اپنی جڑیں بنانی چلی جاتی ہے۔ محبت نے میرے دل میں ابھی اپنا گھر بنا لیا ہے۔ اور میں اس میں قید ہونا چاہتی ہوں۔ امی اور ابو میرے لیے بے شک اچھا ہی سوچ رہے ہوں گے لیکن میں ان کی خوشی کی خاطر زندگی کو سمجھوتے کا نام دے کر جینا نہیں چاہتی میں کیا کروں۔ میں بے بس ہوں لاچار ہوں۔ امی ابو کی خواہش سر آنکھوں پر لیکن جو میرے اختیار میں نہیں خدارا وہ مجھ سے مت مانگیں ورنہ میں جی نہیں پاؤں گی۔" اس قدر صاف اور واضح اظہار محبت وہ بھی سامیہ جیسی پروقار و سنجیدہ لڑکی کے منہ سے سن کر میں تو ہوا میں تحلیل ہو گئی۔
"آپ کو محبت ہو گئی ہے۔" میرے اس ایک سوال میں ان گنت سوالات تھے سامیہ آپی اور میں بچپن سے ساتھ ساتھ تھے ہماری عمروں میں بس ایک



سال کا فرق تھا۔ لیکن ہماری دوستی پیار اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے والی طبیعت نے عمر کے اس ایک سال کے فرق کو کبھی نہیں گردانا تھا۔
اسکول کالج اور پھر یونیورسٹی تک ہم دونوں ساتھ ساتھ تھے اور ہمارے شوق مشاغل باتیں اور مقاصد بھی یکساں پھر نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا جس میں سامیہ کو پر عطا ہو گئے تھے اور وہ محبت کی اڑانیں بھرنے لگی تھیں اور میں بے خبر رہ گئی تھی۔
"یہ کب ہوا سامیہ آپی؟ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" میری آواز میں تحیر تھا۔ انہوں نے میرے کندھے پہ سر رکھ دیا۔
"مشحون یہ شاید پہلی بار تھا کہ ایک بات ہمارے درمیان ان کہی رہ گئی۔ ہم تو چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔ پر پتا نہیں کیوں میں تمہیں بتا ہی نہ سکی کہ میں اپنے اندر کیا تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔ شاید اس لیے کہ پہلے میں خود یقین کر لینا چاہتی تھی کہ جو میں محسوس کر رہی ہوں وہ وہی ہے جسے محبت کہتے ہیں اور آج یہ جذبہ پوری آب و تاب کے ساتھ مجھ پر جلوہ گر ہوا ہے۔ ہاں مشحون میں اقرار کر رہی ہوں کہ مجھے نعمان احمد سے محبت ہو گئی ہے اور میں اس کے علاوہ کسی اور کا تصور تک نہیں کر سکتی۔" وہ کسی الوہی جذبے کے زیر اثر تھیں۔
میں ان کے لہجے کی پختگی میں کھو سی گئی۔
"کون ہے وہ شخص؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟"
"نعمان سے میں یونیورسٹی میں ہی ملی تھی۔ وہ ایم بی اے کے بعد اب جاب کرنے لگا ہے۔ پہلا اشارہ اس کی طرف سے ملا تھا۔ تب میں نہیں سمجھی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ میرے دل میں اپنا گھر بناتا گیا۔ اور مجھے یقین ہونے لگا کہ اس شخص سے متعلق میرے جذبے بھی بدلنے لگے ہیں۔"
حقیقت کو عیاں کرتے وقت ان کی آواز مترنم ہو گئی۔ بارش اب بھی باہر ہو رہی تھی اور کمرے میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مگر سامیہ آپی کی آنکھوں میں محبت کی قندیلیں روشن تھیں۔
"کیا آپ کو لگ رہا ہے کہ آپ صحیح فیصلہ کر رہی ہیں؟" جانے کیوں مجھے خدشہ سا ستانے لگا۔ انہوں نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔
"میں نہیں جانتی میرا فیصلہ درست ہے یا غلط میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میں اپنی محبت نہیں کھو سکتی پھر مشحون تم یہ بھی تو سوچو کہ زندگی مجھے گزارنی ہے نا کہ امی اور ابو کو، اگر میں ان کی مرضی سے شادی کر بھی لوں تو میں خوش نہیں رہ پاؤں گی۔ کیونکہ محبت کھو کر کوئی خوش نہیں رہ پاتا۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور میں اسے سمجھوتے کا نام نہیں دے سکتی۔" ان کی آنکھوں میں پھر سے آنسو بھر گئے۔ میں نے انہیں گلے سے لگا لیا۔ کچھ بھی ہو۔ مجھے سامیہ آپی کی خوشیاں بے حد عزیز تھیں اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ان کا ساتھ دوں گی۔
اگلے دن میں امی ابو کے کمرے میں موجود تھی۔ سامیہ آپی نے اپنی زندگی سے متعلق جو فیصلہ لیا تھا اسے کسی نہ کسی طرح ان تک پہنچانا تو تھا ہی سو یہ ذمہ داری میں نے لی۔
"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟" میں نے بہت ہمت جمع کرنے کے بعد ان ہستیوں کو مخاطب کیا جو میرے لیے بہت عزت و احترام رکھتے تھے۔ آج میں ان کے فیصلے کے خلاف جا رہی تھی۔ صرف سامیہ کے لیے۔
"ہاں کہو بیٹا۔" ابو کا وہی شفقت بھرا انداز امی کی نگاہیں بھی مجھ پہ ٹکی تھیں۔
"ابو آپ سعادت انکل کو منع کر دیں کیونکہ سامیہ آپی اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہیں۔" میں نے تمہید باندھنے کی بجائے براہ راست کہا۔
"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" جواب ابو کی بجائے امی نے دیا تھا اور صاف لگ رہا تھا کہ انہیں میری بات پہ غصہ آ گیا ہے۔
"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں امی۔ سامیہ آپی اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہیں اور میرے خیال سے ہمیں ان کے ساتھ زبردستی نہیں کرنی چاہیے۔" میں نے تحمل سے کہا مگر امی کو اچھا نہیں لگا۔

"سامیہ اتنی بڑی کب سے ہو گئی کہ اسے ہمارے فیصلے غلط لگنے لگے۔" امی کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

"ایک منٹ رفعت۔" ابو نے پہلی بار لب کھولے۔

"بیٹا سامیہ کو آخر انکار کیوں ہے؟ آپ نے وجہ نہیں پوچھی۔" ابو سمجھ دار اور حلیم الطبع انسان تھے اس لیے تحمل اور بردباری سے پوچھنے لگے۔

"وہ کسی اور کو لائیک کرتی ہیں۔" میں نے نگاہیں جھکالیں۔ وہ دونوں چپ ہو گئے۔ جو کافی دیر بعد مجھے ابو کی آواز سنائی دی۔

"بیٹا آپ اپنے کمرے میں جا سکتی ہیں۔"

میں وہاں سے چلی آئی۔ پیچھے ان دونوں میں نہ جانے کیا باتیں ہوئیں۔

"کیا ہوا مشعون تم نے امی ابو سے بات کی؟" میں واپس اپنے کمرے میں آئی تو سامیہ آپی پریشان صورت لیے بیٹھی تھیں۔

"ہاں میں نے ان تک بات تو پہنچادی ہے۔ مگر فی الحال رزلٹ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" میں نے اپنے ہونٹ کاٹے۔

"اوہ خدایا وہ نہیں مانے تو..." وہ بالوں میں انگلیاں پھنسا کر مزید پریشانی سے گویا ہوئیں تو مجھے بے اختیار ان پر پیار سا آگیا۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گی کہ وہ مان جائیں اور پھر وہ ہمارے والدین ہیں ان کی خوشیاں بھی ہماری ہی خوشیوں سے ہوتی ہیں۔" میں نے انہیں خود سے لگا کر تسلی دی تو وہ چپ ہو گئیں۔

✲ ✲ ✲

دو دن یونہی گزر گئے۔ امی نے کوئی بات کی۔ نہ ہی میں پوچھنے کی ہمت کر سکی۔ تیسرے دن صبح ناشتے کے بعد جب امی کچن سمیٹ رہی تھیں تو میں ہمت کر کے ان کے پاس جا پہنچی۔

"امی پھر آپ نے سامیہ آپی سے متعلق کیا سوچا" میرے سوال پر امی نے میری طرف مڑ کے دیکھا۔

"تمہیں سامیہ کی وکالت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے دوٹوک انداز میں مجھے سرزنش کی۔

"امی وہ میری بڑی بہن ہیں۔ مجھے ان کی خوشیاں بہت عزیز ہیں۔" میں ان کے سامنے تن کے کھڑی ہو گئی۔

"تمہاری بہن ہونے سے قبل وہ ہماری بیٹی ہے اور ہم اس کی خوشیوں کے دشمن نہیں ہیں۔" انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر ایسا ہے امی تو پھر آخر ان کی بات ماننے میں تامل کیوں؟ جیسا وہ چاہتی ہیں آپ ویسا کرتی کیوں نہیں؟" میں سراپا سوال بن گئی۔

"بچوں کی ہر ضد پوری نہیں کی جاتی مشعون پھر شادی کوئی چار دنوں کا معاہدہ نہیں۔ عمر بھر کا ساتھ ہے۔ اس کی بنیاد محض محبت کے کھوکھلے جذبے پر نہیں رکھی جاسکتی۔ محبت کے رنگ بہت کچے ہوتے ہیں۔ یہ جتنی جلدی چڑھتے ہیں۔ اتنی ہی جلدی اتر بھی جاتے ہیں سامیہ کو سمجھاؤ۔ سعادت بھائی تمہارے ابو کے بچپن کے دوست ہیں۔ ان کا بیٹا عامر شارجہ میں انجینئر ہے۔ سر آنکھوں پہ بٹھائیں گے وہ سامیہ کو۔ محبت کا کیا ہے وہ تو جب دو انسان نکاح کے رشتے میں جڑتے ہیں تو وہاں بھی پیدا ہو جاتی ہے اور محبت اگر شادی کے بعد اپنے ہم سفر سے پیدا ہو تو زیادہ اثر رکھتی ہے۔ شادی پہلے کیا جانے والا پیار بعد میں اپنا اثر کھو دیتا ہے۔"

امی کا ایک ایک لفظ میرے دل پہ نقش ہو رہا تھا۔ آخر انہوں نے بھی تو ابو سے ارینج میرج کی تھی اور اتنی شاندار زندگی گزاری تھی۔ ان کے مابین محبت اعتماد اور وفا کا جو رشتہ تھا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ مگر میں یہ تمام باتیں سامیہ آپی کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔ کیونکہ ان کا نظریہ حیات الگ تھا۔ وہ محبت کو کھونے کی ہمت نہیں رکھتی تھیں۔ اور نہ ہی کسی انجانے انسان کے ساتھ



[ا]پنا رشتہ جوڑنے کو تیار ہے۔ اگلے کئی دنوں تک پھر [ایک] خاموشی چھائی رہی۔ ابو کم کم نظر آتے تھے اور امی [بے] تعلق سی ہو گئی تھیں۔ گھر میں چھائی ہوئی اس [چپ] فضا نے ابرار کی شوخیاں بھی چھین لی تھیں اور [سامیہ] آپی کی چپ، پژمردگی اور بے رونق آنکھوں [کا ح]ال مجھے ہر پل جھنجھوڑتا اور میں ایک ہی دعا کرتی [کہ کس]ی طرح ان کے چہرے کی رونق بحال ہو جائے۔ وہ [پہلے جی]سے ہنسنے بولنے لگیں۔

✲ ✲ ✲

"مشعون امی اور ابو نے یوں چپ کیوں سادھ لی [ہے]۔ آخر وہ کیا چاہتے ہیں؟" بالآخر وہ بے نام سی اس [چپ] سے جھنجلا گئی تھیں۔ میں نے ان کے ہاتھ تھام [لیے]۔

"سامیہ آپی ایک بار پھر اپنے فیصلے پر غور کر لیں کہ [و]الدین بھی تو آخر اپنی اولاد کا بھلا ہی چاہتے ہیں۔ ان [کے] فیصلوں میں اپنی اولاد کے لیے بھلائی ہوتی ہے۔" [مجھے] نہ جانے کیا ہوا میں انہیں سمجھانے بیٹھ گئی۔ ان [کی] آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

"کیا تم بھی تھک گئی ہو میرا ساتھ دیتے دیتے۔" [انہ]وں نے مجھے بے اعتباری سے دیکھا۔

"نہیں میں تھکی نہیں اور نہ ہی تھکوں گی۔ میں تو [آ]ج کی ایک نئی راہ کو آپ تک ہموار کر رہی ہوں۔ [ا]س دن امی نے جو باتیں کیں پتا نہیں کیوں مجھے ان [میں] بہت سچائی اور بہتری نظر آئی اور وہ یہ کہ محبت اگر [ش]ادی کے بعد پیدا ہو تو زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ شادی سے [پہلے] کی جانے والی محبت بعد میں اپنا اثر کھو دیتی ہے۔" [میں] خود بھی کھونے لگی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے میں جوا کھیلوں؟ اپنی زندگی کو [داؤ پر] لگاؤں؟ یہ دیکھنے کے لیے کہ شادی کے بعد مجھے [محبت] ملتی ہے کہ نہیں مشعون تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ [تم] جان بوجھ کر مجھے تجربوں کی نذر ہو جانے کا مشورہ [دے] رہی ہو۔"

[پہ]لی بار میں نے ان کے لہجے میں شدت محسوس کی

شاید وہ اب بے زار ہو چکی تھیں۔ میں جو انہیں کچھ سمجھانے کے ارادے سے بیٹھی تھی ان کے جوابی جملوں میں بغاوت کی بو محسوس کر کے چپکی ہو گئی۔

اتفاق تھا کہ اسی وقت وہاں سے ابو کا گزر ہوا۔ انہوں نے ہماری باتیں سن لی تھیں اور شاید سامیہ آپی کے چہرے کی بے زاری بھی پڑھ لی تھی۔ انہوں نے گہرا سانس لیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے ہمارے قریب آ گئے۔

"تو آپ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ اپنی پسند سے ہی شادی کریں گی۔" انہوں نے سامیہ کو مخاطب کیا تھا۔ سامیہ آپی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس اثبات میں گردن ہلائی۔

"ٹھیک ہے آپ کی شادی وہیں ہو گی جہاں آپ چاہتی ہیں۔ آپ اس لڑکے سے کہہ دیں کہ رشتے کے لیے اپنے بڑوں کو ہمارے ہاں بھیجیں۔" ابو اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھ گئے۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتی رہ گئیں۔

✵ ✵ ✵

امی کو جب پتا چلا کہ ابو نے سامیہ آپی کی بات مان لی ہے تو پہلے پہل انہوں نے خوب اعتراض کیا۔ لیکن پھر جب ابو نے سمجھایا تو وہ چپ ہو گئیں نعمان بھائی کی فیملی اچھی تھی۔ امی ابو کو وہ لوگ پسند آئے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے دل میں آئے شکوے بھی مٹنے لگے اور انہوں نے دل سے رشتہ پکا کر دیا۔ سامیہ آپی بہت خوش تھیں۔ اس لیے ظاہر ہے میں بھی بہت خوش تھی۔ پھر اچانک امی نے مجھ سے وہ سوال کیا کہ میں اندر تک لرز گئی۔

"مشعون اگر تم بھی اپنے لیے لڑکے کا انتخاب کر چکی ہو تو ابھی بتا دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری باری پہ بھی ہمیں کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔" ان کی سرد آواز میں گونجنے والا یہ سوال مجھے اندر تک ہلا گیا۔ میں نے فوراً" نفی میں سر ہلایا۔

"امی پلیز آپ میری طرف سے بدظن نہ ہوں میری زندگی میں کوئی بھی نہیں ہے۔" میں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ امی آہستہ سے میرے قریب آئیں۔ مجھے سینے سے لگایا اور پوچھا۔

"تو پھر ہم سعادت بھائی کے بیٹے سے تمہارا رشتہ پکا کر لیں؟ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" میں حیران رہ گئی۔ ابو کی نظریں بھی مجھ پہ ٹکی تھیں ان کی آنکھوں میں ایک آس تھی۔ امید تھی۔ میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔

میں بچپن سے ہی ابو کے ساتھ بہت اٹیچ تھی۔ ان کو دکھ پہنچانے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر میری زندگی میں کوئی تھا بھی نہیں۔ تو کیا وجہ تھی جو میں ابو کی آس کو خالی جانے دیتی۔

بس یہی ایک احساس تھا جس نے آن واحد میں مجھ سے اتنا بڑا فیصلہ کروا لیا۔

"آپ میرے لیے جو بہتر سمجھیں وہ کریں مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہے۔" امی نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ ابو کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ان دونوں کو خوش دیکھ کر مجھے اپنے دل میں ڈھیروں سکون اترتا محسوس ہوا۔

✵ ✵ ✵

کاتب تقدیر نہ جانے کیا لکھ رہا تھا۔ سب کی قسمتوں کی ڈوریں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کے فیصلوں کے آگے ہمارے فیصلے کچھ نہ تھے۔ مگر انسان بہت بے خبر ہے۔ اسے اپنے فیصلوں پہ ناز ہے۔ اطمینان ہے۔ جیسے سامیہ آپی کو تھا۔ وہ اپنے لیے اپنی پسند کی راہیں چن کر نازاں تھیں کہ انہوں نے نصیب کے سارے رنگ چرا کر اپنی دسترس میں کر لیے ہیں پر حقیقت کچھ اور ہی تھی۔

گھر میں ہماری شادیوں کی تیاری شروع ہو چکی تھیں۔ امی جو پہلے سامیہ آپی سے تھوڑا ناراض تھیں۔ اب سارے شکوے گلے بھلا کر بڑے پیار سے



دونوں کی پسند سے ہر چیز لے رہی تھیں۔ ابرار البتہ اداس ضرور تھا۔ اسے بس ایک ہی غم تھا کہ ہم دونوں ایک ہی وقت میں ایک ساتھ اسے اکیلا چھوڑ کے جا رہی تھیں۔

"اچھا ہے نا تمہارے تو عیش ہو جائیں گے۔ ویسے بھی اکلوتے ہونے کی وجہ سے امی کے تو شروع سے ہی لاڈلے ہو۔ اب ابو کی محبتیں بھی تمہیں ہی ملا کریں گی۔" سامیہ آپی نے اس کے بال بکھیر ڈالے

دن یونہی ہنستے مسکراتے گزرتے رہے اور پھر وہ گھڑی بھی آن پہنچی جب ہم دونوں بیاہ کر بابل کے آنگن سے اڑ گئیں۔

سامیہ آپی کی سسرال حیدر آباد میں ہی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد وہ لوگ کراچی شفٹ ہوئے تھے۔ میں شادی کے ایک ہفتے بعد ہی اپنے سسرال والوں کے ساتھ شارجہ سدھار گئی۔

وہ جو لاکھ اطمینان کے باوجود ایک خدشہ سا تھا کہ نہ جانے وہ ان دیکھا انجانا شخص کیسا ہو گا وہ عامر کی محبتیں ... مٹ گیا۔ عامر بہت ہی پیاری شخصیت کے مالک ... اللہ نے انہیں بہت کچھ دیا ہے۔ لیکن میں نے ... کبھی غرور کرتے نہیں دیکھا۔ جب مجھے معاذ کے ... کی خوشخبری ملی تو انہوں نے ہی نہیں بلکہ میرے ... سسر نے بھی مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ مجھے تو ... بیٹھے بٹھائے جنت ہی مل گئی تھی۔

اس سارے عرصے میں گھر والوں سے اور سامیہ ... سے فون پہ رابطہ رہا۔ وہ کبھی کبھی ذکر کر دیا کرتی ... کہ ان کے مالی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ یا پھر ... پر بھائی بہنوں کا بوجھ ہے۔ ایک بہن کی شادی تو ... نے عمیر کی پیدائش کے بعد کر دی تھی۔

میں ان کی دلجوئی کرتی تھی کہ کیا ہوا جو حالات ٹھیک ... وہ آپس میں محبت اور تعاون سے ہر کٹھن ... کو عبور کر لیں گے۔ سامیہ آپی خاموش ہو جاتی ... شاید وہ مجھے بتا نہیں پاتی تھیں کہ کٹھن حالات

اور یک طرفہ قربانیوں کی چکی میں پس پس کر محبت بھی آخر دم توڑ ہی دیتی ہے آخر کب تک محبت کے نام پہ انسان خود کو قربان کرتا جائے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ جس سے آپ محبت کرتے ہیں اسے آپ کی خوشیوں اور آرام سے واسطہ ہی نہ ہو۔ سامیہ آپی اپنی ساس کا خیال رکھتی تھیں۔ دیوروں کی خدمتیں کرتی تھیں نندوں کو خوش رکھتی تھیں تب جا کے شوہر کے دل میں مقام و عزت کی حق دار ٹھہرتی تھیں یہ نہیں ہے کہ ساس کی خدمت کرنا یا نندوں سے اچھا سلوک کرنا کوئی غلط بات ہے۔ بلکہ یہ ذمہ داری تو ہر شادی شدہ عورت پہ عائد ہوتی ہے۔ میں بات تو صرف سامیہ آپی کے نظریے کی کر رہی ہوں۔ جنہیں سمجھوتے سے چڑ تھی اور جو کہتی تھیں کہ میں زندگی کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔ تو کیا اس محبت اور اس کی شادی شدہ زندگی نے پے در پے ان سے سمجھوتے نہیں مانگے تھے؟ کیا انہوں نے محبت کی ساکھ بچانے کے لیے زندگی کے ہر مقام پر کمپرومائز نہیں کیا تھا۔

نعمان بھائی نے بے شک انہیں پیار دیا تھا لیکن بدلے میں ان سے ہر مقام پر کمپرومائز مانگا تھا۔ ان کے شوہر کو بہنوں اور بھائیوں کے حقوق تو یاد رہتے تھے مگر بیوی صرف قربانیوں اور سمجھوتوں کے لیے تھی۔

نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی میں ان کی اور اپنی ازدواجی زندگی کا موازنہ کرنے لگی اور میں اس نتیجے پر پہنچی کہ کبھی کبھی سمجھوتے کے تحت جوڑے گئے رشتوں میں بھی بے پناہ محبت جنم لے سکتی ہے۔ جیسے میرے اور عامر کے درمیان محبت نے اپنا وجود بنایا تھا اور کبھی کبھی محبت کے دامن میں بھی سمجھوتے جگہ بنا سکتے ہیں۔ جیسے سامیہ آپی کی زندگی میں ہو گیا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

✵ ✵

نبیلہ عزیز

# درِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن 'بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل حور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باوٴ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوس سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس ... نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو ... ہیں۔

## ۱۸ اٹھارہویں قسط
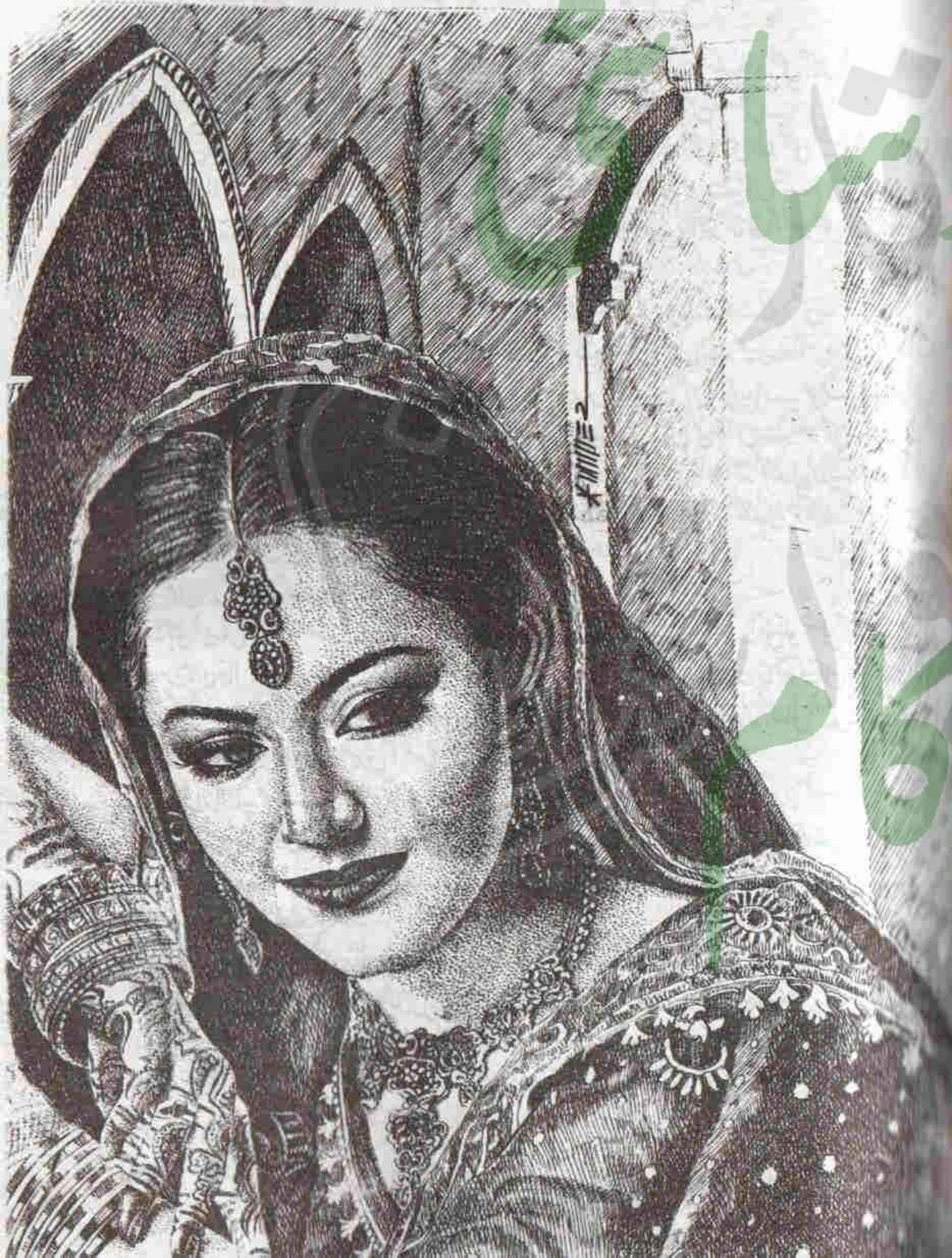
اور یہ سناٹا کافی دیر یوں ہی چھایا رہا تھا۔
وقار آفندی کی آواز کہیں گم ہو چکی تھی جبکہ اس چیز سے بے خبر عائشہ آفندی اپنی ہی کہے جا رہی تھیں۔
"ہاں! میں نے زہرہ کو دیکھا ہے بھائی صاحب..... وہ..... وہ..... میری زہرہ ہی تھی..... وہ میرے سامنے ہی گاڑی بیٹھ کر چلی گئی' اور میں..... میں اسے پکارتی رہ گئی' اس نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں' میری آواز بھی نہیں سنی' وہ رکی بھی نہیں اور چلی گئی۔" عائشہ آفندی گہرے صدمے کے زیر اثر تھیں' اسی لیے ان کے منہ سے بے الفاظ نکل رہے تھے۔
اور گہرے صدمے کے زیر اثر تو شاید وقار آفندی بھی تھے جن کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔
"عائشہ! تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے شاید؟" انہوں نے سوال کیا تھا' لیکن بمشکل.....
"نہیں! ہر گز نہیں' مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی' اتنے سال ہو گئے پہلے کبھی ایسی غلط فہمی نہیں ہوئی تو آج ہونی تھی بھلا؟ میں اپنے پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ زہرہ تھی' وہ سر سے پاؤں تک زہرہ تھی' زہرہ میرے دل پہ لکھی ہے' میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں بھلا؟" عائشہ آفندی کے ساتھ ساتھ آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ وقار آفندی کو یقین بھی دلا رہی تھیں۔
"لیکن عائشہ....." انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا' مگر عائشہ آفندی نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔
"نہیں بھائی صاحب! اب کوئی تسلی یا دلاسا مت دیجیے گا' وہ یہیں کہیں ہے' میرے آس پاس' بس آپ ایک بار پھر اسے تلاش کرنا ہے' وہ اسی ملک میں ہے' وہ ضرور مل جائے گی' بس ایک بار..... صرف ایک بار اس سے پوچھنا ہے کہ وہ اپنی عائشہ کو اس طرح اچانک بغیر بتائے کیوں چھوڑ کر چلی گئی؟ اس نے اگر کسی کے ساتھ شادی کر لی تھی تو مجھے بتا کر جاتی' غیروں کی طرح' اجنبیوں کی طرح کیوں چلی گئی؟" عائشہ آفندی روتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا' کال بند ہونے کی آواز پہ عائشہ آفندی چونک گئیں۔ انہوں نے فوراً" دانیال کی سمت دیکھا تھا۔
"فون بند کیوں ہو گیا ہے؟"
"امی! یہاں سگنلز کا مسئلہ ہے' کال ڈراپ ہو جاتی ہے۔" دانیال انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا' وہ کافی دیر سے پریشان حال سی رو رہی تھیں اور دانیال ان کی طرف سے متفکر ہو رہا تھا' اسے پتا تھا کہ ان کی صحت پہ اثر پڑے گا' لیکن وہ تھیں کہ سمجھ ہی نہیں رہی تھیں' انہیں اس وقت زہرہ کے سوا کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا' سالوں بعد وہی جوانی والی بے صبری آ ٹھہری تھی۔
ان کی زبان پہ صرف زہرہ کا نام تھا۔
ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ زہرہ کو کہیں سے ڈھونڈ کے اپنے سامنے لے آئیں اور وہ سب کچھ پوچھ ڈالیں جو وہ اتنے سالوں سے اپنے دل و دماغ میں لیے پھر رہی تھیں۔ لیکن ان کا بس چلتا تب نا؟ دانیال ان کی حالت کے پیش نظر ان کی میڈیسن لے آیا تھا۔
"پلیز یہ میڈیسن کھا لیں' طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے زبردستی انہیں میڈیسن کھلائی تھیں' ان کی میڈیسن میں نیند کی دوا بھی شامل تھی' جس کے بعد وہ یقیناً" تھوڑی ریلیکس ہو جاتیں' اسی لیے وہ انہیں ان کے بیڈ روم میں لے آیا تھا۔ اور انہیں کمبل اوڑھا کر کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ باہر آ کر بھی ٹہلتے ہوئے اسی بات کو سوچ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وقار آفندی کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا اور ان کی سماعتوں میں سائیں سائیں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔




دماغ کے پرخچے اڑ گئے تھے' ان کی سوچیں' ان کے خیالات اور ان کا سکون سب کچھ برباد اور منتشر ہو گیا تھا' ان کا ذہن ہر چیز سے مفلوج ہوا تھا تو انہوں نے عائشہ آفندی کا فون بغیر کچھ کہے ہی بند کر دیا تھا' اس وقت ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا' ان کی قوت گویائی بھی جیسے سلب ہو چکی تھی' وہ جہاں تھے وہاں ہی بیٹھے رہ گئے۔ ان کی ذات دھواں دھواں ہو رہی تھی اور اس دھوئیں کے مرغولے آسمان کی سمت اٹھ رہے تھے' اک اذیت ناک اور تلخ سا غبار تھا جو ان کے اطراف میں بہت تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا اور وہ اس تلخ غبار میں ڈوبتے جا رہے تھے اور انہیں اس کیفیت میں نہ جانے اور کتنی دیر گزر جاتی کہ اچانک مبارک خان آفس روم کے دروازے پہ دستک دے کر اندر چلا آیا۔
"صاحب جی! وہ نیچے وزیٹنگ روم میں معیز ہمدانی آپ کا انتظار....." مبارک خان کی کہتے کہتے اچانک ان کی نظر اٹھی تھی اور وہ بے ساختہ چپ ہو گیا۔ قیامت گزر جانے کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے' وہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔
"صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں؟" مبارک خان ان کی ٹیبل کے قریب آ گیا تھا' لیکن وہ پھر بھی متوجہ نہیں ہوئے اور مبارک خان کی تشویش اور بڑھ گئی تھی۔
"صاحب! کیا بات ہے؟ آپ ٹھیک نہیں لگ رہے؟" اس نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے کو ہلایا اور وقار آفندی یک دم جیسے کسی سکتے سے باہر آئے' انہوں نے چونک کر مبارک خان کی سمت دیکھا' ان کی آنکھیں خالی خالی لگ رہی تھیں۔
"صاحب! آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟" مبارک خان ان کی طرف سے بے حد پریشان تھا اور وقار آفندی کچھ بھی بولنے سے قاصر نظر آ رہے تھے' اس نے کچھ سوچتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور پھر جگ سے پانی انڈیل کر گلاس ان کی سمت بڑھا دیا تھا۔
"صاحب! یہ پانی پئیں۔" اس نے ان کی حالت کے پیش نظر فوراً" انہیں پانی نکال کے دیا تھا۔
"نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ انکار کرتے ہوئے اپنی چیئر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مٹھیاں بھینچتے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے' ان کے ہر انداز سے بے سکونی' بے چینی اور اضطراب جھلک رہا تھا۔
"صاحب! آپ کچھ بتائیے؟"
"بس کرو مبارک خان' بس کرو' چپ ہو جاؤ۔" وقار آفندی یک دم غصے سے دھاڑ اٹھے تھے اور مبارک خان ان کی ایسی گرج پہ گڑبڑا کے رہ گیا' وقار آفندی کا غصہ اور وہ بھی اس انتہا کا؟ مبارک خان حیرت زدہ سا ہو رہا تھا' وقار آفندی کا یہ روپ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ حیرت تو لازما" ہونی تھی۔
"گاڑی نکالو' ہمیں حویلی جانا ہے۔" انہوں نے اپنا کوٹ اور موبائل اٹھاتے ہوئے حکم جاری کیا۔
"جی بہتر۔" وہ حیرت کے باوجود ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گلاس ٹیبل پہ رکھ کے باہر نکل گیا اور اس کے پیچھے وہ بھی باہر نکل آئے۔ آفس میں کیا ہو رہا تھا اور وہ کیا' کیا کام ادھورے چھوڑ کر جا رہے تھے' انہیں کوئی پروا نہیں تھا' ان کی ذات پہ کیا بیت رہی تھی' یہ صرف وہی جانتے تھے۔ مبارک خان نے بہت عجلت میں گاڑی نکالی تھی اور ان کے نیچے پہنچنے تک وہ ان کے لیے گاڑی کا دروازہ بھی کھول چکا تھا اور جیسے ہی وہ اندر بیٹھے گارڈ نے آگے بڑھ کے دروازہ بند کر دیا اور دوسرے ہی پل مبارک خان نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی اور ڈرائیو کرتے ہوئے حویلی کا رخ کیا تھا' وقار آفندی کی حالت گاڑی میں بھی کافی مضطرب محسوس ہو رہی تھی' مبارک خان کو تجسس تو ہو رہا تھا' لیکن وہ اب دوبارہ کچھ کہہ کر ان کا ضبط نہیں آزمانا چاہتا تھا' اسی لیے چپ بیٹھا رہا اور بہت جلد حویلی کے بڑے سے گیٹ کے سامنے آ کر بریک لگائے تھے۔ عارف نے وقار آفندی کی

گاڑی دیکھتے ہوئے ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر پھرتی سے اٹھ کر گیٹ کھول دیا۔ وقار آفندی کی اپنے وقت سے پہلے آفس سے واپسی سب کے لیے ہی حیرانی اور تشویش کا باعث تھی۔

آسیہ آفندی اپنی دونوں دیورانیوں ثروت بیگم اور ثمرہ بیگم کے ساتھ لان میں بیٹھی باتیں کرتی ہوئی چائے پی رہی تھیں، جب اچانک اندر داخل ہونے والی وقار آفندی کی گاڑی دیکھ کر چونک گئیں۔

"وقار آبھی گئے؟" وہ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

"آپ لوگ بیٹھیں، میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔" وہ معذرت کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں، اتنے میں وقار آفندی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کوریڈور تک پہنچ چکے تھے اور ان کے پیچھے آسیہ آفندی بھی تیز تیز قدم اٹھاتی قریب آگئیں۔ وقار آفندی کوٹ بازو پہ ڈالے کوریڈور میں چلتے ہوئے ہی اپنے گلے سے ٹائی کی ناٹ کھولنا شروع ہو گئے تھے۔

"وقار! آپ آج جلدی آگئے ہیں، کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" آسیہ آفندی ان کے بازو سے ان کا کوٹ تھامتے ہوئے کافی فکر مندی سے پوچھ رہی تھیں۔

"ہوں ٹھیک ہوں۔" انہوں نے بمشکل مختصر سے جواب سے نوازا تھا۔

"لیکن آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے؟ سب ٹھیک تو ہیں نا؟ علیزے کیسی ہے؟" آسیہ آفندی کا پہلا خیال علیزے کی سمت گیا تھا۔

"ہاں! ٹھیک ہیں، سب ٹھیک ہیں، علیزے بھی ٹھیک ہے، ڈونٹ وری۔" وہ اپنے بیڈ روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے اور آسیہ آفندی بھی ان کے پیچھے پیچھے تھیں۔

"لیکن آپ ٹھیک نہیں ہیں، آپ....."

"آسیہ! پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔" وقار آفندی نے آسیہ آفندی کی سمت پلٹتے ہوئے نہ جانے کس انداز، کس لہجے میں کہا تھا کہ آسیہ آفندی حیرت اور بے یقینی سے پتھر کی طرح ایک ہی جگہ پہ جم کے رہ گئی تھیں۔

"تنہا چھوڑ دوں....." وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھیں، اور وقار آفندی ٹھٹک گئے۔

"آسیہ! میں اس وقت بہت الجھا ہوا اور بہت پریشان ہوں، پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ، مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔" اس بار انہوں نے ذرا ٹھہر کے سمجھایا تھا اور آسیہ آفندی، وقار آفندی کی اجنبی سی صورت، اجنبی سا انداز دیکھتی ہوئی باہر نکل گئیں، وہ گلے پڑنے والی اور بحث و تکرار کرنے والی بیویوں میں سے نہیں تھیں، اسی لیے دل میں اٹھتے ہزاروں سوال، وسوسے اور وہم دل میں ہی دباتی ہوئی چلی گئیں اور وقار آفندی راکنگ چیئر پہ ڈھے گئے تھے، دل و دماغ میں ایک اتھل پتھل سی مچی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سوکھے پیڑ پہ بہار آجائے تو ہرے پیڑ بھی اسے حیرانی اور حسد سے دیکھتے ہیں کہ یہ مرتے مرتے جینے کیسے لگا اور اس پہ بہار آئی ہے تو کیوں آئی ہے؟ آخر وجہ کیا تھی؟ وہ سوکھے سے ہرا کیسے ہو گیا؟ اس کی شادابی کا راز کیا ہے؟ سب ہی اس راز کو جاننا چاہتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے مدحیہ، فائزہ بیگم اور ممتاز حیات جاننا چاہتے تھے کہ نبیل حیات جیسے سوکھے اور خشک پیڑ پہ آج بہار آئی لگ رہی تھی اور اس بہار کو سب ہی نے محسوس کیا تھا، یہاں تک کہ ملازموں نے بھی، کیونکہ نبیل نے آج انہیں بلاوجہ ہی مقررہ تنخواہ سے زیادہ پیسے دیے تھے، حالانکہ ملازموں نے تو کہا بھی نہیں تھا، وہ سب زیادہ پیسے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔

"صاحب! یہ پیسے؟" ان کے ملازم نے پیسے دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا، لیکن نبیل نے ہاتھ اٹھا کر ملازم کو کچھ


روک دیا۔

"یہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں، رکھ لو۔" اس نے باقاعدہ خود بول کر اپنی خوشی کا اعلان کیا تھا۔

"صاحب! بہت مہربانی ہے آپ کی، اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔" ملازم اور ملازمہ دعائیں دیتے ہوئے پلٹ گئے تھے، لیکن نبیل ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی دہلیز میں کھڑی مدحیہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا، کیونکہ وہ اس کی سمت اسی کی سمت دیکھ رہی تھی اور اس کے دیکھنے کا انداز خاصا گہرا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" نبیل نے اپنے تاثرات کافی حد تک کمپوز کر لیے تھے۔

"آپ کی خوشی....." وہ سنجیدگی سے کہتی ہوئی دہلیز سے ہٹ کے نبیل کے ساتھ والے صوفے پہ آبیٹھی۔

"کیا مطلب؟ میری خوشی؟" وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

"خوشی آپ کی ہے، مطلب بھی آپ جانتے ہوں گے، آپ ہمیں نہ بتانا چاہیں تو یہ الگ بات ہے۔" مدحیہ بڑی سنجیدگی سے کھوج رہی تھی۔

"ارے مدحیہ! کیسی باتیں کر رہی ہو؟ میں کیا نہیں بتانا چاہتا؟" نبیل حیران ہوا تھا۔

"وجہ..... اپنی خوشی کی۔" مدحیہ کا لہجہ مضبوط تھا اور نظریں نبیل پہ جمی ہوئی تھیں۔

"ادھوری خوشی بتانے کا مزا نہیں آتا، پوری خوشی بتاؤں گا تو تمہیں بھی خوشی ہو گی۔" نبیل بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا، البتہ چہرے پہ اس کی خوشی کا عالم اب بھی وہی تھا جو زری کی کال سنتے ہوئے تھا۔

"تو آپ ادھوری خوشی میں اتنے خوش ہو رہے ہیں کہ ملازموں میں پیسے بانٹتے پھر رہے ہیں؟" مدحیہ نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں! صرف اسی لیے کہ شاید کوئی غریب خوش ہو کر دل سے دعا دے دے اور میری ادھوری خوشی پوری خوشی میں تبدیل ہو جائے۔" نبیل بڑے دل سے کہہ رہا تھا اور مدحیہ اس کے لہجے کی شدت پہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کسی سے محبت کرتے ہیں، آپ نے کبھی بتایا کیوں نہیں؟" مدحیہ کو حقیقتاً نبیل کے اس جذبے کا جان کر بہت حیرانی اور تعجب ہوا تھا۔

"میں کسی سے محبت کرتا ہوں، مجھ سے کبھی کسی نے پوچھا ہی نہیں، نہ میری ماں اور بہن نے، نہ میرے دونوں بھائیوں نے۔" نبیل کے منہ سے بلا ارادہ ہی شکوہ پھسلا تھا اور مدحیہ کو اس شکوے نے گردن جھکانے پہ مجبور کر دیا اور شرمندہ ہوئی تھی۔

"ایم سوری! میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں، میں سمجھتی تھی کہ آپ بھی میری طرح اس جذبے، اس احساس سے خالی، بس جیے جا رہے ہیں، آپ کی کسی بھی لڑکی سے شادی کر دیں گے اور آپ کا گھر بس جائے گا۔" مدحیہ جو سوچتی تھی وہی کہہ رہی تھی۔ نبیل اس کی بات پہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرایا تھا۔

"میری جان! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، جن لوگوں کے دل بس جاتے ہیں، ان لوگوں کے گھر بڑی مشکل سے بستے ہیں، ہمیشہ ایک ہی چیز بستی ہے یا دل یا گھر۔" نبیل نے خاصی گہری بات کہی تھی، مدحیہ اس کی باتوں پہ حیران ہوئی تھی۔

"اور جو لوگ لو میرج کر لیتے ہیں؟ وہ تو اپنا گھر بھی بسا لیتے ہیں اور دل بھی؟" مدحیہ نے اپنے اندازے کے مطابق کہا۔

"ہونہہ! غلط فہمی ہے تمہاری، کبھی قریب سے مشاہدہ کرنا، پھر تمہیں پتا چلے گا کہ گھر بسانے کی کوشش میں دل کا خون ہوتا ہے، اور جن لوگوں کا گھر بھی بستا ہے اور دل بھی وہ لوگ دنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔" نبیل کی بات پہ مدحیہ کو اتفاق کرنا ہی پڑا تھا، کیونکہ اس نے سو فیصد درست بات کہی تھی۔

"اللہ کرے کہ آپ کا بھی ان ہی لوگوں میں شمار ہو۔" مدحیہ نے روایتی بہنوں کی طرح دعا دی تھی۔
"آمین...." نبیل نے صدق دل سے آمین کہا۔
"تو پھر اب بتادیں نا کہ کون ہے وہ لڑکی جس سے آپ محبت کرتے ہیں؟" مدحیہ نے اپنے مطلب کا سوال پوچھ ہی لیا تھا اور نبیل اس کی بات پہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔
"صبر میری جان صبر' دل آورے کو آنے دو' پھر سب پتا چل جائے گا تمہیں۔"
"کیا مطلب؟ دل آور بھائی کو بھی اس سلسلے کا پتا ہے؟"
"نہیں پتا! کیونکہ میں نے کبھی کسی کو بتایا ہی نہیں' ہاں اب وہ آئے گا تو ضرور شیئر کروں گا۔"
"اوہ تو یعنی آپ سب سے چھپائے پھر رہے ہیں؟" مدحیہ نے سرہلاتے ہوئے کہا۔
"ہاں کہہ سکتی ہو۔" اس نے بھی اثبات میں جواب دیا تھا۔
"اوکے! ایز یو وش' دل آور بھائی کے آنے کا ہی انتظار کرلیتے ہیں۔"
"بالکل! میں بھی اس کی واپسی کا انتظار کررہا ہوں۔" نبیل جیسے کوئی ارادہ باندھے بیٹھا تھا۔
"ٹھیک ہے' پھر میں چلتی ہوں' آپ سے بعد میں ملاقات ہوتی ہے۔" مدحیہ اپنی گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"مدحیہ...."
"جی بھائی؟" نبیل کی آواز پہ اس کے قدم تھم گئے تھے۔
"میں نے سنا ہے جبزی پاکستان آیا ہوا ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟" نبیل کا لہجہ اور انداز سنجیدہ ہو چکے تھے۔
"جی! آپ نے ٹھیک سنا ہے' وہ کل ہی پاکستان آیا ہے' ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے' میں اس وقت اسے ہی پک کرنے جارہی ہوں۔" اس نے بغیر جھجکے اور بغیر رکے اسے صاف صاف بتادیا تھا.... نبیل کچھ کہنا چاہتا تھا' لیکن کہہ نہیں پارہا تھا۔
"ڈونٹ وری! وہ ہمارے نام نہاد بابا جیسا برا اور بدنیت نہیں ہے' اس کا کریکٹر ہمارے بابا کے کریکٹر سے لاکھ درجہ بہتر اور اچھا ہے۔ بدکردار نہیں ہے وہ اچھے برے کی تمیز رکھتا ہے عزت کرنا بھی جانتا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان ایسا کوئی ریلیشن نہیں ہے' جس کی وجہ سے آپ کو شرمندہ ہونا پڑے اور گردن جھکانی پڑے' وہ میرا محض ایک دوست ہے' اس کے علاوہ اور کچھ مت سمجھیے گا' اس وقت وہ پاکستان میں ہمارا مہمان ہے اور مہمان نوازی کرنا ہمارا حق بنتا ہے' مجھے یہ حق نبھانے سے مت روکیے گا۔" مدحیہ نے نبیل کے سامنے ہر بات واضح کردی تھی اور نبیل اس کی ساری بات سمجھ گیا تھا' اسی لیے سر کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی' وہ جان چکا تھا کہ مدحیہ اتنی سرکشی دکھاتی ہے تو کیوں؟ وہ غلط نہیں تھی' بس طریقہ غلط تھا۔

✵ ✵ ✵

"زونیہ' زوبیہ نیچے آؤ دونوں۔" مریم نے صحن میں کھڑے ہو کر چھت پہ کھیلتی دونوں بہنوں کو آواز دی تھی۔
"جی آپی....؟" وہ دونوں اچھلتی کودتی نیچے اتر آئیں۔
"دونوں اپنا ہوم ورک ختم کرو۔" مریم نے برآمدے میں تخت پہ رکھے ان کے اسکول بیگز کی طرف اشارہ کیا۔
"آپی! رات کو ختم کرلیں گے۔" زونی نے لجاجت سے کہا۔
"ہرگز نہیں! رات کو لائٹ نہیں ہوتی' اندھیرے میں تم لوگوں سے پڑھا نہیں جاتا' نیند آجاتی ہے' اس لیے ابھی بیٹھو اور ختم کرو' شاباش...." اس نے انہیں برآمدے کی سمت دھکیلا تھا' اور خود کچن کی سمت آگئی' کیونکہ رات کے کھانے کے لیے تیاری بھی تو کرنی تھی۔
"امی! اس سے تو بہتر ہے کہ میں کالج چھوڑ دوں۔" کچن سے سنائی دیتی ایمن کی آواز پہ مریم کے قدم باہر برآمدے میں ہی رک گئے تھے۔
"تو بیٹا تم بتاؤ میں اور کیا کروں؟ اگر میرے پاس کچھ پیسے ہوتے تو میں تمہارے ابا جی کی دوائی ہی لے آتی' کل سے انہوں نے دوائی نہیں لی اور میں نے عدیل اور مریم کے سامنے بھی ذکر نہیں کیا کہ ان کی دوائی ختم ہو چکی ہے' وہ دونوں بھی پریشان ہوں گے' عدیل اپنی تنخواہ پہلے ہی ایڈوانس لے چکا ہے اور کہاں سے لے گا بھلا؟" عابدہ خاتون کی پریشان اور متفکر سی آواز پہ مریم جیسے منجمد سی ہوگئی تھی۔ ابا جی نے کل سے دوائی نہیں کھائی تھی اور ان لوگوں کو پتا ہی نہیں تھا؟ مریم سوچ کر ہی پریشان ہوگئی۔
"اگر وہ دوائی نہیں لیں گے تو ٹھیک کیسے ہوں گے؟ اب کیا ہوگا؟ عدیل بھائی بھی ایڈوانس لے چکے ہیں' اف! کیا کریں اب؟" مریم کی پریشانی کا گھوڑا بے سمت دوڑ پڑا تھا' اب اسے چین نہیں تھا۔
"امی! اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ میں کالج چھوڑ دیتی ہوں' یہ فیسیں اور کتابوں کا خرچہ سب فضول ہے' ایمان بھی کالج چھوڑ دے گی' اس طرح کچھ تو بوجھ کم ہوگا۔" ایمن الٹا امی کو سمجھا رہی تھی اور مریم تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی کمرے میں آکر بستر پہ ڈھے سی گئی۔
اس مسئلے کا کوئی حل سجھائی نہیں دے رہا تھا' صرف ایک کمانے والا تھا اور پورا گھر کھانے والا تھا۔ اور اس کی جاب بھی ایسی تھی کہ بمشکل گزارا ہوتا تھا' اوپر سے ابا جی کی بیماری ان کا علاج' آخر کیا کچھ ہو سکتا تھا اکیلے بندے سے" مریم سوچ سوچ کر ہلکان ہونے لگی۔
"مریم آپی! وہ فاطمہ آپی آئی ہیں۔" ایمان نے کمرے میں جھانکتے ہوئے اطلاع دی اور مریم یک دم اٹھ بیٹھی۔
"فاطمہ آئی ہے؟" اسے حیرانی ہوئی تھی۔
"جی ہاں! فاطمہ آئی ہے' کیونکہ آپ جو نہیں آتیں۔" فاطمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کی بجائے شکوہ کیا تھا۔
"السلام علیکم...." مریم اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔
"وعلیکم السلام! آج حجرہ نشین کیوں ہوئی بیٹھی ہو؟" فاطمہ نے چارپائی کے ساتھ رکھی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"آج دل پہ تھوڑا بوجھ آگیا ہے' باہر نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا۔" مریم بے ساختہ کہہ گئی تھی۔
"دل پہ بوجھ آگیا ہے؟ مگر کس قسم کا؟" فاطمہ کو حیرانی ہوئی تھی کہ مریم پہلی بار اس سے کچھ ڈسکس کررہی ہے۔
"جو تم سمجھ رہی ہو ایسا کچھ نہیں ہے فاطمہ! میں بس اپنے گھر کے حالات کی طرف سے پریشان ہوں' چند دن پہلے ابا جی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی' وہ ہاسپٹلائز رہے ہیں' کافی خرچہ اٹھانا پڑا عدیل بھائی کو' اب گھر کے اور اسکول کالجز کے ہی اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ کیا بتاؤں تمہیں۔" مریم اتنی پریشان تھی کہ سب کہہ دیا تھا' حالانکہ پہلے وہ اپنے گھر کے حالات بھی چھپا کے رکھتی تھی' لیکن آج اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔
"اوہ تو یہ بات ہے؟" فاطمہ نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے سرہلایا۔
"یہ بات اتنی چھوٹی نہیں ہے فاطمہ۔"
"میں جانتی ہوں یہ بات اتنی چھوٹی نہیں ہے' اسی لیے تو تمہارے لیے ایک آفر لے کر آئی ہوں' باوجود اس کے

کہ تم اور تمہارا بھائی پہلے بھی ایک آفر ٹھکرا چکے ہو۔" فاطمہ کی بات پہ مریم نے ایک دم جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا۔

"آفر.... ؟ کیسی آفر.... ؟" مریم نے اچنبھے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے لیے جاب کی آفر...." فاطمہ نے مختصراً" بتایا۔

"میرے لیے جاب کی آفر؟ فاطمہ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" مریم کو وقفے وقفے سے حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔

"میں جو کہہ رہی ہوں' تم سن رہی ہو' کیا خیال ہے کروگی جاب؟" فاطمہ نے بھی سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں جاب...." مریم کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"اگر گھر کے حالات بہتر کرنا چاہتی ہو تو تمہیں یہ آفر قبول کرلینی چاہیے' ایک آدمی آج کل کے مہنگائی کے دور میں گھر نہیں چلا سکتا' بیماریوں کے علاج' گھر کے اخراجات' اسکول اور کالجز کی فیسیں اور دیگر ضروریات واقعی ایک آدمی سے ہینڈل نہیں ہوسکتیں' گھر کے باقی افراد کو بھی اس کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے' اور میرا خیال ہے کہ یہ موقع اللہ نے تمہیں دیا ہے' اب کی بار ٹھکرانا مت' ورنہ پچھتاؤگی۔" فاطمہ اسے سمجھا رہی تھی اور وہ سمجھ رہی تھی۔ مریم کو احساس ہوچکا تھا کہ فاطمہ ٹھیک کہہ رہی ہے' حالانکہ مریم نے پہلے بھی ایک' دوبار جاب کرنے کی بات کی تھی' لیکن عدیل نے سختی سے منع کردیا تھا' لیکن آج کل گھر کے جو حالات جارہے تھے' ان کے پیش نظر ضروری تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنے مقام پہ ڈٹ جاتی' ورنہ عدیل اکیلا ہی اس چکی میں پستا رہتا۔

"اب کیا سوچ رہی ہو؟" فاطمہ نے خفگی سے ٹھوکا دیا۔

"سوچ نہیں رہی' فیصلہ کررہی ہوں۔" مریم بے حد سنجیدہ تھی۔

"کیسا فیصلہ؟"

"جاب کرنے کا۔"

"ہوں! اچھی بات ہے' کرنا چاہیے۔" فاطمہ نے اس کی ہمت بندھائی تھی اور مریم نے آخر کار فیصلہ کرہی لیا تھا۔

"ٹھیک ہے' مجھے یہ آفر قبول ہے' تم بتاؤ جاب کیا ہے؟" مریم ایک مضبوط فیصلہ کرنے کے بعد قدرے مطمئن ہوچکی تھی۔

"ارے جاب تو بہت ہی ایزی ہے تمہارے لیے' میری آنٹی کی ایک پرائیویٹ انگلش اکیڈمی ہے' انہیں ایک اچھے مزاج کی فی میل ٹیچر کی ضرورت ہے' وہ تو آج اخبار میں اشتہار دینا چاہ رہی تھیں' لیکن میں نے انہیں روک دیا کہ ایک بار مجھے ٹرائی کرلینے دیں' مجھے سب سے پہلا خیال تمہارا ہی آیا تھا' اکیڈمی کا ماحول بہت ہی اچھا ہے اور سیلری بھی بہت اچھی ہوگی' تمہیں شکایت نہیں ہوگی' اور یہ جاب ایسی ہے کہ تمہیں کسی بھی انٹرویو کی کوفت نہیں اٹھانا پڑے گی' وہ تو تمہیں فوراً" اپائنٹ کرلیں گی' بس تمہارے ہامی بھرنے کی دیر ہے۔" فاطمہ اس کے لیے ڈھال بن گئی تھی' مریم کو اور بھلا کیا چاہیے تھا' اس نے ہامی بھرلی تھی اور فاطمہ اس کے فیصلے پہ بے حد خوش ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کا پیپر ختم ہوچکا تھا' وہ فارغ ہوچکی تھی' اس لیے اپنے نیکسٹ پیپر کی تیاری کے لیے وہ کمپیوٹر لیب میں آگئی' جہاں اسٹڈی کرتے کرتے اسے ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور جب ہوش آیا تو اپنے سر پہ ہاتھ مار کے رہ گئی۔

"اف خدایا! اتنا ٹائم ہوگیا ہے؟" اس نے اپنے موبائل سے ٹائم چیک کرتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

"عبداللہ بھائی کی کال بھی نہیں آئی؟" وہ سارا پھیلاوا سمیٹتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی.... اور کمپیوٹر لیب سے [illegible]



اس نے عبداللہ کا نمبر ڈائل کیا تھا' دوسری طرف پہلی رنگ پہ ہی کال ریسیو کرلی گئی تھی۔

"ہیلو.... ؟"

"السلام علیکم بھائی! آپ آئے کیوں نہیں؟ اور نہ ہی کال کی ہے آپ نے؟

"اتنا ٹائم ہورہا ہے۔" زری ٹائم دیکھ کر پریشان ہورہی تھی۔ "ڈونٹ وری کچھ نہیں ہوتا' مجھے پتا تھا کہ تم پیپر کی تیاری کررہی ہو' اس لیے تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا' اب تم تیار رہو' میں بس آرہا ہوں۔" عبداللہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فون بند کردیا۔ زری اپنا دوپٹہ اور اسکارف اچھی طرح اوڑھتی ہوئی یونیورسٹی کا طویل ترین احاطہ تیز تیز قدموں سے طے کرتی ہوئی گیٹ سے نکل آئی' اسے پتا تھا کہ عبداللہ کو پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی' وہ جس بینک میں کام کرتا تھا وہ اس کی یونیورسٹی سے زیادہ دور نہیں تھا' اس لیے وہ زری کو آسانی سے پک اینڈ ڈراپ کردیتا تھا' زری کو ابھی وہاں کھڑے پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ یک دم اس کا رنگ فق ہوگیا' اس کے دائیں طرف سے ملک اسد اللہ کی آواز ابھری تھی۔

"کہاں تھیں اتنی دیر سے؟ ہم کب سے تمہارا انتظار کررہے ہیں؟ اتنا لمبا ہوگیا تھا تمہارا پیپر؟" وہ عین اس کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے زری کو سرتاپا قہر آلود نظروں سے دیکھا تھا' وہ اپنی جگہ پہ کانپ کے رہ گئی تھی۔

"وہ.... میں اپنے نیکسٹ پیپر کی تیاری کے لیے لیب میں چلی گئی تھی' عبداللہ بھائی کو میں نے صبح ہی بتادیا تھا۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بمشکل جواب دیا تھا کہ کہیں جواب نہ دینے پہ وہ مزید غضب سے نہ بھر جائیں۔

"اپنے عبداللہ بھائی کی بات ہم سے نہ ہی کرو تو بہتر ہے' خیر چھوڑو اس قصے کو' آؤ ہم تمہیں ڈراپ کردیتے ہیں۔" انہوں نے زری کو کہتے ہوئے ذرا فاصلے پہ کھڑی اپنی گاڑی کی سمت اشارہ کیا۔

"نن.... نہیں! تھینک یو' عبداللہ بھائی مجھے لینے کے لیے آرہے ہیں' ابھی فون پہ بات ہوئی ہے ان سے۔" زری ان کے ساتھ جانے کا کبھی مرکے بھی نہیں سوچ سکتی تھی' وہ اسے آتے جاتے اپنی موت کے فرشتے کی طرح دکھائی دیتے تھے' اور اپنی موت کے فرشتے کے ساتھ اپنی مرضی سے کیسے جاسکتی تھی بھلا؟

"ہم بھی تو تمہیں ہی لینے کے لیے آئے ہیں؟" وہ کافی سخت اور برفیلے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"جی! وہ تو.... ٹھیک ہے' لیکن.... وہ عبداللہ بھائی بھی بس پہنچنے ہی والے ہیں۔" اس وقت زری پہ ایک ایک لمحہ عذاب گزر رہا تھا' ان کی دہشت ہی اتنی تھی کہ ایسے ٹھنڈے اور یخ بستہ موسم میں وہ اور بھی ٹھنڈی ہوگئی تھی' اس کے ہاتھ پاؤں بالکل یخ ہورہے تھے اور ماتھے پہ بھی ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

"کوئی بات نہیں' اسے منع کردو' ہمارے ساتھ چلو۔" انہوں نے اسے دوبارہ چلنے کا کہا۔

"ایم سوری بھائی! میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔" اس نے انکار کردیا تھا اور ملک اسد اللہ ایسے صاف انکار پہ آگ کی طرح بھڑک اٹھے تھے۔

"تم ہمارے ساتھ چلنے سے انکار کررہی ہو؟" ان کی غضب ناک دھاڑ پہ آس پاس کے لوگ بھی ٹھہر گئے تھے' زری نے شرمندگی اور خوف سے چہرہ جھکالیا' وہ ان کے اس قدر غیظ و غضب کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔

"دیکھتے ہیں کہ کیسے نہیں جاتی ہو تم۔" انہوں نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے زری کا بازو دبوچا اور اسے کھینچتے ہوئے اپنی گاڑی تک لے آئے تھے۔

"نہیں بھائی صاحب! اس طرح تو نہیں نا۔" عبداللہ نے ان کا بازو تھام کے انہیں روک دیا تھا' وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہے تھے۔

"دیکھو ملک عبداللہ! ہم تمہیں بار بار سمجھا رہے ہیں کہ ہمارے راستے میں مت آؤ' مت ٹانگ اڑاؤ اس معاملے میں۔" انہوں نے جیسے عبداللہ کو دھمکی دی تھی۔

"کیا کرلیں گے آپ؟ زری کو اپنے ساتھ لے جائیں گے؟ ہونہہ! دیکھتا ہوں میں کہ کیسے لے کر جاتے ہیں؟" عبداللہ بھی غصے سے کہہ رہا تھا اور پھر وہاں سے پلٹ کر اپنی گاڑی کی سمت چلا گیا۔ ملک اسداللہ زری کو دوبارہ اپنی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کرنے لگے' لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوتے ایک پولیس کار جھٹکے سے ان کے قریب آرکی' انہوں نے ملک اسداللہ کو سیکنڈز میں اریسٹ کرلیا تھا اور زری ملک' اسداللہ کو پولیس والوں کے شکنجے میں دیکھ کر ششدر سی رہ گئی تھی۔

"بھائی!" اس نے پلٹ کر عبداللہ کی سمت دیکھا وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا کسی کا فون سن رہا تھا۔

"بھائی پلیز! روکیں انہیں! وہ اسد بھائی کو لے کر جارہے ہیں۔" زری ایک بہن تھی' اپنے بھائی کو مشکل میں دیکھ کر رہ بھی نہیں سکتی تھی' وہ بھاگتی ہوئی عبداللہ کے قریب آئی تھی۔

"ان کے سنگین عزائم کے آگے بندھ باندھنے کے لیے یہ سب بہت ضروری ہے' جانے دو فی الحال' انہیں بھی تو پتا چلے کہ جیل کی سلاخیں کس چیز کا نام ہے؟ پاکستان میں تو چوہدری اور ملک لوگ جیل میں بند ہونا اپنی توہین سمجھتے ہیں' اپنی جگہ غریبوں کے بیٹوں کو پیش کردیتے ہیں' اور وہ بے گناہ چاہے جتنے سال جیل میں سڑتا رہے' انہیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔" عبداللہ اپنے جاگیردارانہ ماحول کو کافی اچھی طرح جانتا تھا اور مخالفت بھی کرتا تھا' لیکن اپنے بابا جان اور بھائی صاحب کے سامنے کبھی اس کی ایک بھی نہیں چلی تھی' اسی لیے تو وہ ان لوگوں سے دور ہوگیا تھا۔

"لیکن بھائی! یہاں پردیس میں وہ جیل میں قید کاٹیں گے' کیا یہ اچھا لگے گا؟" زری پھر بھی اس کا بھلا چاہ رہی تھی۔

"وہ اگر جیل میں قید نہیں کاٹیں گے تو تم پاکستان جاکر قید کاٹوگی۔" عبداللہ کا لہجہ سنجیدہ ہوچکا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"میرا مطلب ہے کہ وہ بھی تو تمہیں ملک حق نواز کی قید میں دینا چاہتے ہیں' آج اگر ڈٹ جاؤ گی تو کل اس قید سے بچ جاؤ گی' انہیں جانے دو' تاکہ انہیں پتا چلے کہ تم کمزور نہیں ہو۔" عبداللہ اسے سمجھا رہا تھا' لیکن زری جو اپنے سینے میں موم کا دل رکھتی تھی' وہ اس موم کے دل کو پتھر کا دل نہیں بنا سکتی تھی' وہ اس وقت اپنے بارے میں نہیں' بلکہ اسداللہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"بعد کی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی' آپ فی الحال انہیں آزاد کروادیں' میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے انہیں تکلیف اٹھانا پڑے اور مجھے بابا جان اور بی بی جان کے سامنے شرمندگی ہو' اگر وہ جیل چلے گئے تو بی بی جان کو بھی تکلیف ہوگی۔" زری آہستگی سے سر جھکائے کہہ رہی تھی اور عبداللہ اس کے دھیمے سے لہجے اور جھکے ہوئے سر کو دیکھ کے رہ گیا اور پھر تاسف سے ایک گہری سانس کھینچی تھی۔

"کاش! کہ وہ بھی اپنی بہن کے لیے اسی طرح کچھ اچھا سوچ لیں' جیسا وہ ان کے لیے سوچ رہی ہے۔" عبداللہ نے اپنے موبائل پہ کسی کو کال ملاتے ہوئے کچھ کہا تھا اور پھر ملک اسداللہ کو آزاد کرنے کا کہہ کر خود گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

"بیٹھو۔۔۔" اس نے زری کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔

"لیکن وہ اسد بھائی۔" اس نے ذرا فاصلے پہ کھڑے اسداللہ اور پولیس آفیسرز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈونٹ وری! پانچ منٹ بعد چھوڑ دیں گے تم بیٹھو۔" عبداللہ نے اسے تسلی دلائی تھی اور تب جاکے اس نے





...گے بڑھائے تھے' ملک اسداللہ کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے' وہ بار بار پلٹ کر انہیں دیکھ رہی ... البتہ ملک اسداللہ نے صرف ایک بار دیکھا تھا' وہ بھی عبداللہ کی سمت دیکھا تھا' لیکن ان کا ایک بار دیکھنا بھی ...ب کا تھا۔

عبداللہ اپنی گاڑی نکال لے گیا تھا اور زری اس واقعے پہ چپ ہوکے رہ گئی تھی' نہ جانے ابھی اور کیا کچھ ہونا ...ل تھا؟

☼ ☼ ☼

بہت بے چین رہتی ہے طبیعت ایک مدت سے
دل و جاں کو نہیں مل پائی راحت ایک مدت سے

بہت مجبور ہوں ورنہ بہت محسوس کرتا ہوں
مری جاں تم سے ملنے کی ضرورت ایک مدت سے

تمہارے غم سے گھبرا کر میں اب لوگوں سے کہتا ہوں
کہ میں نے ترک کردی ہے محبت ایک مدت سے

اس نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا تو لیپ ٹاپ کی وال پہ یہ تین اشعار اسے سیاہ رنگ کے لفظوں میں لکھے نظر آئے ...۔ اس کی وال پیپر کا کلر کمبی نیشن بلیک اینڈ وائٹ تھا' سفید اسکرین پہ سیاہ رنگ کے چنار کے پتوں کے درمیان ... یہ اشعار بے پناہ اداسی کا اعلان کررہے تھے اور وہ ان اشعار کو پڑھنے کے بعد اور بھی بے چین اور مضطرب ...یا تھا' اسی لیے لیپ ٹاپ کو وہیں بیڈ پہ چھوڑ کے بیڈ سے اٹھ گیا' آج نہ جانے کیوں اسے بار بار کسی کا خیال ...ارہا تھا۔۔۔ ورنہ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ دل آور شاہ کو بے چینی لاحق ہوتی۔ اور جب ہوتی تھی تو وہ اپنے ...طرب دل کو اندر ہی اندر مارنے کی اور اس کی خواہش اور احساسات دبانے کی کوششیں کرتا تھا' تب سگریٹ پہ ...ریٹ سلگتا رہتا' اور وہ اپنے اندر کا غبار سگریٹ کے دھوئیں کی صورت باہر نکالتا رہتا تھا۔

"آپ کچھ بے چین سے لگتے ہیں؟" زری کی دھیمی آنچ دیتی آواز پہ دل آور نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کے اسے ...ا تھا' وہ اس کے سامنے والے صوفے پہ بڑی تمکنت سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی اور اپنے دل کی پیاس کو قطرہ ...سیراب کررہی تھی' اس لمحے وہ خود کو دنیا کی امیر ترین عورت تصور کررہی تھی' جس کا محبوب سراپا اس کے ...امنے تھا اور سر جھکائے غلاموں کی طرح بیٹھا تھا' اس لمحے اسے دو جہاں کے والی سے اور کچھ نہیں چاہیے تھا' ...صرف ایک خواہش تھی کہ یا لمحے ٹھہر جائیں' یا پھر یوں ہی بیٹھے بیٹھے عمر تمام ہوجائے' لیکن وہ تھا کہ ان دونوں ... سے کوئی ایک کام بھی نہیں چاہتا تھا' نہ لمحوں کو ٹھہرانا چاہتا تھا' نہ عمر بتانا چاہتا تھا' کیونکہ وہ ایک حقیقت پسند ...تھا' حقیقت کو افسانہ سمجھ کے زری کی طرح خوش نہیں ہوسکتا تھا۔

"...اس لیے بے چین ہیں؟ میری وجہ سے یا اس تنہائی کی وجہ سے؟" وہ اسے بولنے پہ اکسا رہی تھی۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔" اس نے پھر چہرہ جھکا لیا۔

"تو آپ صحیح سمجھادیں۔" زری میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی تھی کہ اس سے سوال جواب کرنے بیٹھ ...تھی۔

"...عبداللہ کو اور کتنی دیر لگے گی؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جتنی دیر آپ کو اپنی بے چینی بتانے میں لگے گی۔" زری تو جیسے اسے ستا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، پھر میں چلتا ہوں۔" وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا اور قدم باہر کی سمت بڑھا دیے تھے۔

"مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ بھی نظر چرانے والوں میں سے ہوں گے۔" زری کی آواز پہ دل آور کے قدم تھم گئے تھے۔

"مجھے بھی آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ نظر جمانے والوں میں سے ہوں گی۔" دل آور نے واپس پلٹتے ہوئے برجستہ جواب دیا تھا اور زری بے ساختہ ہنس پڑی تھی اور اس کی ہنسی کا سحر ایسا تھا کہ دل آور نے وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا تھا لیکن ان کے گھر سے نکلنے کے بعد بھی اس کی سماعتوں میں زری کی اس ہنسی کی کھنک باقی رہی تھی، وہ عبداللہ سے ملنے آیا تھا، لیکن عبداللہ واش روم میں شاور لے رہا تھا اور نگارش اپنے میکے گئی ہوئی تھی، اسی لیے وہ زری کے پاس زیادہ دیر تنہا نہیں بیٹھا تھا، وہ آج جس موڈ میں تھی وہ دل آور شاہ کو بھی بے چین کر رہی تھی، اسی لیے تو وہ اٹھ آیا تھا، لیکن گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بھی اس کا دھیان زری کی طرف ہی تھا۔ اور اس وقت بھی اس کا دھیان اسی کی طرف تھا جب اس دھیان کے تسلسل کو فجر کی اذان نے توڑ دیا تھا۔

دل آور نے چونک کر دیکھا، اس کا لیپ ٹاپ بیڈ پر ہنوز آن ہی پڑا ہوا تھا اور ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا، اس نے سر جھٹکتے ہوئے سگریٹ جھٹک کر ایش ٹرے میں مسلا اور خود باتھ روم کی سمت بڑھ گیا، اذان ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے وضو کر کے اب نماز بھی پڑھنی تھی، جب ہی اپنے بوجھل اور تھکے تھکے ذہن سے ہر بات جھٹک ڈالی تھی اور پھر نماز کے بعد دعا میں اپنے لیے چین اور سکون مانگا تھا، اللہ سے صبر اور اطمینان عطا کرنے کی درخواست کی تھی، وہ آج حقیقتاً "اداس اور بجھا بجھا سا تھا، شاید زری والی اداسی اس کے اندر اتر آئی تھی، وہ اسے بے وجہ ہی یاد کر رہا تھا، دل کو بے کلی لاحق تھی۔

☼ ☼ ☼

مری کا موسم آج بھی بہت اچھا ہو رہا تھا۔

سب ہی اپنے وقت پہ بیدار ہو گئے تھے، لیکن صرف علیزے تھی جو ابھی تک سو رہی تھی، اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی، اس لیے اس کی نماز بھی قضا ہو چکی تھی، اب تو دن کے ساڑھے گیارہ کا ٹائم ہو رہا تھا، اسی لیے عائشہ آفندی نے رجو کو اسے جگانے کے لیے بھیجا۔ رجو نے باقاعدہ اس کے بیڈ روم کے دروازے کو زور، زور سے پیٹا تھا، تب جا کے علیزے کی آنکھ کھلی تھی۔

"کون ہے؟" اس کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔

"بی بی جی! میں ہوں، رجو، دروازہ کھولیں بی بی جی، بہت ٹائم ہو رہا ہے، دن کے بارہ بج رہے ہیں۔" رجو نے باہر سے ہی اپنا اعلان جاری رکھا تھا۔

"بارہ بج گئے؟" علیزے نے دروازہ کھولتے ہوئے حیرت سے کہا، اس کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور قدم بھی تھوڑے غیر متوازن لگ رہے تھے، کل وہ بہت ڈسٹرب رہی تھی، اس لیے رات کو ٹرینکولائزر لے کر سوئی تھی، جب ہی اس وقت اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے، ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔

"جی! بارہ بج گئے ہیں، آپ فریش ہو کر آ جائیں، عائشہ بی بی آپ کا ہی انتظار کر رہی ہیں۔" رجو کہہ کر چلی گئی اور علیزے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتی ہوئی باتھ روم میں آ گئی اور دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی، اک عجیب سا احساس اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا، وہ اپنے ہاتھ، پاؤں، اپنا چہرہ، اپنی گردن چھو چھو کر دیکھ رہی تھی، اتنی دیر سونے کی وجہ سے سارا جسم سویا سویا سا لگ رہا




تھا۔ "علیزے۔" اس کے بیڈ روم سے آذر کی آواز سنائی دی۔

"جی آذر بھائی آ رہی ہوں۔" اس نے جلدی جلدی برش کیا اور منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی۔ "اتنی دیر لگا دی تم نے طبیعت تو ٹھیک ہے نا" آذر کو تشویش ہو رہی تھی۔

"جی ٹھیک نہیں رات ٹرینکولائزر لے کر سوئی تھی اس لیے جلدی آنکھ نہیں کھلی بلکہ اب بھی جسم تھکا تھکا سا لگ رہا ہے۔" وہ سر جھکائے آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

"ڈونٹ وری! ابھی فریش ہو جاؤ گی، باہر سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں، کیا آج گھومنے کا ارادہ نہیں ہے؟" آذر اسے فریش کرنے کے لیے پوچھ رہا تھا۔

"جی! ابھی آتی ہوں۔" وہ انکار کر کے ان لوگوں کا موڈ نہیں خراب کرنا چاہتی تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ہامی بھر لیتی تھی۔

"او کے! جلدی آ جاؤ۔" وہ اس کا ہاتھ تھپک کے باہر نکل گیا اور علیزے گرم کپڑے پہننے لگی، وہ تھوڑی دیر میں باہر آئی تو واقعی سب ہی منتظر تھے۔

"لیجیے شہزادی علیزے آ چکی ہیں، اب قافلے کو روانگی کی اجازت دیجیے۔" کومل کا لہجہ دھیما لیکن طنزیہ اور کاٹ دار تھا آذر نے آج پھر اسے چونک کر دیکھا تھا کیونکہ وہ زیادہ دور نہیں کھڑا تھا با آسانی سن سکتا تھا۔ اور اس کی بات سن کر آذر کو آج بھی سخت الجھن اور حیرت ہوئی تھی کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ ایسا کیوں تھا آخر......؟

"کیا بات ہے آج اتنا لیٹ کیوں ہو گئیں...؟" عائشہ آفندی کو بھی اس کی طرف سے تشویش ہو رہی تھی۔

"بس نیند گہری تھی اس لیے وقت کا احساس نہیں ہوا، ایم سوری کہ آپ سب کو میری وجہ سے انتظار کرنا پڑا۔" علیزے نے بے حد آہستگی سے کہتے ہوئے کومل کی سمت دیکھا تھا۔ جس کے چہرے کی ناگواری وہ پہلے تو نہیں لیکن اب با آسانی محسوس کر سکتی تھی کیونکہ وہ کومل کے اندر کی کاٹ اور ناگواری کی جھلک دیکھ چکی تھی۔

"ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈیر ہم پورا دن بھی سوئی رہتیں تو ہم پورا دن انتظار کر سکتے تھے۔" دانیال نے

مسکرا کر اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو بھائی! اٹس مائی پلیژر۔۔۔'' علیزے کا لہجہ سنجیدہ تھا وہ کل سے کچھ چپ چپ سی تھی اسے کومل کا شک اندر ہی اندر کسی پن کی طرح چبھ رہا تھا۔

''چلو پھر جلدی سے ناشتا کرو' آج نتھیا گلی کے لیے نکلتے ہیں۔'' دانیال نے اسے ناشتا یاد دلایا۔

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے' آپ چلیں میں راستے سے کچھ لے لوں گی۔'' علیزے کو واقعی بھوک نہیں تھی اس نے انکار کردیا تھا اور اس کے انکار پہ سب کھڑے ہوچکے تھے ان کا رخ باہر گاڑیوں کی سمت تھا عائشہ آفندی کے ساتھ علیزے بھی دھیمے اور سست قدم اٹھاتی باہر نکل آئی تھی۔

سامنے ہی روش پہ منصور حسین گاڑی کا دروازہ کھولے الرٹ کھڑا تھا علیزے کی ڈائریکٹ نظر اسی پہ پڑی تھی اور اتفاقاً''منصور حسین نے بھی اسی پل نظریں اٹھا کر اندرونی مین ڈور کے سامنے والی سیڑھیاں اترتی علیزے کی سمت دیکھا تھا نظروں کا یہ تصادم علیزے کے لیے خفت کا باعث تھا اسے جب بھی اپنا منصور حسین سے لپٹنا یاد آتا تھا وہ شرمندگی سے زمین میں گڑ جاتی تھی' یہی وجہ تھی کہ کل سے اس کا منصور حسین سے نظر ملانا محال ہوگیا تھا' ایک کومل والی بات اور دوسری اپنی بدحواسی میں کی گئی حرکت' دونوں ہی اس کے ڈوب مرنے کے لیے کافی تھیں' منصور حسین نے بھی اسے دیکھ کر نظریں جھکالی تھیں اور جب وہ اس کے پاس سے گزر کر گاڑی میں بیٹھی تو وہ دروازہ بند کرکے اپنی سائیڈ پہ آگیا دوسری گاڑیاں رفتہ رفتہ نکل چکی تھیں۔

وہ بھی گاڑی بیک کرتے ہوئے گیٹ سے باہر لے آیا تھا' آج عائشہ آفندی علیزے کے ساتھ تھیں اور رجو منصور حسین کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے علیزے بیٹا۔۔۔؟ تم اداس اور چپ چپ سی لگ رہی ہو؟'' عائشہ آفندی پوچھے بغیر نہیں رہ سکیں علیزے کی خاموشی سب ہی کو محسوس ہورہی تھی۔

''ارے پھوپھو! میں نے بتایا تو ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں' بس تھکن ہورہی ہے' کبھی اتنا سفر جو نہیں کیا' اور پھر پورا پورا دن گھومنا پھرنا' میری تو ٹانگوں اور پاؤں کی ایڑیوں میں درد ہونے لگتا ہے' میں بہت جلدی تھک جاتی ہوں۔'' علیزے انہیں مطمئن کرنے کے لیے تسلی دی۔

''تو کسی روز ریسٹ کرلونا۔'' انہوں نے اپنے ہاتھ سے علیزے کے چہرے پہ آئے بال پیچھے ہٹائے تھے۔

''میرا ریسٹ کرنا دوسروں کو ناگوار گزرتا ہے۔'' علیزے کا لہجہ ذرا سا بھیگ گیا اس سے کومل کی ناگواری برداشت نہیں ہورہی تھی۔

''کس کو ناگوار گزرتا ہے؟'' عائشہ آفندی کو اچنبھا ہوا۔

''ہوں! کسی کو بھی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی اور اپنی طرف سے بات ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

''مگر بیٹا۔۔۔''

''پلیز آپ اس بات کو رہنے دیں' زیادہ کریدنے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔'' علیزے نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور عائشہ آفندی چپ ہوگئی تھیں وہ بھی تو زہرہ سے ملنا چاہتی تھیں' اسے کریدنا چاہتی تھیں' کیا اسے بھی اس کریدنے پہ تکلیف ہوسکتی تھی؟ لیکن عائشہ آفندی کو اس طرح یہ پتا تو چل سکتا تھا ناکہ وہ انہیں بنا بتائے سب کچھ چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟ کیوں کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا؟ کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ پیچھے عائشہ پہ کیا گزری ہے؟ کیا بیتی ہے اس کی ذات پہ؟ عائشہ آفندی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔



''پھوپھو!'' کیا سوچ رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں بیٹا!'' انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے آہستگی سے کہا اور علیزے کا کندھا تھپکتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

☼ ☼ ☼

''جس طرف بھی دیکھ رہا ہوں' ہر طرف سوچیں ہی سوچیں نظر آرہی ہیں' کیا بات ہے؟ تم بھی سوچ میں گم ہوگئے؟'' دانیال خفگی سے کہتا ہوا آذر کے برابر ایک پہاڑی کے اوپر بنی ریلنگ کے قریب آکھڑا ہوا۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟''

''میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ میں اس وقت ہر چہرے پہ گہری سوچ کے سائے دیکھ رہا ہوں' امی بھی سوچ میں گم ہیں' علیزے بھی چپ اور پرسوچ سی ہے' کومل کے چہرے کا بھی یہی حال ہے' اور ادھر تم بھی اسی مرض کا شکار ہوئے کھڑے ہو۔'' دانیال کی خفگی ہنوز تھی۔

''دانیال! تم نہیں جانتے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟'' آذر بے حد الجھا ہوا تھا۔

''ہونہہ! تمہارے جیسا بے خبر نہیں ہوں میں۔'' دانیال استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا' آذر نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔

''میرے جیسا بے خبر؟ کیا مطلب۔۔۔؟''

''تم کومل کے بارے میں سوچ رہے ہونا۔۔۔؟'' دانیال کے اندازے پہ آذر کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے پھیل گئیں کہ اس نے اس قدر درست اندازہ کیسے لگالیا؟

''دانیال۔۔۔! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' آذر حیران پریشان تھا۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ تم کومل کے بارے میں سوچ رہے ہو کہ کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ اتنا کھردرا کیوں ہے؟'' دانیال تو اسے کسی نجومی کی طرح سب کچھ پرفیکٹ بتا رہا تھا۔

''دانیال۔۔۔؟'' وہ حیرت کے مارے مزید کچھ نہیں کہہ پایا تھا اور دانیال نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور پہاڑوں کے اس پار ڈوبتے سورج کو دیکھا اور آذر کو وضاحت دی تھی۔

''دن شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے سورج بے دار ہوتا ہے اور یہ سورج پورا دن پوری کائنات پہ راج کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ سورج ڈوب جاتا ہے اور آسمان کے سینے پہ چاند جگمگانے لگتا ہے' ٹھنڈی میٹھی روشنیوں والا چاند' سب ہی اس چاند کو اس کی نرمی اور مٹھاس کی وجہ سے پسند کرتے ہیں اور لوگوں کی اس پسندیدگی کی وجہ سے سورج کو چاند سے جلن ہونے لگتی ہے اسے اپنے آپ پہ بھی غصہ آتا ہے کہ وہ غروب کیوں ہوتا ہے۔۔۔؟ کیوں چاند کو ابھرنے کا موقع دیتا ہے۔۔۔؟ لیکن یہ ڈوبنا اور ابھرنا ایک فطرت ہے اور یہ فطرت ازل سے اب تک جاری رہے گی' اسی طرح سورج کی چاند سے جلن بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔'' دانیال آذر کو ایک مثال دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کررہا تھا لیکن آذر پھر بھی نا سمجھی سے دیکھ رہا تھا۔

''میری اس مثال کا اشارہ علیزے اور کومل کی طرف ہے' کومل سورج ہے' بڑی حویلی کی بڑی بیٹی' اس نے ہمیشہ اپنے تمام کزنز میں راج کیا ہے' لیکن جیسے ہی علیزے پیدا ہوئی' پورے گھر کی توجہ اور پیار محبت علیزے کی سمت منتقل ہوگیا' پورا دن سورج کی دھوپ میں گزارنے والے لوگ چاند کے شیدائی ہوئے تو سورج کو بھی شکایتیں ہونے لگیں' اسے چاند سے حسد اور جلن محسوس ہوتی تھی' بڑی حویلی میں علیزے چاند تھی تو کومل بھی سورج کا

سا مقام رکھتی تھی اس لیے یہ پرخاش اس کے دل میں بچپن سے چلی آرہی ہے' کسی بھی بچے نے کومل کی حیثیت کو کم نہیں کیا تھا سوائے علیزے کے.... اور بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی آذر صاحب' یہ معاملہ بہت سنگین ہے' یہ قصہ بہت دور تک جاتا ہے۔" دانیال آج شاید آذر کی آنکھوں سے ناسمجھی کی پٹی اتارنے کے درپے تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب کہ کومل کے ساتھ دل کے معاملے میں بھی ایسا ہی سلوک ہوا ہے' کومل جس کو پسند کرتی ہے وہ علیزے کو پسند کرتا ہے۔" دانیال کے اس دھماکے پہ آذر دو قدم دور اچھلا تھا' وہ دانیال کو ششدر سا دیکھ رہا تھا' وہ ایسے انکشاف کر رہا تھا کہ آذر دنگ رہ گیا تھا۔

"کومل شاید بچپن کی ساری باتیں اگنور کر کے علیزے کے ساتھ نارمل کزنز کی طرح ہی ہو کرتی لیکن آذر آفندی کی محبت اسے ایسا کرنے سے روک دیتی ہے' کیونکہ کومل آذر کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہے اور آذر' علیزے کو دیکھ کر اس پہ قربان ہوتا ہے' ایسے عالم میں تم بتاؤ کہ کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ درست کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ کیسے علیزے کے ساتھ دوستوں کی طرح اور کزنز کی طرح رہ سکتی ہے؟ کیسے بڑی بہنوں کا سا سلوک کر سکتی ہے؟ علیزے اور کومل کے درمیان تم کھڑے ہو میرے دوست' اور فیصلہ بے پناہ مشکل ہے کہ کس کو کس طرف جانا چاہیے؟" دانیال نے آج اس قصے کا سارا کچا چٹھا کھول کے رکھ دیا تھا اور آذر نے بے ساختہ ریلنگ کو مضبوطی سے تھام لیا کہ مبادا وہ کہیں گر ہی نہ جائے۔

"اور ہاں! ایک بات اور اس سارے قصے میں علیزے بے گناہ اور انجان ہوتے ہوئے بھی اس چکی میں پس رہی ہے' اس کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن پھر بھی قصوروار ٹھہرائی جا رہی ہے۔" دانیال اسے ہر بات سے آگاہ کر رہا تھا۔

"کومل مجھے پسند کرتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" آذر نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"کیوں؟ یہ کیوں نہیں ہو سکتا بھلا؟ کیا اس چیز پہ کوئی پابندی ہے؟" دانیال نے اس کے بچکانہ سے سوال پہ خفگی سے کہا۔

"مگر دانیال...."

"کیا تم نے اپنے ماتھے پہ لکھوا رکھا ہے کہ تم علیزے کو پسند کرتے ہو اور کوئی تمہیں پسند نہ کرے؟" دانیال کو آذر کی لاپروائی اور نادانی پہ چڑ ہو رہی تھی۔

"میں علیزے کو پسند کرتا ہوں؟ دانیال تم غلط فہمی کا شکار ہو' میں علیزے کو...."

"ہاں! تم علیزے کو محض اپنی کزن سمجھتے ہو' ہے نا؟ ہونہہ۔ اگر کزنز تو پھر اور بھی بہت ہیں۔ صرف علیزے کے لیے ہی اتنے ہلکان کیوں ہوتے ہو؟ وہ تمہارے لیے اتنی اسپیشل کیوں ہے؟ مان لو میرے یار کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ سب سچ ہے' تم علیزے کو پسند کرتے ہو اور کومل تمہیں پسند کرتی ہے۔ اور پسند کا یہ چکر کچھ مناسب نہیں ہے' کیا بنے گا آخر؟" دانیال خود بھی متفکر ہو رہا تھا جبکہ آذر تو مزید کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ وہ سب واپسی کا شور مچا رہے تھے اور آذر جیسے مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا گاڑی تک آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے دھیان میں بیڈ روم کا دروازہ کھول کے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھیں' لیکن اندر داخل ہوتے ہی انہیں شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا' بیڈ روم سگریٹ کے دھوئیں سے دھواں دھواں ہو رہا تھا اور اس قدر زہریلے دھوئیں





سے ان کا دم گھٹ گیا۔

وہ کھانستے ہوئے بمشکل کھڑکی تک گئی تھیں اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے۔

"وقار! یہ آپ اسموکنگ کر رہے ہیں؟ اتنی زیادہ...؟ ہر چیز دھواں دھواں ہو گئی ہے۔" آسیہ آفندی ان کے عین سامنے آکھڑی ہوئی تھیں وہ راکنگ چیئر پہ جھول رہے تھے۔

"کھڑکی بند کر دو آسیہ۔" انہوں نے بے حد گمبھیر اور بوجھل آواز سے کہا تھا۔

"کیسے بند کر دوں کھڑکی...؟ پورا بیڈ روم حبس زدہ ہو رہا ہے آپ کا دم نہیں گھٹ رہا؟" آسیہ آفندی پریشانی سے جھنجلا رہی تھیں۔

"دم گھٹ رہا ہے' اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کھڑکی بند کر دو۔" وقار آفندی کا لہجہ بہت عجیب ہو رہا تھا' آسیہ آفندی بے بس سی کھڑی تھیں آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا ان کو اس حال میں دن رات تمام کرتے ہوئے' اور ان کو پورا ایک ہفتہ ہو چکا تھا ان سے اس حال کی وجہ پوچھتے ہوئے' وہ جب زیادہ اصرار کرتی تھیں تو وقار آفندی غصے سے ڈانٹ دیتے تھے اور وہ ہزاروں الجھنیں ذہن میں لیے پلٹ جاتی تھیں۔

"ایسی کیا بات ہے آخر جو آپ مجھ سے شیئر نہیں کرتے؟" آسیہ آفندی ان کے قریب آگئی تھیں اور وقار آفندی نے ان کے سوال کو نظر انداز کر کے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے ہنکارا بھرا۔

"علیزے کے برتھ ڈے میں صرف پانچ دن رہ گئے ہیں' ان لوگوں کو کہو صبح واپس آجائیں۔" ان کو اس حال میں بھی علیزے کا برتھ ڈے یاد تھا' اتنے دنوں بعد کوئی بات کی بھی تھی تو علیزے کی۔ آسیہ آفندی چپ سی ہو گئیں۔

"علیزے کا برتھ ڈے یاد ہے آپ کو؟"

"ہونہہ! تمہیں کس نے کہا کہ میں بھول گیا ہوں؟" وہ استہزائیہ ہنسے تھے۔

"علیزے انیس سال کی ہو رہی ہے' اس کی انیس برتھ ڈیز سلیبریٹ کی ہیں میں نے' کوئی ایک بھی بھولا ہوں تو بتاؤ مجھے؟" یہ ان کا ریکارڈ تھا کہ انہوں نے علیزے کا ایک بھی برتھ ڈے مس نہیں کیا تھا' وہ ہمیشہ ہر سال کہیں ملک سے باہر بھی ہوتے تھے تو اس کے برتھ ڈے پر گھر واپس آجاتے تھے اور کافی دھوم دھام سے سلیبریٹ کرتے تھے تو اس بار کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کا برتھ ڈے سلیبریٹ نہ ہوتا اور مس ہو جاتا؟

"لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اس بار برتھ ڈے مس ہو جائے گا' کوئی سلیبریشن نہیں ہو گی۔" آسیہ آفندی اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔

"نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا' وقار آفندی کی زندگی میں علیزے کی کوئی بھی خوشی مس نہیں ہو سکتی ان شاءاللہ جب تک زندہ ہوں یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔" وہ پر عزم سے لہجے میں کہتے ہوئے راکنگ چیئر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ذرا فریش ہونے کے لیے باتھ روم کا رخ کیا۔ اور آسیہ آفندی آذر کو فون کرنے کے لیے چل دیں۔

وقار آفندی نے اتنے دنوں بعد اپنی چپ کا روزہ توڑا تھا اس لیے آسیہ آفندی کے لیے فی الحال یہ بھی کافی تھا کہ چلو انہوں نے کسی کام میں دلچسپی تو لی ہے نا؟ اسی لیے انہوں نے فوراً" فون کر کے اپنی فوج کو واپسی کا آرڈر دے دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

صوفیہ سرور

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

زنداں کی بلند دیواروں کے اس پار کی دنیا بہت حسین ہوتی ہے ڈھیروں مناظر نظروں سے گزرتے ہیں آوازیں سماعتوں سے ٹکراتی ہیں آزاد اور پرلطف زندگی چاروں طرف رقصاں ہوتی ہے۔ آزادی ایک حسین اور تابناک چیز ہے اس کی قدر و قیمت و اہمیت اس سے پوچھیں جس پر جیل کی چھوٹی سی دنیا میں کائنات محدود کردی جاتی ہے۔
کرن میں ـــــ نیا سلسلہ "روداد قفس" کے نام سے شروع کیا ـــ ہے جیلوں میں قید خواتین کے حالات و واقعات پر مبنی۔ آخر ایسے کون سے مسائل و حالات تھے جن کی وجہ سے وہ قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے پر مجبور ہوئیں۔ اس سلسلے کی کوئی کہانی آپ کے پاس ہے تو ہمیں روانہ کریں۔ ہم نوک پلک سنوار کر اسے شائع کریں گے۔

پہلے نوید اخبار لاتا تھا تو وہ اس فضول خرچی سے سخت چڑتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ اسے بھی دلچسپی ہو گئی، اب وہ احمد کو بھیج کر گھر کے سارے کاموں سے فارغ ہو کر اخبار لے کر بیٹھ جاتی۔

آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ اخبار پڑھتے ہوئے اس کی نظر ایک ایسی خبر پر پڑی جس نے اس کا دل دہلا دیا تھا۔ خبر لودھراں کی سکینہ کی تھی جو گاؤں اچ کی باسی تھی۔ غربت اور تنگدستی نے اسے اپنی بیٹی بیچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنے پانچ ہیپاٹائٹس کا شکار بچوں کو بچانے کے لیے اس نے جوہریوں سے بیعانہ بھی لے لیا۔ لیکن قدرت نامہربان تھی وہ جس بیٹی کو بیچنا چاہتی تھی وہ بھی ہیپاٹائٹس کا شکار ہو گئی اور جوہریوں نے بیعانہ واپس مانگ لیا۔

میں خون بیچ کر روٹی خرید لایا ہوں
امیر شہر بتا یہ حلال ہے کہ نہیں

خبر پڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے چھ سال پرانا دور یاد آ گیا، جب جیل کی چار دیواری میں اس کی ملاقات رضیہ سے ہوئی تھی۔

✡ ✡ ✡

نرمل کی زندگی تھپیڑوں کی زد میں آ گئی تھی۔ بڑی روایتی سی کہانی تھی اس کی ظالم بھابھی اور عجیب سی [illegible]وں والا بھابھی کا بھائی۔ اس کا اپنا بھائی عمران مفلوج ہو کر بستر پر موجود تھا۔ اور ایک دن اپنی عزت و ناموس کی خاطر اس نے بھائی کے سالے کو چھری گھونپ دی۔ نتیجتاً" آج وہ جیل کے در و دیوار میں تھی۔

"چل آ میرے ساتھ۔" ایک موٹی سی عورت نے نرمل کو اشارہ کیا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے پیچھے چلنے لگی۔

"کتنا ظلم ہوا تیرے ساتھ بھری جوانی میں جیل آ گئی اور اوپر سے بیرک نو میں، جہاں وہ ذہنی مریضہ موجود ہے۔ مجھے تو ڈر ہے تجھ پر حملہ ہی نہ کر دے،" رانو کہہ رہی تھی ناخن بڑے مارتی ہے۔ قابو میں ہی نہیں آتی۔" وہ بڑی باتونی تھی، نرمل کے چہرے پر خوف کے

تاثرات نمودار ہوئے تو بولی۔

"تو فکر نہ کر کوئی گل بات ہو تو مجھے بتاؤ نا' میں تیرا مسئلہ حل کر دوں گی۔" بیرک آپہنچی تھی۔ نرمل کچھ تذبذب سے اندر آئی تو نظر سامنے موٹی سی عورت پر پڑی جو بڑی خوف ناک نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ اس سے کچھ دور درمیانے جثے کی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ جس کا چہرہ اسے نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ ایک ہی جگہ پر کھڑے چاروں جانب دیکھ رہی تھی' بیرک کے اندر کا ماحول انتہائی ناخوشگوار تھا۔

"کیا نام ہے تیرا۔" خوف ناک نظروں والی عورت نے پوچھا۔

"نر.... نرمل۔" وہ اٹک کر بولی۔

"بیٹھ جا کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہی ہے۔" نرمل ڈرتے ہوئے اس سے کچھ دور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ یقیناً" یہی وہ ذہنی مریضہ ہے جو ناخن مارتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو' جس کے بارے تو سوچ رہی ہے وہ یہ ہے میں نہیں؟" خوف ناک عورت نے قہقہہ لگایا۔

"پر تو فکر نہ کر سلطانہ کے ہوتے ہوئے یہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ اس عورت کو بار بار ہنسنے کی عادت تھی۔

"میں یہاں کیسے رہوں گی۔" نرمل نے دل ہی دل میں سوچا اور آنسو بہانے لگی۔ سلطانہ نامی عورت رخ موڑ کر سگریٹ پینے میں مصروف تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کو کھانے کا وقت ہوا تو ساری قیدی عورتیں یوں کھانے پہ ٹوٹ پڑیں جیسے برسوں سے بھوکی ہوں۔ لیکن وہ نفسیاتی مریضہ جو کہ نرمل کے سامنے تو ابھی تک کچھ بھی نہ بولی تھی' اس نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

"کھالے رضیہ۔" سلطانہ نے اسے تیسری دفعہ کہا تو اس نے ایک نظر سامنے پڑی پلیٹوں پر ڈالی۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر اذیت اور پھر غصے کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔ اچانک اس نے ——— دال اور روٹی کی پلیٹوں کو اٹھایا اور سامنے دیوار پر دے مارا۔ ساتھ ہی اس کی چیخیں گونجنے لگیں۔ نرمل اس کے وحشی انداز پر گھبرا گئی۔ رضیہ اپنے بال نوچ رہی تھی۔ دیکھ بھال پر معمور عورتوں نے اسے جکڑ لیا اور نہ جانے کس نے اس پر تھپڑوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ ساتھ ہی کوئی گالیاں بھی دے رہی تھی۔

نرمل نے خوف زدہ ہو کر کانوں میں انگلیاں دے دیں اور سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

تھوڑی دیر تک معاملہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ نرمل نے سر اٹھا کر دیکھا' رضیہ ایک طرف پڑی سسکیاں لے رہی تھی' اس کی حالت بہت خراب لگ رہی تھی۔ سلطانہ دیوار سے ٹیک لگائے کش پہ کش لگا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اطمینان اور لاتعلقی جھلک رہی تھی۔ نرمل اس کے رویے پر حیران تھی۔ سلطانہ نے اس کی نظریں خود پر جمی محسوس کیں تو قریب کھسک آئی۔

"پہلے دن ہی پریشان ہو گئی۔ یہاں اکثر ہی ایسا ہوتا ہے۔ کھانے کے ٹائم ایسا ہی دورہ پڑتا ہے اسے۔ ساری بیرکیں عورتیں سے بھری ہیں' صرف اس میں ہی ہم تین ہیں' کس وجہ سے اس کے پاگل پن کی وجہ سے۔ سب ڈر کے بھاگ گئیں۔ دورہ پڑے تو دوسروں پر حملہ کر دیتی ہے۔ کچھ نہیں دیکھتی ناخنوں سے سب چھیل ڈالتی ہے' بڑی جناتی قوت ہے' قابو نہیں آتی۔"

اس کے کانوں میں سب کچھ انڈیل کر وہ کش پہ کش لگانے لگی۔ نرمل نے سگریٹ کے دھوئیں سے بڑی ہی ناگواری محسوس کی۔ اتنی بڑی بیرک میں محض تین عورتوں کا ہونا اس کے لیے بھی حیران کن تھا۔ نرمل اب رضیہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سسکیاں بند ہو چکی تھیں۔ نہ جانے ایسا کیا ہو جاتا ہے اسے کھانے کو دیکھ کر' نہ جانے کیا معمہ ہے اس کے پیچھے۔

☼ ☼ ☼

اسے جیل آئے ایک ہفتہ گزر گیا تھا اور اس



پورے ہفتے میں پہلے دن جیسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ جیل کے درودیوار سے وہ کسی حد تک مانوس ہو چکی تھی۔ اس دوران نرمل نے رضیہ کو کسی سے گفتگو کرتے نہ دیکھا تھا۔ سارا دن وہ کسی غیر مرئی نقطے کو گھورنے میں مصروف رہتی۔

اس رات سلطانہ جلد ہی سو گئی تھی۔ نرمل کو لگتا تھا وہ کسی قسم کا نشہ کرتی تھی' شاید افیون کھاتی تھی۔ پیسہ ہو تو جیل کے درودیوار میں بھی ہر چیز پہنچ جاتی ہے۔

نرمل آنکھیں موندے لیٹی تھی' لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اچانک اسے ہلکی آواز میں رونے اور سسکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں' اس نے بے چین ہو کے آنکھیں کھول دیں۔ یقیناً" رضیہ رو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز اونچی ہوتی گئی۔ نرمل کا دل پسیج گیا تھا' لیکن اس کے اندر کا خوف اسے اٹھنے نہ دے رہا تھا۔

رضیہ کو روتے ہوئے کافی دیر ہو گئی' لیکن اندر کا غم ختم ہونے میں نہ آرہا تھا۔ بالاآخر نرمل سے رہا نہ گیا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر رضیہ کی طرف چل دی۔ قریب پہنچ کر وہ کچھ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔ لیکن کچھ بولنے کی اور پوچھنے کی ہمت اس میں نہ تھی مبادا وہ اس پر حملہ نہ کر دے۔ کئی لمحات خاموشی کی نذر ہو گئے۔ وہ عورت ابھی تک آنسو بہا رہی تھی۔

"تم کیوں رو رہی ہو؟" نرمل کو اس کے علاوہ کوئی سوال نہ سوجھا وہ عورت چونک کر اسے دیکھنے لگی پر کچھ نہ بولی' اس کی سرخ آنکھیں ویران تھیں۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ پھر سے رونے لگی۔

"اس طرح روؤ مت۔" نرمل کو نہ جانے کیوں بے چینی ہو رہی تھی۔

"تو پھر ہنسوں کیا؟" اب کے بار وہ بھرائی آواز میں بول اٹھی۔

"تم اٹھ جاؤ' چلی جاؤ یہاں سے۔" اس کی درشت آواز سن کر نرمل ایک دم سہم گئی' لیکن پھر ہمت کر کے بولی۔

"تم مجھے اپنی پریشانی بتاؤ۔ تم اتنا کیوں رو رہی ہو؟"

"کیا تم نے کبھی کسی ایسے کو قتل کیا ہے' جس سے تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ محبت ہو۔ جسے تم مارنا نہ چاہتی ہو' تم نے پھر بھی مار دیا ہو مجبوراً۔" نرمل نے بے اختیار جھرجھری لی۔ اسے رضیہ سے یک دم خوف محسوس ہونے لگا اور وہ ذرا پیچھے ہو گئی۔ اس رضیہ نامی عورت کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔

"فکر نہ کرو' میں اب اور کسی کو نہیں ماروں گی' جن کو مارنا تھا مار چکی۔"

"تم نے کیسے مارا؟" نرمل کے منہ سے بے اختیار نکلا' لیکن عورت نے اسے جو جواب دیا اسے سن کر اسے بہت حیرت اور خوف محسوس ہونے لگا۔

"سنو گی میری کہانی۔"

☼ ☼ ☼

شہر کے کنارے پر موجود اس کچی پکی بستی کے مکان اپنے مکینوں کی غربت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ انہی گھروں کے درمیان ایک گھر سراج کا تھا جو اپنی بیوی رضیہ اور تین بچوں راشد' فضل اور فاطمہ کے ساتھ رہتا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے کلرک تھا' اچھی گزر اوقات ہو رہی تھی۔

قدرت کے کھیل عجیب ہیں' ایک دن سراج کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ رضیہ پچھاڑیں کھا رہی تھی اور بچے بلک رہے تھے۔ دو سالہ فاطمہ سب کی توجہ سے دور بھوک سے رو رہی تھی۔ بیوی بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ گھر کی کمائی اور روزی روٹی کا واحد سہارا چھن گیا۔ رضیہ کے والدین بھی غریب تھے' بھائی کوئی تھا نہیں' سراج بھی دنیا میں تنہا تھا۔ نہ کوئی بہن' نہ بھائی۔ وہ روتی رہی کہ رونا ہی مقدر ٹھہرا تھا۔ تقدیر اپنے من پسند فیصلے کرتی ہے اور وقت اس کا کام گزرنا ہے یہ کسی کے لیے تو رکتا ہی نہیں۔ ابتدائی دنوں میں تو بستی والوں نے کافی خیال رکھا۔ لیکن آخر کب تک۔ رضیہ نے اپنی سمجھ داری سے جو چند پیسے جوڑ رکھے تھے وہ بھی ختم ہونے لگے۔

سراج بے شک غریب تھا، لیکن اس نے بیوی، بچوں کو تین وقت کی روٹی عزت سے کھلائی تھی۔ رضیہ طبیعتاً" شرمیلی تھی، آس پاس کہیں جاتی ہی نہ تھی، گھر سے نکلتی بھی تو مجبوری کے عالم میں۔ لیکن اب اسے جن حالات کا سامنا تھا، ان میں اس کا روزی روٹی کے لیے گھر سے باہر نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔

ویسے بھی وہ کب تک شوہر کی موت کا غم منا سکتی تھی، پیٹ ایسی حقیقت ہے جو بڑے بڑے غم بھلا دیتی ہے۔ اس نے بھی سب کچھ بھلا کر مزدوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

✡ ✡ ✡

رضیہ کی بستی کی چند عورتیں ایک فیکٹری میں پرس سینے جاتی تھیں۔ اس نے بھی وہاں جانا شروع کر دیا۔ بچوں کو ایک رحم دل پڑوسن کے حوالے کرتی اور آٹھ بجے کام کے لیے چلی جاتی۔ شام چھ بجے کے قریب لوٹتی تو ڈیڑھ سو روپے ہاتھ میں ہوتے۔ پیسے اگرچہ کم تھے، لیکن وہ خدا کا شکر ادا کرتی کہ روکھی سوکھی روٹی مل رہی تھی۔ وہیں کام کرتے اسے دو ماہ گزر گئے کہ ایک دن سپروائزر نے اسے بلاوا بھیجا، وہ جانے لگی تو باقی تمام عورتوں نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا، وہ ان کی نظروں سے گھبرا سی گئی۔

سپروائزر کے کمرے میں پہنچی تو اس نے اسے سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ کچھ دیر تو وہ اسے گھورتا رہا، جیسے برمے سے اس کے جسم میں سوراخ کر رہا ہو۔

"تمہارا نام رضیہ ہے نا؟"

"جی۔" اس نے نظریں جھکا کر جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"شوہر کیا کرتا ہے تمہارا؟"

"جی وہ وفات پا گیا ہے۔" اس نے آنسو پیے۔

"چہ چہ... بڑا افسوس ہوا، کتنے بچے ہیں تمہارے۔"

"جی تین بچے ہیں۔"

"فرمائشیں تو کرتے ہوں گے۔" وہ مسکرایا۔

"جی کیسی فرمائشیں؟" وہ حیران ہوئی۔

"بھئی کھلونوں کی، کپڑوں اور جوتوں کی، بچے تو بڑی فرمائشیں کیا کرتے ہیں۔"

"جی نہیں میرے بچے بڑے قناعت پسند ہیں۔"

"ہوں۔"

"ویسے کام تو تم اچھا کرتی ہو۔ ڈیڑھ سو روپے تو کم ہے۔ سوچ رہا ہوں تمہاری مزدوری دو سو کر دوں۔" اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

"لیکن یہاں تو سب ڈیڑھ سو ہی لیتی ہیں۔" وہ بولی۔

"ارے سب کو چھوڑو، بہت سی تو تین سو بھی لیتی ہیں۔" وہ بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ رضیہ اس کے لہجے اور نظروں کے مفہوم کو سمجھ چکی تھی۔ اس کا اندر کھولنے لگا۔

"تم ذرا ہمت کرو، پھر دیکھنا نوٹوں کی بارش ہو جائے گی۔" رضیہ کا منہ سرخ ہو گیا۔

"تم جیسا گھٹیا انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ذلیل انسان میں تمہارے پیسوں پر لعنت بھیجتی ہوں۔"

"ارے جا جا تیری کیا اوقات ہے، میں نے دیکھی ہوئی ہیں تیرے جیسی عورتیں تو میرے تلوے چاٹتی ہیں۔ ارے ہاں تو کرتی ساری خواہشیں پوری کر دیتا۔"

"جہنم میں جاؤ تم اور بھاڑ میں جائیں وہ عورتیں، میری خواہشیں اتنی بے قابو نہیں کہ ان کے لیے میں اپنی عزت گروی رکھ دوں۔" رضیہ وہاں سے غصے کے عالم میں نکل گئی اور دوبارہ کبھی فیکٹری نہ آئی۔

✡ ✡ ✡

ایک ہفتے تک اسے کوئی نیا کام نہ مل سکا۔ جب فاقوں کی نوبت آ پہنچی تو اس کی پڑوسن صائمہ اس کے گھر آئی۔ جو بنگلوں میں کام کرتی تھی۔

"میں اپنی بہن کے پاس جا رہی ہوں، بیس دنوں کے لیے۔ مالکوں کو تب تک عارضی ملازمہ کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچا تجھ سے زیادہ ضرورت مند اور کون ہو گا، تب ہی تیرا نام لے دیا۔ بیس دنوں کے دو ہزار ملیں گے۔ دل مانے تو کل بتا دینا مجھے۔" دل کے ماننے کی تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ وہ دو دن بعد سے کام پر جانے لگی۔ ایک طرف سے اطمینان ہوا تو دوسری طرف عزت کو لاحق خطرات بھی ختم ہو گئے۔

کچھ دنوں سے اسے راشد کی صحت گرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، بچے تو سب ہی کمزور ہو گئے تھے، لیکن راشد کا چہرہ بھی پیلا رہنے لگا تھا۔ ساتھ ہی وہ سارا سارا دن سست سا پڑا رہتا۔ رضیہ بے حد فکر مند ہو گئی۔ راشد زیادہ باتیں بھی نہ کرتا، نہ کسی سے کھیلتا۔ ایک ہفتے بعد اس نے مالکوں سے ہزار روپیہ لیا اور اسے اسپتال لے گئی۔

ڈاکٹر نے چھ سو فیس لینے کے بعد چیک اپ کیا اور جو کچھ رضیہ کو بتایا اسے سن کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ راشد کو ہیپاٹائٹس ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے چند دوائیں لکھ دیں اور ساتھ ہی راشد کی خوراک بہتر کرنے کی ہدایت کی۔ مزید بتایا کہ مکمل علاج پر پچھتر ہزار لگیں گے۔ اس نے تین سو کی دوائیں لیں اور سو روپے کا پھل۔ راشد کو لیے وہ گھر پہنچی تو خالی ہاتھ تھی۔

✡ ✡ ✡

بیس دن پورے ہو چکے تھے اور ایک مرتبہ پھر وہ بے روزگار ہو چکی تھی۔ جو پیسے ملے تھے وہ بھی خرچ ہو چکے تھے۔ گھر میں ایک دفعہ پھر فاقے چل رہے تھے۔ راشد مزید کمزور ہو چکا تھا۔ اس نے محلے والوں سے امداد چاہی، لیکن پہلے ہی وہ ہر گھر کی مقروض تھی، اسے ہر جانب سے انکار سننا پڑا۔

اس شام کو جب بچے بھوک سے بلبلا رہے تھے تو وہ غائب دماغی کے عالم میں گھر سے نکل آئی، دل بچوں کی حالت پر خون کے آنسو رو رہا تھا، لیکن بے بس تھی، معصوم پھولوں کے لیے کچھ کرنا اس کے اختیار میں کہاں تھا۔

سڑک ختم ہوئی تو آگے کچا رستہ تھا۔ وہ بھی ختم ہوا تو آگے سرسوں کا کھیت نظر آیا۔ سرسوں دیکھ کر اس کے اندر امید کی شمع روشن ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر وہاں سے سبز پتے توڑنے شروع کر دیے، جب اچھے خاصے توڑ چکی تو دوپٹے میں بھر کر گھر لوٹ آئی۔

گھر میں بچے رو رو کر نڈھال ہو چکے تھے، پڑوس سے ماچس لے کر اس نے آگ جلائی اور ساگ دھو کر برتن میں ڈال کر آگ پر چڑھا دیا۔ گھر میں موجود نمک مرچ اس میں ڈالا اور جب گاڑھی سی کچی تیار ہوئی تو پلیٹوں میں ڈال کر بچوں کے آگے رکھ دی۔ ساتھ روٹی وغیرہ کچھ نہ تھا۔ بچوں نے دیکھا تو منہ میں پانی بھر آیا اور منہ جلنے کی پروا کیے بغیر جلدی جلدی کھانے لگے، رضیہ منہ پرے کر کے رونے لگی۔

"امی کھانا اور ہے۔" فاطمہ نے اسے بلایا تو وہ آنسو صاف کر کے مڑی۔

"امی تھوڑا سا اور دے دو، بھوک لگی ہے، بہت مزے دار ہے۔" فاطمہ کے لہجے میں حسرت تھی۔

دیگچے میں ابھی خاصا ساگ موجود تھا۔ رضیہ نے دوبارہ پلیٹیں بھر دیں۔ بڑے دنوں بعد بچوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد سے رضیہ روز ساگ توڑنے کے لیے جانے لگی۔ ایک دن وہاں گئی تو کرخت صورت دیہاتی شجر کے نیچے حقہ پینے میں مصروف تھا۔ رضیہ ساگ توڑنے کے لیے کھیت میں داخل ہوئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"خبردار! ساگ نہ توڑ، سارے پتے خراب کر دتے نیں بس چھڈ دے، ہن اہندی جان ڈھاتے کھا گئیں اے باقی تے چھڈ دے۔" وہ غصے سے بھرے لہجے میں بولا۔ وہ اس کے غصے سے سہم گئی، اسے اپنی توہین کا احساس بھی ہونے لگا۔ لیکن پھر اپنے بھوکے بچوں کی صورتیں یاد آئیں تو عزت نفس کو پس پشت ڈال کر بولی۔

"میرے بچے بھوکے ہیں اور گھر میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے تو میں نے سوچا یہاں ساگ توڑ لوں۔"

"سارا منج (خالی) کردتا ای۔ میں تیری اولاد دا ٹھیکا لیا ہے۔ جتھوں مرضی کھوا۔ اج توں بعد ایتھے نہ آئیں نئیں تے بری کراں گا۔" رضیہ وہاں سے مایوس لوٹ آئی۔ تاریکی میں جو روزن کھلا تھا وہ بند ہوچکا تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ ایک در بند تو سو کھلا تو خدا نے اس کے لیے پھر روزی کا ایک دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ رفیق مغل کا تھا جو ایک بڑے صحن میں کھلتا تھا' گھر خاصا بڑا تھا۔ دو ملازم پہلے سے کام کرتے تھے' لیکن کھانا پکانے کے لیے ایک عورت کی ضرورت تھی۔

رضیہ نے ایک دفعہ پھر سکھ کا سانس لیا۔ اس کی یہ ملازمت مستقل تھی نہ کہ بیس روزہ۔ چار ہزار تنخواہ اور کھانا مفت۔

"اب میں راشد کا علاج بھی شروع کروادوں گی آٹھ ہزار ایڈوانس لے کر۔" اس نے خوشی خوشی نہ جانے کتنے منصوبے بنا ڈالے۔

✲ ✲ ✲

راشد کو علاج کے لیے اسپتال میں داخل کرادیا گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ تین ماہ کے اندر اندر وہ صحت یاب ہوجائے گا۔ رضیہ نے رفیق مغل کی بیوی سے آٹھ ہزار روپے ایڈوانس لے لیے۔ جس میں سے تین ہزار کا راشن ڈلوالیا گیا۔

رضیہ صبح سے شام تک ادھر کام کرتی دوپہر کو کھانا دینے کے لیے گھر چکر لگاتی۔ شام کو راشد کے پاس جاتی۔ تین چار گھنٹے اس کے پاس گزارنے کے بعد وزیٹرز ٹائم ختم ہوجاتا تو وہ لوٹ آتی۔ جاتے ہوئے جب راشد اس کا دوپٹہ پکڑلیتا تو آنکھ میں آنسو بھر آتے' وہ بیٹا جو ایک رات کے لیے بھی اس نے خود سے دور نہ کیا تھا' اب ہر رات اس سے دور ہی گزرتی تھی۔

اس کی آنکھوں میں ماں سے رکنے کی التجا ہوتی' لیکن وارڈ میں دس' پندرہ بیڈ تھے' وہاں کسی کے ٹھہرنے کی گنجائش کہاں' صرف چند مریضوں کے تیمارداروں کو رکنے کی اجازت تھی۔ اتنی گنجائش تو رضیہ کے پاس تھی نہیں کہ وہ راشد کے لیے ایک کمرہ لیتی۔

اس کے علاج پر اتنا خرچ آجاتا تھا کہ ہر ماہ ان کے پاس چند سو روپے بچتے۔

تین ماہ گزر گئے' لیکن راشد صحت یاب نہ ہوسکا ڈاکٹرز نے کہا کہ علاج مزید چھ ماہ چلے گا اور اب ہر ماہ تین' چار ہزار سے علاج نہ ہوسکے گا' اکٹھے پندرہ ہزار جمع کرائے جائیں' بے شک اس کے بعد ہر مہینے پانچ' پانچ ہزار دیے جائیں۔

وہ یہ سن کر پریشان ہوگئی۔ پہلے ہی وہ کھینچ تان کر گزارا کررہی تھی' اب اکٹھے پندرہ ہزار کہاں سے آئیں گے۔ گھر آکر اس نے اپنے گھر کے قیمتی سامان کو ایک جگہ جمع کرنا شروع کردیا۔ یہ سامان دو پلیٹوں ایک دیگچی' ایک پتیلے' ایک چمچہ اور توے کے علاوہ دو چادروں' تین چارپائیوں' ایک میز اور ایک صندوق پر مشتمل تھا۔ اس نے ایک چادر ایک پلیٹ' توے دیگچی اور ایک چارپائی کے سوا سب کچھ بیچ دیا۔ لیکن اس پرانے سامان کی قیمت زیادہ سے زیادہ کیا ہوسکتی تھی۔ سارے سامان کو بیچنے سے تین ہزار روپے ملے۔ ابھی اسے مزید بارہ ہزار روپے کی ضرورت تھی۔

اگلے دن وہ کام پر گئی تو لنچ تیار کرنے کے بعد وہ چائے خود لے کر لاؤنج میں گئی۔ حالانکہ اس سے پہلے ساجد جو کہ وہاں چھوٹے موٹے کام کرتا تھا' وہ لے کر جاتا تھا۔

رفیق مغل اور اس کی بیوی صوفے پر بیٹھے خوش گپیاں کررہے تھے۔ چائے پیش کرنے کے بعد وہ وہیں کھڑی رہی تو' مسز رفیق مغل نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا بات ہے رضیہ' کوئی کام ہے؟"

"وہ... وہ بیگم صاحبہ!" اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔

"بولو رضیہ! کیا بات ہے؟" اب کے بار رفیق مغل نے پوچھا تھا۔ رضیہ نے اس کی جانب دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔



"مجھے کچھ پیسے چاہیے تھے؟" یہ سن کر مسز رفیق مغل کے ماتھے پر شکنیں پڑگئیں۔

"تم نے ساری تنخواہ تو پہلے ہی ایڈوانس لے لی ہے' اب تمہیں اور پیسے چاہئیں' دیکھو ہمیں ملازمہ کی ضرورت ہے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہماری مجبوری سے فائدہ اٹھانا شروع کردو۔"

"نہیں بیگم صاحبہ! میں تو خود بڑی مجبور ہوں' میرا بیٹا بیمار ہے' اور وہ اسپتال...."

"اُفوہ رفیق اس کو دو ہزار دے دو' ایک تو ان عورتوں کے بہانے ختم نہیں ہوتے۔"

"دو ہزار' لیکن مجھے تو...."

"دو ہزار رکھنے ہیں تو رکھو' ورنہ ہمیں ملازموں کی کمی نہیں۔" دل تو چاہا کہ منع کردے' لیکن پھر راشد کا علاج کیسے کراتی۔

اس نے میز پر پڑے دو ہزار اٹھالیے اور کچن کی طرف چل دی۔ اس بات سے بے خبر کہ دو آنکھیں بڑی گہرائی لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔

سہ پہر کو بیگم صاحبہ ڈرائیور کے ساتھ شاپنگ پر گئیں تو اسے رفیق صاحب کا بلاوا آیا۔ وہ حیران ہوئی کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ گئی تو رفیق مغل صوفے پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ذرا سیدھا ہو بیٹھا۔

"بیٹھ جاؤ ادھر۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں جی میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"میں کہہ رہا ہوں نا بیٹھ جاؤ۔" رضیہ کو بیٹھنا ہی پڑا۔

"تمہیں اپنے بچوں کے لیے پیسہ چاہیے نا۔"

"وہ میرا بیٹا بیمار ہے' اس لیے...."

"ہاں ہاں وہی۔" رفیق مغل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دیکھو اگر میں تمہاری ضرورت پوری کردوں تو بدلے میں تم مجھے کیا دوگی۔" رفیق کی سرخ آنکھیں مزید سرخ ہوگئیں۔

"میں بھلا آپ کو کیا دے سکتی ہوں۔" پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔

"میں آپ کو بڑی دعائیں دوں گی جی۔" اس کی بات پر پہلے تو رفیق مغل اسے دیکھتا رہا' پھر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اسے قہقہہ لگاتا دیکھ کر وہ حیران ہوئی اور پریشان بھی۔ ایسی کیا بات کہہ دی تھی اس نے۔

"رضیہ یا تو تو بڑی بھولی ہے یا جانتے بوجھتے بن رہی ہے۔ آج کل ہر کام دعاؤں سے نہیں ہوتا' اس کے لیے دوا بھی کرنی پڑتی ہے۔ ویسے بھی میں نے تیری خالی خولی دعاؤں کا کیا کرنا ہے۔" اس کی بات سمجھ آنے پر رضیہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ چہرے پر درشتی کے آثار نمودار ہوگئے۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں تمہارے جیسے لوگوں پر۔ تم لوگوں نے ہر عورت کو بکاؤ مال سمجھ رکھا ہے کیا؟"

"تم بھی بڑی گرم ہورہی ہے' گھر جاؤ اور سوچو پیسے نہ ملے تو علاج کیسے ہوگا تیرے بیٹے کا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں' سوچ کر کل بتا دینا۔" اس کے چہرے پر بڑی کمینی مسکراہٹ تھی۔ رضیہ نے باہر کا رخ کیا۔ اب وہ ایک پل بھی ادھر رکنا نہ چاہتی تھی۔ جلدی میں بچوں کے لیے کھانا لینا بھی یاد نہ رہا۔

گھر پہنچ کر بچوں کو کھانا دیا۔ راشد کو وہ دوپہر کو ہی کھانا دے آئی تھی۔ اسپتال نزدیک تھا۔ لہٰذا قدرے سہولت تھی۔ رات کو کھانا پھر لے کر جانا تھا۔

دونوں بچوں کو لے کر اسپتال پہنچی تو راشد منتظر تھا۔ سارا دن اکیلے گزار کے وہ گھبرا جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو روز ہی گھر جانے کی ضد کرتا تھا۔ لیکن اب کافی سنبھل گیا تھا۔ پاس والے بیڈ پر اس کی عمر کا لڑکا تھا۔ جس سے اس کی کافی دوستی ہوگئی تھی۔ ایک مزید بھیانک صورت حال اس کی منتظر تھی۔ راشد کا پیٹ اسے قدرے پھولا ہوا محسوس ہوا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر معائنے کے لیے آئی تو پتا چلا کہ اس کے پیٹ میں پانی پڑنے لگا ہے۔ پہلے وہ اسے گھر بھیجنے کا سوچ رہے

تھے، لیکن اب اس کا ایڈمٹ رہنا پہلے سے زیادہ ضروری ہو گیا تھا۔

"ماں میں ٹھیک ہو جاؤں گا نا۔" راشد نے زرد امید بھری آنکھوں سے دیکھا۔

"ہاں! بالکل تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں نے پیسوں کا انتظام کر لیا ہے۔ ایک مہینہ لگے گا، پھر تم گھر آجاؤ گے۔" رضیہ کے یقین دلانے پر اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک آگئی۔ بیٹے کی زرد رنگت، ویران آنکھوں میں چمکتی امید اور علاج کے لیے پیسوں کی کمی نے اسے رلا دیا۔

قدرت نے اسے عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں نہ آگے جانا ممکن تھا، نہ پیچھے ہٹنا۔ ایک طرف عزت تھی تو دوسری جانب اولاد، کہاں جاتی وہ، سب نے پیسے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ امداد کرتا تو کون؟ ٹائم ختم ہوا تو وہ گھر آگئی۔ رات بھر سو نہ سکی اور صبح کی اذان ہونے لگی۔ تب ہی اس نے عزت کو بیٹے کی جان پر قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

رضیہ نے رفیق مغل کو جو فیصلہ سنایا تھا وہ سن کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ رفیق کی بیوی آج پھر گھر نہیں تھی۔ لاؤنج میں صوفے پر وہ بیٹھا تھا اور رضیہ کی نظریں جھکی تھیں۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم اتنی ظالم نہیں ہو سکتیں کہ اپنے بچے کو موت کے منہ میں جانے دو۔"

"کوئی ماں اپنی اولاد پر ظلم نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ دنیا بہت ظالم ہے۔ نیکی کا بدلہ چاہتی ہے، انسانیت کی توہین کی صورت۔"

"اچھا یہ رکھو دس ہزار روپے، دس ہزار بعد میں دوں گا۔" وہ اس کی بات سن کر کچھ بدمزا ہوا۔

"اور ہاں کل تمہاری بیگم صاحبہ اپنی بہن کے گھر جا رہی ہیں، ذرا نہا دھو کر آنا۔" وہ کانپتے ہاتھوں سے پیسے اٹھا کر چل دی۔

اگلی صبح انتہائی غیر متوقع تھی۔ رفیق مغل کی بیوی کو گھر کے دوسرے ملازم سے ساری صورت حال کا علم ہو گیا اور وہ لاؤنج میں کھڑی رفیق مغل کو بے نقط سنا رہی تھی۔ رضیہ داخل ہوئی تو شور نے اسے کچھ بے چین کر دیا۔ بیگم صاحبہ کی غصے سے بھری آواز باہر تک آرہی تھی۔

"بیگم صاحبہ تمہیں اندر بلا رہی ہیں۔" دوسرے ملازم نے آکر بتایا۔ وہ کانپتے کانپتے لاؤنج میں آئی تو رفیق کو بھیگی بلی بنے دیکھا۔ اس کی بیوی کے چہرے سے اشتعال کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

"آگئی کمینی۔ دکھا دیے اپنے نیچ لوگوں والے کرتوت۔ تم گھٹیا ذات کے لوگ ہوتے ہی ایسے ہو۔ بدذات حرام زادی۔" رضیہ نے اپنا چہرہ تپتا محسوس کیا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"ڈرامے کرتی ہے۔ بند کر اپنا رونا اور دفع ہو جا یہاں سے۔" رضیہ تو پتھر کی ہو چکی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور رضیہ کے منہ پر زور کے طمانچے رسید کرنے لگی۔ تھپڑوں سے جی نہ بھرا تو دھکا دے کر اسے گرا دیا اور لاتوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ رفیق پہلے والی پوزیشن میں بیٹھا تھا اس نے اپنی بیوی کو روکنے کی بھی کوشش نہ کی۔ رضیہ چپ چاپ مار کھا رہی تھی۔ اس نے مزاحمت تک نہ کی۔

بالآخر رفیق کی بیوی نے ہتھیار ڈال دیے اور گالیاں دیتے دیتے کمرے میں چلی گئی۔

رضیہ نے اپنے ٹوٹے بکھرے بدن کو سمیٹا اور لڑکھڑاتے قدموں سے گھر چلی آئی۔ بچوں نے اس کا سوجا منہ پھٹا ہونٹ اور اس سے بہتا خون دیکھا تو رونے لگے ان کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی رونے لگی۔

اس رات وہ راشد سے ملنے نہ جا سکی۔ اس سے اگلے روز گئی تو وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔

"آپ کیسی ماں ہیں آپ کا بیٹا مر رہا ہے اور آپ کو کوئی پروا نہیں۔" ڈاکٹر راؤنڈ لگانے آئی تو اس سے کہنے لگی۔

"کل تک اگر پیسوں کا بندوبست نہ کیا تو یہ مر جائے گا۔" اس کے لہجے میں سفاکی تھی۔



☼ ☼ ☼

رضیہ کے لیے آخری امید محلے میں موجود شیخ صاحب کا گھرانا تھا۔ جو بڑا ہی سخی اور دیالو تھا۔ بیٹے کی جان بچانے کے لیے اس نے ان سے پیسے مانگنے کا سوچ لیا۔

وہ ان کے گھر داخل ہوئی تو تمام اہل خانہ ٹیبل کے گرد کھانا کھانے کے لیے جمع تھے۔ وہ ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد چھوٹا بیٹا باہر نکلا۔

"ہاں بولو کیا کام ہے؟" اس نے رضیہ سے پوچھا۔ پیچھے سے شیخ صاحب بھی برآمدے میں نکل آئے۔

"شیخ صاحب میرے بچے بھوکے ہیں ایک بیٹا بیمار ہے۔ لیکن گھر میں کچھ بھی نہیں۔ خدا کے لیے ہماری امداد کریں۔ ورنہ ہم بھوکے مر جائیں گے۔" رضیہ یہ کہتے ہوئے رو پڑی۔ گھر کے حالات بھی تو انتہائی خراب ہو چکے تھے بچے بھوک سے بلک رہے تھے راشد کا علاج بھی تو ختم ہو گیا تھا۔ اس کے لیے بھی پیسوں کی ضرورت تھی۔

"ایک تو جو بھی محلے میں بھوکا ننگا ہوتا ہے وہ آپ کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ پچھلے مہینے وہ راجو آپ سے پندرہ ہزار ادھار لے کر گیا تھا دو دن میں لوٹانے کا وعدہ کیا اور پینتیس دن گزر گئے ہیں اس نے شکل نہیں دکھائی۔"

"ہاں! ہاں صحیح کہہ رہا ہے تو میں نے کون سے خزانے چھپائے ہوئے ہیں جو ان بھوکوں ننگوں میں بانٹ دوں۔"

"تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ تھوڑا دینے میں آپ کے رزق میں کوئی کمی تھوڑی آجائے گی۔" اس کی آنکھیں پھر سے برسنے لگیں۔

"اوہ جا مائی! تنگ نہ کر۔" شیخ صاحب نے رضیہ کے ہاتھ کو پکڑ کر باہر دھکیلا۔ رضیہ حق دق سی رہ گئی۔

"اللہ کا خوف کرو۔ خود دسترخوان بھر کر کھا رہے ہو اور پڑوسی تین دن سے فاقے کر رہے ہیں۔ ڈرو اللہ سے کہیں وہ تمہیں اپنی پکڑ میں نہ لے لے۔"

"دھمکیاں دیتی ہے۔ چل دفع ہو۔ یہاں سے نکل فوراً۔" شیخ صاحب کے بیٹے نے اسے دھکا دیا وہ منہ کے بل پکے فرش پر جا گری اور دن میں تارے نظر آگئے۔ بڑی مشکل سے اٹھی۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا اسے صاف کیا اور گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کچھ دور جا کر مڑ کے ایک دکھ بھری نگاہ ڈالی اور سیدھا چلنے لگی۔

دل میں طوفان تھا۔ اور دماغ جل رہا تھا، سراج کے مرنے کے بعد سے اسے جن جن حالات سے گزرنا پڑا تھا وہ سارے نگاہوں میں گھومنے لگے۔ بچوں کے معصوم چہرے۔ جو فاقہ کرنے پر مجبور تھے اور راشد کا چہرہ جو بیماری سے لڑتے لڑتے تھک سا گیا تھا، اس کا جسم کمزور اور ہڈیوں کا ڈھانچہ محسوس ہوتا تھا۔

گھر پہنچی تو ایک قیامت کی خبر اس کی منتظر تھی۔ راشد مر چکا تھا۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے گرم گرم سلاخ اس کے دل میں گھونپ دی ہو۔ وہ درد سے چلانے لگی۔ بین کرنے لگی۔ اس کا جگر گوشہ اس سے چھن گیا تھا، اس کی روح خالی ہو گئی تھی۔ دروازے پہ کھڑی ایمبولینس کا منحوس سائرن شور مچا رہا تھا، راشد کو نکال کر صحن میں لا کر چارپائی پر ڈال دیا گیا۔ اس کی روح قفس عنصری سے دو گھنٹے پہلے پرواز کر گئی تھی۔

"میرا راشد۔" وہ کہہ کر میت سے لپٹ گئی اور اس کا منہ چومنے لگی۔ آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت جاری تھے۔ اچانک وہ نیچے گری اور بے ہوش ہو گئی۔ اور ہوش میں آئی تو بھی خرد سے بے گانہ تھی۔

"رضیہ تے سکتہ ہو گیا ہے۔ نہ کچھ بلودی اے نہ کہندی اے۔"

"روندی وی نہیں۔" ایک عورت دوسری کے کان میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔

اور پھر قل، ساتواں سب کچھ ہو گیا۔ اس کا لخت جگر افلاس کے ہاتھوں مر کر مٹی کے ڈھیر تلے جا سویا تھا۔ آٹھویں روز اس نے دل میں فیصلہ کیا اور دونوں

بچوں کو نہلا دھلا کر تیار کر دیا اور لے کر چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

چلتے چلتے وہ لوگ نہر کے کنارے پہنچ گئے۔ رضیہ نے بچوں کو اپنے ساتھ لپٹایا اور پھر نہر میں دھکا دے دیا۔ وہ سیدھے پانی میں جا کر ڈوبنے لگے۔ آنکھوں میں حیرت اور خوف کے وہ تاثرات تھے کہ رضیہ کا دل خون خون ہو گیا۔ ابھی وہ خود جست بھر کر چھلانگ لگانے ہی لگی تھی کہ کسی نے اسے پکڑ لیا۔

اس کی آنکھوں نے جو آخری منظر دیکھا تھا کہ ایک ریلا دونوں بچوں کو بہالے گیا۔ کئی لوگوں نے انہیں بچانے کے لیے چھلانگ لگا دی اس سے زیادہ وہ دیکھ نہ سکی اور بے ہوش ہو گئی۔

پھر سب کچھ نیند میں ہوتا گیا' اسے بارہ سال کی سزا ہو گئی اور وہ جیل میں آگئی۔ ساری داستان کے اختتام میں نرمل اور رضیہ دونوں ہی رو رہے تھے۔ نرمل کو اس پر بے حد ترس آرہا تھا۔ اس کے بعد وہ اکثر اس سے باتیں کر کے دل بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن رضیہ کو چپ لگ گئی تھی وہ اس کی کسی بات کا جواب ہی نہ دیتی۔

پھر ایک دن وہ پاگل ہو گئی۔ سب کو مارنے کو دوڑتی' دورے تو اسے پہلے بھی پڑتے تھے لیکن اب والی کیفیت صاف اس کی دماغی حالت کے بگڑنے کی غماز تھی۔ اسے پاگل خانے بھجوا دیا گیا' ادھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ نرمل کا کیس واپس لے لیا گیا اور وہ بری ہو گئی۔

گھر آئی تو خبر ملی بھائی مر چکا ہے وہ بہت روئی بہت تڑپی۔ بھابھی سر تاپا بدل چکی تھیں۔ انہیں چپ سی لگ گئی تھی۔ چند رشتہ داروں کی کوشش سے اس کی شادی نوید سے ہو گئی۔ چار سالوں میں وہ سب کچھ بھول بھال گئی لیکن اخبار کی اس خبر نے اسے پھر سے سب یاد دلا دیا تھا۔ نوید گھر لوٹا تو اسے گم سم بیٹھے دیکھا۔

"نرمل۔"

"جی۔" وہ چونک گئی۔

"کن سوچوں میں گم ہو۔ آج کیا پڑھ لیا اخبار میں۔" نوید نے اس کے سامنے اخبار اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر جب خبر پر نظر پڑی تو تاسف سے ٹھنڈی آہ بھری۔

"اچھا آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" وہ چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی۔ کچن میں آکر بھی اس کا ذہن انہی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

آخر لوگ ایسے بے بس ہو کر خودکشی کرنے والوں کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ ایسے کیا حالات درپیش ہوتے ہیں کہ والدین بچوں کو مار کر خود بھی مر جاتے ہیں؟ اور ہم سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی بے حسی کی چادر اوڑھے رہتے ہیں؟ جس ملک کا حکمران روز ڈیڑھ لاکھ کا صرف سوٹ زیب تن کرتا ہو اس ملک کی عوام اور کیا کرے گی خودکشی کے سوا؟

پھر اسے ایک مشہور کالم نگار کے الفاظ یاد آگئے۔ جو اس نے پاکستان کے حکمرانوں کے بارے کہے تھے۔

"جس شخص نے چالیس برس تک جیب سے پیٹرول نہ ڈلوایا ہو۔ جس کے جوتے بیٹ مین پالش کرتے ہیں اور جس کی گاڑی کا اے سی ان کی تشریف آوری سے ایک گھنٹہ پہلے آن کر دیا جاتا ہو۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کا ادراک کیسے کرے گا۔ اسے کیسے معلوم ہو گا کہ درد کیا ہوتا ہے۔ وہ اس باپ کا دکھ کیسے جانے گا۔ جس کا بیٹا روزانہ ڈگریاں اٹھا کر گھر سے نکلتا ہے۔ اور شام کو ناکام واپس لوٹ آتا ہے۔ اسے کیا معلوم جینز کیا ہوتا ہے اور ڈسپرین کی ایک گولی اور اینٹی بائیوٹک کی ایک گولی کے لیے زندگی کے کس کس تنور سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ناواقف لوگ ہیں جنہوں نے زندگی میں کبھی آٹا ہی نہیں خریدا چنانچہ یہ لوگ بھوک کے احساس سے بے بہرہ ہیں۔"

"کیا اللہ ہم سے ناراض ہے جو ایسے حکمران ہم پر مسلط کر دیے گئے ہیں۔ اے پروردگار! ہم پر رحم کر اور بے شک رحم کرنا تیری صفت ہے۔" نرمل نے کھڑکی سے باہر نظر آنے والے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے لب دعا گو تھے۔

☼

فرخ فاطمہ

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے!

"مومنو! لے پالکوں کو ان کے (اصل) باپوں کے (نام) سے پکارا کرو کہ خدا کے نزدیک یہی درست بات ہے۔"

(الاحزاب' آیت 5)

امتیاز فاروقی کی نظریں سامنے کیلنڈر پر درج آیت مبارکہ پر جمی تھیں اور ذہن مسلسل جھٹکوں کی زد میں تھا۔ برسوں قبل جس بات کو انہوں نے معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا' آج وہ اپنی تمام تر سفاکی اور ہولناکی سمیت ان کے سامنے تھی۔ وہ اس آیت سے نظریں ہٹا کر ثمر کو دیکھنا چاہتے تھے جو بے چینی سے ان کے جواب کا منتظر تھا لیکن جسم کی پوری طاقت اپنی آنکھوں میں صرف کر کے بھی وہ ایسا نہ کر سکے۔ ان کی روح جسم کا ساتھ دینے سے قاصر تھی اور جب کتاب اللہ کے کسی حکم کو نہ ماننے کی وجہ سے روح جسم سے ناراض ہو جائے تو جسم مٹی کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں رہتا' امتیاز فاروقی اس وقت خود کو مٹی کا ڈھیر سمجھ رہے تھے۔ کوئی جواب نہ ملنے پر ثمر اٹھ کر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"کل میں نے ڈیڈی سے بات کی تھی' مجھے امید ہے وہ کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔" ثمر کی آواز میں نرم گرم جذبوں کی آمیزش تھی جبکہ آنکھوں میں آنے والے خوبصورت وقت کا انتظار تھا۔

"اعتراض نہیں کریں گے' مطلب کل انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا؟" ساریہ کی سریلی آواز اور عادتاً" بات کرتے ہوئے بھنووں کو جنبش دینا' آج ثمر کو ہمیشہ سے بڑھ کر خوبصورت لگ رہے تھے۔ اس کے معصوم سے چہرے پر ملاحت کے ساتھ ساتھ اشتیاق بھی پھیلا ہوا تھا۔

"کل جب میں بات کر رہا تھا تو ڈیڈی بیٹھے بیٹھے کھو سے گئے تھے۔ تم جانتی تو ہو ڈیڈی کی عادت کو اور یہ بھی جانتی ہو کہ جب ڈیڈی کہیں کھو جائیں تو میں ان کو ڈسٹرب نہیں کرتا۔" لاپرواہی سے بولتے ہوئے وہ چہل قدمی کرتے کرتے رک گیا اور اچانک گھوم کر ساریہ کے آگے آگیا۔

"تم جانتی ہو آج تم اور یہ شام ہمیشہ سے زیادہ حسین ہیں۔ یہ خوشبو بکھیرتے گلاب' آسمان پر شفق کے رنگ' یہ آشیانوں کو لوٹتے پرندے' یہ خوبصورت پارک اور تمہارا ساتھ' کیا دنیا میں اس لمحے سے بڑھ کر کچھ حسین ہو سکتا ہے؟" کھوئے کھوئے سے لہجے میں محسوس کیے جانے والا جذب تھا۔

"ہاں ہے۔" ساریہ کی سرگوشی میں چہکار تھی۔

"اس دنیا میں آپ کی محبت ان حسین لمحات سے بھی زیادہ خوبصورت ہے میرے لیے۔" عقیدت و محبت سے گندھا لہجہ ثمر کے دل پر نقش ہو گیا۔

"بس تو پھر اسی محبت میں ہمیشہ کے لیے جکڑے جانے کے لیے آپ تیار رہیں' عنقریب ہی میری ممی اور ڈیڈی آپ کے ہاں آئیں گے۔" شرارتی لہجہ ساریہ کی سماعت میں رس گھول گیا۔ بے اختیار ہی شرم اس پر حاوی ہو گئی اور وہ بوکھلا کر دوپٹہ سر پر درست کرنے لگی۔ ثمر اس کے سرخ چہرے کو محظوظ ہوتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"کل تم نے بھی تو اپنی مما سے بات کرنی تھی نا؟" کچھ یاد آنے پر وہ چونکا۔

"ہاں ابھی میں نے مما کو بتایا ہی تھا کہ مہمان آگئیں۔ مما کا جواب جاننے کا موقع ہی نہیں ملا۔" ساریہ کے لہجے میں افسوس تھا۔

☼ ☼ ☼

"اماں جان' یہ مصباح ہے آپ کی بہو۔" اس نے لاپرواہی سے یوں تعارف کروایا جیسا بہو کے نہیں کام والی ماسی کے متعلق بتا رہا ہو۔

"السلام علیکم اماں جان۔" مصباح نے احترام سے سلام کیا۔

"کیا کہہ رہا ہے تو تنو؟ تو نے اس سے شادی کر لی ہے؟" اماں جان کا لہجہ معمول سے بڑھ کر غصیلا تھا۔ حیرت کے جھٹکے سے نکلنے کے بعد وہ بولیں۔

"تو کیا کرتا؟ آپ نے تو اس کے گھر رشتہ لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔" آج وہ بھی اماں جان کے لہجے سے خائف نہ ہوئے تھے۔

"کون سے گھر رشتہ لے کر جاتی میں' خود تو نے بتایا تھا کہ لڑکی کے ماں باپ ہیں نہ بہن بھائی' رشتے کی خالہ کے گھر رہتی ہے' چھڑی چھانٹ سے شادی کیسے کر لی تو نے؟ جانے کیا حسب نسب اس کا۔"

"اماں جان حسب نسب جان کر ہم نے کیا ... ہے۔ مصباح مسلمان ہے یہی کافی ہے میرے لیے۔" تنو کا لہجہ مضبوط تھا۔

"تیرے لیے کافی ہو گا میرے لیے کافی نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے' ملک جلال مرحوم کی بہو اور ایک بے نام و نشان لڑکی۔ اگر تو نے اس گھر میں رہنا ہے تو واپس شہر میں چھوڑ کے آ' ورنہ اس گھر کے دروازے تم پر بند ہیں۔" اماں جان یہ کہہ کر رکی نہیں' سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ... کی خادمہ رکھی بھی تھی جو ہر وقت ان کے ساتھ ...



... تھی۔

... مصباح چلیں' شاید اماں جان کو میری ... نہیں ہے۔ ان کی نسل بڑھانے اور ان کی ... کا حساب رکھنے کے لیے ان کے دیگر دو بیٹے ... ہیں۔" انہوں نے مصباح کا ہاتھ پکڑا اور حویلی کے ... گیٹ کی طرف بڑھے۔

"لیکن امتیاز ہمیں اماں جان سے بات کرنی ... شاید ہم ان سے معافی مانگیں تو وہ موم ... ہیں۔" مصباح اپنی سلجھی ہوئی معاملہ فہم فطرت ... مطابق گویا ہوئی۔

"نہیں مصباح! وہ میری ماں ہیں میں ان کو جانتا ... جو بات وہ ایک دفعہ کہہ دیں مرتے دم تک اس ... نہیں ہٹتیں۔" امتیاز کا لہجہ سخت تھا۔

☼ ☼ ☼

پھر انہوں نے کراچی — آکر نئی زندگی کا آغاز ... امتیاز فارن کوالیفائیڈ تھے۔ انہیں بغیر کسی ... کے شاندار جاب مل گئی۔ زندگی ان دنوں ... خوبصورت ہو گئی تھی۔ امتیاز اور مصباح ایک ... کی رفاقت میں بے انتہا خوش تھے۔ دن تیزی ... گزرتے چلے گئے۔ ان کی شادی کو دس سال گزر ... لیکن گھر کا آنگن ہنوز سونا تھا۔ مصباح کے زور ... انہوں نے ایک ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا اور ... حقیقت نے ان کی زندگی کی خوبصورتی کو نگل ... مصباح ماں نہیں بن سکتی تھی۔ جس شام امتیاز ... نے یہ بات مصباح کو بتائی' وہ تڑپ تڑپ کر رو ... گئی۔

"... کوئی بات نہیں مصباح! بہت سے لوگوں کو اللہ ... محروم رکھتا ہے۔ اس میں بھی کوئی مصلحت ... اچھا تم روؤ نہیں پلیز۔" وہ اس کو بہلا رہا تھا۔ ... بجیلا اور شفیق ملازم کے ہمراہ لاؤنج میں ... مگر اندر کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ مصباح ... رو رہی تھی۔ ملازم ان کو ڈرائنگ روم میں ... کی بجائے ہمیشہ کی طرح لاؤنج میں ہی لے آیا

تھا۔ بجیلا تیزی سے آگے بڑھی۔

"کیا ہوا مصباح؟ تم کیوں رو رہی ہو؟ بھائی جان بتائیے نا کیا ہوا ہے؟" مصباح کی طرف سے جواب نہ ملنے پر وہ امتیاز کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بتاؤ نا امتیاز کیا بات ہے؟ بھابھی کیوں ایسے رو رہی ہیں؟" شفیق نے بھی تشویش سے پوچھا۔ امتیاز بھلا اپنے اتنے مخلص دوست اور بہنوں جیسی اس کی بیوی سے کب تک چھپاتے۔ انہوں نے ہی تو ان کو سیٹل ہونے میں مدد دی تھی۔ جب بھی زندگی نامہرباں ہوئی تو وہ ان کے لیے گھنا سایہ ثابت ہوئے۔ دھیرے دھیرے امتیاز نے دونوں کو ساری بات بتادی۔

"اوہ۔۔۔" دونوں کے چہرے پر گہرے دکھ کے آثار چھا گئے۔

"امتیاز' تم جانتے ہو ہمارے ہاں اللہ کی رحمت دوسری بار آنے والی ہے۔" کچھ دیر خاموشی کے بعد شفیق بولے۔

"میں وعدہ کرتا ہوں بیٹا ہوا یا بیٹی' وہ تمہارا ہوگا کیوں بجیلا؟" انہوں نے بجیلا سے تائید چاہی۔

"بالکل' کیوں نہیں' اللہ نے ہمیں ایک بیٹا پہلے بھی دیا ہے۔ اور اللہ اور بھی دے گا۔ یہ بچہ آپ کا ہوا۔" بجیلا تو میاں سے بھی بڑھ کر نرم دل تھی۔ دوسرا وہ مصباح کو بالکل اپنی بہن کی طرح مانتی تھی اور امتیاز کا احترام بڑے بھائی جیسا کرتی تھی۔ اور اتنا تو وہ دونوں جانتے تھے کہ چاہے جو کچھ بھی ہو جاتا امتیاز' مصباح کو چھوڑنے اور دوسری شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

"چلو اب رونا بند کرو۔" بجیلا نرمی سے مصباح سے مخاطب ہوئی۔ امتیاز بے اختیار شفیق سے لپٹ گیا۔

سات ماہ بعد ان کے ہاں ثمر خوشیوں کا پیامبر بن کر آگیا۔ شفیق کے کہنے کے مطابق انہوں نے ایسا انتظام کیا کہ ان چاروں کے سوا کوئی نہ جانتا تھا کہ بچہ درحقیقت کس کا ہے۔ سب ہی سمجھتے تھے کہ اس بچے کو مصباح نے جنم دیا ہے۔ ولدیت کے خانے میں

امتیاز فاروقی کا نام درج تھا۔ بقول شفیق۔

"نوے فیصد کیسز میں اس طرح ہوتا ہے کہ جب لے پالک بچوں کو پتا چلتا ہے کہ وہ درحقیقت کسی اور کی اولاد ہیں تو وہ اپنے حقیقی ماں، باپ کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔" امتیاز اپنے دوست کے احسانوں کے بوجھ تلے دبتے جا رہے تھے۔ ثمر کی پیدائش کے دو سال بعد خدا نے شفیق اور بجیلا کو دو جڑواں بیٹا، بیٹی دیے۔ شفیق نے تنہائی میں برملا امتیاز فاروقی سے کہا۔

"یار مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہارے کام آیا ہوں، اسی لیے اللہ نے مجھے بیٹی دے کر میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کردی ہے۔" امتیاز مسکرا کر رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم ڈیڈی۔" امتیاز فاروقی کو لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر ثمر چینل سرچنگ کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"وعلیکم السلام بیٹا جی۔ کب آئے آپ حویلی سے؟" شگفتہ انداز میں جواب دے کر انہوں نے پوچھا۔

"بس ابھی دو، تین گھنٹے ہوئے ہیں ڈیڈی۔"

"حویلی میں سب ٹھیک ٹھاک تھے نا؟ آپ کی دادی اماں اور دونوں تایا؟"

"جی ڈیڈی سب فٹ فاٹ تھے۔" وہ اپنے مخصوص شرارتی انداز میں گویا ہوا۔

"اپنی مما کو بتایا اپنے آنے کے متعلق؟ ورنہ وہ شکوہ کریں گی۔" مصباح بیگم ثمر کے متعلق بہت حساس تھیں۔ اس وقت وہ ڈنر پر انوائیٹڈ تھیں۔

"جی ڈیڈی، آتے ہی یہی کام کیا تھا۔"

امتیاز فاروقی پر حویلی کے بند دروازے اس دن سے لے کر آج تک نہ کھلے تھے۔ لیکن ثمر فاروقی کے لیے یہ دروازے ہمیشہ وا رہتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ امتیاز فاروقی کے ایک بھائی تو دو شادیاں کرنے کے باوجود ہنوز اولاد سے محروم تھے اور دوسرے بھائی کی تین بیٹیاں تھیں، سو اماں جان اپنے اکلوتے پوتے سے بے انتہا محبت رکھتی تھیں اور جب ان کو ثمر کی پیدائش کی اطلاع ملی تھی تو انہوں نے حویلی میں سات دن چراغاں کیا تھا۔

"وہ ڈیڈی، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔" ثمر ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے سیریس ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہاں ہاں بولو بیٹا میں سن رہا ہوں۔" امتیاز فاروقی نرم خو لہجے میں بولے۔

"وہ ڈیڈی بات دراصل یہ ہے کہ... میں... مجھے...." ثمر جھجک گیا۔

"ارے بولو بھی بیٹا جان۔" امتیاز فاروقی نے سامنے لگے کیلنڈر سے نظریں ہٹا کر ثمر کو دیکھا۔

"کہیں کسی لڑکی وڑکی کا چکر تو نہیں ہے۔؟" بیٹے کو کمپنی دیتے وقت وہ ایسے ہی شوخ ہو جاتے تھے۔

"ہاں ڈیڈی۔" ثمر کچھ حوصلہ پا کر بولا۔

"پھر جلدی بتاؤ نا کون ہے وہ خوش نصیب؟ ہمیں بھی اب پوتوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔" وہ مزید شوخ ہوئے۔

"ڈیڈی، وہ... آپ اسے جانتے ہیں بلکہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ شفیق انکل کی بیٹی ساریہ۔"

"کیا؟" ان پر تو گویا ساتوں آسمان ٹوٹ پڑے تھے۔ عین اسی وقت ان کی نظریں سامنے لگے کیلنڈر کی طرف اٹھیں اور پھر وہیں جم گئیں۔

دوسری طرف ثمر ان کو گم صم پا کر اٹھ کر چلا گیا۔ جانتا تھا کہ ڈیڈی اپنے بھائیوں، اپنی اماں جان اور اپنے گاؤں سے بے حد پیار کرتے ہیں اور کبھی کبھار اچانک بیٹھے بٹھائے ماضی میں کھو جاتے ہیں۔ سو ایسے وقت ان کو ڈسٹرب نہیں کرتا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس سمیت اس کے ڈیڈی، ساریہ، شفیق اجمل اور بجیلا آنٹی پچھتاوے کی ایسی دلدل میں کھو جائیں گے کہ ان کو باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا۔ آج ہی تو ساریہ نے بھی اپنے مما پاپا سے بات کرنی تھی۔

"تم یہاں کیسے آئیں۔؟" حریم نے کوئی تیسری بار اس سے پوچھا تھا۔ ہر بار کی طرح اب بھی وہ گونگی بنی دیکھ کر رہ گئی۔

"جب تک تم مجھے بتاؤ گی نہیں میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گی۔" حریم اس کی مسلسل خاموشی سے اکتانے لگی تھی۔ اب کی بار بھی اس نے صرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔

"کیا تم نہیں چاہتیں کہ تم اپنے گھر جاؤ، تمہیں انصاف ملے، اپنے بہن بھائیوں سے ملو۔" حریم نے اسے جذباتی کرنے کی کوشش کی۔ اس جذباتی پن سے بھی اس کے رویے میں رتی بھر فرق نہیں آیا تھا۔ بلکہ چہرے پر سختی اور اذیت پہلے سے زیادہ بھر گئی۔ حریم کا دل چاہا کہ اس پتھر کے بت کو دیوار پر دے مارے۔ روز کی طرح آج بھی وہ مایوس اٹھی تھی۔ اسے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا لیکن ایک فیصد بھی کامیابی اسے اس لڑکی کی جانب سے نہیں ملی۔

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ کچھ بتائے گی۔ اب تو اس کی خاموشی اور یہ پتھریلے پن پر مجھے غصہ آنے لگا ہے۔" حریم، سعد کے سامنے بیٹھی اسے اپنی آج کی ناکامی سے آگاہ کر رہی تھی۔

"تم کوشش جاری رکھو۔" جواباً سعد اطمینان سے بولا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے، مجھے لگتا ہے کہ میں پاگل ہوں اور بت سے باتیں کر رہی ہوں، تم خود یہ کیس

شمسہ فیصل

ہینڈل کرو۔" وہ جل کر بولی۔ سعد کو ہنسی آگئی۔

"تمہاری تو وہ پھر سن لیتی ہے۔ مجھے دیکھ کر ہی وہ پھر جائے گی بالکل دریائے سندھ کی طرح' آخر سندھ کی بیٹی جو ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے؟" حریم نے ناراضی کا اظہار کیا۔

"میری مجال... بہر حال ابھی تم اس فائل کو دیکھو' کہیں نا کہیں تو کوئی ایسا پوائنٹ ملے گا جو اسے بولنے پر اکسائے۔" حریم نے بددلی سے فائل پکڑی اور اسے دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"حبہ! دیکھو تو تم سے ملنے کون آیا ہے؟" حریم پورے تین دن بعد آج پھر اس کے سامنے موجود تھی۔ آج اسے یقین تھا کہ اس پتھر میں وہ شگاف ڈالنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی۔ حبہ نے بنا کسی تجسس کے اس کی جانب دیکھا' دوسرے ہی لمحے وہ سرسری اٹھی نگاہیں جھکنا بھول گئی تھیں۔

"زنیرہ..." اس کے ہونٹ نیم وا ہوئے۔ وہ ٹکٹکی باندھے آنے والی کو دیکھ رہی تھی۔

"جانتی ہو اسے..." حریم نے اس کی محویت کو توڑا۔ حبہ نے اس کی جانب دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ حریم کے اندر تک اطمینان اترا تھا۔ دو ہفتوں میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ حبہ نے اس کی کسی بات کا جواب دیا ہو۔

"تم سے پورے دس سال چھوٹی ہے یہ... لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہاری خاموشی اسے تمہارے مقام پر لا رہی ہے۔" حریم نے اس کے جذبات میں سیندھ لگائی۔ حبہ نے تڑپ کے حریم کو دیکھا اور بے اختیار سامنے بیٹھی سانولی سی بچی کو اپنے حصار میں لے لیا۔

"میری زنیرہ کو کچھ نہیں ہوگا میں اپنی زنیرہ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔" وہ چلاتے ہوئے زنیرہ کو اپنے حصار میں مضبوط کرنے لگی۔

"ناٹک مت کرو' تم اپنی بہن کی دشمن ہو' تمہاری خاموشی اسے چارہ بننے پر مجبور کر رہی ہے۔" حریم زنیرہ کو اس سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ حبہ نے بے ساختہ اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں انجانا خوف ہلکورے لینے لگا۔ وہ حریم کے کہے بنا بھی جان سکتی تھی کہ زنیرہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس کا دل پسلیوں کے درمیان مچلا گیا۔

"میری زنیرہ کو بچالیں باجی۔" وہ بے بسی اور منت سے کہتے ہوئے حریم کے پیروں میں بیٹھتی چلی گئی۔ زنیرہ خوفزدہ ہو کے حبہ سے لپٹ گئی۔

"کیسے بچاؤں میں تمہاری زنیرہ کو... تم میرے ساتھ تعاون کرنے کو تیار نہیں۔" حریم جان بوجھ کر لہجے میں لاپروائی سموتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹی۔ حبہ نے روتے ہوئے اس کے پیر پکڑے تھے۔ حریم سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پتھر کا یہ بت یوں پاش پاش ہو کے بکھرے گا۔ وہ بنا کچھ کہے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اسے حبہ پر ترس آنے لگا۔

"علی داد بخش کون تھا...؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سوال کی جانب آئی حبہ کے اندر باہر جیسے زہر بھر گیا تھا۔

"علی داد کون تھا؟" حریم نے اپنا سوال دہراتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے مجھے خریدا تھا۔" حبہ کی پرنم آنکھوں میں نفرت بھری تھی اس نے کچھ لمحوں بعد جواب دیا۔

"تو پھر یہ کیا ہے...؟" حریم نے فائل میں سے نکاح نامہ نکال کے اس کی جانب بڑھایا۔ اک تکلیف کا سایہ حبہ کے چہرے پر آ کے ٹھہر گیا۔

"کیا آپ نے اس میں درج کوائف نہیں پڑھے۔" اس کی رگ رگ میں اذیت تھی۔

"لیکن اسلام میں یہ سب جائز ہے۔" حریم اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے مطلب کا اسلام مت پڑھائیں باجی جی۔ نکاح اور ونی میں فرق ہوتا ہے۔" وہ تمسخر سے بولی۔



اس کے جواب پر اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تم نے اپنے شوہر کو قتل کیوں کیا؟" حریم اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔ حبہ نے وحشت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا نکاح نامہ پرزے پرزے کر دیا۔

"تمہاری یہ جذباتیت کورٹ میں کام نہیں آئے گی۔ تمہیں پھانسی لگوا دے گی اور زنیرہ کو خون بہا کے طور پر جانا پڑے گا۔" حریم سختی سے بولی حبہ کی جذباتیت جھاگ کی طرح بیٹھی تھی۔

"بولو حبہ! تم نے داد بخش کو بنا کسی رنجش کے قتل کیوں کیا...؟" وہ درشتی سے بولی۔

"نہیں تھا وہ میرا شوہر' سودا ہوا تھا میرا' مجھے ونی کیا گیا تھا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ حریم سن سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے بعد حبہ نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ حریم خود ہی بولتے بولتے اکتا گئی پھر زنیرہ کو لیے واپس چلی گئی۔

"اب یہاں مت آئیے گا۔" اس نے اپنے پیچھے [illegible] کو کہتے سنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے یقین نہیں ہوتا سعد کہ سترہ سال کی لڑکی کو [illegible] سال کے ساتھ شخص ونی کیا گیا۔ کس قدر ظلم ہے وہ بھی آج کے ترقی یافتہ دور میں۔" حریم جب سے آئی تھی ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔

"دنیا میں ترقی ہوئی ہے' سوچوں اور رواجوں میں [illegible] نہیں آئی۔" سعد بھی دلبرداشتہ تھا۔

"کب تک عورتیں رسموں' رواجوں اور عزتوں کی سولی چڑھتی رہیں گی۔" حریم کا دکھ کم نہیں ہو رہا تھا۔

"جب تک دنیا فنا نہیں ہو جاتی۔" سعد اطمینان سے بولا۔

"تم مرد کس قدر خود غرض ہوتے ہو۔ خود کو بچانے کے لیے عورت کا سہارا لیتے ہو۔" اس کے اطمینان پر حریم کو پتنگے ہی لگ گئے۔ اس کی بات پر سعد ہنس دیا۔

"مسز میں جانتا ہوں کہ تم ویمن رائٹس کی علمبردار ہو لیکن پلیز اپنے معصوم شوہر پر تو الزام تراشی کی بوچھاڑ نہ کرو۔" سعد مظلومیت سے بولا۔ اس کے انداز پر حریم کی ہنسی آگئی۔

"او کے بتاؤ گے کیا کرنا ہے۔" اس نے بات پلٹی۔

"ہوں۔" سعد کچھ لمحے سوچنے کے بعد اسے ہدایات دینے لگا جسے حریم پوری توجہ سے سننے لگی۔

☼ ☼ ☼

"کیسی ہو حبہ..." تین دن بعد حریم پھر سے حبہ کے سامنے تھی۔ حبہ نے بے چینی سے اسے دیکھا جیسے اسی کے انتظار میں ہو' اس کی متلاشی نگاہیں اس کے ارد گرد سے ہوتی ہوئی اس کے چہرے پر آن کے ٹھہر گئیں۔

"زنیرہ کو تمہارا باپ واپس لے گیا ہے۔ تم چاہتی تھیں نا کہ میں اب تم سے نہ ملوں۔ سو آج آخری بار آئی ہوں یہ بتانے کہ پنچایت نے کیا فیصلہ دیا ہے؟" حریم نے کہتے ہوئے اس کی جانب دیکھا جہاں زردی کھنڈی تھی۔

"کیا فیصلہ دیا ہے...؟" وہ بمشکل بولی۔

"زنیرہ کو ونی کرنے کا..." حریم دل گرفتی سے بولی۔ حبہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے لگا اب اس کا دل کبھی دھڑک نہیں پائے گا۔ رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو گیا۔

"آپ نے وعدہ کیا تھا کہ زنیرہ کو بچالیں گی۔" وہ روتے ہوئے اداس لہجے میں بولی۔

"ہاں لیکن اگر تم میرا ساتھ دیتیں تب..." اس کا لہجہ لاپروا لیکن پراعتماد تھا۔

"میں آپ کا ساتھ دوں گی' آپ جو کہو گی وہی کروں گی۔" حبہ جنونی انداز میں کہتے ہوئے اس کے آگے بیٹھ گئی۔

"تو پھر بولو تم نے اپنے شوہر کو قتل کیوں کیا...؟" حریم نے اپنا سوال دہراتے ہوئے پین پکڑا تھا۔

"سات سال پہلے میرا بھائی جو مجھ سے پانچ سال بڑا ہے اور اکلوتا بھی' اس نے معمولی رنجش پر گوجروں کے بیٹے کا قتل کیا تھا' کچھ دن وہ چھپا رہا۔ لیکن کب تک' ہم غریب تو سدا کے یتیم مسکین ہوتے ہیں جس

کا جیسے دل چاہے ہمیں استعمال کرے۔ گوجروں نے میرے بھائی کو ڈھونڈ نکالا' پنچایت لگی۔ اور انہوں نے خون بہا کے طور پر عورت کو مانگا.... پھر وہی ازلی خود غرضی' عورت تو پیدا ہی قربانی کے لیے ہوئی ہے۔ کبھی باپ کی خاطر تو کبھی بھائیوں کے لیے اور کبھی شوہر بچوں کے لیے۔" وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی حریم دم سادھے اسے سن رہی تھی۔

"میں بھی عورت تھی' اپنے مفاد کے لیے انہوں نے مجھے چارہ بنایا۔ عورت کمزور نہیں ہوتی لیکن جذباتی بلیک میلنگ اور دودھ کا تاوان اسے کمزور بنادیتا ہے۔ میں زبان رکھتی تھی لیکن انہوں نے زبان کاٹ کے مجھے گائے بھینس کی طرح قربان کردیا۔ انہوں نے میرا قتل نہیں کیا تھا بلکہ مجھے اک زندہ لاش میں بدل دیا۔" اس کی ہچکی بندھی تھی۔

"مجھ سترہ سال کی معصوم لڑکی کو.... انسٹھ سال کے مرد کے ساتھ ونی کردیا گیا۔ ادی اسے شرم نہ آئی مجھے اپنی بیوی بناتے ہوئے۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا تو اماں ابا نے مجھے پیٹ ڈالا' مجھے خود غرض اور ڈائن کہا جو اپنے بھائی کی خاطر ذرا سی قربانی نہیں دے رہی' یہ قربانی تو نہیں تھی' یہ تو ظلم تھا۔.. میری کوئی منت' کوئی التجا' کوئی آنسو کام نہ آیا میرے اپنے ہی میرے دشمن ہو گئے تھے تو میں بھلا اپنے لیے کتنا لڑپاتی۔" اس کے آنسو تھم چکے تھے۔

"میرا نکاح کردیا گیا' میرے ابا کو بیٹی کے بدلے بیس ہزار مل رہے تھے پھر وہاں میری کیا وقعت رہ جاتی۔ مہندی کی رات داد بخش نے نئی نویلی دلہن کے چکر میں کچھ زیادہ ہی پی لی۔ سوئے قسمت اپنے نشے میں اس نے چوہدری کی بیٹی سے دست درازی کی کوشش کی.... چوہدری کے بیٹے نے داد بخش کو رنگوں ہاتھوں پکڑلیا۔ بات ہاتھاپائی سے قتل تک چلی گئی۔ داد بخش نے چوہدری کے بیٹے اور دو کمیوں کا قتل کردیا۔ اور خود فرار ہو گیا۔" وہ کہہ کے خاموش ہوئی۔

"پھر کیا ہوا حبہ؟" حریم جو سانس روکے اس کی بات سن رہی تھی اس کی خاموشی پر جی بھر کے بدمزا ہوئی حبہ تمسخرانہ مسکرائی۔

"ہم دو ٹکے کے لوگ تھے' لیکن اب کی بار مخالف میں خان تھے۔ خانوں نے داد بخش کو ڈھونڈ نکالا' بڑے لوگوں کے لیے پنچایتیں نہیں لگتیں' عدالتیں لگتی ہیں.... جرم ثابت تھا' چشم دید گواہ موجود تھے.... عدالت نے اسے پھانسی کی سزا سنائی.... اس رات میں پر سکون نیند سوئی.... میرے اندر جو سکون کا گلستان آباد ہوا اسے اجڑنے میں چند ہفتے لگے.... پتا نہیں ان کے درمیان کیا مذاکرات ہوئے اور صرف تین ماہ اٹھارہ دن' بیالیس گھنٹے بعد وہ رہا ہو کر آگیا۔ میری راتوں کی نیند لٹ گئی... میرا سکون برباد ہو گیا.... میں رخصت ہو گئی بالکل ایسے جیسے چین' سکون رخصت ہوا۔ اس پل مجھے سب سے زیادہ نفرت اپنے ماں جائے اور جنم دینے والوں سے ہوئی۔

میرے دن جس قدر عذاب میں گزرتے راتیں اتنی ہی کرب ناک ہوتیں۔

وہ مجھے پکارتا تو میں اس کا جھریوں بھرا چہرہ دیکھتی رہ جاتی۔" وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں بول رہی تھی۔

"میرے پاس آتا تو مجھے وحشت ہونے لگتی۔ میں نے کئی بار خود کو مارنے کی کوشش کی لیکن حوصلہ نہ کرپائی۔ ہمیشہ یہی سوچتی کہ میرا کیا قصور.... پھر میرا حوصلہ اس کے قتل پر آمادہ ہوا۔ شادی کے دو ماہ بعد میں نے اس کے دودھ میں چوہے مار گولیاں ڈال کے اسے خنجر کے پے درپے وار کے بعد قتل کردیا۔" وہ کہہ کر مطمئن سی خاموش ہو گئی۔ حریم نے اس کی جارحانہ حرکت پر جھرجھری لی۔

"لیکن فائل میں تو ایسا کچھ نہیں لکھا۔" حریم نے خاموشی کو توڑا۔

"میں نے خود تھانے میں اپنا بیان لکھوایا تھا.... لیکن وہی بات ادی کہ غریبوں کا تو خدا بھی نہیں ہوتا۔" مایوسی اس کے لہجے میں ٹوٹ کے بکھری۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس تسلی اور ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں تھا۔

"میں مجرم ہوں۔ لیکن مجھ سے پہلے میرے ماں ... بھائی مجرم ہیں جنہوں نے اپنے مفاد کے لیے ... لڑکی کو ونی کیا۔ اور اب میری نو سالہ زنیرہ کو ونی ... چاہتے ہیں۔ خون بہا لینا گناہ نہیں' لیکن خون ... نام پر عورتوں کو بیچنا گناہ ہے۔ اپنے حق کے لیے ... ہے تو ہاں میں مجرم ہوں' ہاں میں مجرم ہوں۔" ... ہونے لگی۔ حریم نے افسردگی اور دکھ سے اسے ...

... تمہیں انصاف میں دلاؤں گی۔" حریم' حبہ کے ... ساف کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے انصاف نہیں چاہیے۔" وہ قطعیت سے ... حریم نے الجھ کے اسے دیکھا۔

"آپ بس میری زنیرہ کو ونی ہونے سے بچالیں۔" ... بے کی انتہاؤں پر کھڑی تھی۔

"تم فکر مت کرو تمہیں بھی انصاف ملے گا اور زنیرہ ... کو کچھ نہیں ہوگا۔" حریم اسے ساتھ لگاتے ہوئے ... سے بولی حبہ کچھ نہیں بولی۔ بس اسے دیکھتی رہ

✲ ✲ ✲

"سعدی کیس تمہارے سامنے ہے اور پورے ... ماہ بعد ری اوپن ہو رہا ہے۔ میں نے عدالتی نوٹس ... کے گاؤں بھجوا دیا ہے۔ لیکن میں زنیرہ کی طرف ... مطمئن نہیں ہوں۔" اس کے اندر کا خوف ... میں الڈ آیا۔

"فکر مت کرو میں باوردی افراد کے ساتھ جا کے ... چار دن پہلے ہی لے آیا تھا اب وہ حمدئی کے NGO میں ہے' تم اتنی مصروف تھیں کہ بتانے کا ... ملا۔ کیس کی سماعت کب ہے؟"

سعدی اسے بتا کے پوچھنے لگا۔

"... سوں۔" وہ پرسوچ انداز میں بولی۔

"ہوں۔" سعدی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہم کیس جیت جائیں گے۔" وہ اپنے اندر کے ڈر ... طور مار نہیں پا رہی تھی۔

"ان شاء اللہ مجھے تم پر اور تمہاری محنت پر پورا ... ہے۔" وہ محبت سے بولا۔

"مجھے حمدئی کے NGO چھوڑ دو۔" وہ اسے اٹھتا دیکھ کر بولی۔ سعدی نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔

✲ ✲ ✲

فگار پاؤں میرے' اشک نار سا میرے
کبھی تو مل مجھے اے گمشدہ خدا میرے

خدا کبھی گم نہیں ہوتا بس انسان لمحوں کی کمزوری میں آکر خدا سے بچھڑ جاتا ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کو اس نے قسمت پر ڈالا تھا۔ لیکن شاید وہ بھول گئی تھی کہ آج جس مقام پر وہ کھڑی ہے وہاں بھی اسے خدا ہی لے کر آیا ہے۔ حریم نے مقدمہ جیت لیا تھا۔

"اگر آپ نہ ہوتیں تو میں کبھی بھی نہ انصاف پاسکتی اور نہ ہی اپنی زنیرہ کو بچاپاتی۔" وہ اکثر حریم سے کہتی جواباً" حریم ہنس دیتی۔

"یہ میرا فرض تھا۔ ایک شہری ہونے کے ناتے' انسانیت کے ناتے' ظلم کو روکنا میری ذمہ داری تھی۔"

حبہ حیران ہوئی کہ صرف انسانیت کے ناتے بھی خود کی زندگی کو کوئی داؤ پر لگا سکتا ہے۔ اٹھارہ مہینوں کی جہد مسلسل کے بعد حریم نے اسے اس کی ذات کی پہچان اور زنیرہ کو لوٹایا' شاہوں نے بارہا ان کے گھر پر حملہ کیا' انہیں ہراساں کرنے کی کوشش کی' لیکن حریم اپنے مقصد سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو زنیرہ بھی ونی کردی جاتی۔

سچ ہے اللہ نہیں کھوتا' انسان بھٹک جاتا ہے۔ انتظار کی تکلیف اٹھانے کی بجائے قسمت کو برا ہونے کی سند دے کر خود کو اللہ سے دور کرلیتا ہے۔ انسان بھول جاتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو ان کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا اس نے اپنی آزمائش کو نئی لگن اور امید میں ڈھالا تھا۔

"مجھے کبھی نہیں ہارنا' میں کبھی نہیں ہاروں گی' مجھے حریم سعدی جیسا بننا ہے۔" وہ شدت جذبات سے رو دی۔ ایک روشن اور سنہری صبح اس کی منتظر تھی۔

✲ ✲

نایاب جیلانی

آٹھویں قسط ۸

انٹرویو کے آغاز کے ساتھ ہی پروفیشنل قسم کے تین چار سوال کیے گئے تھے۔ تینوں بزرگ حضرات خاصے تجربہ کار معلوم ہوتے تھے۔ اس کی کوالیفکیشن اخبار میں دیے گئے اشتہار سے زیادہ تھی۔ سو ان لوگوں نے خصوصی توجہ سے اسے نوازا۔

"محترمہ! آپ جاسکتی ہیں۔ پندرہ دن تک آپ کو حتمی جواب دیا جائے گا۔"

"تھینک یو سر۔" عفیفا نے رسمی انداز میں مسکرا کر کہا۔ انٹرویو سے پہلے والے انتظار نے اس کا دماغ پلپلا کر دیا تھا۔ چکر کھاتا دماغ اور نیند سے بند ہوتی آنکھیں لیے وہ اس وسیع و عریض عمارت سے باہر آ گئی۔

## مکمل ناول

ٹیکسی کی تلاش میں مزید آدھا گھنٹہ برباد کرنے کے بعد جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو جی بری طرح سے متلا رہا تھا۔ بھوک کے مارے سکڑتی آنتوں میں شاید ہوا بھر گئی تھی۔ نفیسہ بیگم اس کی زرد پڑتی رنگت دیکھ کر خفا ہونے لگیں۔

"کیا ضرورت تھی سڑکوں پر مارا مارا پھرنے کی۔ یہاں بیٹھو، میں تمہارے لیے اسکوائش لاتی ہوں۔" وہ ناراضی سے بولتے ہوئے اسے چارپائی پر بٹھا کر خود کچن میں چلی گئیں۔

"امی! آپ نے انٹرویو کا تو پوچھا نہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دباتے ہوئے زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

"بھاڑ میں جائے انٹرویو۔" وہ اسکوائش کا جگ ا کر باہر نکل آئیں۔

"اپنی رنگت دیکھو، کیسی زرد ہو رہی ہو۔ آج کو تمہیں ڈاکٹر عالیہ کے کلینک لے کر چلوں گی۔ معاملہ کچھ اور ہی دکھتا ہے۔" وہ گویا خود کلامی کے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ عفیفا ان کی بات کا م ہمیشہ کی طرح سمجھ نہیں سکی۔

"میں نہیں جاتی کسی ڈاکٹر واکٹر کے پاس ابھی دوائیوں کی اسمیل آنے لگی ہے۔" فیفا نے چڑھا کر اسکوائش کے دو گلاس چڑھا لیے۔

"کھانا لگاؤں؟" امی پوچھ رہی تھیں۔

"زوروں کی بھوک لگی ہے۔ جلدی سے آیئے۔ آج تو معدہ بھی بد دعائیں دے رہا ہو گا۔ مچل کر بولی۔

"پہلے ہاتھ منہ تو دھو لو۔" انہوں نے کچن کی جاتے ہوئے کہا۔

"ابھی بالکل بھی ہمت نہیں۔" وہ کسلمندی چارپائی پر لیٹ گئی۔

"خود کو تھکانے کی کیا ضرورت ہے بیٹا! میں ہوں۔ گولی مارو نوکری کو۔" وہ تازہ چھلکے اتار تھیں۔ فیفا اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے واش روم کی چلی گئی۔ واپس آئی تو امی کھانا ٹرے میں لگائے پر اس کی منتظر بیٹھی تھیں۔

"کل راحت بھابھی کی طرف چلیں گے۔

دن ہو گئے ہیں۔ موبی سے ملنے کو دل مچل رہا ہے۔ نہ جانے کیوں موبی کو دیکھ کر بھائی صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بھائی صاحب کی آنکھوں کا تارہ تھا غیب اک پل کو بھی نظر سے اوجھل نہیں کرتے تھے۔"

"کبھی کبھی میں ایک بات سوچتی ہوں۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے پرسوچ سے انداز میں بولی۔

"کون سی بات۔" نفیسہ بیگم ساتھ ساتھ سلاد کے لیے کھیرا بھی کاٹ رہی تھیں۔ عفیفا کو سلاد کے بغیر کھانا کھانے کی عادت نہیں تھی۔ وہ سبزی خور تھی۔ کچی، پکی ہر طرح کی سبزیاں شوق سے کھاتی تھی۔

"یہی کہ راحت مامی بہو کے معاملے میں خاصی خوش نصیب ہیں۔ اگر کوئی اور ہوتی تیز مزاج قسم کی خود غرض سی لڑکی تو مامی اور موبی کے لیے مشکلات کا پہاڑ کھڑا ہو جانا تھا۔"

"تو اور کیا۔ موبی مسکین کو نہ جانے وہ برداشت کرتی یا پھر..." انہوں نے گہرا طویل سانس خارج کیا تھا۔

"اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں، اگر زوبی سے ماہیر کی شادی ہو جاتی تو نہ جانے موبی اور مامی کا کیا حشر ہوتا۔ کیسی جنونی سی وہ لڑکی تھی۔ ماہیر کو کہیں کا بھی نہ چھوڑتی۔ اپنے سوا اسے کچھ اور دکھتا ہی کہاں تھا۔ اپنی ذات کے گنبد میں قید، ماہیر عالم کے عشق میں گرفتار۔" فیفا ماضی کے کسی لمحے میں کھو گئی۔

"فیفا!" امی نے اسے ٹھوکا دے کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"جی امی!"

"زوبی کا کچھ پتا ہے۔" بڑے طویل عرصے بعد انہوں نے اس ذکر کو چھیڑا تھا۔ ایسا قصہ جو کسی بوسیدہ کتاب کی طرح اوطاق میں رکھ دیا گیا تھا۔ اور آج اس قصے پر پڑی گرد صاف کرنے کا نہ جانے انہیں کیسے خیال آگیا۔

"مجھے کیا خبر... اس کی شادی ہو چکی ہو گی۔ اب اتنے بے شمار سال بھی تو بیت چکے ہیں۔ مجھے تو صدیوں کا سفر لگتا ہے گویا۔"

"صرف آٹھ نو سال پہلے کی تو بات ہے۔" امی کا حافظہ بھی بلا کا تیز تھا۔ ابھی تک زوبی کو ذہن میں رکھا ہوا تھا۔

"فرض کرو اگر کبھی اس لڑکی کا تم سے ٹاکرا ہو جائے تو پھر؟" امی نے نہ جانے کیوں اس لاحاصل بحث کو چھیڑ لیا۔

"تو کیا... میں نظر چرا کر قریب سے گزر جاؤں گی۔" وہ لاپرواہی سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولی۔

"اور اگر اس نے ماہیر کا پوچھ لیا؟"

"ماہیر کا بھلا کیوں پوچھے گی۔ امی! آپ ان امیر زادیوں کی محبت کو ہرگز نہیں جانتیں۔ دودھ کے ابال جیسی محبت ہوتی ہے ان کی۔ یا پھر پانی کے بلبلے جیسی۔" فیفا نے تنفر سے کہا۔

"ہوں۔" انہوں نے محض ہنکارا بھرا۔

"سہیل کا فون آیا تھا؟" معاً انہیں خیال آیا تو پوچھنے لگیں۔ ان کی تان بھی سہیل کے فون پر ٹوٹتی تھی۔

"نہیں۔" وہ کھانا کھا چکی تھی۔ مگر طبیعت بہتر ہونے کی بجائے بھاری ہو گئی تھی۔ ایک دم ہی اس کا دل پھر سے متلانے لگا۔

"تم کر لیتیں۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح ڈپٹ کر کہا۔

"موبائل تو پاس تھا نا۔"

"رات کو کروں گی بات۔" وہ بے زاری سے بولی۔ یوں لگ رہا تھا گویا کھایا پیا باہر آجائے گا۔ ایک دم اسے حرارت بھی محسوس ہونے لگی

"یاد آیا زمیلہ کا ویزہ لگ گیا ہے۔" اچانک انہیں خیال آیا تو خوشی کے عالم میں بتانے لگیں۔

"واقعی۔" فیفا کو بھی فطری سی مسرت ہوئی۔

"بہت بے تاب ہو رہی تھی وہ نبیل کے پاس جانے کے لیے۔"

"ہر کوئی تمہاری طرح تو نہیں ہوتا۔ اچھا بھلا ویزہ لگ گیا تھا۔ بس ٹکٹ خریدنا تھا۔" امی کو ابھی بھی اسی بات کا قلق تھا کہ وہ سہیل کے پاس جا نہیں سکی۔

"امی! میں نے کب جانے سے انکار کیا ہے۔ وہ تو سہیل نے خود ہی منع کر دیا تھا۔" وہ ٹھنک کر بولی تھی۔

"شاید ابھی تمہارے نصیب میں باہر کا سفر نہیں۔" وہ برتن اٹھا کر کچن میں رکھ آئی تھیں۔ اسی پل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"امی! فون سنیے میں ذرا واش روم میں جا رہی ہوں۔" فیفا کو شدید قسم کی ابکائی آگئی تھی۔ وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بھاگی۔

"دیکھا میں نہ کہتی تھی معاملہ کچھ اور ہے۔" ایک سرخوشی کے عالم میں انہوں نے ریسیو اٹھایا تھا۔ دھیان ان کا فیفا میں ہی اٹکا تھا۔

"علامات تو یہی ہیں۔ تاہم تصدیق بھی ڈاکٹر سے کروا لینی چاہیے۔" وہ گویا خود سے بول رہی تھیں۔ اتفاق سے سہیل کا فون تھا۔ انہیں تو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔

"بڑے اچھے وقت اور نیک ساعت میں فون کیا ہے بیٹے۔" نفیسہ بیگم کے لبوں میں سے گویا پھول جھڑ رہے تھے۔

"میں سمجھا نہیں۔" سہیل واقعی ان کے لہجے میں چھپی بے تحاشا خوشی کی وجہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

"خیر سے خوشخبری ہے۔" وہ اپنے تجربے کے پیش نظر خود سے اندازہ لگا چکی تھیں اور انہیں گویا سو فیصد یقین تھا کہ معاملہ یہی ہے۔

"کیسی خوشخبری؟" سہیل پھر بھی سمجھ نہیں پایا۔ البتہ اس کا ماتھا ضرور ٹھنکا تھا۔

"فیفا کہاں ہے؟" اب وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"واش روم میں ہے۔ بے چاری نے سارا کھایا پیا الٹ دیا ہے۔ الٹیاں کر کر کے ادھ موئی ہو رہی ہے... خیر، تم پریشان مت ہونا۔ شروع کے مہینوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ابھی اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتی ہوں۔ کوئی طاقت کے ٹانک لکھ کر دے گی تو طبیعت دھیرے دھیرے سنبھلتی جائے گی۔" وہ اپنی سادگی میں اور انجان پن میں کیسے کیسے دھماکے کر رہی تھیں۔ اس بات کی انہیں خبر تک نہیں تھی۔ اگر جان جاتیں کہ کچھ دیر بعد حقیقتاً ان کے پیروں کے نیچے سے زمین سرک جائے گی تو وہ کچھ بھی بولنے سے پہلے سوچ تو لیتیں۔

"میں اب بھی آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔" اس کے لہجے میں سناٹوں کی وحشت سرپٹخ رہی تھی۔ اپنے الفاظ کے برعکس وہ نا صرف سمجھ چکا تھا بلکہ دو پل میں ہی اس نے انتہا پر پہنچ کر ایک فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا گویا اس کی ذات کے پرخچے اڑائے جا رہے ہیں۔ بہت دیر تو اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ صدمہ، دکھ تھا، بے یقینی تھی۔ اعتماد، اعتبار ٹوٹا تھا، کیا ہوا تھا؟ کچھ لمحے تو وہ ذلت، رسوائی اور اپنی توہین کے ایک کڑے امتحان سے گزرا تھا۔ اور ٹیلی فون سے ہزاروں میل دور سے آتی آواز نے اس کے وجود کو ڈھانے میں آخری ضرب کا کام کیا تھا۔

"تم باپ بننے والے ہو سہیل۔" نفیسہ بیگم نے خوشی سے لبریز لہجے میں کہا۔ وہ اپنی ہی دھن میں مگن

تھیں۔
"میں باپ نہیں بننے والا۔ یوں کہیں آپ کی بیٹی ماں بننے والی ہے۔ مگر اس سے ایک دفعہ پوچھ ضرور لیجیے کہ یہ بچہ ہے کس کا؟" وہ کسی زخمی شیر کی طرح پھنکارا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔" نفیسہ بیگم کے وجود پر گویا لرزہ طاری ہو گیا۔ ان کے دماغ پر گویا ہتھوڑے کی ضرب لگائی گئی تھی۔ رگوں میں گردش کرتا خون جوش کھانے لگا تھا۔ فشار خون اس حد تک بلند ہو گیا تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا بس دو لمحوں میں ہی وہ زمین بوس ہو جائیں گی۔ مگر ریسیور پر ان کی گرفت ہلکی نہیں پڑی تھی۔ ان کے حلق سے صدمے کی شدت سے پھٹی پھٹی آواز برآمد ہوئی۔

"تمہارے حواس تو قائم ہیں۔ کیسی گندی بات تم نے منہ سے نکالی ہے۔" نفیسہ بیگم کا جی بھی بری طرح سے متلایا۔

"میں نے صرف منہ سے گندی بات نکالی ہے۔ اپنی بیٹی سے پوچھو، جو نہ جانے کس کا گند اٹھائے پھر رہی ہے۔" تحکم و غصے کی شدت سے سہیل ادب و احترام کا دامن ہاتھ سے چھوڑ چکا تھا۔ کسی بھی غیرت مند مرد کے لیے اس کی منکوحہ کا حاملہ ہونا کسی غلیظ گالی سے کم نہیں ہوتا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو سہیل! میری بیٹی پر بہتان لگانے کی ضرورت نہیں۔" وہ گویا حلق کے بل چلا اٹھی تھیں۔ ان جیسی نرم خو، حلیم مزاج، خاتون کا چلانا کسی تعجب سے کم نہیں تھا۔ تبھی تو فیفا ننگے پیر بھاگی تھی۔

"نہ جانے کس کا فون ہے؟" فیفا کا دل بری طرح سے کانپ رہا تھا۔

"آپ کی بیٹی اسی بہتان کے قابل ہے۔ ابھی فون پر بلاؤ اسے میں پوچھتا ہوں کہ میرے ساتھ اس ذلیل اور گھٹیا عورت نے بد دیانتی کیوں کی۔ صرف چند ماہ انتظار کرنے کو کہا تھا۔ مگر یہ انتظار بھی اس فحش عورت سے برداشت نہیں ہو سکا۔ اچھا ہوا جو بات کھل گئی ہے۔ مجھے میرے رب نے محفوظ رکھ لیا۔ میں کسی کے گناہ کے بوجھ اٹھانے سے بچ گیا۔ اپنی بیٹی کو کہہ دیجیے گا۔ میری طرف سے وہ آزاد ہے۔ میں اسے طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں..... میرا آپ کی بیٹی سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ اس پر عدت بھی واجب نہیں آپ کے بھولپن اور سادگی کی وجہ سے مزید وضاحت کر دوں۔ میرا آپ کی بیٹی سے کوئی ازدواجی تعلق نہیں رہا۔" وہ گہرے کاٹ دار طنزیہ لہجے میں دھاڑ رہا تھا۔

"نہیں سہیل! ایسا لفظ منہ سے مت نکالو۔ میری بیٹی کو گالی مت دو۔ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری نظر دھوکا کھا گئی۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔" وہ پچھاڑیں کھا کر زمین پر پورے قد سے ڈھے گئی تھیں۔ ریسیور ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ان کے لبوں پر گویا ایک ہی التجا ٹھہر گئی تھی۔

"ایسا کچھ بھی نہیں..... میری فیفا پاک ہے۔ ہر گناہ سے پاک ہے۔ ہر بہتان سے بری ہے۔"

"امی! ہوش میں آئیں۔ کیا ہوا ہے آپ کو اللہ کا واسطہ ہے خود کو سنبھالیں۔" فیفا تڑپ کر آگے بڑھی تھی۔ ماں کا سر اپنی گود میں رکھ کے ان کے بہتے آنسو اپنے دوپٹے سے صاف کرتی وہ خود بھی پھپک پھپک کر رو دی۔

"مجھے نہیں اب ہوش میں آنا۔ میں نے تجھے برباد کر دیا۔ میری بیٹی مجھے معاف کر دے۔ مجھ سے گناہ سرزد ہو گیا بڑوں کا کہنا ہے بغیر تصدیق کے کوئی بھی بات منہ سے نہ نکالو۔ پہلے سوچو، غور کرو پھر منہ سے بولو پر میں نے کیا غضب ڈھا دیا ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پیٹ رہی تھیں۔ ان کے حواس گم ہو رہے تھے۔

"امی! کچھ بتائیے بھی تو۔ میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ آپ کیوں اس طرح سے روئے جا رہی ہیں۔ فون کس کا تھا؟" فیفا ان کے دونوں ہاتھ بمشکل اپنے ہاتھوں میں دبائے سسک رہی تھی۔

"سہیل کا فون تھا۔ میں پگلی تیری بھاری طبیعت سے کچھ اور سمجھی منہ سے پھوٹ بھی دیا۔ وہ کہتا ہے تیرا اور اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ بچہ اس کا نہیں اس نے تجھے طلاق دے دی۔" وہ اپنا سر دیوار سے پٹخ رہی تھیں۔ پچھتاوا، صدمہ، دکھ، وہ بری طرح سے اعصابی دباؤ کا شکار ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھیں۔ پچھتاوے کے کوڑوں نے انہیں ادھ موا کر دیا تھا۔ صدمے کی تلوار انہیں کاٹ رہی تھی۔ بیٹی کی بربادی کا دکھ ان کی رگوں میں زہر بن کر دوڑ رہا تھا۔ منہ سے نکلی بات اب واپس نہیں آ سکتی تھی۔ سہیل کا اعتبار اب دوبارہ سے قائم نہیں ہو سکتا تھا۔

"کک..... کون سا بچہ؟" عفیفا وحشت زدہ سی رہ گئی۔ دو پل میں سارا قصہ اس کے دماغ میں کسی بھالے کی طرح جا کھبا۔ ماں کی سرخوشی کا راز اس پر کھل گیا تھا۔ اس راز نے جو قیامت برپا کی تھی۔ ماں کی بکھری حالت ـــ دیکھ کر سامنے آ گئی۔

"امی! ہائے امی، یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔" اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے گویا پاگل ہوتی دھڑکنوں کو ڈپٹ کر خاموش کروانا چاہ رہی تھی۔

"میں نے عظیم گناہ کمایا۔ بغیر تصدیق کے کفر بک دیا۔ تیرے پاکدامن کو داغ داغ کر دیا۔ مجھ بدبخت کو پھانسی کی سزا سناؤ۔" وہ اب بھی اپنا سر فرش پر پٹخ رہی تھیں ان کی رک رک کر چلتی سانسوں کا شور بہت ہلکا تھا۔ عفیفا اس صدمے کے اثر سے دو پل میں ہی باہر نکلی۔ ماں کی نازک حالت نے اسے گویا جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

"امی! خود کو سنبھالیں کچھ بھی نہیں ہوا آپ نے کچھ نہیں کیا۔" وہ بھاگ کر کچن میں سے پانی اٹھا لائی۔

"مجھے پانی نہیں چاہیے۔ مجھے زہر چاہیے۔" انہوں نے کانچ کا گلاس دیوار سے دے مارا۔

"امی! میری پیاری امی، ہوش کریں۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا۔ میں کہاں جاؤں گی۔" فیفا پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں خود کو معاف نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں۔" ان کے ماتھے سے اور سر کے پچھلے حصے سے خون کا فوارہ

پھوٹ پڑا۔

"میری ذرا سی نادانی نے تیرے ماتھے پر داغ سجا دیا۔" ان کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ان کے حواس کھو رہے تھے۔ ان کی دھڑکنیں بے حد معدوم ہو رہی تھیں۔

"امی! ہائے میری امی۔" عفیفا کے پیروں تلے سے زمین دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ وہ بدحواس سی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ٹیلی فون کی طرف لپکی۔

"کسے فون کروں؟" اس کا ذہن گویا تھک کر صاف سلیٹ کی مانند ہو گیا۔

"فیفا! مجھے معاف۔" شاید یہ آخری بات تھی جو نفیسہ بیگم کے منہ سے برآمد ہوئی۔ وہ مکمل طور پر ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی تھیں۔ فیفا کے وجود میں گویا بجلی بھر گئی۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں کے ساتھ ماہیر کا نمبر ڈائل کیا تھا اور کچھ ہی دیر بعد وہ لٹی پٹی سی ماں کو ہسپتال لے کر جا رہی تھی۔ ماہیر آدھے گھنٹے سے بھی پہلے آ گیا تھا۔ فیفا کو اجڑی اجڑی حالت میں دیکھ کر اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ تاہم کسی انہونی کا خیال ماہیر کو سخت بے چین کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی۔" حریم کی چیخ نما آواز سن کر راحت بیگم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ ابھی دس منٹ ہوئے تھے انہیں لیٹے ہوئے۔ نہ جانے کب اونگھ سی طاری ہو گئی تھی۔ حریم کی آواز انہیں بہت قریب سے سنائی دی تھی تو وہ دہل کر اٹھ بیٹھیں۔

"کیا ہوا ہے؟"

"امی! نفیسہ پھوپھو۔" حریم کی بھرائی آواز نے ان کا دل مزید دہلا کر رکھ دیا۔

"نفیسہ کو کیا ہوا ہے؟" ان کی نیند حریم کے چہرے کو دیکھ کر ہی بھاگ گئی۔

"نفیسہ پھوپھو کی شریان پھٹ جانے کی وجہ سے ڈیتھ ہو گئی۔"

"ہائے کب؟" راحت بیگم نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ابھی چند روز پہلے تو بالکل صحت مند تھی۔" راحت بیگم کو گویا یقین نہ آیا۔ منہ سے پھٹی پھٹی آواز برآمد ہوئی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے۔" حریم آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" وہ چپل پہنتے ہوئے اٹھ گئیں۔

"ابھی ماہیر کا فون آیا ہے۔" حریم نے لب کچلتے ہوئے بتایا۔

"ہائے' یہ کوئی جانے کی عمر تھی۔" وہ پھکوں پھکوں رونے لگیں۔ حریم کی توقع کے برخلاف انہوں نے کافی صدمہ لیا تھا۔ نند سے لاکھ عداوت سہی مگر ان کی وفات کی خبر نے ان کے دل کو دکھ کے احساس سے بھر دیا۔

"اکٹھے رہتے ہوئے زندگی بیت گئی تھی مگر آج تک نفیسہ نے میرے ساتھ بدکلامی نہیں کی۔" نفیسہ پھوپھو کی ان خوبیوں کو تو وہ ان کی زندگی میں بھی سراہتی تھیں۔

"امی! ایک اور افسوس ناک خبر بھی ہے۔" حریم کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے ان تکلیف دہ الفاظ کو منہ سے نکالے۔

"ہائے' اب اور کون سی "افسوسناک" خبر سنانی ہے۔" وہ ابھی تک زار زار رو رہی تھیں۔

"فیفا کو طلاق ہو گئی ہے۔" حریم نے لب کچلتے ہوئے بتا ہی دیا۔

"طلاق۔" راحت بیگم کا گویا لمحہ بھر کے لیے سانس رک گیا۔

"تو کیا طلاق کی خبر سن کر نفیسہ یہ صدمہ سہار نہیں سکی۔ ہائے' یہ کیا ظلم ہو گیا ہے۔ اس سہیل بدبخت نے کیوں طلاق دی؟ کچھ خبر ہے تمہیں؟"

"امی! تفصیل کا کچھ پتا نہیں..... ماہیر نے کہا ہے' میں آپ کو لے کر پھوپھو کے گھر آ جاؤں۔" حریم کچن کا سامان تیزی سے سمیٹ رہی تھی۔ اس کے آنسو بھی مسلسل گر رہے تھے۔ نفیسہ پھوپھو جیسی پرخلوص ہستی کے انتقال کا دکھ الگ تھا اور فیفا کے اجڑنے کی خبر نے الگ اسے بے حد رنجیدہ کر دیا تھا۔

"تم ہرگز نہیں جاؤ گی۔" روتے ہوئے انہیں خیال آیا تو فوراً بولیں۔

"مگر امی! ماہیر کہہ رہے ہیں۔ آپ اکیلی کیسے جائیں گی۔" حریم ان کے دوٹوک واضح لہجے کو سن کر حیرانگی چھپا کر بولی۔

"ماہیر کو بھلا ان نزاکتوں کی کیا خبر۔ تم نے مرگ والے گھر میں بالکل نہیں جانا۔" ان کے لہجے میں واضح تنبیہہ تھی۔

"میں ثریا کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" وہ چادر اٹھا کر موبی کے متعلق بغیر ہدایات دیے چلی گئی تھیں۔

"بھلا یہ کیا بات ہوئی؟" حریم کو امی کی یہ الگ سی منطق بالکل بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ اسے بے حد افسوس تھا کہ وہ نفیسہ پھوپھو کا آخری دیدار نہیں کر سکے گی۔ آج کا پورا دن اس سے کوئی کام نہیں ہو سکا تھا۔ فیفا کے صدموں سے گھائل دل کا احساس اسے مارے ڈال رہا تھا۔ وہ پورا دن بولائی بولائی سی پھرتی رہی۔ نفیسہ پھوپھو کی بعد نماز عشا تدفین ہو گئی مگر ابھی تک کسی کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔

راحت بیگم نے تو فیفا کے پاس ہی رکنا تھا۔ البتہ ماہیر اور ثریا خالہ کی بھی ابھی واپسی نہیں ہوئی تھی۔

"پھوپھو مر گئی ہیں بھابھی۔" نہ جانے کب دبے قدموں سے چلتا ہوا موبی اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ حریم تو خوفزدہ سی ہو کر اچھل پڑی۔

"موبی تم۔" اس نے دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھ کے موبی کی طرف دیکھا۔

"ڈرا کر رکھ دیا ہے مجھے۔"

"ذرا ذرا سی باتوں پر ڈرا مت کرو بھابھی۔" موبی اس کے برابر میں بیٹھ رہا تھا۔

"تم کھانا کھاؤ گے موبی!"

"بھوک نہیں۔" اس کی آنکھیں بے حد سرخ تھیں۔ یوں لگتا تھا گویا وہ کافی دیر روتا رہا ہے۔

"بھابھی! تم روئی ہو نا۔" اس کی طرف دیکھے بغیر وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔ یوں کہ حریم تک اس کی آواز بمشکل پہنچی۔

"ہاں....." وہ اپنی نم آنکھوں کے بھیگے گوشے پونچھتے ہوئے بولی۔

"نفیسہ پھوپھو مر گئیں اس لیے۔" وہ سامنے دیوار پر لگے گھڑیال کو دیکھ رہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ بھاگتی دوڑتی ان سوئیوں کو رکنا نہیں آتا تھا۔ اگر گھڑیال کی یہ سوئیاں رک بھی جاتیں تب بھی دن' ہفتے اور مہینے اسی طرح سے گزرتے جانے تھے۔ گھڑی کی سوئیاں روکی جا سکتی تھیں مگر وقت کو قید نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کے اس قیدی کی خواہش تھی کہ آج کچھ گھنٹے تک وقت ایک جگہ ہی تھم جائے۔ آگے نہ بڑھے۔ وہ حریم سے آج بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا اور اس کی یہ خواہش تھی کہ اس کی تنہائی میں کوئی بھی مخل نہ ہو۔

"ہاں۔" حریم کی آواز بھرا رہی تھی۔

"اور فیفا کو طلاق ہو گئی۔ اس لیے بھی روتی رہی ہو۔"

"ہوں۔" اسے پھر سے شدید قسم کا رونا آ گیا۔ اگر وہ گھٹ گھٹ کر رونے کی بجائے کھل کر رو لیتی تو شاید اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ اسے فیفا کے اجڑنے کا دکھ تھا۔ شادی کے بعد اتنی کم مدت میں طلاق' فیفا کی زندگی میں کیسے کیسے سوال چھوڑے گی۔ وہ کسی ایسے مسافر کی طرح تھی جس کی ناؤ بیچ سمندر میں ڈوب گئی تھی۔ شوریدہ لہریں جسے نگلنے کو بے تاب تھیں اور زندگی گویا ساحل پر کھڑی تمسخرانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"طوفان آ جائے تو اسے روکنے کے لیے خود کو طوفان کے حوالے کرنا عقلمندی نہیں۔ طوفان کے تھمنے کا انتظار کرنا چاہیے۔" موبی کی فلسفیانہ روح دھیرے دھیرے بے دار ہو رہی تھی۔

"کیسا طوفان؟" حریم ٹھٹک کر رہ گئی۔

"کسی اور طوفان کی کسر رہ گئی ہے؟" اس کا لہجہ نہ جانے کیوں طنزیہ ہو گیا۔

"طوفان اور امتحان میں بال برابر فرق ہے۔" موبی نے گویا اس کی بات سنی ان سنی کر دی تھی۔

"طوفان ایک ہی جھٹکے میں سب کچھ اڑا کر تہس نہس کر دیتے ہیں جبکہ امتحان قطرہ قطرہ وجود میں سے رس نچوڑ لیتا ہے۔"

"موبی! کوئی اور بات کرو نا۔" حریم کم از کم رات کے اس پہر موبی کی کسی بھی ثقیل قسم کی گفتگو کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

"کوئی اور بات؟" موبی کی آنکھ میں سوچ کی رانی اتر آئی۔ چہرہ پھر سے کسی بوڑھے کی مشابہت اختیار کر گیا تھا۔

"ایک شیشے کا شہر ہے بھابھی۔" موبی نے کہنا شروع کیا اور جب بھی وہ کچھ کہتا تھا "انہونا" ہی ہوتا۔

"موبی!" حریم کے لب محض پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ وہ جان چکی تھی کہ موبی پھر سے کسی انہونی کا ذکر کرنے والا ہے۔ تبھی تو اس کا دل پوری رفتار سے دھڑکنے لگا۔

"کانچ کے شہر کی ایک داسی، تمہاری کٹیا کے دروازے پر دستک دے گی۔ سمجھو تو بھکارن ہو گی۔ کچھ مانگے گی یا چھینے گی۔ تم اس بھکارن کو کچھ دو گی یا خالی لوٹاؤ گی؟" وہ سامنے والی دیوار پر نیلی آنکھیں جمائے کسی اور ہی جہان میں تھا۔

"سوالی یا بھکاری کو خالی تو نہیں لوٹایا جاتا۔" حریم نے سانس روک کر جواب دیا تھا۔

"مگر میں پتا ہے کیا چاہتا ہوں؟" اس نے بڑی بڑی لمبی آنکھوں کو بالکل سکیڑ لیا۔

"کیا؟" حریم کی آنکھوں میں سوال اتر آیا۔

"تم بھکارن کو واپس لوٹا دو۔ خالی ہاتھ، خالی کشکول۔" اس کے لہجے میں سناٹا سا اتر آیا۔

"مگر سوالی کو خالی لوٹانا اچھا تو نہیں ہوتا۔ حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ دینا چاہیے۔"

"تو پھر تم اسے کیا دو گی؟" حریم نے دیکھا، موبی ہولے ہولے مسکرا رہا تھا۔

"جو سوالی مانگے گا۔ اگر میری پہنچ میں ہو سکا تو دوں گی۔" حریم اس کی الجھی مسکراہٹ کو سمجھ نہیں پائی۔

"فرض کرو بھابھی! اگر سوالی تمہارا "دل" مانگ لے تو پھر۔" مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

"دل۔" حریم دھک سے رہ گئی۔

"سوالی تو سوال کرتا ہے۔ جو اس کی مرضی چاہے مانگ لے۔" مسکراہٹ کا دائرہ اب سمٹتا جا رہا تھا۔

"مگر بھکاری مجھ سے کیوں مانگے گا؟" وہ الجھ کر بولی۔

"اس لیے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے اور کسی کے پاس نہیں۔" موبی اب تھکے تھکے قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے قدموں میں ذرہ بھر لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ اس کی چال میں کوئی غیر معمولی پن نہیں تھا۔ وہ چہرے، مہرے، چال، گفتار سے ہیجڑا تو نہیں دکھتا تھا مگر نہ دکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ حقیقتیں بدل تو نہیں جاتیں۔ اور جو موبی کا دکھ تھا وہ کوئی اور سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اور اسے نہ جانے کس کس کا دکھ تھا۔ شاید فیفا کا، حریم کا یا شاید کانچ کے شہر کی اسی داسی کا یا شاید اپنے ادھورے پن کا۔

"اور میرے پاس کیا ہے؟" حریم نے بہتی چاندنی میں اترے گہرے سکوت سے پوچھا۔

"میرے پاس کیا ہے؟" وہ اپنے اردگرد نظر دوڑا رہی تھی۔ مگر اسے ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا جو وہ کسی کو دان کر سکتی۔

"ماہیر عالم ہے نا۔" گہرے سکوت میں بہتی چاندنی نے تمسخر سے کہا تھا۔

"ماہیر عالم۔" حریم کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گویا زمین اس کے قدموں کے نیچے سے دھیرے دھیرے سرک رہی ہے۔ اس کے وجود پر گویا پوری عمارت ڈھے رہی تھی۔ ملبے کے ایک ڈھیر کے نیچے وہ دب چکی تھی۔ اس کی سانسوں کا تسلسل اب ٹوٹنے کے گویا قریب قریب تھا۔ دھول اور مٹی اس کے حلق میں





بس چکی تھی۔

"ماہیر!" اس کے لبوں سے دلدوز چیخ برآمد ہوئی۔ ڈم لائٹ بھی چلی گئی تھی۔ ہر سو اندھیرا پھیل گیا تھا۔ یوں کہ ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ حریم کے دل میں خوف کی ایک تیز لہر ابھر آئی۔ اسی پل کسی نے حریم کے شانے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھا۔

"کک... کون ہو تم؟" وہ بے اختیار چلانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"یہ شیری کمبخت نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔" آنسرنگ مشین کے ٹیپ شدہ جواب کو ایک ہزار مرتبہ سننے کے بعد ہنی بری طرح سی اکتا چکی تھی۔ وہ بھناتے ہوئے کارڈلیس پھینک کر صوفے سے اٹھ کر گلاس ونڈو میں آکھڑی ہوئی۔

کرسمس کی رونقیں عروج پر تھیں۔ نیچے زندگی گویا تھرک رہی تھی۔ نیم برہنہ عورتیں سنہری دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لیے سامنے بنے پارک کی کارپٹڈ گھاس پر چت لیٹی تھیں۔ کچھ واک کے انداز میں ٹہل رہی تھیں۔ کچھ بوائے فرینڈز کے ساتھ مستیوں میں مصروف تھیں۔

آج امریکہ میں عام تعطیل کا دن تھا۔ سو نوجوان، بوڑھے، بچے سب فرصت کو انجوائے کر رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوش باش سے ان چہروں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں تھکن سی اتر آئی۔

"بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے، بے مقصد۔" وہ نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں اپنی زندگی کے اس مقصدِ خاص کو تلاشنے لگی جس کے حصول کی خاطر اسے اجنبیوں کے اس دیس میں بھیج دیا گیا تھا۔ علم سمیٹتے، ڈگریاں لیتے۔ ہر میدان میں اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑتے، خود کو ایک بہترین کاروباری شخصیت متعارف کرواتے۔ وسیع و عریض حلقہ احباب رکھنے کے باوجود وہ کس قدر تنہا تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ اس نے کبھی اپنی تنہائی کا بٹوارہ نہیں کیا تھا۔ مگر نہ جانے کب، کس طرح کوئی چپکے سے اس کی تنہائی میں مخل ہو گیا تھا۔ حالانکہ یہ "تنہائی" تو کسی اور کی امانت تھی جسے اس نے بچا بچا کر اور سنبھال سنبھال کر صرف اسی کی خاطر رکھا ہوا تھا۔

وہ بھی دسمبر کی ایک ٹھٹھرتی صبح تھی۔ کہر میں لپٹی ہوئی۔ حالانکہ دور دور تک کہر کا نشان نہیں تھا۔ مگر نہ جانے کیوں ہنی کو ہر شے دھندلی دھندلی سے دکھائی دے رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ آج صبح سے ہی اس کی آنکھوں میں نمکین پانی جمع ہو رہا تھا۔ وہ پوری رات روتی رہی تھی۔ وہ طلوعِ سحر تک روتی رہی تھی۔ کبھی کبھی بلاوجہ ہی طبیعت رونے کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ مگر ہنی بغیر وجہ تو نہیں رو رہی تھی۔ جس کے فراق میں یہ نمکین موتی بے مول ہو رہے تھے اسے تو خبر تک نہیں تھی۔

وہ اسی سفید پتھریلے بینچ پر بیٹھی تھی۔ اردگرد سے بے نیاز، اپنے آپ میں مگن۔ خواب کے عالم میں آبلہ پائی کا سفر کرتی ہوئی۔ سوچوں کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی، کسی جزیرے کی تلاش میں بھٹکتی۔ صحراؤں کی خاک چھانتی دور بہت دور نکل گئی تھی جب کوئی چپکے سے اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ عجیب بے تکلف آدمی تھا۔ مقابل کی مرضی جانے بغیر صرف خود کو اجاگر کرنے اور زبردستی متعارف کروانے والا عجیب سا نوجوان۔ جسے مقابل کی ناگواری، ناپسندیدگی، غصے کی قطعاً پروا نہیں تھی۔ جسے اداس اور خاموش لوگوں کی اداسی کے متعلق جاننے کا بہت شوق تھا۔ بقول اس کے "اداس چہرے اسے بے تحاشا اٹریکٹ کرتے تھے۔ یوں کہ اس کے دل میں گویا کھب کر رہ جاتے۔ ہنی کو وہ بہت دلچسپ شخصیت رکھنے والا آدمی محسوس ہوا تھا۔ تبھی تو اس نے اس اجنبی کو اپنے حلقۂ احباب میں شامل کر لیا۔

"اے غمگین لڑکی! کیوں اس برفیلی صبح کو غم ناک کر رہی ہو؟" وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے بولا۔ اپنے قریب ایک مردانہ آواز سنتے ہی ہنی گویا ہوش کی دنیا میں لوٹی۔

"وائے آر یو سٹنگ ہیر؟" وہ اچھل کر قدرے دور

ہٹتے ہوئے ناگواری سے بولی۔

"ہو آر یو؟" اس نے ماتھے کی چتون کو واضح کرتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ کا بندہ۔" اللہ کے اس بندے نے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ سجاتے ہوئے جتایا۔

"خاموش اور اداس لوگ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ کا چہرہ مجھے خاموشی اور اداسی کی تصویر لگا۔ سو میں یہاں اس لیے بیٹھ گیا ہوں۔ آپ کو برا لگ رہا ہے تو میں اٹھ جاتا ہوں۔" حالانکہ اس کا اگلے آدھے گھنٹے تک بھی اٹھنے کا ارادہ نہیں تھا۔

"جسٹ شٹ اپ۔" وہ غصے سے بھنائی۔

"گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔"

"کیوں جناب! یہ پارک بھی آپ کی ملکیت میں ہے۔" اس کی آنکھوں میں بلا کی شوخی تھی۔

"ویسے میں آپ کو روزانہ ہی اس جگہ بیٹھا دیکھ کر سوچا کرتا تھا۔"

"کیا؟" اس نے بھنویں اچکا کر دیکھا۔

"یہی کہ ہو نہ ہو' اس لڑکی کی کوئی چیز ضرور کھو چکی ہے۔ جس کے سوگ میں یہ اداس بیٹھی روتی ہوئی نظر آتی ہے۔" اس نے تو ہوا میں تیر چھوڑا تھا تاہم لگا ٹھیک نشانے پر تھا۔

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے سچ مچ کچھ کھو دیا ہے۔ تبھی تو میرا دل خالی خالی سا ہے۔" اس کی آنکھیں پھر سے نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

"آپ کا دل خالی ہے؟" مقابل گویا اچھل پڑا۔

"پھر تو اس خالی مکان کو رینٹ پر لیا جا سکتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ ہنی ناراض ہونے کی بجائے ہنس پڑی۔

"ویسے تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام تو میرا ذرا مشکل سا ہے۔ تبھی یہاں سب جاننے والے شیری کے نام سے پکارتے ہیں۔ تم بھی شیری کہہ سکتی ہو۔" بڑی بے نیازی سے کہا گیا۔ ہنی کو پھر سے ہنسی آ گئی تھی۔

"میرا نام بھی ذرا مشکل سا ہے۔ مجھے بھی سب ہنی کے نام سے پکارتے ہیں۔"

"ہنی؟ یعنی شہد..... واؤ' ایک زمانے میں مجھے شہد بہت پسند تھا۔ شہد کے بغیر میرا ناشتا نامکمل ہوتا تھا۔ مگر ہوا کیا؟ شہد مہنگا ہو گیا۔ بس میرے شہد کھانے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ خیر اب مجھے شہد کھانے کی ضرورت نہیں رہی۔" وہ ہاتھ رگڑ رگڑ کر سردی کی شدت کو کم کرنا چاہ رہا تھا۔

"کیوں بھئی۔" ہنی گویا ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔

"جناب! جب پوری کی پوری ہنی میرے سامنے ہے تو پھر مارکیٹ میں جا کر پیسے کیوں بھروں؟ یہ ہنی مجھے ابھی اسی وقت شہد ملا دودھ پلائے گی۔ ناشتا بھی کروا دے گی۔ پھر اپنی گاڑی میں مجھے میری فلیٹ تک چھوڑ کر بھی آئے گی۔ بدلے میں مجھے کچھ زیادہ نہیں کرنا ہو گا۔ ایک تھینک فل سی مسکراہٹ گفٹ کروں گا۔ دوبارہ ملنے کا وعدہ لوں گا۔ ٹیلی فون نمبر لوں گا اور اللہ حافظ کہہ کر اگلی ملاقات کا انتظار کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ یہ پیاری سی ہنی مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کروائے گی۔ تو کیا خیال ہے ڈیئر ہنی! تمہیں شیری کی دوستی قبول ہے؟" وہ نان اسٹاپ شروع ہو چکا تھا یوں کہ ہنی سے قہقہہ روکنا محال ہو گیا۔ اس کے حلقہ احباب میں پہلی مرتبہ ایسا شوخ اور زندہ دل آدمی شامل ہوا تھا اور ہنی نے اس کے ساتھ دوستی کا بندھن باندھنے میں لمحہ بھر بھی نہ سوچا اور فٹ سے بول دیا۔

"فرینڈ۔" وہ اپنا ہاتھ پھیلائے مسکرا دی۔

"آہو جی! فرینڈز' فرینڈز۔" شیری نے جواباً بڑی پرجوش سی مسکان اچھالی تھی۔ یہ ان کی دوستی کی ابتدا تھی۔ ان تین چار سالوں میں وہ ہنی کے ساتھ کسی پکی سہیلی جیسا دوستانہ بنا چکا تھا۔ ہنی جو آج تک کسی سے اپنے دل کے راز کہہ نہیں پائی تھی۔ فقط اس کے سامنے اپنے دل کے سارے درد کھولتی چلی گئی تھی۔

مگر نہ جانے پچھلے کئی روز سے شیری کا نمبر کیوں آف تھا۔ اس کا فلیٹ بھی لاکڈ تھا۔ ویسے بھی وہ سرکاری رہائش گاہ میں رہتا تھا۔ اردگرد کے لوگ اس کے بارے میں اتنا جانتے نہیں تھے۔ اسی پل' اسی لمحے ہنی کے دل میں بھی چبھتا ہوا ایک سوال ابھرا تھا۔

"اور تم شیری کے بارے میں کتنا جانتی ہو؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔" جواب اس کی توقع کے برعکس تھا۔ اسی لیے تو ہنی کا دل دھک سے رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب زرجان کی آنکھ کھل گئی۔ دل میں عجیب سی بے کلی چٹکیاں بھر رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر روم فریج میں سے کوک کا ٹن نکال کر پینا شروع کر دیا تھا۔ مگر دل کی بے چینی کو قرار نہیں آیا۔

اچانک نیند ٹوٹ جانے کے بعد دوبارہ سونے کی کوشش کرنا نرا بے کار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے بہت دقتوں کے بعد بھی نیند نہیں آئے گی۔ سو وہ اٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔ منہ' ہاتھ دھونے کے بعد طبیعت کچھ فریش ہو گئی تھی۔

واپس آ کر اس نے گلاس ونڈو سے بھاری پردے کھینچ دیے تھے۔ لان میں مصنوعی روشنیوں کی وجہ سے ہر سو اجالا بکھرا ہوا تھا۔ گیٹ کیپر ڈیوٹی بدل رہے تھے۔

مما اپنے گھر میں رہتی تھیں۔ بہت کم زرجان ہاؤس میں ان کا چکر لگتا تھا۔ اگر موڈ ہوتا تو رات بھی رک جاتیں۔ جیسا کہ آج اپنے موڈ کے تحت وہ رات ادھر ہی رک گئی تھیں۔ آج کھانا بھی ان دونوں نے اکٹھے کھایا تھا۔ مما' زرجان کا موڈ فریش دیکھ کر بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ آج ان دونوں نے بلا مبالغہ ہر موضوع پر گفتگو کی تھی۔ مما بھی آج شاید بہت فرصت میں تھیں۔ سو ان کے موڈ اور فرصت کو دیکھ کر زرجان نے ایک بالکل الگ سا قصہ چھیڑ دیا۔ حالانکہ گھر کا کوئی بھی فرد اس معاملے میں بولنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے دونوں بڑے بھائیوں کو سرے سے اس قصے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ تو بس زرجان تھا ہر ایک کی فکر میں پریشان ہونے والا۔

"مما! آپ سے ایک بات کہنا تھی۔" بہت دیر سوچ و بچار کے بعد بالآخر اسے مناسب الفاظ مل ہی گئے تھے۔ ویسے بھی وہ کافی دنوں سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے کسی ایسے ہی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے زرجان کو آج یہ موقع میسر آ گیا۔

"کہو' اس میں اتنا غور و فکر کرنے کی کیا بات ہے۔" مما کا موڈ بے حد شگفتہ تھا۔ مگر یہ موضوع ایسا تھا کہ ان کی شگفتگی سمٹ سکتی تھی۔

"آپ نے ہنی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"کیا مطلب؟" وہ قطعاً "سمجھ نہیں پائیں۔

"آپ ہنی کو واپس کیوں نہیں بلوا لیتیں۔ اتنے سالوں سے وہ تنہا رہ رہی ہے۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟ جس مقصد یا شوق کی غرض سے آپ نے اسے امریکہ بھیجا تھا۔ وہ بھی پورا ہو چکا ہے۔ اس کی شادی کے لیے یہی مناسب ایج ہے۔ آپ اس بارے میں کیوں نہیں سوچتیں۔" زرجان نے بہت سنجیدگی کے عالم میں اپنے خیالات کا کھل کے اظہار کر دیا۔

"نہ جانے کیوں اس اسٹیج پر پیرنٹس بے بس اور لاچار ہو جاتے ہیں۔ پہلے ایسی باتوں پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ مگر اب بہت سی باتیں ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ بچوں کی بے جا ضد کس کس مقام پر رسوا کرتی ہے۔ تم اپنی مثال ہی لے لو۔ کب مانی تم نے میری بات اس لڑکی کی خاطر جوگ لے لیا۔ میری ذرہ بھر پروا نہ کی۔ اب بھی سنبھل جاؤ تو میں پھر سے زندہ ہو جاؤں گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے بچوں نے مجھے ہر مقام پر ہرٹ کیا ہے۔ اپنے بھائیوں کو دیکھ لو' بیویوں کے قول کی پاسداری کا کیسا احساس کیا ہے۔ بوریا بستر سمیٹ کر پردیس آباد کر لیے۔ چلو' ایک لحاظ سے بہتر زندگی کے لیے انہوں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ پھر تم اور ہنی ہو میرے جینے کی آس مگر تم دونوں ہی مجھے فقط ایک خوشی بھی نہیں دے سکتے۔" ان کی آواز بھرانے لگی۔ تبھی تو وہ ضبط کی کڑی منزل سے گزرتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔

"آپ ہنی کی شادی کر دیں۔ اور ہنی کے بعد میں

بھی شادی کرلوں گا اور شادی بھی آپ کی پسند سے ہو گی۔" بعض فیصلے لمحہ بھر میں اپنے انجام تک پہنچ جاتے ہیں ۔ یہ وقت اور ماحول کا اثر تھا یا ماں کے آنسوؤں نے اس کے دل کو پگھلا دیا تھا۔ جو بھی تھا' زرجان کے اس عہد نے محترمہ فلک ناز کے چہرے پر خوشی کے کئی رنگ اتار دیے۔

"تم سچ کہہ رہے ہو زرجان۔" ان کی آواز خوشی کی زیادتی سے لرزنے لگی۔

"تھینک یو' سو مچ میری جان۔"

"مگر شرط صرف یہ ہے پہلے ہنی کی شادی ہو گی۔" اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔" وہ نم آنکھوں کو نزاکت کے ساتھ ٹشو سے پونچھنے لگیں۔

"آپ ہنی کو شادی کے لیے رضامند کریں۔"

"میرے خیال میں ہنی تقریباً" رضامند ہی ہے۔" مما کے انکشاف نے زرجان کو بری طرح سے چونکا دیا۔

"اچھا۔۔۔" اس کی حیرانی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔

"آپ کو کیسے خبر ہوئی؟"

"ہنی کی زندگی میں کوئی آچکا ہے۔"

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" وہ سچ مچ اس انکشاف پر بے حد خوش ہوا۔

"شیری نام ہے۔ بہت اچھے عہدے پر فائز ہے۔ پچھلے تین سال سے ہنی اسے جانتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شیری بھی ہنی میں انٹرسٹڈ ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگرچہ شیری کا بیک گراؤنڈ کچھ خاص نہیں ہے۔ تاہم خود وہ مکمل طور پر اسٹیبلشڈ ہے۔ جتنا میں اسے جان پائی ہوں مجھے وہ ہر لحاظ سے اچھا لگا ہے۔" مما اور کسی کی تعریف کریں۔ بات تو حیران کن تھی یا تو وقت بدل چکا تھا یا پھر محترمہ فلک ناز کی سوچ میں تبدیلی آگئی تھی۔ جو بھی تھا' زرجان کے لیے اپنی ماں کا اس لحاظ سے سوچنا بہت اچھا اور اچھوتا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی بھر گئی۔ کیا یہ کم تھا کہ انہوں نے انسانوں میں تفریق کرنا ترک کر دیا تھا۔

"کیا آپ شیری سے مل چکی ہیں؟"

"نہیں البتہ میں غائبانہ طور پر اسے اچھی طرح سے جانتی ہوں۔"

"تو پھر آپ ہنی سے اس ٹاپک پر کھل کے بات کر لیں۔" زرجان سمجھ چکا تھا کہ ان کے جاسوس انہیں ہر طرح کی معلومات بہم پہنچا دیتے تھے۔ ان کی واقعی ہی چار آنکھیں تھیں۔ دو ادھر تھیں اور دو ادھر۔

"عنقریب میرا ارادہ ہے کہ ہنی سے ملنے امریکہ چلی جاؤں۔" انہوں نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

"آپ ہنی کو پاکستان کیوں نہیں بلوا لیتیں۔ کچھ عرصہ اسے یہاں ہمارے ساتھ بھی رہنا چاہیے۔" زرجان کا انداز زیر سوچ تھا۔

"ان شاء اللہ ' صرف کچھ ماہ تک وہ ہمارے ساتھ ہو گی۔" وہ کچھ سوچ کر دھیرے سے مسکرا دیں۔

"میں اپنے بچوں کی خوشیوں کو کبھی ختم نہیں ہونے دوں گی۔" وہ گویا خود سے عہد باندھ رہی تھیں۔

"اور تم سناؤ' ان لوگوں سے روابط میں کوئی کمی نہیں آئی؟" معاً" انہیں خیال آیا تو پوچھنے لگیں۔ لہجے میں ناگواریت نہیں تھی۔ زرجان کو پھر سے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"مما اور ان لوگوں کا ذکر اتنے نرم الفاظ میں کریں ۔۔۔ یا حیرت۔" وہ بے اختیار سوچے چلا گیا۔

"زرجان؟" انہوں نے چٹکی بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"جی مما۔" وہ سنبھل کر سیدھا ہوا۔

"کیا حال احوال ہے تمہارے تایا جان کا؟" ان کا لہجہ طنزیہ تو نہیں تھا مگر زرجان کو طنز ہی لگا۔

"اب پہلے سے بہتر ہیں۔"

"تم ان کا چیک اپ وغیرہ کرواتے ہو۔" ایک اور سوال۔

"جی۔۔۔" زرجان نے محض اثبات میں سر ہلایا۔

"تم کبھی کبھی ان کی طرف چکر لگا لیا کرو۔ اگر



فنانشلی پرابلم ہو تو تم ان کا خیال رکھا کرو۔ اب ایک فرد کے گناہ کی سزا پورے خاندان کو دینا عقلمندی نہیں۔ بہرحال ان لوگوں کا اس قصے سے بھلا کیا تعلق تھا۔ میں بھی ناحق انہیں رگیدتی رہی تھی۔" دیر سے ہی سہی انہوں نے اپنی ایک اور غلطی کو تسلیم کر لیا۔

"جی مما۔" زرجان اب کے سچ مچ حیرت کا بت بن گیا۔

"یا اللہ! یہ بدلاؤ' یہ انقلاب کیسے آگیا۔"

"اور وہ حریم' کس فیملی میں اس کی شادی ہوئی ہے؟" ان کا لہجہ سرسری سا تھا۔ گویا وہ اس کے بھی مالی حالات کا اندازہ لگانا چاہتی تھیں۔

"اچھے لوگ ہیں۔۔۔۔ وضع دار سے' بہرحال اس کا ہزبینڈ بہت نائس ہے۔" زرجان نے مختصر الفاظ میں بتا دیا۔

"اور وہ حانی' اس کا کیا بنا؟ ویسے لڑکیاں خوب صورت ہیں۔ اگر اس کے پیر میں نقص نہ ہوتا تو شاید میں۔۔۔۔ خیر چھوڑو۔" وہ گویا کوئی بات کہنا چاہتی تھیں مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر خاموش ہو گئیں۔

"حانی کی انگیجمنٹ ہو چکی ہے۔" زرجان نے جتا کر کہا۔

"او۔۔۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔" محترمہ فلک ناز اور حریم کی فیملی کے بارے میں گفتگو کریں۔ آج تو دن ہی انوکھا طلوع ہوا تھا شاید۔

"کس جگہ منگنی کی ہے؟"

"اسلام آباد میں ۔۔۔۔ اس کی خالہ کے گھر۔" زرجان اب حیرت کے جھٹکوں سے قدرے سنبھل گیا تھا۔ تاہم اس کی سنجیدگی ابھی تک برقرار تھی۔

"کون سی خالہ۔" فلک ناز چونک گئیں۔

"میرے خیال میں ان کی ایک ہی خالہ ہیں۔" زرجان نے سوچتے ہوئے بتایا۔

"نام کیا ہے خالہ کا؟" مما کے لہجے میں کچھ غیر معمولی پن تھا۔ زرجان بھی چونک گیا۔

"شاید نورینہ۔"

"ہوں۔۔۔۔" وہ ہنکارا بھر کے لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئیں۔

"جانتے ہو۔۔۔۔ یہ نورینہ کون تھی؟"

"کون تھیں؟" زرجان کو بھلا نورینہ کے بارے میں جاننے کی کیا ضرورت تھی۔ تاہم مما کے لہجے میں سنجیدگی کی بو پا کر وہ سمجھ گیا تھا کہ کچھ تو غیر معمولی تھا ہی۔

"تمہارے پاپا کی سابقہ منگیتر۔" مما نے گویا انکشاف کیا۔

"اچھا۔۔۔۔" زرجان قطعاً" حیران نہیں ہوا۔

"مما! ایک بات تو بتائیے؟" کچھ سوچ کر وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"کیا؟" وہ ابھی تک ماضی کے کسی لمحے میں کھوئی ہوئی تھیں۔ چونک کر زرجان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"آپ کی پاپا کے ساتھ شادی کیسے ہوئی؟ ایک مڈل کلاس فیملی کے کسی فرد سے نانا نے آپ کو کیسے بیاہ دیا؟" بہت سالوں سے زرجان اس بارے میں جاننے کی خواہش رکھتا تھا۔ مگر مما ان لوگوں کے متعلق تو کیا پاپا کے بارے میں بھی کچھ بولنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

"کیا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ دل تو کیا میری تو سوچیں تک زخمی ہیں زرجان۔" محترمہ فلک ناز کے چہرے پر زردیاں سی کھنڈ گئیں۔ چہرے کے تاثرات بدل کر رہ گئے تھے۔

"سوری مما! میں نے آپ کا دل دکھا دیا۔" زرجان یک لخت شرمندگی کے عمیق گڑھے میں گر گیا۔ ماں کے چہرے پر زلزلے کے آثار دیکھ کر وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔

"نہیں بیٹا! دکھا ہوا دل مزید اور کیا دکھے گا۔" انہوں نے گہرا سانس خارج کر کے کہنا شروع کیا۔

"جس بوسیدہ کتاب کو ہمیشہ کے لیے بند کر کے دل کے سرد خانے میں رکھ دیا تھا۔ آج تمہارے لیے اس کا صفحہ صفحہ کھول دیتی ہوں۔" وہ اپنے گلاسز اتار کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولیں۔

زرجان گویا سمجھ گیا تھا کہ وہ آج اپنے دل کے سارے بوجھ اتار دینا چاہتی ہیں۔ وہ اپنے بچوں میں سے صرف

زرجان سے اس حد تک اٹیچ تھیں کہ اپنے ماضی کے بارے میں بات کرتے ہوئے بہت ریلیکس فیل کر رہی تھیں۔

"میں ایسی برف کی عورت نہیں تھی۔ جذبات اور احساسات رکھنے والی عام سی لڑکی تھی۔ ایک عام سے شکل و صورت رکھنے والے عام سے باپ کی اکلوتی لاڈلی کم رو بیٹی۔ مجھے کبھی احساس تک نہیں ہوا تھا کہ میری شکل معمولی سی ہے۔ میرے خدوخال میں کوئی سحر انگیزی نہیں احساس کمتری تو مجھے چھو کر نہیں گزرا تھا۔ یہ سارا کمال پاپا کی دولت کا تھا یا میری ذہانت کا ذہانت کے معاملے میں خاندان بھر میں میری ٹکر کا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس لیے اپنے سرکل کے علاوہ میں کالج' یونیورسٹی اور پورے خاندان میں ہمیشہ سراہی جاتی رہی۔ ان چیزوں نے میرے دماغ میں غرور نام کا تھوڑا سا خناس بھر دیا تھا۔ میرے دوست بہت کم تھے اور جو تھے میری ذہانت سے خار کھاتے تھے۔

مجھے یاد ہے۔ جب میں بزنس ایڈمنسٹریشن کے حوالے سے اضافی ڈگریز لے کر فارن سے واپس آئی تو پاپا نے میرے اعزاز میں ایک گرینڈ فنکشن ارینج کیا تھا۔ اس پارٹی میں ملک کے نامور چیدہ چیدہ بزنس مین' صنعت کاروں' کے علاوہ پاپا نے اپنی کمپنی کے چند ایک ورکرز کو بھی بطور خاص انوائٹ کیا تھا۔ انہی میں سے ایک تمہارے پپا جمشید بھی تھے۔

یہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ پاپا نے جمشید کو میرے لیے پہلے سے ہی پسند کر رکھا تھا۔ پاپا شاید اس کی وجاہت سے متاثر ہو گئے تھے اور وہ ہماری دولت سے ایک معمولی سے گھر کا چند ہزار ماہوار لینے والا نوجوان جسے بہت کچھ پانے کے لیے ایک شارٹ کٹ درکار تھا اور یہ اس کی خوش بختی تھی کہ میری صورت میں اسے یہ شارٹ کٹ میسر آگیا۔ بغیر کسی جدوجہد کے جب کوئی چیز خود بخود پکے ہوئے پھل کی طرح دسترس میں آجائے تو اس کی قدر پھوٹی کوڑی کے برابر ہوتی ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ پاپا نے ایک غلط فیصلہ کیا تھا۔ میرے لیے ایک غلط شخص کا انتخاب کیا گیا۔ جس کے نزدیک رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اگر وہ اپنے ماں باپ جیسے رشتوں کو چھوڑ سکتا تھا تو پھر اس کے لیے مجھے یا اپنی اولاد کو چھوڑنا کچھ مشکل تھا۔

تمہارے دادا نے جمشید کو نافرمانی کے جرم میں گھر سے بے دخل کر دیا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ جمشید عباس نے اپنی بچپن کی منگیتر کو ریجیکٹ کر دیا تھا جو کچھ اسے مجھ سے حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ سب کچھ نورینہ اسے نہیں دے سکتی تھی اور جب اسے تین خوب صورت بیٹے اور وہ سب کچھ حاصل ہو گیا جو اسے چاہیے تھا۔ جس کی چاہ میں وہ اپنے پچھلوں کو چھوڑ آیا تھا۔ جن سے تمام روابط اس نے خود ختم کر لیے تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ میں نے بہت کوشش کی تھی۔ جمشید کے پیرنٹس سے اس کے تعلقات بحال کرنے کی۔ مگر وہ لوگ ہمارے ساتھ کسی بھی قسم کا رابطہ' تعلق استوار نہیں کرنا چاہتے تھے۔

تمہارے دادا' دادی کی وفات کے بعد جمشید کو احساس ہوا کہ اس نے ایک لاحاصل خواہشات کی تمنا کر کے بہت غلط کیا ہے۔ اپنے ساتھ بھی اور اپنے والدین کے ساتھ بھی۔ پچھلی غلطیوں کو سدھارنے کے چکر میں وہ نئے حساب کتاب کھولتا چلا گیا۔ جمشید کے رویے کے بدلاؤ نے ہر عورت کی طرح مجھے بھی متوحش کیا تھا۔ طرح طرح کے خدشات اور واہمے میرے دل میں پنپنے لگے تھے۔ مجھے خود سے یہ احساس ہوا کہ شاید میرے رویے میں شدت پسندی کے باعث جمشید مجھ سے دور ہو رہا ہے۔ ہاں' میں اس بات کو تسلیم کرتی ہوں کہ میں بہت شدت پسند تھی۔ اپنے شوہر اور اولاد کی محبت میں عام عورتوں سے بھی دس گنا زیادہ محبت کرتی تھی۔ یہ میری شدت پسندی تھی کہ میں کسی بھی طور تم لوگوں کو پل بھر کے لیے نظروں سے اوجھل نہیں کرتی تھی۔ تب میں۔ ایک گھریلو عورت کا روپ دھارے ایک آیا کی طرح تم لوگوں کے اردگرد گھومتی رہتی تھی۔ اس کے باوجود اس ناشکرے انسان کو اپنی زندگی میں پیچھے رہ جانے والی اور کھو دینے والی چیزوں کی طلب اکسائی رہتی۔



گھر میں چیخ چیخ اور بدمزگی ایک روٹین کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم لوگوں کے معصوم ذہن کسی تباہی کو بہت جلد محسوس کرنے لگیں۔ میری حتی المقدور کوشش ہوتی تھی کہ جمشید اپنا غصہ صرف میرے تک محدود رکھے۔ مجھے اپنا گھر بچائے رکھنا تھا۔ اس گھر کو بچانے کی خاطر میں نے ہر قسم کے پل صراط پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جمشید کے رویے میں تبدیلی کا آغاز تب ہوا' جب تمہارے دادا' دادی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے جمال بھائی کے گھر میں اس کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ مجھے لگتا تھا تمہاری گھنی میسنی بے اولاد تائی کی چالوں میں جمشید الجھ کر گھر کا راستہ بھول گیا ہے۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ اتنے سال ان لوگوں سے نفرت کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ جمشید جیسے ناشکرے کے مقدر میں ٹھوکریں لکھ دی گئی ہیں.....

اسے کسی نے بھی راہ سے ہرگز نہیں بھٹکایا تھا۔ بھٹکنا تھا۔ بھٹکنا اس کے نصیب میں تھا سو وہ اپنی راہیں خود ہی کھوٹی کر گیا۔

ذلت اور رسوائی میرے مقدر میں بھی لکھی گئی تھی۔ بے مراد مجھے بھی رہنا تھا۔ سو جمشید جاتے جاتے مجھے اپنے نام کے مان سے بھی آزاد کر گیا۔ تم تینوں کو دھتکار گیا۔ کبھی نہ پلٹنے کے لیے چلا گیا۔ مڑ کر اس نے دیکھا بھی نہیں۔ بغیر جرم کے ایسی سزا سنا دی تھی مجھے' جس کے زہر نے میری رگوں کو نیلا کر دیا۔

کچھ ایسی ہی نفرت مجھے جمشید اور اس سے تعلق رکھنے والے ہر رشتے سے ہو گئی تھی۔ پہلے کبھی کبھار میں جمال بھائی کے گھر چلی جاتی تھی۔ پھر مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ تمہاری تائی میرے بچوں کو بڑی پیاسی نظروں سے دیکھتی ہے۔ وہ شاید ممتا کی ترسی ہوئی تھی۔ مگر مجھے اس کی نظروں سے وحشت ہونے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میرے بچے بھی مجھ سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ تب حریم اور حانی ابھی پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ جمشید کے چلے جانے کے بعد میں نے اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔۔۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم لوگوں کو کبھی خبر ہو کہ اس دنیا میں تمہارا کوئی ددھیالی رشتہ دار بھی موجود ہے۔

جمشید نے بری محبت میں خود کو تباہ کر لیا تھا۔ نہ جانے کس طوائف کے عشق نے اسے دیوانہ کر دیا۔ عمر عزیز کی ساری پونجی نہ جانے کہاں کہاں لٹاتا رہا۔

جب دنیا سے خالی ہاتھ لوٹنے کا وقت آیا تو اسے اپنے جگر کے ان ٹکڑوں کا خیال آگیا۔ جنہیں وہ بے رحم موجوں کے حوالے کر گیا تھا۔ آخری وقت میں اسے کاندھا دینے کے لیے جب کوئی اپنا نہ تھا تب زرجان عباس دل کو ہاتھوں میں لیے باپ کے در پر پہنچ گیا۔ اس کی سلگتی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے۔ اس کے دل کی پیاس بجھانے۔

کیا ایسے باپ زرجان عباس جیسے بیٹوں کے حق دار ہو سکتے ہیں؟

مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ جب تم جمشید سے ملنے جاتے تھے۔ پھر اس کی میت کو کاندھا دینے پہنچ گئے۔"

"وہ تو میرا فرض تھا مما! انہوں نے مجھے بلوایا تھا۔ اگر میں نہ جاتا تو ساری زندگی کبھی خود کو معاف نہ کرتا۔ اور مما! انہیں کسی غلط صحبت نے تباہ نہیں کیا تھا۔ وہ دنیا کے جھمیلوں سے تنگ آگئے تھے۔ شاید اپنے والدین کو ناراض کرنے کے کرب نے انہیں کبھی خوش نہیں ہونے دیا۔ کبھی کبھی انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ پپا اپنی پچھلی غلطیوں کی پشیمانی مٹانے کے چکر میں مزید غلطیاں کرتے رہے تھے۔ آخری عمر میں انہیں بہت سے پچھتاوے رُلاتے تھے۔ اپنی منگیتر کے دل کو توڑ دینے کا پچھتاوا' والدین کا دل دکھانے اور نافرمانی کرنے کا پچھتاوا۔ آپ کو اور ہمیں چھوڑ دینے کا اذیت ناک پچھتاوا۔

مما! کیا وہ قابل معافی نہیں تھے۔ انسانیت کے ناتے ہی سہی۔" وہ ماں کے کرب کو بہت اچھی طرح سے سمجھ سکتا تھا۔ محترمہ فلک ناز خاموش تھیں۔ ماضی سے حال تک کے سفر نے انہیں تھکا ڈالا تھا۔ وہ

اپنی سرخ ہوتی آنکھوں سے زرجان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس نے ایک ایک نقش اپنے باپ کا چرایا تھا۔ ہاں، اس کا دل جمشید کے دل جیسا نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ جیسا نافرمان اور باغی نہیں تھا۔ وہ کسی کا دل دکھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور انہی خوبیوں نے زرجان عباس کو مکمل کر رکھا تھا۔

"شاید نہیں۔" وہ اپنے ہونٹوں کو اذیت سے کچل رہی تھیں۔

"کیوں نہیں؟" زرجان کی آنکھوں میں سوال ابھر آئے۔

"اگر دیکھا جائے تو ہم نے آپ نے، پاپا کے جانے کے بعد بھی ایک بہترین زندگی جی ہے مگر انہوں نے زندگی کو نہیں، زندگی نے انہیں برتا ہے۔ افلاس، تنہائی، دکھ، کرب اور پچھتاووں کے سنگ۔"

"اس زندگی کا جمشید نے خود سے انتخاب کیا تھا۔ جو لوگ ہاتھ آئی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے۔ انہیں ساری زندگی پچھتاووں کے سہارے ہی زندہ رہنا ہوتا ہے۔" وہ اپنی سرخ آنکھوں کو مسل رہی تھیں۔

"ہوں۔" زرجان نے ہنکارا سا بھرا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ ہر آدمی جو کرتا ہے وہ بھگتتا بھی ہے۔ جو بوتے ہیں۔ بالآخر کاٹنا بھی تو وہ ہی ہوتا ہے۔ نفرت کی فصل اگا کر محبت کی خواہش اور طلب رکھنا عقلمندی تو نہیں۔

اک عمر گزار دینے کے بعد اپنی غلطیوں کا اور اک باقی ماندہ زندگی کے خاتمے میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔ مگر پھر بھی اولاد ہونے کے ناتے اس نے اپنے باپ کے آخری وقت اور لمحوں میں اپنی قربت کا مان بخش کر ٹوٹتی سانسوں کو جو سکون بخشا تھا۔ اس کا دل آج بھی مطمئن تھا۔ اس نے اپنا فرض نبھایا تھا۔ اگر وہ کچھ اور زندہ رہتے۔ تب بھی زرجان ———— نیکی محبت اور تحفظ انہیں فراہم کرتا۔

وہ اپنے آپ کو بدقسمت ترین لوگوں میں شمار کرتے تھے۔ جب والدین پاس تھے تو ان کی محبت کو انہوں نے کبھی سمجھا نہیں۔ ہمیشہ نافرمانی اور بدکلامی سے والدین کا دل دکھاتے رہے۔ خدا انہیں پھر بھی نوازتا رہا۔ مگر شکر اور صبر کرنا انہوں نے سیکھا ہی کہاں تھا اور شاید ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ فلک ناز جیسی مغرور عورت کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے وہ خود بھی تنگ آ چکے تھے۔ شاید ان کا دل مانگے کی ان آسائشات سے اوب گیا تھا۔ ان کے اندر کا باضمیر انسان زندہ ہو گیا تھا جو بھی تھا۔ والدین کی ناکام زندگی نے کسی اور کے تو نہیں، ہاں زرجان کے دل میں ایک چبھن دیتا احساس ضرور چھوڑ دیا تھا۔ ایک گھر کا سکھ اور سکون اس کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ ہاں، وہ پر امید ضرور تھا۔ ایک بہت اچھا اور مخلص ساتھی پا کر ایک گھر کی بنیاد رکھنے کی امید تو بہرحال زندہ تھی۔

کبھی کبھی رات کے کسی پہر اگر آنکھ کھل جاتی تو دل انہونی سی خواہشوں پر اکسانے لگتا۔ ایک مخلص دوست نما ہم سفر کی طلب بیدار ہو جاتی۔ جو ان کہے دل کے سارے درد جان لینے کے فن سے آشنا ہوتا۔ جو نیند سے خالی ان آنکھوں میں میٹھی نیند کو بھر دیتا۔ جو لبوں پر کوئی ایسا شگوفہ کھلا دیتا۔ جس کے بعد کوئی مسکراہٹ کھوکھلی نہ دکھتی۔

ایسا کوئی ہم سفر جو دل کے بے تحاشا قریب ہوتا۔ اور ایسا بھلا کون ہے؟ کون ہے؟ زندگی تمناؤں سے خالی ہو جائے تو پھر زندگی نہیں ایک زنجیر بن جاتی ہے۔ جس کا گھیرا گلے کے گرد دھیرے دھیرے تنگ ہوتا رہتا ہے۔ سانسیں گھٹن کا شکار ہو جاتی ہیں۔

اور زرجان عباس زندگی کو تمناؤں سے خالی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ زندگی جو رب رحیم کی امانت تھی۔ وہ اس امانت کو بڑے سلیقے کے ساتھ برتنا چاہتا تھا۔ اور یہ سلیقہ دان کرنے کا ہنر بھی کسی ایسے ہم سفر کے پاس ہو سکتا تھا جو بغیر صلے کے چاہے جانے کا خود میں حوصلہ رکھتی۔

تو زرجان عباس کو کسی ایسے ہی ہم سفر کی تلاش تھی۔ کبھی وہ سوچا کرتا تھا کہ اس کی تلاش شاید حریم جمال پر ختم ہو چکی ہے۔ مگر ایسا ہرگز نہیں تھا۔ رب کائنات کی اس وسیع کائنات کا دائرہ کہاں کہاں تک پھیلا تھا۔ اور اس کی ماں جو تجربوں کی بھٹی میں سلگ سلگ کر کندن بنی تھی۔ ان کا کہا کیسا سو فیصد سچ تھا۔

"زندگی حریم جمال پر ختم نہیں ہوتی۔"

بہت مشکل سے ہی سہی، بہت اذیت اور کرب سے گزرنے کے بعد ہی سہی، زرجان عباس نے تسلیم کر لیا تھا کہ زندگی کو ایک جگہ روک دینا، قانون فطرت کے خلاف ہے۔ وہ فطرت کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خدا کے بنائے قوانین اور تقدیر جیسی اٹل حقیقت کے ساتھ ضد نہیں باندھ سکتا تھا۔ اس نے حریم جمال کو کھو کر صبر کر لیا تھا اور اس نے اپنی ماں کے دل کو اپنی طرف سے رضامندی کا سندیسہ سنا کر اپنا فرض نبھا دیا تھا۔

اور کسی نے سچ ہی کہا ہے زندگی جہد مسلسل کا نام ہے۔ رک جائے تو جمود طاری کر دیتی ہے۔ بڑھتی رہے تو دراصل زندگی کہلاتی ہے۔

رات صبح نوخیز میں دھیرے دھیرے ادغام کر رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے سلائیڈ لاک کر کے بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔

ارادہ تھا کہ تھوڑی دیر لان میں ٹہلنے کے بعد نماز فجر پڑھنے کے لیے مسجد چلا جائے گا مگر مما کے کمرے کی لائٹ آن دیکھ کر قدرے ٹھٹک گیا۔

لان میں جانے کا ارادہ بدل کر وہ کچھ سوچتا ہوا مما کے بیڈ روم کی طرف آ گیا۔ ابھی ہینڈل پر ہاتھ رکھے وہ گھمانے کی خواہش رکھتا ہی تھا جب اندر سے آتی مما کی نم نم آواز نے اس کے قدموں کو ہی نہیں پورے کے پورے زرجان عباس کو ساکت کر دیا۔

"میں صرف اتنا چاہتی ہوں..... ماہیر عالم کو اس ملک سے نہ سہی شہر سے بہت دور بھیج دیا جائے۔ اتنا دور کہ اس کی خوشبو تک بھی یہ فضا محسوس نہ کر سکے۔ میں اپنی طرف سے کسی کو بھی ذرہ بھر تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ ماہیر کو تو بالکل بھی نہیں۔ میری اس کے ساتھ کسی بھی قسم کی عداوت نہیں۔ بلکہ میں نے تو بہت عرصے پہلے شاید اسے دیکھا تھا۔ اس کی شکل تک بھول چکی ہے۔ وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں..... بس میں چاہتی ہوں، بغیر اسے کوئی تکلیف دیے کسی اور شہر ٹرانسفر کر دو یہ اس کے حق میں بہت بہتر ہے۔" مما کی آواز نہ جانے کیوں لرز رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ خاموشی سے دوسری طرف سے آنے والی آواز سنتی رہی تھیں۔

"تو پھر یوں کرنا، اسے ٹرمینیٹ کر دینے کی دھمکی دینا۔ اگر وہ پھر بھی نہ مانا تو ظاہر ہے یہ جاب تو اس کے ہاتھ سے جائے گی ہی۔ البتہ کسی اور کمپنی میں اس کی سی وی ہرگز بھی نہیں پہنچنی چاہیے۔ اسے ہر صورت یہ شہر چھوڑنا ہو گا۔ مجھے ایک طوفان کی آمد کی خبر ہو رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی یہ طوفان بہت سے گھروں کو تباہ کر دے۔" ان کا انداز خود کلامی سے مشابہہ تھا۔

"کیسا طوفان؟" زرجان نے الجھ کر بند دروازے کی طرف دیکھا۔

"کیا مما نہیں جانتیں ماہیر عالم کون ہے؟ اگر وہ نہیں جانتیں تو پھر ماہیر کو کیوں شہر بدر کروانے کے پلان بنا رہی ہیں۔ کیا صرف اس لیے کہ حریم بھی ماہیر کے ساتھ یہ شہر چھوڑ دے! صرف اور صرف میری وجہ سے تاکہ میں حریم کی فیملی سے کوئی تعلق نہ رکھوں؟ حریم سے ملنا چاہے کسی بھی بہانے سے ہو، ختم ہو جائے۔ ایک طرف وہ حریم کی فیملی کو سپورٹ کرنے پر مجھے فورس کر رہی ہیں اور دوسری طرف ان کی سیٹلڈ لائف کو ڈسٹرب کرنے کی پلاننگ ہو رہی ہے۔ مما کے قول اور فعل میں یہ تضاد کیوں ہے؟ کیا یہ نہیں جانتیں کہ ماہیر اگر پریشان ہو گا تو حریم بھی از خود ڈسٹرب ہو گی اور حریم اگر ڈسٹرب ہو، اپ سیٹ ہو تو زرجان بھلا کیسے سیٹ رہ سکتا ہے۔" وہ ماں کی دوہری شخصیت کی گتھی میں اس حد تک الجھ گیا تھا کہ اسے لان میں جانا یاد ہی نہ رہا۔

"آپ میری وجہ سے حریم اور ماہیر کو یہ شہر چھوڑنے پر مجبور نہیں کر سکتیں مما! کبھی نہیں۔ میں دانستہ نادانستہ حریم کی فیملی سے روابط نہیں رکھوں گا مگر میری یہ شرط ہے، ضد ہے یا جو بھی سمجھ لیں۔ ماہیر اور حریم اپنا گھر اور یہ شہر چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔"

وہ گویا خود سے عہد کرتا ہوا پلٹ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"پر میری بچی! ہوا کیا تھا۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔" راحت بیگم بھاری ہوتی آواز سے بمشکل بول رہی تھیں۔ پورا دن رونے دھونے میں گزر گیا تھا۔ حلق میں گویا کانٹے پھنس رہے تھے۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ تدفین کے بعد اہل محلہ کی خواتین اور مرد حضرات بھی دھیرے دھیرے چلے گئے تھے۔ اب خالی بھاں بھاں کرتے گھر میں راحت بیگم اور فیفا کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ بیٹھک میں عفیفا کی ایک پھوپھو کے شوہر اور ان کے کوئی بھتیجے موجود تھے۔ ماہیر انہی کے پاس بیٹھا تھا۔

پورا گھر خالی ہو جانے کے بعد عجیب سا وحشت ناک سناٹا ہر سو پھیل گیا تھا۔ تدفین کے بعد کا مخصوص خوفزدہ کر دینے والا سناٹا۔

نفیسہ کی ناگہانی موت نے جہاں راحت بیگم کو بے حد غمزدہ کر رکھا تھا۔ وہیں بے شمار سوال بھی اٹھ رہے تھے اور اب جبکہ پورا گھر مہمانوں سے خالی ہو گیا تھا۔ تب راحت بیگم کو نفیسہ کے اچانک چلے جانے کا سبب پوچھنے کا خیال آیا۔ صدمے سے نڈھال اجڑی اجڑی عفیفا کا سر راحت بیگم کی گود میں تھا۔ وہ اس کے بالوں میں نرمی سے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ عفیفا کے سوجے پپوٹوں والی بند آنکھوں میں دھیرے دھیرے سے جنبش ہوئی۔

"کیا ہوا تھا؟" عفیفا کو بہت زیادہ سوچنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ جو ہوا تھا زخم خوردہ دل پر گویا اس کا لفظ لفظ نقش تھا۔ اس کی دکھتی آنکھوں سے ایک دفعہ پھر آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ عفیفا نے آنسوؤں کی یلغار میں درد سے ٹوٹتے وجود کا سارا دکھ کہہ سنایا۔ دل پر پڑے بوجھ کو سرکانا تو تھا ہی۔ ورنہ اسے تو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے وجود کو کوئی آرے کے ساتھ چیر رہا ہے اور اس گھائل شدہ دل میں دھیرے دھیرے نیزے اتارے جا رہے ہیں۔

"ارے میں مر گئی بندہ بشر غلط فہمی کا شکار تو ہو ہی جاتا ہے۔ اس بدبخت سہیل نے ذرا دیر کو سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بندہ وضاحت تو طلب کرتا ہے۔ غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے براہ راست بات کرتا ہے۔ پکڑ کر دو لفظوں میں معاملہ نبٹا دیا۔ اس بے چاری کو دل کا دورہ نہ پڑتا۔ دماغ کی شریان نہ پھٹتی تو آخر کیا ہوتا۔ کوئی پوچھتا تو سہی سہیل سے بھلا ایسے ظلم ڈھا دیتے ہیں۔ اگر نفیسہ کو خوشخبری کا شک ہو گیا تھا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔ اب اسے کیا خبر تھی کہ بیچ کا معاملہ کیا ہے۔ خود تو خالی نکاح پڑھوا کر اپنے نام سے باندھ کر دفعان ہوا تھا۔" راحت بیگم کا دل گویا دھک سے رہ گیا تھا۔ پھر جو بات سمجھ میں آئی تو ان کی زبان سے مغلظات کا گویا طوفان امڈ آیا۔

"تم مجھے ذرا کال ملا کر دو۔ ابھی کرتی ہوں اس بے غیرت سے بات۔ ذرا حیا نہیں آئی۔ پکڑ کر بہتان باندھ دیا ہے۔"

"مامی! جب ایک دفعہ اعتبار اور اعتماد کا خون ہو جائے۔ تو پھر رشتے میں ہمیشہ کے لیے دراڑ آجاتی ہے۔ میری کوئی وضاحت سہیل کا دل کبھی بھی صاف نہیں کر سکتی۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ مرد کے دل میں بال برابر بھی بدگمانی یا شک پیدا ہو جائے پھر آسانی سے اس کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے لگتا ہے کہ اب سہیل کبھی بھی میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔" وہ سسکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ راحت بیگم کا دل گویا مٹھی میں آگیا۔

"حوصلہ کر صبر سے کام لے میری بچی! کیسا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے تیرے اعصاب پر۔" راحت بیگم بھی رو دیں۔

"کہتے ہیں نا۔۔۔ منہ سے نکلی بات اور کمان سے نکلا تیر کبھی واپس نہیں آسکتا۔ نفیسہ بے چاری نے کب سوچا ہو گا۔ وقت کیسی الٹی چال چلنے لگے گا۔ اسے تو یہی دکھ قبر میں اتار گیا کہ بیٹی کو کیسے اپنے ہاتھ سے برباد کر ڈالا ہے مگر بیٹی! یہ سب تو نصیب میں لکھا تھا۔ بھلا کوئی ماں اپنی اولاد کا گھر برباد کر سکتی ہے۔"

"مامی میرا دل چاہتا ہے۔ ایک دفعہ صرف ایک دفعہ



واپس پلٹ آئے۔ میری امی کی سانسیں بحال ہو جائیں۔ وہ پھر سے چلتی پھرتی نظر آئیں اور میں امی کو چیخ چیخ کر بتاؤں کہ امی! آپ نے کوئی جرم نہیں کوئی گناہ نہیں کیا۔ یہ سب میرے نصیب کے کمال میرے مقدر کی سیاہی ہے۔ میری پیشانی پر یہ ... لگانا تھا۔ میری بربادی اسی طریقے سے ظہور پذیر ... اور سہیل کی اصلیت بھی اسی طریقے سے ... تھی۔" وہ لمحہ بھر سانس لینے کے لیے رکی۔

"جتنا میں سہیل کو جان پائی ہوں مامی! ان چند ایک فونک کالز میں جس قدر میں نے سہیل کو سمجھا ہے۔ مجھے اول روز سے ہی لگتا تھا کہ وہ کانوں کا کچا اور ... باز قسم کا آدمی ہے۔ غیر مستقل مزاج۔ شادی کی رات اسے اپنے ادھورے کاغذات کے سلسلے میں ... طلب کر لیا گیا تھا۔ اس سے اگلے روز وہ واپس عمان چلا گیا اور شادی کے لیے صرف دو دن پہلے پاکستان محض نکاح پڑھوانے آیا۔ میں تو پہلے سے ہی ... جلد بازی میں ہونے والی شادی کے بارے میں ... رہی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میرے واہمے حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔"

"بس بیٹی صبر کرو۔۔۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔" راحت بیگم نے ایک طویل گہرا سانس کھینچا۔

"چائے لاؤں آپ کے لیے۔" فیفا انہیں کنپٹیاں ... دیکھ چکی تھی۔ اسی لیے اٹھتے ہوئے بولی۔

"اگر تکلیف نہ ہو تو۔ بنا ہی دو۔ پتی ذرا تیز ڈالنا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔"

"ٹیبلیٹ بھی لاتی ہوں۔۔۔ آپ کچھ دیر آرام کریں۔"

"آرام کیسا نفیسہ کا چہرہ نظر کے سامنے سے ہٹتا نہیں۔" وہ بھرائی آواز میں بولیں۔ عفیفا آنسو ... ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔ چائے بناتے ہوئے بھی اس کے آنسو مسلسل بہتے رہے تھے۔ واپس آئی تو مامی کو اپنا منتظر پایا۔

"بس چائے لوں گی۔ یہ گولی رہنے دو۔" انہوں نے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"زمیلہ کا ویزہ لگ گیا ہے۔" محض عفیفا کا دھیان بٹانے کی غرض سے انہوں نے موضوع گفتگو بدل دیا تھا۔

"اچھا۔۔۔ یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے۔" فیفا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ چمکنے لگی۔

"بس نبیل کے پاس جانے کی آج کل تیاری کر رہی ہے۔" وہ چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے خوشی خوشی بتانے لگیں۔ کل تک اس کی ماں کو بھی اسے سہیل کے پاس بھجوانے کی بہت خواہش تھی۔ جب اس کا ویزہ لگا تو وہ کس قدر مسرور ہوتی رہی تھیں۔ اس کے نہ جانے کا سن کر ان کی خفگی بھرا رویہ پھر سے فیفا کی آنکھوں کو بھگونے لگا۔

"کیا اس کنڈیشن میں سفر کر لے گی؟" وہ ان کربناک سوچوں کو جھٹکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"میں تو منع کر رہی تھی مگر وہ نہیں مان رہی۔ اب دیکھو نا ایسے مواقع پھر بار بار نہیں ملتے۔ نہ ہی قسمت ہر دفعہ مہربان ہوتی ہے۔"

"ہوں۔" فیفا پرسوچ سے انداز میں سر ہلانے لگی۔ کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی تھیں۔ قسمت بار بار مہربان کہاں ہوتی تھی۔

"اس کے گھر اور سسرالی حالات کے بارے میں تو تم اچھی طرح سے جانتی ہو۔ پیس کر رکھ دیا ہے ان لوگوں نے میری معصوم بچی کو۔ بہتر ہے شوہر کے پاس چلی جائے۔ سکھ کا سانس تو لے گی۔ یہاں تو پورے ٹبر کو نبٹاتے نبٹاتے آدھی ہو کر رہ گئی ہے۔" ہر ماں کی طرح بیٹی کے معاملے میں وہ بھی حد سے زیادہ جذباتی تھیں۔

"جی۔" فیفا نے محض اثبات میں سر ہلا کر ان کی تائید کی تھی۔ اسی پل ماہیر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ سفید شلوار قمیص میں سرخ آنکھیں لیے وہ فیفا سے مخاطب ہوا۔

"اگر زحمت نہ ہو تو تین کپ چائے بنا دو۔ مہمانوں کو طلب محسوس ہو رہی ہے۔"

"ابھی بناتی ہوں۔" وہ اٹھ کر جانے لگی

”پہلے بتا دیتے تو ایک ساتھ ہی بنا لاتی۔ ابھی مجھے بھی بنا کر دی ہے۔“ راحت بیگم فیفا کی تھکن زدہ آنکھوں کو دیکھ کر کہنے لگیں۔

”تم رہنے دو۔ میں خود بنا لیتا ہوں۔“ وہ نرمی سے کہتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔

”ماہیر کو چینی، پتی کہاں ملے گی۔ میں دیکھتی ہوں۔“ فیفا بھی اٹھ کر اس کے پیچھے کچن میں چلی گئی تھی۔

”تم کیوں آئی ہو؟ آرام کر لیتیں۔ چائے کا مسئلہ نہیں میں بنا لوں گا۔“ وہ کیبنٹ کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔

وہ باہر نکلنے لگی تھی جب ماہیر نے اسے روک لیا۔

”ادھر بیٹھو، مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔“

”کیا سہیل والے مسئلے پر بات کرنی ہے؟“ عفیفا رک گئی تھی مگر پلٹی نہیں۔

”ہاں......“

”پلیز ماہیر! میں اس موضوع پر بات نہیں کر سکتی۔“ اس کے زخم پھر سے ادھڑنے لگے تھے۔ آنکھیں نمکین پانیوں سے لبالب بھر گئیں۔

”فیفا......!“ ماہیر نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”یہاں بیٹھو۔“ وہ موڑھا پیر کی ٹھوکر سے نزدیک کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے سہیل کا نام پھر سے نہیں سننا۔ اس کی وجہ سے میری ماں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ میں ہرگز بھی اس کا نام دوبارہ نہیں سننا چاہوں گی۔“ وہ موڑھے پر بیٹھتے ہوئے بھرائی آواز میں کہنے لگی۔

”میں جانتا ہوں...... جو کچھ بھی آج سے پہر ہوا تھا۔ کیا ایک دفعہ سہیل سے بات کرنا ضروری نہیں کم از کم ہمارے ضمیر اور دل پر کوئی بوجھ تو نہیں رہے گا۔ پھوپھو کی سادگی نے جو قیامت برپا کی ہے۔ اس کی وضاحت بہت ضروری ہے فیفا!“ ماہیر نے ہمیشہ والے نرم لہجے اور نرم آواز میں کہا تھا۔ بہت سالوں بعد فیفا کے لیے اس کی آنکھوں میں بے تحاشا نرمیاں اتر آئی تھیں۔

”ان وضاحتوں کا کوئی حاصل نہیں ہو گا ماہیر! الٹا، میرے وجود کے اور بھی پرخچے اڑائے گا۔ تم خود ایک مرد ہو۔ ہر ایک کی اپنی ایک فطرت ہوتی ہے۔ مجھے نہیں لگتا، سہیل کبھی مجھ پر دوبارہ سے اپنا اعتبار بحال کر پائے گا۔ میں اب بھی اس کی نظر میں نامعتبر ہوں اور ہمیشہ نامعتبر ہی رہوں گی۔“ وہ اپنے نچلے لب کو بری طرح سے کچل رہی تھی۔ یہاں تک کہ سرخ رنگ کی بوند سی ٹپک پڑی۔

”پھر بھی میں ایک دفعہ سہیل سے بات ضرور کروں گا۔“ وہ گویا خود سے مخاطب تھا۔ فیفا نے اٹھ کر جوش کھاتے پانی میں پتی ڈالی۔

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے مجھے طلاق دے دی ہے۔“ عفیفا کا لہجہ زہر زہر ہو رہا تھا۔ آنکھیں برس برس کر تھک چکنے کے باوجود پھر سے برسنے لگیں۔

”تم نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔“ ماہیر کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

”نہیں، امی نے بتایا تھا اور بڑے واضح الفاظ میں بتایا تھا۔“ وہ آنکھوں کی نمی چھپانے کی غرض سے رخ موڑے کھڑے ہو گئی تھی۔ مگر بھرائی آواز اور لہجہ گویا سارا بھید کھول گیا۔

”تم نے خود تو نہیں سنا۔ پھوپھو شاید صدمے کے زیر اثر ایسا کچھ سوچ رہی ہوں گی کبھی بول بھی دیا ہو گا۔“ ماہیر کا انداز پر سوچ تھا۔

”نہیں، سو فیصد ٹھیک سنا تھا امی نے اور یہ الفاظ سن کر ہی ان کے ہاتھ سے ریسیور گرا تھا۔“

”پھر بھی فیفا! اسے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کے لیے وقت تو دینا چاہیے۔ اور اس سارے قصے کی وضاحت تو ناگزیر ہے۔ گھر بار بار نہیں بنتے اور جب ٹوٹ جاتے ہیں تو پھر ہر کوئی نقب لگانے دوڑتا ہے۔ میں — زمیلہ کے لیے کبھی ایسا سوچ نہیں سکتا اور تم زمیلہ سے الگ نہیں ہو۔ تمہاری آبادی میں میری راحت ہے تم شاد رہو، میری یہ دعا ہے۔“ ماہیر نے



بڑھ کر اس کے سر پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ضبط کے گویا سارے ٹانکے ادھڑ گئے۔ وہ ماہیر سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

”ماہیر! اس نے مجھے گالی دی۔ مجھ پر گناہ کا الزام میری ماں کی سادگی کو اس نے غلط رنگ دے کر میری ہی نظر میں دو کوڑی کا کر دیا۔ مجھے ذلتوں کے میں پھینک دیا۔“

”خود کو سنبھالو فیفا! تمہیں ان حالات کا مقابلہ کرنا خود کو مضبوط کرو۔ وقت کبھی کبھی بہت کڑے ان لیتا ہے۔ بس ثابت قدمی کی ضرورت ہوتی“ وہ اس کے سر کو نرمی سے تھپکتا ہوا بہت مضبوط میں کہہ رہا تھا۔ فیفا کے دل کو ڈھارس سی ہوئی۔

”میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وقت کس کس ائش میں مبتلا کرے گا۔“ وہ سنبھل کر آنسو پونچھتی ان سی فریج میں سے دودھ نکالنے لگی۔

”یہ دنیا ہے فیفا! اور یہاں سب کچھ کبھی ناممکن ہوتا۔ اگر کچھ انہونا ہو جائے تب بھی حیران نہیں ۔ نہ جانے کیسے کیسے قصے اور داستانیں صفحہ پر بکھری پڑی ہیں۔ جس کتاب کو بھی کھولو گی۔ الگ کہانی سامنے آئے گی۔ انوکھی، عجیب اور کن۔ یہ دنیا عجیب و غریب قسم کے واقعات سے پڑی ہے۔ تم ابھی تک شاک کی کیفیت میں ہو۔ ہو تم ہو اور اسی سوچ و بچار میں ہو کہ گھڑی دیر میں بھلا تمہارے ساتھ کیا ہو گیا ہے...... تو اس تحیر کی کیفیت سے نکل آؤ۔ حقیقت کا سامنا اگرچہ یہ تمہارے لیے بہت مشکل ہی نہیں، بھی ہے۔ مگر جب تک تم خود کو مضبوط نہیں کر پاؤ ان بگڑے حالات کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہو گا۔ ہمیشہ سے تم پر فخر رہا ہے۔ تمہارے اعصاب کی نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا ہے۔ عورت کو اسی ے اسٹرونگ ہونا چاہیے۔ مجھے امید ہے، دکھ اس فیز سے نکلنے کے بعد تم اپنی زندگی کو نئے سے سنوار لو گی۔ یاد رکھنا فیفا! زندگی کے بگاڑ اٹریکٹ نہیں کرتے۔ لوگ ہمارے دکھوں پر ہمدردی نہیں جتا سکتے۔ ہنس ضرور سکتے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے۔ اگر ہماری مرضی کے مطابق سنور نہ سکا تو اسے تم نے خود پھر سے سنوارنا ہے۔ کوشش کرو گی تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہو گا۔ زندگی بعض لوگوں کو اپنے ہی انداز میں برتتی ہے۔ بس ہمت اور صبر کا ہتھیار پاس ہونا چاہیے۔“

”تم نے ٹھیک کہا ماہیر۔“ وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔ اس کے لفظ ہمیشہ ہی فیفا کے لیے جادو اثر ثابت ہوتے تھے۔ کالج اور یونیورسٹی کا ”بیسٹ مقرر“ کا خطاب وہ اسی لیے تو حاصل کرتا تھا کہ اسے بولنے کا اور بہت اچھا بول کر مقابل کے دل میں اترنے کا فن آتا تھا۔

”گڈ گرل۔“ ماہیر بھی اس کشیدہ فضا کے اثر کو زائل کرنے کی غرض سے مسکرا دیا۔

”مجھے سہیل کا فون نمبر چاہیے۔ اور تم بھی ایک دفعہ ٹرائی کرنے کی کوشش کرنا۔“

”او کے۔“ فیفا شوکیس میں سے کپ نکال لائی۔

”تم گھر نہیں جاؤ گے۔ گیارہ بجنے والے ہیں۔ حریم بھی اکیلی ہو گی۔“

”مہمانوں کو چائے دے لوں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض کرتا ہوں کہ گیارہ نہیں ایک بجنے والا ہے۔“ وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

”کل ختم کے بارے میں کیا سوچا ہے۔“ فیفا کا دل حالیہ مسئلے کی طرف کیا آیا۔ آنکھیں پھر سے برسنے لگیں۔

”یہ چائے پکڑا آؤں پھر بات کرتے ہیں۔“ ماہیر اپنا کپ سلیب پر رکھ کر ٹرے اٹھائے باہر نکل گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ فیفا کچن سمیٹ رہی تھی۔ راحت بیگم لاؤنج میں رکھی چارپائی پر لیٹی اونگھنے لگی تھیں۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد ماہیر کے اعصاب بھی بری طرح سے تھک چکے تھے۔ اسے گھر جانے کی جلدی بھی تھی۔ نیند تو خیر کیا آنی تھی۔ بس حریم کی تنہائی کا خیال بری طرح سے ستا رہا تھا۔ اگرچہ موبی گھر میں ہی تھا مگر اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا۔

"تم نے کھانا کھایا ہے؟" ماہیر چائے کا کپ اٹھا کر مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

"ہوں۔" وہ محض اس خیال سے سر ہلانے لگی تھی کہ ماہیر کہیں اصرار کر کے کھانا نہ کھلانے کی کوشش کرے۔ فیفا کو تو کھانے کے نام سے ہی ابکائی آنے لگی تھی۔ انہی ابکائیوں نے آج اس کے سر سے چادر تک کھینچ لی تھی۔ وہ قسمت کی ستم ظریفی کا شکوہ بھلا کس سے کرتی۔

"رسم قل کے انتظام کے بارے میں پوچھ رہی تھی؟" وہ اسے موضوع کی طرف لانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ کیونکہ ماہیر اسے تفصیل بتانے لگا تھا۔

"تم فکر مت کرو۔ میں علی الصبح آجاؤں گا۔ اگر حریم کے اکیلے پن کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں نے آج ادھر ہی رک جانا تھا۔ خیر کل تو حریم بھی آجائے گی۔" ماہیر نے اسے تسلی دی تھی۔

"اور اب پلیز رونا مت یہ ٹھیک ہے کہ صبر کی تلقین کر دینا آسان ہوتا ہے۔ خود اگر اسی اسٹیج سے گزر جائے تو پھر خبر ہوتی ہے۔ بہرحال کچھ دیر کے لیے یہ ضرور سوچنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی زندگی اور اس کی موت کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اور اس وقت مقرر کا ایک لمحہ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ یہ صدمہ تمہارے لیے بھی پہاڑ جتنا ہے اور میرے لیے بھی وہ کہتے ہیں نا 'مصیبت' دراصل مصیبت جھیلنے والوں پر ہی آتی ہے اور صبر اس کی سب سے بڑی اور اعلا قسم کی دوا ہے۔ برداشت ایک بہترین ڈوز ہے۔ اللہ سے ہمیشہ بہتری کی امید رکھو۔ شکوے سے دوری ہی اصل کامیابی ہے۔"

"تم ہمیشہ اچھی باتیں کرتے ہو۔ دل میں اتر جاتی ہیں تمہاری باتیں' یاد ہے 'تمہیں' زوباریہ کہا کرتی تھی کہ ماہیر بولے تو پرندے تک رک رک کر سننے کی کوشش میں ہلکان ہوتے ہیں۔" نہ جانے کیسے اس نازک گھڑی میں زوباریہ کا ذکر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے پھسل گیا۔ فیفا لمحہ بھر کے لیے تو خود بھی ساکت رہ گئی۔ ماہیر کی خفگی کے خیال نے اس کا سر جھکا دیا۔ دل ہی دل میں وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔

"زوباریہ کے فرمان اور ارشادات کے بھلا کیا کہنے تھے۔ ایسی ایسی مبالغہ آرائی کرتی تھی کہ دیوان کالے ہو جائیں۔ مگر اس کے قصوں میں کوئی کمی نہ آئے۔" ماہیر نے بغیر برا مانے اتنے عام سے لہجے میں کہا کہ فیفا کو سچ مچ جھٹکا لگا۔

"ماہیر اور زوباریہ کے بارے میں بات کرے حیرت۔" اس کی حیرانی آنکھوں کی پتلیوں سے چھلک رہی تھی۔

"تم نے ہمیشہ اس کی محبت کو ایک قصہ ہی تو سمجھا ہے تھا ماہیر۔" گفتگو خود بخود ایک اور سمت کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ نہ فیفا کو اندازہ ہو سکا تھا اور نہ ہی ماہیر کو۔

"اسے محبت نہیں' جذباتیت کا نام دینا مناسب ہو گا۔ بھلا محبت کسی کے دل میں زبردستی گھسائی جا سکتی ہے۔" ماہیر نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ زوباریہ کی بچکانہ سی محبت کے کسی پرانے 'ماضی کا حصہ بن چکے منظر کو یاد کیا تھا۔

"اس کی محبت میں بہت شدت تھی ماہیر۔" فیفا نہ جانے کیوں ماضی کے اوراق کھول بیٹھی تھی۔ شاید اسے گفتگو کے لیے کسی موضوع کی ضرورت تھی۔ شاید وہ اپنا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔ دل کو کاٹ دینے والی سوچوں سے بچنے کے لیے اس نے گویا زوباریہ کا سہارا لے لیا۔

"شدت پسندی اور انتہا پسندی ایک ہی زنجیر کا حصہ ہیں۔ ان میں محبت بھلا کہاں فٹ ہوتی ہے۔ محبت تو نام ہے 'نرماہٹ کا' شگفتگی کا..... دلوں کو نرمی بخشتی ہے' نفرت اکھاڑ پھینکتی ہے۔ مٹھاس بھرتی ہے۔ ایثار دیتی ہے۔ ایثار لوٹاتی ہے۔ قربانی دیتی ہے۔ صبر سکھاتی ہے۔ کسی جنون کو' نوجوانی کی ضد کو بھلا محبت کا نام دینا کہاں کی سچائی ہے۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔" وہ کھل کر مسکرا دیا تھا اور یہ مسکراہٹ خاص فیفا کے لیے تھی۔ وہ چاہتا تھا۔ فیفا کا دھیان کچھ دیر کے لیے ہی سہی بٹ ضرور جائے۔



"ماہیر! تم نے کبھی اس کی محبت کو نہیں سمجھا۔ کبھی بھی نہیں۔ شاید اسے محبت کرنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ یا پھر سچائی تو یہ ہے کہ تقدیر نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔" وہ پھیکے سے انداز میں' بہت ہلکی آواز میں کہہ رہی تھی۔ یوں کہ ماہیر کی سماعتوں تک اس کی آواز پہنچ نہیں پائی۔

"ماہیر' ماہیر!" اسی پل لاؤنج میں سے راحت بیگم کی آواز ابھری۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی تھیں۔ آنکھیں مسلتے ہوئے انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر ماہیر کو پکارا۔

"جی امی!" وہ چائے کا خالی کپ سنک میں رکھ کے باہر نکل آیا۔

"تم ابھی ادھر ہی ہو۔ گھر نہیں جانا کیا؟ وقت تو دیکھو حریم گھر میں اکیلی ہو گی۔" وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئیں۔ ماہیر بائیک کی چابی جیب میں سے نکال کر تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاس رکا۔

"میں ابھی نکلنے لگا ہوں۔ آپ دروازے لاک کر کے سو جائیں۔ سویرے ان شاء اللہ آجاؤں گا اور فیفا کو اب رونے مت دیجیے گا۔" وہ انہیں تاکید کرتا ہوا باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ فیفا اس کے پیچھے ہی گیٹ بند کرنے کی غرض سے باہر چلی گئی تھی۔ راحت بیگم نے اک ٹھنڈی آہ بھر کے تکیے پر سر رکھ لیا۔ ان کی آنکھیں پھر سے نیند کی وجہ سے بند ہونے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"حریم! گھبرایئے مت' میں ہوں شاہنواز۔" حریم کی مسلسل چیخوں نے شاہنواز کو بری طرح سے بوکھلا دیا۔

"تم....." اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ ہر سو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا تھا۔ سوائے سانسوں کے شور اور مہیب خاموشی کے کوئی اور احساس زندہ نہ تھا۔

"آپ ڈر گئیں کیا؟" اب وہ اندھیرے میں ایک اندازے سے چلتا ہوا بالکونی کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی دور ہوتی آواز سے حریم اندازہ لگا رہی تھی۔ وہ یقیناً بالکونی میں رکھا ہوا جنریٹر آن کرنے گیا تھا۔ کچھ دن پہلے یو پی ایس کی بیٹری خراب ہو گئی تھی۔ ماہیر نئی بیٹری لانے کی بجائے جنریٹر اٹھا لایا تھا۔ حالانکہ اس کا شور بہت ناگوار گزرتا تھا۔ تھوڑی دیر میں پورا گھر روشن ہو گیا۔ حریم کی گویا جان میں جان آئی۔

"تم اس وقت اوپر کیوں آئے ہو؟" وہ جو اطمینان سے تخت پر بیٹھ رہا تھا حریم کی بے حد ناگوار آواز سن کر ناراضی سے بولا۔

"جنریٹر آن کرنے۔ مجھے خبر تھی کہ ماہیر اور خالہ جان گھر میں نہیں ہیں۔ جنریٹر کی بیلٹ کھینچنا بہت مشقت طلب کام ہے۔ سو میں اسی لیے آیا ہوں۔"

"تو اب چلے جاؤ' بڑی مہربانی۔" وہ تحمل سے بولی تھی۔ ویسے بھی ان چند دنوں میں شاہنواز کی شخصیت اور فطرت تقریباً" کھل کر سامنے آچکی تھی۔ وہ بہت احساس کرنے اور خیال رکھنے والا بندہ تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ خدمت خلق کے لیے ہی دنیا میں آیا تھا۔ اہل محلہ سے لے کر گھر میں روزمرہ کے کام سر انجام دیتی ماسی تک اس کے گن گانے میں رطب اللسان تھے۔ محلے کا چوکیدار اور جمعدار تک شاہنواز کے اسیر ہو چکے تھے۔

حریم تو شاہنواز کی ان خوبیوں سے قطعاً" ناواقف تھی اور جب سے اسے شاہنواز کی خوبیوں کا ادراک ہوا تھا۔ اس کے دل میں شاہنواز کی عزت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ویسے بھی وہ بہت ہمدرد انسان تھا۔ دوسروں کے بوجھ غیر محسوس طریقے سے ایسے بانٹ لیتا کہ اگلے بندے کو خبر بھی نہیں ہو پاتی۔ حریم کے کتنے ہی کام وہ بن کہے چٹکیوں سے سر انجام دے دیتا تھا۔

وہ بہت جلد راحت بیگم کی پسندیدہ ہستیوں کی لسٹ میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ راحت بیگم کو واک کروانے باہر بھی لے جاتا تھا۔ اس دوران ثریا خالہ کو بھی آفر کرنا نہیں بھولتا تھا۔

راحت بیگم سچ ہی کہا کرتی تھیں کہ شاہنواز کے دم سے ہی رونق ہے۔ ورنہ تو یہاں الو ہی بولتے۔

"اور امی آپ نے سچ کہا۔" حریم گویا کھل کر مسکرا

دی تھی۔ پہلے اسے سوچوں میں گم اور اب مسکراتے دیکھ کر شاہنواز جی بھر کے حیران ہوا۔

"امی نے کیا سچ فرمایا ہے۔" وہ بالکونی کی لائٹس اور غیر ضروری گلوب آف کر کے پھر سے تخت پر بیٹھ گیا تھا۔

"یہی کہ تم بہت اچھے ہو۔ تمہارے دم سے رونق ہے۔" وہ تیز رفتاری سے چلتے ہوئے پنکھے اور روشن روشن لاؤنج کو دیکھ کر بولی۔ اگر شاہنواز نہ آتا تو سچ مچ حریم سے جنریٹر آن کرنا بہت مشکل امر تھا۔ اس وقت وہ خوف کے عالم میں دبک کر بیٹھی ہوتی جو اگر شاہنواز نہ آتا۔

"یہ انکشاف کب ہوا؟" وہ مصنوعی حیرانی سے پوچھنے لگا۔

"تم سچ مچ بہت اچھے ہو شاہنواز!" حریم نے پوری سچائی سے اعتراف کیا۔

"اسی خوشی میں مجھے ایک کپ چائے پلا دیں۔ یقیناً" وہ دوبارہ اسی لیے بیٹھ گیا تھا کہ اسے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ بے وقت اس نے کبھی کسی کو زحمت نہیں دی تھی۔ مگر مغرب کے وقت وہ حرارت سی محسوس کر رہا تھا۔ سو چائے پی کر کئی گھنٹے سوتا رہا۔ اب بھی جسم بری طرح سے تھکن کا شکار تھا اور اس کی تھکن کو صرف چائے ہی کم کر سکتی تھی۔

"ابھی بنا دیتی ہوں۔" وہ جو وقت بے وقت اس کے کئی طرح کے کام نبٹا دیتا تھا۔ حریم کو انکار کرنا بالکل مناسب نہ لگا۔ ویسے بھی اسے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ ماہیر کے گھر آنے تک تو اسے لازمی جاگنا ہی تھا۔ سو وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ شاہنواز اس کے پیچھے کچن میں نہیں آیا تھا بلکہ اس نے دور سے ہی ہانک لگائی۔

"حریم! دو کپ چائے بنا دینا۔ ایک کپ ابھی پی لوں گا اور دوسرا بعد میں گرم کر کے پی لوں گا۔"

"بڑے سمجھدار آدمی ہو۔" حریم کو اس کی عقلمندی پر ہنسی آ گئی۔

"شکریہ جناب! اس تعریف پر بھلا کیا کہوں۔" وہ بھی عاجزی سے مسکرا دیا۔ یہ عاجزی اور انکساری بھی اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ خلوص، احسان اور ہمدردی کے کئی رنگوں کے ملاپ سے اس کی شخصیت تشکیل پاتی تھی۔ اور اس کا ہر رنگ بڑا گہرا اور اپنائیت سے لبریز تھا۔ وہ دوسروں کے درد کو، تکلیف کو بہت جلد سمجھ لیتا تھا اور پھر بساط بھر اس تکلیف کو کم کرنے کی بھی کوشش کرتا۔

"تمہارے ثریا خالہ کے ساتھ تعلقات بحال نہیں ہوئے؟" وہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ شاہنواز جانے لگا تھا مگر کچھ سوچ کر حریم نے اسے روک لیا۔

"ان کے ساتھ سفارتی تعلقات کبھی بھی بحال نہیں ہو سکتے۔" کچھ سوچ کر وہ بھی بیٹھ گیا تھا۔ اس کے خیال میں تھا کہ حریم تنہائی اور اکیلے پن کی وجہ سے اسے روک رہی ہے۔

"تم نے کبھی کوشش کی؟"

"ایک ہزار ایک مرتبہ۔ مگر اماں کی بدگمانیاں کبھی دور نہیں ہو سکتیں۔" اس کا انداز خاصا لاپروا قسم کا تھا۔

"ان بدگمانیوں کا آغاز کب ہوا؟" حریم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ابو کی دوسری شادی کے فوراً" بعد۔" وہ کب سنجیدہ ہوتا تھا۔ اب بھی لاپرواہی سے بولا۔

"مگر اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟" حریم نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ شاہنواز پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

"آپ نہیں سمجھوگی حریم! یہ کہانی تو ازل سے چلتی آ رہی ہے۔ بھلا سوکن کی اولاد کو کون سینے سے لگا سکا ہے۔ بہت کم لوگ وسیع ظرف رکھتے ہیں اور میری اماں کا ظرف تو آپ کے سامنے ہے۔"

"مگر میں تو انکل کی خاموشی پر بہت حیران ہوتی ہوں۔"

"ارے ابو۔" شاہنواز بے اختیار ہنس دیا۔

"ابو تو نہ تین میں ہیں نہ تیرہ میں۔"



"مگر کیوں؟ مرد کو اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے۔"

"چلیں، ہم اپنے بڑوں کی غلطیوں سے سبق سیکھ لیں گے۔ وہ کچھ نہیں کریں گے۔ جو پہلے دہرایا جا چکا ہے۔" اس کا انداز بے حد ہلکا پھلکا تھا۔

"ماہیر ابھی تک نہیں آیا۔" شاہنواز کی نظریں گھڑی کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

"میں بھی فکر مند ہو رہی ہوں۔ بہت ڈر لگ رہا ہے۔" بالآخر اس نے اپنے خوف کو زبان دے ہی دی تھی۔ مختلف باتوں میں الجھتے ہوئے بھی اس کا سارا دھیان ماہیر کی طرف تھا اور گھڑی کی سوئیاں بھی گویا دل کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں۔ ہر دھڑکن کے لب پر ماہیر کے بخیریت پہنچنے کی دعا تھی۔

"فکر کرنے کی کیا بات ہے۔ آپ نے فون کیا؟" وہ چائے کا کپ تخت پر رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ موبائل تو اس کی جیب میں ہے۔

"میں ابھی فون کرتا ہوں۔" وہ موبائل نکال کر ماہیر کا نمبر پریس کرنے لگا۔

"نمبر آف ہے حریم۔" اب وہ پریشان بیٹھی حریم سے مخاطب ہوا۔

"کیوں؟ خیر تو ہے نا۔" وہ حد درجہ متوحش ہو گئی۔

"ارے گھبرائیے نہیں کیا پتا موبائل کی بیٹری ڈیڈ ہو۔" شاہنواز نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

"ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ وہ موبائل ہمیشہ چارج ہی رکھتے ہیں۔" حریم کا تفکر کے مارے برا حال تھا۔ بس رونے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

"کیا پتا، مصروفیت اور پریشانی میں اسے خیال نہ رہا ہو۔" وہ حتی المقدور کوشش کر رہا تھا کہ حریم کی پریشانی کم کر سکے۔

"اگر تم کہو تو میں پتا کرنے چلا جاتا ہوں۔ نفیسہ پھوپھو کے گھر کا ایڈریس بتا دیں۔"

"وہ ہمارے گھر کے برابر میں ہی رہتی ہیں۔" حریم نے لب کچلتے ہوئے بتایا۔

"او... اچھا، میں نے سمجھا وہ بھی آپ کی طرح کہیں اور شفٹ نہ کر گئی ہوں۔ میں ابھی پتا کر کے آتا ہوں۔"

"نہیں، شاہنواز! اس کی ضرورت نہیں۔" رات کے اس پہر اپنے کسی کام سے شاہنواز کو باہر بھیجنا حریم کو قطعاً" گوارا نہیں تھا۔ تبھی تو وہ سختی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کیا حرج ہے۔ میں ابھی آدھے گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔" شاہنواز کا اصرار بھی حریم کو قائل نہ کر سکا۔ وہ ہرگز بھی کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔

"نہیں، تم ایک دفعہ پھر ٹرائی کرو۔"

"موبائل آف ہے حریم۔" ہر دفعہ ٹیپ شدہ جواب موصول ہوتا رہا تھا اور اسی پل لائٹ بھی آ گئی تھی۔ شاہنواز اٹھ کر جنریٹر آف کرنے چلا گیا۔

ایک دم ہی شاہنواز کو گزرتے وقت کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ وہ سلیپر پیروں میں اڑستے ہوئے اپنا چائے کا کپ اٹھا کر خود بھی اٹھ گیا۔

"دروازہ بند کر لیں حریم۔" جاتے جاتے اس نے تاکید بھی کی تھی۔ حریم نے سر ہلا کر پہلے کچن کی لائٹ کو آف کیا تھا۔ پھر لاؤنج کا دروازہ بند کرنے کے لیے آئی تو گیٹ پر ماہیر کی بائیک رکنے اور ہارن کی آواز سن کر اس نے سرخوشی کے عالم میں باہر جھانکا تھا۔ شاہنواز سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ بیل کی آواز سن کر فوراً" گیٹ کھولنے چلا گیا۔

ماہیر نے بے حد حیرانی کے عالم میں بیرونی سیڑھیاں اترتے شاہنواز کو دیکھا تھا۔ حریم کا چہرہ بھی اسے دکھائی دے رہا تھا۔ وہ رسمی سے انداز میں شاہنواز کے سلام کا جواب دے کر بڑے نپے تلے قدم اٹھاتا حریم تک آیا تھا۔ جس کے چہرے پر ماہیر کو اچانک دیکھ کر خوشی چمک اٹھی تھی۔

"شاہنواز اوپر کیا کر رہا تھا؟" ماہیر کا لہجہ بے انتہا سنجیدہ تھا۔ یوں کہ حریم بھی اس کے سرد انداز کو محسوس کر کے ٹھٹک گئی۔ اس کا دل پہلو میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"تو کیا ماہیر مجھ پر شک کر رہے ہیں۔" اس کے اردگرد خوفناک سوچیں پھن پھیلائے کھڑی تھیں۔

☼ ☼ ☼

زندگی کسی ایک فرد کے چلے جانے سے رک نہیں جاتی چاہے وہ کتنی ہی عزیز ہستی کیوں نہ ہو۔ جن کے بغیر سانس لینا محال ہوتا ہے۔ اک اک لمحہ گزر نہیں پاتا۔ زندگی جن کے بغیر بوجھ محسوس ہونے لگتی ہے جب وہ بچھڑ جاتے ہیں۔ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ کبھی نہ لوٹنے کے لیے ایسے سفر کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ جب نہ رہیں تو پھر بھی اس رینگتی زندگی کو آگے بڑھانے، رواں رکھنے کے لیے جینا تو پڑتا ہے۔ زندہ رہنا تو پڑتا ہے۔ جب تک سانسیں باقی ہوں۔ دھڑکنیں زندہ ہوں۔ رگوں میں دوڑتا خون رواں ہوں۔ تب تک خود کو زندہ رہنے والوں میں شمار کرتے ہوئے خود کو زندگی کا احساس دلانا ایک مجبوری بن جاتی ہے۔ اہل زمین ___ سے کٹ کر بھی تو نہیں رہا جا سکتا۔ اگر ایسا ہو جائے تو وجود کھوکھلے اور دل دیمک زدہ ہو جاتے ہیں اور جسم خاکی خوراک کے ایندھن سے چلتا ہے اور اس ایندھن کی فراہمی کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانا بے حد ضروری ہوتے ہیں۔ گھر بیٹھے من و سلویٰ تو اترنے سے رہا۔ پیٹ کے دوزخ کو بجھانے کے لیے، معاملات زندگی کو پہلے کی طرح رواں کرنے کے لیے، اس نے دھیرے دھیرے ہی سہی اپنی بکھری اور ریزہ ریزہ ہوتی ہمتوں کو مجتمع کر ہی لیا تھا۔ بالآخر اسے ایسا کرنا ہی تھا۔

وقت کی بے رحم کروٹ پر عفیفا نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی یہ دنیا ایسے ایسے حیران کن، تعجب انگیز واقعات کی بھرمار سے بھری پڑی تھی۔ یہاں کچھ بھی انوکھا یا انہونا نہیں ہوتا۔ ہر چیز کی انتہا تک بھی توقع کی جا سکتی تھی۔

اگرچہ سہیل کے بے رحمانہ اور سفاکانہ قسم کے یکطرفہ فیصلے نے فیفا کی روح تک کو زخمی کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ایک آس سی دل کے ارد گرد لپٹی کرلاتی رہتی تھی۔ شاید اسے یقین تھا کہ امی کو کچھ سننے میں مغالطہ ہوا ہو گا۔ ماہیر کے احساس دلانے پر وہ پھر سے پر امید ہو چکی تھی۔ ماں کی ناگہانی موت کو امر خداوندی تسلیم کر کے اس نے صبر اور شکر کا دامن پکڑ لیا تھا۔ اب صرف دل نادان خوش فہمیوں کے ہنڈولوں میں جھول رہا تھا۔

ہر عورت کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کا گھر ٹوٹنے سے بچ جائے۔ وہ طلاق جیسے خوفناک قسم کے داغ سے بھی خوفزدہ تھی اور یہ دھبا ایسا بدنما تھا کہ دنیا کے کوئی بھی اسم اس داغ کو دھو نہیں سکتا تھا۔ مطلقہ عورت کو جو مقام اس معاشرے نے دے رکھا تھا۔ اس سے عفیفا مختار نابلد تو نہیں تھی۔

سہیل سے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے متعلقہ نمبر سارے آف تھے۔ وہ ایک اچھی کمپنی میں بطور ڈیلر کام کرتا تھا۔ اس کی سیلری اور پوسٹ بھی اچھی تھی۔ اس حساب سے اسے آفس کی طرف سے فری رہائش بھی میسر تھی مگر عفیفا کو پریشانی نے اس لیے بھی گھیرے میں لے رکھا تھا کہ سہیل کے گھر کا نمبر بھی مسلسل آف جا رہا تھا۔

گزشتہ پوری رات وہ سہیل کے پرسنل نمبر پر ٹرائی کرتی رہی تھی اور صبح اٹھتے ___ ہی نماز فجر کے بعد اس نے پہلا کام سہیل کے گھر میں موجود فون پر کال کرنے کا کیا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی، کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ مگر آواز کسی اجنبی عورت کی تھی۔ فیفا کا دل بری طرح سے دھڑکنے لگا۔

”سہیل سے بات کروا دیں۔“

”کون سہیل؟“ دوسری طرف سے حیران حیران آواز ابھری۔

”یہ فلیٹ سہیل کا نہیں؟“ عفیفا نے خوفزدہ سے انداز میں پوچھا۔

”ہم کسی سہیل کو نہیں جانتے۔“ رکھائی سے کہتے ہوئے وہ خاتون شاید فون رکھنے لگی تھی جب فیفا سرعت سے بول اٹھی۔

”آپ کون ہیں؟“

”اس گھر کے نئے مکین ہیں۔ شاید پہلے کوئی سہیل



یہاں رہتا ہو گا۔ تاہم یہ فلیٹ اب ہمارا ہے۔“ فون کھٹاک کی آواز کے ساتھ بند کر دیا گیا تھا۔ فیفا کے پیروں تلے سے گویا دھیرے دھیرے زمین سرکنے لگی۔

”سہیل کہاں چلے گئے ہیں؟ مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ یا اللہ میں کیا کروں؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب دل کچھ سنبھل گیا تو اس نے سہیل کی کمپنی کے ہیڈ آفس فون کر کے سہیل کے متعلق معلومات لیں۔ انفارمیشن آفیسر نے ریکارڈ چیک کر کے بتایا تھا کہ سہیل ڈیڑھ ماہ پہلے دوبئی چلا گیا تھا۔ یہ جاب اس نے چھوڑ دی تھی۔ شاید اسی سلسلے میں وہ مصروف بھی تھا۔ دوبئی میں اس نے اپنا ذاتی کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ اسی وجہ سے وہ عفیفا کو فی الحال اپنے پاس نہیں بلوا رہا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ پوری طرح سے سیٹلڈ ہونے کے بعد وہ فیملی کو اپنے ساتھ رکھے گا۔ جو بھی تھا۔ سہیل کی خاموشی فیفا کے سارے خدشات کی تصدیق کر رہی تھی۔

یہ اسی دوپہر کی بات تھی۔ فیفا گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ عصر کے بعد وہ قریبی اکیڈمی میں جاب کے متعلق بات کرنے جائے گی۔ اکیڈمی کی پریذیڈنٹ امی کی جاننے والی تھیں۔ سو فیفا کو یقین تھا کہ اسے جاب ضرور مل جائے گی۔

وہ صحن دھو رہی تھی جب فون کی بیل سنائی دینے لگی۔ وہ وائپر ہاتھ سے پھینک کر تقریباً بھاگتے ہوئے فون تک پہنچی تھی۔ دل تھا کہ مچل مچل کر پسلیاں توڑنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ ریسیور تھاما۔ اس کا خیال ___ تھا کہ شاید سہیل کا فون ہو گر مگر کال تو کسی دفتری نمبر سے آ رہی تھی۔ جس کمپنی میں اس نے انٹرویو دیا تھا۔ وہاں سے اسے کال کی گئی تھی۔ فیفا تو اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی پر سجدے میں گر گئی تھی۔

اسے اگلے دن جوائن کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ سو اسی حساب سے وہ روزمرہ کے کام نبٹانے کے بعد نماز پڑھ کے قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگی تھی۔ امی کی روح کو تلاوت قرآن پاک کرنے کے بعد ایصال ثواب پہنچانا اس کے معمول میں شامل ہو گیا تھا۔

کچھ دن پہلے جب راحت بیگم واپس جانے لگیں تو انہوں نے فیفا کو ہر ممکن کوشش کی تھی۔ ساتھ لے جانے کی مگر وہ اپنی ماں کے گھر کو لاک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دوسرے اسے یہ بھی پتا تھا کہ ماموں لوگ خود کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ اور وہ پورشن بھی اتنا کھلا نہیں تھا۔ گنتی کے کمرے تھے۔ وہ اپنی وجہ سے کسی کو تکلیف میں مبتلا نہیں کر سکتی تھی۔ ماہیر کے کئی دفعہ سمجھانے پر بھی اس نے اپنے گھر میں رہنے کو فوقیت دی تھی۔

اگلی صبح وہ مقررہ وقت پر آفس پہنچ گئی تھی۔ اسے سیکرٹری کی جاب کے لیے اپائنٹ کیا گیا تھا۔ پہلے دن جو شیڈول اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ ہرگز بھی قابل اعتراض یا ٹف نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح سے کام کے حوالے سے بریفنگ دی گئی تھی سو وہ مطمئن ہو کر پوری دلجمعی کے ساتھ کام میں محو ہو چکی تھی۔ پہلے روز ہی اسے اسٹاف سے متعارف بھی کروا دیا گیا تھا۔ ویسے بھی فیفا کی کھانے ملنے والی نیچر نہیں تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔

جاب کے تیسرے روز وہ اپنے باس کے بارے میں جان پائی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے یہ چہرہ دیکھا دیکھا لگ رہا تھا۔ بہرحال کام کے حوالے سے وہ مطمئن تھی سیلری بھی اطمینان بخش تھی۔

پرابلم تھی تو صرف یہ کہ اس کی ٹیبل زرجان صاحب کے کمرے کے ایک کونے میں رکھی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا کیبن الگ کر دیا جائے۔ مگر فی الحال ایسی کوئی ڈیمانڈ کرنا حماقت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ویسے بھی زرجان آفس میں جتنی دیر موجود رہتا تھا اس کا دھیان صرف اور صرف اپنے کام کی طرف ہوتا تھا۔ اس کی نظروں نے کبھی بغاوت نہیں کی تھی۔ وہ اپنی نظر پر پورا کنٹرول رکھتا تھا۔ ویسے بھی دفتر کے لوگ زرجان کے گن گاتے تھے۔

فیفا سے زرجان کی بات صرف کام کے حوالے

سے ہوتی تھی۔ پہلے روز بھی زرجان نے اسے کام کے حوالے سے کافی کچھ سمجھایا تھا۔ فیفا کو اس کا مہذب اور شائستہ انداز بہت بھایا تھا۔ وہ آفس کے ہر ورکر سے ہی بڑے مہذب انداز میں گفتگو کرتا تھا۔

اس صبح زرجان معمول سے کچھ پہلے آگیا تھا۔ فیفا دس منٹ بعد پہنچی تھی۔ دراصل فیفا کو زرجان سے کچھ پہلے آفس پہنچنا ہوتا تھا۔ وہ دن بھر کا شیڈول تیار کر کے زرجان کی ٹیبل پر رکھ دیتی تھی۔ یوں کہ زرجان کو پھر اسے مخاطب کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی مگر آج اس سے کچھ برعکس ہی ہوا۔ فیفا جب روم میں داخل ہوئی تو زرجان پہلے سے ہی موجود تھا۔ اس کی نظریں اپنے لیپ ٹاپ پر تھیں۔ فیفا کے سلام کا جواب بھی اس نے سر ہلا کر دیا۔

"آج آپ لیٹ ہو گئیں؟" وہ مصروف سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"نہیں سر! آج آپ جلدی پہنچے ہیں۔" فیفا نے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا پرس اور ضروری چیزیں ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا....." وہ بغیر اختلاف کیے سر ہلانے لگا۔

"آج میری گھڑی نے جلدی آٹھ بجا دیے ہیں۔"

"بہت اچھا مذاق ہے۔" فیفا نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ جلدی جلدی کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگی تھی۔ اس کی نظریں کمپیوٹر اسکرین پر تھیں۔

"سر! آج آپ کو خواجہ اسجد کے ساتھ میٹنگ طے کرنا تھی۔"

"ہوں..... اس پروگرام کو کینسل کر دیں۔ آج ہمیں سائٹ پر جانا ہو گا۔ فیکٹری ایریا میں کچھ پرابلمز کی اطلاعات مل رہی ہیں۔"

"سر! خواجہ اسجد کی کالز بھی آرہی تھیں۔" فیفا نے سی ایل آئی چیک کی تو مسڈ کالز کی ایک لائن نظر آرہی تھی۔

"خواجہ سے ملاقات، بہت ضروری ہو گئی ہے۔" زرجان کی پیشانی پر تفکر نما سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد اسے سائٹ پر جانا تھا مگر ہنی کی فون کال نے اسے پھر سے الجھا دیا۔

"زرجان! آپ کہاں ہیں؟" وہ بہت بے قراری سے پوچھ رہی تھی۔

"خیریت ہنی! تم ٹھیک تو ہو۔" زرجان بے حد فکر مند ہو گیا تھا۔ ہنی کی آواز بھرا رہی تھی۔ یقیناً" وہ بہت اپ سیٹ بھی تھی۔

"زرجان! میں بہت بیمار ہوں۔ بہت اکیلی ہوں۔ مجھے آپ سب کی ضرورت ہے زرجان! آپ لوگ کیوں چاہتے ہیں کہ میں سسک سسک کر مر جاؤں۔" وہ بری طرح سے سسک رہی تھی۔ زرجان بے حد بوکھلا گیا۔

"ہنی! پلیز، خود کو سنبھالو۔"

"آپ اس وقت کہاں ہیں؟"

"میں آفس میں ہوں۔" زرجان بہت دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ اگر — لہجے کو دھیما نہ کرتا تب بھی عفیفا تک اس کی آواز نہیں پہنچ پاتی۔ ویسے بھی اس کی توجہ کام کی طرف تھی۔ وہ اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو کر کام کرتی تھی۔

"گھر کب جائیں گے؟"

"ابھی کچھ پتا نہیں۔"

"مما کہاں ہیں؟" ہنی بے صبرے پن سے پوچھ رہی تھی۔

"وہ اپنے آفس میں ہیں۔ شاید ان کی آج میٹنگ بھی ہے۔ آج کل میں وہ تمہارے پاس آنے والی ہیں۔" زرجان نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

"کب آئیں گی!؟"

"عنقریب، تم فکر مت کرو۔" وہ اسے لفظوں سے بہلانا چاہتا تھا۔ مگر وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ہنی ایک میچور لڑکی ہے۔ خود مختار ہے۔ اگر من مانی پر اتر آتی تو یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ خاموش تھی تو صرف ماں کی وجہ سے۔ اپنی ماں کو دکھ دینے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مگر ممی تھیں کہ اس کے



بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتی تھیں اور یہاں کی مصلحت آمیز خاموشی کی سمجھ بھی نہیں آتی تھی۔ جو بھی تھا۔ وہ تنہا رہتے رہتے تنگ آچکی تھی۔ اس بھاگتی دوڑتی زندگی اور کانچ کے اس اجنبی شہر سے اکتا چکی تھی۔ اسے واپسی کے راستوں پر پلٹنا تھا۔ مگر جس راہ پر اس کا قدم بڑھتا تھا۔ وہ ہی اجنبی ہو جاتا۔ زندگی میں اس نے بہت کم لوگوں پر بھروسہ کیا تھا۔ بہت کم لوگوں سے دل کے راز شیئر کیے تھے۔ اپنی ماں کے علاوہ دوسرا رازدار شیری تھا جو اسے امریکہ کی ایک اجلی صبح اپنے برابر بیٹھا دکھائی دیا تھا اور وہ بغیر سوچے سمجھے اس پر اعتبار کرنے لگی تھی اور اب شیری کا منظر سے ایک دم غائب ہو جانا بھی اس جیسی شدت پسند لڑکی کو بری طرح سے توڑ پھوڑ گیا تھا۔ وہ رشتوں کے معاملے میں بہت زیادہ شدت پسند تھی۔ مگر مسئلہ بھی یہ تھا کہ اسے بہت کم رشتے میسر آئے تھے اور جو پاس تھے 'قریب' تھے۔ ہمیشہ سے ہی برسوں کی دوری پر نظر آتے تھے۔ اتنے فاصلے درمیان میں موجود تھے کہ قربتوں کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔

اور یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ رشتوں کے معاملے میں وہ ہر درجہ مفلس تھی اور محبتوں کے معاملے میں تو بالکل ہی قلاش۔

"آپ کب تک مجھے جھوٹے بہلاوے دیتے رہیں گے زرجان۔" وہ غصے سے چلا اٹھی۔

"ممی سے کہہ دیں، کوئی ضرورت نہیں اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے میرے پاس آنے کی۔ میں بھی ان سے ملنے کے لیے ترس نہیں رہی ہوں۔"

"ہنی! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" زرجان نے اپنے ازلی نرم لہجے میں کہنا چاہا۔

"آپ کچھ نہیں جانتے زرجان! آپ کو کچھ خبر نہیں۔ جو زہر میری رگوں میں اتر چکا ہے نا۔ اس کی کسی کو خبر نہیں ہو سکتی۔" وہ ٹوٹ کر شاید بکھر رہی تھی۔ اور اسے سمیٹنے والا کوئی نہیں تھا اور جب ضبط کے ٹانکے ادھڑ گئے تو ہنی نے خود ہی لائن ڈس کنیکٹ کر دی۔ زرجان نے تھکے تھکے انداز میں ریسیور رکھ دیا تھا۔ جو شگفتگی اور تازگی وہ صبح صبح محسوس کر رہا تھا۔ ایک دم ہی گویا اس کا اثر زائل ہو کر رہ گیا تھا۔ بے پناہ تھکن اس کے وجود میں اتر کر رہ گئی تھی۔ عفیفا نے بہت دفعہ نوٹ کیا تھا کہ زرجان کا اچانک موڈ بدل گیا ہے۔ آف ٹائم سے کچھ پہلے وہ فیکٹری ایریا سے مین آفس آگئے تھے۔

"آپ کو ڈرائیور گھر چھوڑ دے گا۔" وہ ڈرائیور کو ضروری ہدایات دے کر خود لفٹ کے ذریعے تھرڈ فلور پر پہنچ گیا تھا۔ عفیفا سر ہلا کر نیچے آگئی۔

ڈرائیور اسے گھر ڈراپ کر گیا تھا۔ گیٹ کے پاس کھڑے ہو کر اس نے چابی نکال کر لاک کھولا تھا جب پڑوس کا ایک بچہ بھاگتا ہوا فیفا کے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں سفید رنگ کا ایک لفافہ بھی تھا۔

"عفیفا باجی! یہ ڈاکیا دے کر گیا ہے۔" بچے نے لفافہ فیفا کے ہاتھ میں تھمایا اور خود یہ جا وہ جا۔

"کیا ہے؟" فیفا حیران نظروں سے لفافہ الٹ پلٹ کر کے دیکھنے لگی۔ یوں ہی لاؤنج تک آتے آتے اس نے لفافہ چاک کر کے کھولا۔ تین چار کاغذات تہ شدہ برآمد ہوئے تھے۔ فیفا کی نظریں گویا کاغذات پر منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے فولڈ شدہ پیپر پلٹ کر دیکھا۔ اس کے دماغ نے زوردار قسم کا چکر کھایا تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا آسمان اور زمین برابر گھومتے جا رہے ہیں۔ اس کا دل بری طرح سے متلانے لگا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بڑی دقتوں کے بعد اس کے کپکپاتے لب ہولے سے پھڑپھڑائے۔

"سہیل نے مجھے طلاق دے دی۔ ہائے امی! آپ کی سادگی اور غلط فہمی نے میرے کردار کو داغدار کر دیا ہے۔ ہائے، میں مر کیوں نہیں گئی۔ یا اللہ! یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا؟" وہ تیورا کر زمین پر گرتی چلی گئی۔

"آپ مجھ پہ شک کر رہے ہیں ماہیر۔" اس کا لہجہ برف کی طرح ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔ ماہیر جو اس کے برابر چلتا ہوا بیڈ روم میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک دم ٹھٹک کر ناک کی سیدھ میں چلتی حریم کو دیکھنے لگا۔

"شک...... کیسا شک؟" ماہیر کا لہجہ سادہ سا تھا تاہم وہ اس کی بات کے مفہوم کو اچھی طرح سے سمجھ چکا تھا۔

"آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ شاہنواز کے حوالے سے۔" حریم کے وضاحتی انداز میں بھی کانچ چیخ رہے تھے۔ وہ چونک سا گیا۔ ٹائی کی طرف بڑھتے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے رک گئے۔ وہ جو صوفے پر اطمینان سے بیٹھ رہا تھا۔ ایک دم سیدھا ہو گیا۔

"شک اور تم پر؟" ماہیر کا ٹھٹکنا بھی فطری تھا۔

"شاہنواز جنریٹر آن کرنے کے لیے اوپر آیا تھا۔" وہ خشک سے لہجے میں وضاحت کر رہی تھی مگر ماہیر نے کون سا کوئی بھی وضاحت اس سے طلب کی تھی۔ البتہ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ عام سے لہجے میں شاہنواز کے بارے میں کیا گیا سوال حریم کو جذباتی طور پر دھچکا پہنچادے گا۔

"اسے خدمت خلق کا کریز ہے۔" ماہیر نے ہلکا سا مسکرا کر ٹائی کی ناٹ کو ڈھیلا کیا۔ اب وہ جھک کر جوتوں کے لیسز کھول رہا تھا۔

"آپ کو برا لگا؟" حریم نہ جانے کن خدشات کو خود پر حاوی کر چکی تھی۔

"برا کیوں لگے گا۔ تم نے اچھا کیا' شاہنواز کو بلوا کر جنریٹر آن کروا لیا۔ بیلٹ خود سے کھینچنے کی غلطی مت کرنا۔" ماہیر کا انداز تنبیہی تھا۔

"میں نے شاہنواز کو نہیں بلوایا تھا۔" ماہیر کا نرم اور سادہ لہجہ اسے پھر سے پرسکون کر چکا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔ وہ خود جنریٹر آن کرنے اوپر آیا ہو گا۔ وہ ایک ہمدرد دل رکھتا ہے۔" ماہیر اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ فریش ہو کر واپس آیا تو حریم کو ابھی تک گم صم سا کھڑا دیکھ کر چونک گیا۔ وہ دبے پاؤں حریم کے قریب آیا تھا۔

"حریم! کیا سوچ رہی ہو؟"

"آپ خفا ہیں مجھ سے۔"

"خفا مگر کیوں؟" ماہیر نے اس کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اسے اپنی طرف گھما لیا۔

"میں تم سے خفا نہیں ہو سکتا اور شک کا تو سوال ہی نہیں۔"

"اچھا۔" وہ گویا پھول کی طرح ہلکی پھلکی ہو گئی۔

"کھانا لاؤں؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ......" وہ کپڑے اٹھا کر واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ واپس آیا تو حریم پہلے سے ہی کمرے میں موجود تھی۔

"تم زرجان کے ساتھ آئی ہو؟" وہ صوفے پر دھپ سے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"جی' مگر آپ کو کس نے بتایا ہے؟" وہ جگ اٹھا کر گلاس میں پانی ڈال رہی تھی۔ لمحہ بھر کو رک کر اس نے ماہیر کی طرف دیکھا تھا۔

"زرجان نے۔" وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"زرجان نے' مگر کیسے؟ کیا آپ کی زرجان سے ملاقات ہوئی ہے؟" حریم کی آنکھوں میں تحیر در آیا۔

"ہوں۔" ماہیر نے محض سر ہلایا تھا۔

"وجہ پوچھ سکتی ہوں۔" اس کا انداز سرسری قسم کا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بھلا زرجان سے ماہیر کو کیا کام ہو سکتا ہے۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ زرجان بھی ماہیر سے ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔

"کچھ آفیشل پرابلم ہے۔ زرجان سے ڈسکشن کرنا تھی۔" ماہیر نے مختصر لفظوں میں وجہ بتادی تھی اور حریم اس کے ٹرانسفر کے آرڈر سن کر بے حد پریشان ہو گئی۔ ایک طرف وہ ماہیر کی اس قدر زرجان سے بے تکلفی پر حیران تھی اور دوسری طرف حالیہ مسئلے نے اسے حد درجہ متوحش کر دیا تھا۔

"ماہیر! آپ اگر کراچی چلے گئے تو ہمارا کیا بنے گا۔ امی' منیب اور میں۔" وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ منیب اور امی کو سنبھالنا اس کے بس کا روگ نہیں۔

"اسی سلسلے میں تو زرجان سے بات کی ہے۔



اللہ کچھ نہ کچھ تو کرلوں گا۔ بہرحال تم فکر مند نہ ہو۔ میں کم از کم اتنی جلدی تمہیں چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔" آخر میں اس کا انداز کافی شریر قسم کا ہو گیا۔

"اور میں آپ کو جانے بھی نہیں دوں گی۔" اس نے بڑی چاہ سے ماہیر کو میٹھی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"اللہ بھی کیسے کیسے دل موہ لینے والے چہرے بناتا ہے۔ جس بھی دل کی سلطنت پر چاہیں' عمر بھر راج کرتے رہیں۔" وہ دل ہی دل میں سوچتی رہی۔

"اگر لے کر جانے والے مجبور کرنے لگے یا پھر انہوں نے زبردستی کرلی تو پھر؟" ماہیر کی روشن آنکھوں میں شرارت بھر گئی۔

"بھلا کون؟" حریم نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"وہ ہی جو سب کو لینے آجاتے ہیں۔" ماہیر ہنوز غیر سنجیدہ تھا۔

"ماہیر۔" وہ سمجھ کر گویا چلا اٹھی۔

"خبردار' جو آپ نے فضول بات کر کے مجھے رلانے کی کوشش کی۔"

"جانا تو سبھی کو ہے میری جان۔" وہ ٹرے کھسکا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

"جلد یا بدیر' سبھی کو رخت سفر باندھنا ہے۔" حریم کی لمبی چوٹی کے کچھ بال ماہیر کے ہاتھ لگ گئے تھے اور اس نے چوٹی کے آخر میں بالوں کو سمیٹنے کی غرض سے لگایا گیا بینڈ اتار کر صوفے کی طرف اچھال دیا تھا۔ اس کے ہاتھ اب چوٹی کے بل دھیرے دھیرے کھول رہے تھے۔

"مگر میں تو کراچی جانے کی بات کر رہی ہوں۔" وہ سخت ناراضی کے عالم میں گویا ہوئی۔

"اور میں دنیا سے جانے کی بات کر رہا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں ابھی تک شرارت کے دیے ٹمٹما رہے تھے۔ وہ حریم کو محض ستا رہا تھا۔ چھیڑ رہا تھا۔

"فار گاڈ سیک ماہیر۔" وہ دبی آواز میں چیخی۔

"اچھا...... ایک بات تو بتاؤ۔" ماہیر نے کچھ سوچ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا؟" وہ ٹرے میز کی طرف کھسکا کر سیدھی ہو گئی یوں کہ ماہیر کا چہرہ اب اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

"فرض کرو...... اگر میں نہ رہا تو۔" وہ بہت تول تول کر بول رہا تھا۔

"ماہیر!" حریم کو لگا صرف چند پل کے لیے زمین اپنے مرکز سے ہٹ گئی ہے۔

"آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں کیا میری جان نکالیں گے۔" حریم کی آنکھوں کے فرش نمکین پانیوں سے گیلے ہوتے چلے گئے۔

"میں تمہارے بغیر' اس دنیا میں بھی اور اس دنیا میں بھی ہمیشہ ادھورا رہوں گا حریم! مگر اس کے باوجود میں ہمیشہ قائم دائم رہنے والی اس سرسبز دنیا میں تمہارے ساتھ کا کبھی بھی خواہش مند نہیں رہوں گا۔ میں تمہیں کسی عہد میں ہرگز نہیں باندھنا چاہتا۔ میں نہ رہا تو تم میری محبت اور میرے نام سے آزاد ہو جاؤ گی۔ خود کو میرے نام سے باندھ کر مت رکھنا۔ میں ماہیر عالم صرف اور صرف تمہیں ہمیشہ کے لیے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" ماہیر کے گرم ہاتھ نے حریم کے سرد ہاتھ کو تھام کر نرمی سے دبایا تھا اور حریم گویا ایک دم مشتعل ہو کر رہ گئی۔

"آپ' ماہیر! آپ چاہتے ہیں کہ میں مر جاؤں۔" وہ دھواں دھار رونے لگی تھی۔

"ارے یار! کیا ہوا۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔" ماہیر کو سنجیدگی کا چولا اتارنا ہی پڑا تھا۔ اس کے آنسو ماہیر کو بوکھلائے دے رہے تھے۔

"حریم جان! بس کرو' پلیز یار! چپ ہو جاؤ نا۔" وہ اس کے آنسو پونچھتا ہوا بے حد متفکر بھی تھا۔ اس کی ناراضی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ دل تھا کہ ابھی تک قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

"جنت میں بھی دم چھلا بنی رہنا۔ ہائے ہماری قسمت' سوچا تھا یہاں نہ سہی' وہاں تو پسند ناپسند کا اختیار دیا جائے گا۔ اپنی مرضی سے کسی حور شمائل کا انتخاب کریں گے مگر واہ رے نصیب۔" ماہیر نے مصنوعی ٹھنڈی آہ بھری۔

"اتنی آہیں بھرنے کی ضرورت نہیں۔ جنت میں تو

میں خود ہی آپ کو لفٹ نہیں کرواؤں گی۔" حریم روتے روتے ہنس پڑی تھی۔ یوں لگ رہا تھا گویا سورج کے تھال کے سامنے بدلیوں نے چادر تان لی ہے۔

"تمہاری بے مروتی کا تو یہ دل ازل سے گواہ ہے۔" ماہیر نے پھر سے آہ بھری۔ حریم تو اس الزام پر تڑپ اٹھی۔ وہ مسکرایا اور پھر کچھ سوچ کر قدرے سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"ہمارا جنا منا کب تک آجائے گا؟"

"بس تھوڑا ہی وقت باقی ہے۔" حریم آن کی آن میں ڈھیروں لاج تلے دب گئی۔ ماہیر کی آنکھوں میں انتظار کے ستارے جھلملانے لگے تھے۔

"پتا ہے حریم! میری زندگی کی دوسری بڑی خواہش کون سی ہے؟"

"بھلا کون سی؟" حریم نے سر جھکائے ہوئے ہی پوچھا تھا۔ پلکوں کی جھالریں حیا سے بوجھل تھیں۔ جھکی نظر اٹھنے کا جواز ڈھونڈ رہی تھی۔ اس پل ماہیر کی طرف دیکھنا اسے دنیا کا سب سے مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔

"اپنے بچے کا چہرہ دیکھنا۔ اسے ہنستے مسکراتے دیکھنا۔ میری خواہش ہے کہ وہ ہر لحاظ سے صحت مند و پرفیکٹ ہو ہر قسم کی جسمانی کمی سے پاک ہو۔ وہ میری نسل کا امین ہو گا۔ ماہیر عالم کی نسل اس سے آگے بڑھے گی۔ میری دعا ہے' خدا ہمیں اولاد کے معاملے میں اس آزمائش سے بچائے جو میرے ماں باپ کی زندگیوں کو دیمک کی طرح چاٹ گئی ہے۔ اب بھی کوئی عیب اس خاندان میں نہ پیدا ہو۔" حریم نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا نہ جانے کب ایک ننھا سا ستارہ ماہیر کی آنکھ کے کونے سے ٹوٹ کر کہیں گر پڑا۔

"اور پہلی بڑی خواہش کیا تھی؟" حریم اس کے لب و لہجے کی افسردگی محسوس کر کے ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

"تمہیں پانے کی' تمہیں پا لیا تو سیراب ہو گیا۔ اب یہ دل مزید تمناؤں سے خالی ہے۔ کسی اور کی طلب نہیں۔" سچائی نے اس کی آنکھوں اور چہرے کو تابناکی بخش دی تھی۔ دل تو اس کے اظہار پر اوس میں بھیگ رہا تھا۔

"اچھا آپ بھی ایک بات بتائیں؟" کچھ سوچ کر اس نے گفتگو کا رخ موڑا۔

"پوچھیں۔" وہ بھی گویا نیند کی دیوی کو بھگا کر بیٹھا تھا۔ بہت ہی فرصت کے عالم میں۔

"خدانخواستہ میں آپ سے دور چلی جاؤں' اتنا دور کہ واپسی کے راستے کھوٹے ہو جائیں۔ کھو جائیں ہو جائیں۔ مجھے آپ تک آنے میں پل صراط سے گزرنا پڑے۔ یا پھر وقت ہمارے درمیان دوری بھر دے۔ زندگی کا سفر ہمیں تنہائیوں کے عذاب بخش دے۔ ایسا کچھ ہو جائے۔ جو دل کو درد کے سفر کا مسافر بنا دے۔" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہتی چلی گئی۔

"تو پھر کیا' تمہاری فرقت کے عذاب میں جینا' تو بھلا جینا؟ یا دل ہار دیں گے یا جان ہم سے دور جانا زندگی سے دور چلے جانے کے برابر ہے۔"

"اللہ نہ کرے۔" وہ دہل کر رہ گئی۔

"یوں دہلنے سے کام نہیں چلے گا۔" ماہیر نے کسی خوف کے زیر اثر بیٹھی حریم کو محبت پاش نظروں سے دیکھا۔

اسے پٹڑی سے اترتا دیکھ کر حریم نے موضوع گفتگو ہی بدل دیا۔

"زمیلہ کب تک جا رہی ہے؟"

"اس ہفتے کے آخر میں۔" ماہیر نے سرسری انداز میں بتایا تاہم حریم کو فطری سا دکھ ہوا۔

"اتنی قریب کی ڈیٹ ہے اور مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"امی نے تمہیں نہیں بتایا۔" ماہیر بھی چونک سا گیا۔

"نہیں۔" اس کا سر بے اختیار نفی میں ہل گیا۔

"شاید ان کے ذہن سے بات نکل گئی ہو گی۔" ماہیر کا انداز وضاحتی قسم کا تھا۔ ویسے بھی ماں اور بہن کی بات کو چھپانے والی عادت اسے پسند نہیں تھی۔

"امی نے زمیلہ کے لیے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔ اگر تمہیں بھی کچھ چاہیے تو منگوا لینا۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" حریم نے کروٹ بدل لی تھی۔ آن کی آن میں دل دکھ کے احساس تلے دب گیا تھا۔

"کیا ہوتا اگر امی مجھے بھی بتا دیتیں۔ میں بھی زمیلہ کے لیے کچھ خرید لیتی۔ نہ جانے کیوں امی اس قدر وہمی ہیں۔" اسے پورا یقین تھا کہ امی کی توہم پرستی والی عادت نے زمیلہ کو بھی وہمی بنا دیا تھا۔ وہ بھی ہر بات چھپا چھپا کر رکھتی تھی۔ کوئی نظر نہ لگا دے۔ کوئی حسد کرے۔

"حریم! کیا ہوا! کیا نیند آ رہی ہے؟" کچھ دیر بعد حریم نے اپنے شانوں پر ماہیر کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا تھا۔

"ہوں۔" حریم کی آواز بھرا رہی تھی مگر ضبط کا دامن اس نے بالکل نہیں چھوڑا تھا۔

"مگر مجھے تو نہیں آ رہی اور میں تمہیں بھی سونے نہیں دوں گا۔" ماہیر نے کہنی کے بل ذرا سا اونچا ہو کر حریم کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

"آپ نے صبح دفتر نہیں جانا؟" اس نے بمشکل لہجے کو بشاش ظاہر کیا۔

"بھاڑ میں گیا دفتر۔" اس نے زبردستی حریم کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

"کیا ہوا ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"کیا چھپانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی ہو؟ کیا ہوا؟" وہ سیاہ کٹوروں میں موجود پانی دیکھ چکا تھا۔

"نہیں تو۔" حریم صاف مکر گئی۔

"ایک بات کہوں حریم۔" ماہیر کچھ پل سوچنے کے بعد سنجیدگی سے بولا۔

"تم امی اور زمیلہ کے رویوں پر مغموم مت ہوا کرو۔" حریم کی آزردگی کی وجہ وہ سمجھ چکا تھا۔ اکثر اپنی ماں کی زیادتیوں کو جانتے بوجھتے' دیکھتے' سمجھتے بھی نظر انداز کر دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں مینٹلی اپ سیٹ ہے اور شاید حریم اس وجہ کو ہرگز نہیں جانتی تھی جس نے راحت بیگم کے ذہن کو بری طرح سے منتشر کر دیا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حریم بہت حساس ہے اور اس کی حساسیت اسے ذرا ذرا سی باتوں پر بھی رلا دیتی ہے۔ تکلیف دیتی ہے اور اس کی یہ تکلیف وہ کم نہیں کر سکتا تھا۔ نہ تو امی اپنی گفتگو اور ذہن کو بدل سکتی تھیں۔ طنز کرنے اور غصہ دکھانے سے باز آ سکتی تھیں اور نہ ہی حریم کڑھنا چھوڑ سکتی تھی۔

مگر اس وقت نادانستہ حریم کے دل میں اک پھانس سی جا چبھی تھی اور اس پھانس کی چبھن ماہیر کے دل تک بھلا کیسے نہ پہنچتی۔ حریم بالکل خاموش تھی۔ اور اس کی خاموشی ماہیر کے دل میں بے قراری بھر چکی تھی۔ اس نے نرمی سے حریم کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ ماہیر کو ایک دم جھٹکا سا لگا۔ اس کی انگلیوں کی پوروں کو نمی نے چھو لیا تھا۔ ماہیر نے اس کا چہرہ زبردستی اپنی طرف موڑا۔

"حریم! رو رہی ہو؟"

"نہیں تو۔" وہ فوراً" آنکھیں پونچھتے بولی۔

"یار! امی کے رویوں کو دل پہ مت لیا کرو۔" ماہیر نے گویا التجا کی تھی۔

"کم از کم آپ تو بتا دیتے۔ مجھے امی اور زمیلہ سے شکوہ نہیں۔ آپ بھی غیر سمجھتے ہیں۔ کچھ بتانا گوارا نہیں کرتے۔" اس نے ناراضی سے جتایا۔

"بس' مجھے بھی خیال نہیں رہا۔" وہ کان کھجانے لگا تھا۔

"اچھا' سوری معاف کر دو نا۔"

"معافی نہیں مل سکتی۔"

"ہائے یہ غضب مت ڈھانا۔" ماہیر نے دہائی دی تھی۔

"مجھے تو تمہارے بغیر نیند نہیں آتی اور ناراضی میں تم بستر الگ کر لیتی ہو۔" اس کی دہائیاں بھی اپنی جگہ درست تھیں۔ حریم کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی۔

وہ حریم کو ایک دفعہ پھر باتوں میں مصروف کر چکا تھا۔ وہ حریم سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہر طرح کی فکر اور پریشانی سے خود کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔ نہ

جانے کیوں اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ دھیرے دھیرے ایک شکنجہ اس کے گرد تنگ کیا جا رہا ہے اور وہ بری طرح سے اس شکنجے میں پھنسنے والا ہے۔ یہ ایک الجھی گتھی تھی جسے وہ جتنا سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی قدر الجھتی جا رہی تھی اور محترمہ فلک ناز کی ذات بھی اس کے لیے ایک معمہ تھی۔ اس کی یادداشت میں بھی اس نام کی کوئی خاتون موجود نہیں تھی۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ حریم سے اس بات کا ذکر کرے پھر خود ہی ارادہ بھی بدل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ حریم حسب معمول فکریں پالنا شروع کر دے گی۔ حالانکہ حریم سے ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان بھی اس کا ذہن خواجہ اسجد کی گفتگو کے درمیان الجھتا رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی ناؤ کیسے کیسے خطرناک طوفان کی زد میں آنے والی ہے۔

"کہاں کھو گئے؟" حریم نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرائے۔

"کہاں کھو سکتا ہوں۔ تمہاری آنکھوں کے ان سمندروں کے علاوہ۔" وہ سنبھل کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ حریم کو خوامخواہ کھانسی آ گئی۔

"جناب بھی شاعرانہ گفتگو کا فن رکھتے ہیں۔"

"اور بھی بہت سی خوبیاں موجود ہیں۔ کبھی فرصت کے لمحے دان تو کر کے دیکھیں۔ مزید بھی بہت کچھ آشکار ہو گا۔" ماہیر اس کی پیشانی پر دھیرے دھیرے شہادت کی انگلی پھیر رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کسی کا نام لکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ حریم سے رہا نہ گیا تو پوچھنے لگی۔

"کیا لکھ رہے ہیں ماہیر۔"

"اپنا نام۔" ماہیر اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"وہ تو پہلے سے ہی لکھا جا چکا ہے۔" حریم شادمانی سے مسکرا دی۔

"کچھ اور لکھ رہے ہیں کیا؟"

"ہوں۔" اس نے محض ہنکارا بھرا۔ سوچ کی رانی اس کی گہری آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ اسی لیے انداز بھی کھویا کھویا سا تھا۔

"بھلا کیا؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

"ماہی۔" ماہیر کے لبوں نے ہولے سے جنبش کی۔

"ماہی۔" وہ اور بھی حیران ہوئی تھی۔

"ماہی یعنی ماہیر عالم؟" اس نے کچھ چونک کر ماہیر کی طرف دیکھا تھا۔

"ماہی آپ کو بھلا کون کہتا تھا؟ کون اس نام سے مخاطب کرتا تھا؟ کون ماہی کے نام سے بلاتا تھا آپ کو؟"

"کوئی بھی تو نہیں۔" ماہیر ایک دم چونک گیا۔

"جھوٹ تو نہ بولیں۔" اس کے لہجے میں بلا کی چبھن در آئی۔

"میں کیوں جھوٹ بولوں گا۔" ماہیر کے لب و لہجے میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ واضح محسوس ہو رہی تھی۔ تبھی تو حریم کچھ اور بھی ٹھٹک گئی۔ اس نے آنکھوں کو ہلکا سا میچ کر بغور ماہیر کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اگرچہ سپاٹ تھے تاہم آنکھوں میں ہلکا سا اضطراب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس اضطراب میں پوشیدہ ایک بند داستان کے نوحوں کی آواز شیشے کے ایک محل سے آ رہی تھی۔ کسی کی درد میں ڈوبی آواز اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جگہ بہتا خون قطرہ قطرہ گر رہا تھا۔

"مگر آپ اس وقت جھوٹ بول رہے ہیں۔" اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

"کیا مطلب؟" ماہیر کی آنکھوں میں ہلکی سی ناگواری در آئی۔

"آپ کس کے ماہی ہو۔" اب وہ زیر لب مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ماہیر نے کچھ الجھ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر دیر تلک دیکھتا رہا۔ شاید حریم کے چہرے پر لکھی کوئی تحریر پڑھنا چاہتا تھا۔

"زوباریہ درانی کے نا۔" وہ پوچھ نہیں رہی تھی۔ بلکہ بڑے واضح لفظوں میں بتا رہی تھی۔ جتا رہی تھی۔ وہ اسے حد درجہ الجھا بھی رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے۔ زوباریہ کون تھی؟" ماہیر نے بڑے ہی ٹھہرے رواں لہجے میں پوچھا تھا۔ اس کے

لہجے میں تجسس پوشیدہ نہیں تھا۔ مگر جو کچھ تھا' وہ اس قدر عام بھی نہیں تھا۔ بہت خاص تھا۔

"شاید ہاں' شاید نہیں۔" وہ دائیں بائیں سر ہلا رہی تھی۔

"کبھی کبھی لگتا ہے کہ میں ازل سے اسے جانتی ہوں اور کبھی یوں لگتا ہے کہ میں اسے سرے سے نہیں جانتی۔ بھلا زوباریہ درانی ہے کون؟" اس کا انداز بہت کھویا کھویا سا تھا۔ قدرے اجنبی اجنبی سا۔

"تمہیں نہیں پتا کیا؟" اس نے دیکھا تھا' ماہیر کے چہرے کے تاثرات کچھ پرسکون ہو رہے تھے۔

"زوباریہ درانی بھلا کون ہے؟" وہ زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔

"بھلا کون ہے؟ کون ہے؟" اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ بڑی واضح تھی۔ عیاں ہوتی' ظاہر ہوتی' کچھ کہتی' کچھ بولتی۔

"زوباریہ درانی کیا تھی؟ ایک آہن گر' مگر ماہیر عالم کو قید نہیں کر سکی۔ اسے قید کرنا اور جکڑنا نہیں آتا تھا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ جوان بخت یا اقبال مند نہیں تھی۔ مگر وہ تھی کیا؟ گرفتار محبت' گرفتار عشق یا گرفتار جنوں۔" اس کی بولتی آنکھوں میں مچلتے سوالوں نے گھڑی بھر کے لیے ماہیر عالم کے دل کی دھڑکن کو بے ترتیب کر دیا تھا۔

"تم زوباریہ کو جانتی ہو؟" وہ سانس روکے پوچھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"خالہ جان! کہاں جا رہی ہیں۔" دھپ دھپ سیڑھیاں اترتے شاہنواز کی نظر ہانپتی کانپتی راحت بیگم کی طرف اٹھی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ خالہ جان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ راحت بیگم کی آنکھیں شاہنواز کو دیکھ کر چمک اٹھی تھیں۔ آج ان کا ارادہ فیفا کی طرف جانے کا تھا۔ کافی دن ہو گئے تھے وہ فیفا کی خیریت معلوم کرنے نہیں جا سکی تھیں۔ ماہیر کے پاس وقت کی کمی تھی۔ دوسرے وہ رات کو بہت دیر سے گھر آتا تھا۔ سو وہ ماہیر سے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کر سکی تھیں۔

کل شام سے ہی وہ ارادہ باندھ چکی تھیں کہ صبح ہوتے ہی فیفا کو اک نظر دیکھنے ضرور جائیں گی۔ ہفتے کے باقی ماندہ دن بہت مصروفیت کی نذر ہونے تھے۔

زمیلہ کے باہر چلے جانے کے دن قریب تھے۔ نا صرف وہ زمیلہ کے لیے خریداری کر رہی تھیں بلکہ ان کی خواہش تھی کہ زمیلہ کے جدہ جانے سے پہلے ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام بھی کریں گی۔ انہیں بیٹی کا مان بڑھانا آتا تھا۔ دوسرے وہ بھرے پرے سسرال میں رہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ زمیلہ کسی کے طنز یا تحقیر کا نشانہ بنتی رہے۔ اور وہ لوگ خوامخواہ زمیلہ کو کریدتے رہیں کہ جاتے سمے ماں معمولی سی دعوت کا اہتمام بھی نہیں کر سکی۔ اس سلسلے میں وہ ماہیر سے پہلے ہی بات کر چکی تھیں اور ماہیر ماں کی خواہش پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے کافی رقم چپکے سے انہیں تھما چکا تھا۔ اس اضافی رقم سے وہ زمیلہ کے لیے اور نبیل کے علاوہ ان کے ہونے والے بچے کے لیے بھی بہت کچھ خرید چکی تھیں اور بہت کچھ خریدنا ابھی باقی تھا۔ ہمیشہ کی طرح یہ تمام تر خریداری چپکے چپکے کی گئی تھی۔ اپنی عزیز از جان سہیلی ثریا جہاں کو بھی نہیں بتایا تھا چونکہ ثریا جہاں پیٹ کی خاصی ہلکی تھیں۔

اس وقت وہ سفید چکن کے شلوار قمیص میں بالکل تیار کھڑی تھیں۔ اور ان کی تیاری سے شاہنواز اندازہ لگا چکا تھا کہ یقیناً" وہ کہیں جا رہی ہیں۔ اسی حساب سے اس نے فوراً" اپنی خدمات پیش کر دی تھیں اور حسب معمول راحت بیگم نہال ہو کر رہ گئیں۔

"لبوں پر سچ مچ یہی دعا تھی کہ کاش شاہنواز گھر میں ہی ہو...... دیکھو' کیسی قبولیت کی گھڑی تھی۔ فرشتے کی طرح تم چھت سے اتر آئے۔" خوشی کے مارے ان کی سفید رنگت دہک اٹھی تھی۔ ایک تو رکشے میں دھکے کھانے اور پھٹ پھٹ کی ناپسندیدہ آواز کے علاوہ کرائے کی بھی بچت ہو گئی تھی۔ سو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔

"چھت پر کیا فرشتے رہتے ہیں خالہ جان۔" بڑی معصومیت سے پوچھا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ جیبیں بھی ٹٹولی جا رہی تھیں۔ یقیناً" بائیک کی چابی کی تلاش جاری تھی۔

"تو اور کیا' تمہارے جیسے فرشتے۔" وہ ایک دفعہ پھر سے نہال ہو گئیں۔

"نہ خالہ جان! مجھ مسکین کو انسان ہی رہنے دیں۔ مجھے فرشتوں سے خاصا ڈر لگتا ہے۔ خصوصاً" اس فرشتے سے جو میری دلاری اماں کے ہٹّے پر ہاتھ دھرے گا اور اماں جان ہمیشہ کے لیے اس خوب صورت پودوں اور درختوں والے گھر کو ویران کر جائیں گی اور ان کے چلے جانے کے بعد یقیناً" یہ سرسبز و شاداب اونچے درخت اور یہ پھول پودے بھی گویا سکھ کی سانس لیں گے۔ جنہیں اماں کے مبارک ہاتھوں نے آج تک کبھی پیار سے نہیں چھوا اور یہ چپس زدہ فرش جو سال کے بارہ مہینے گرد و غبار اور درختوں کے گلے سڑے پھل' چرمرے' بے جان' سوکھے پتوں سے اٹا رہتا ہے۔ جسے کبھی صاف کرنے کی توفیق نہیں کی گئی۔ حتیٰ کہ ماسی تک نے اسے دھونے کی اور رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس گھر کے در و دیوار تک خوشی کے مارے لرز لرز جائیں گے جب خیر سے اماں صاحبہ کا کوچ کا وقت آئے گا۔ تب ان جالوں سے اٹی چھتوں اور دیمک زدہ الماریوں کو کوئی ملال تو نہ ہو گا کہ ایک خاتون کی موجودگی کے باوجود دیمک انہیں بری طرح سے چاٹ رہا ہے۔" شاہنواز کی فراٹے بھرتی زبان کو ثریا جہاں کی گولی کی طرح لہراتی جوتی بھی روک نہیں پائی تھی۔

"میں نے کچھ غلط کہا ہے اماں جان۔" شاہنواز نے معصومیت کے گویا سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔

"ستیاناس' تیرا شاہ ہے۔" ثریا جہاں جلبلا کر رہ گئیں۔

"قبر سے اٹھا کر لے آؤ' رباب آرا کو گھر بھر کی صفائی ستھرائی کر جائے۔ کم بخت ذرہ بھر لحاظ نہیں کرتا اور زبان کے آگے تو گویا خندق ہے۔ چلنے پر آتی ہے تو رکتی نہیں۔"

"کیوں بہشتن کی روح کو تڑپاتی ہیں اماں! ایسا نہ ہو بے چاری رات کو آپ سے ملاقات کرنے ہی آ جائیں۔" وہ بھی تو شاہنواز تھا' کبھی وار خالی نہیں جانے دیتا تھا۔ اور ویسے بھی اسے بائیک کی چابی نہیں مل رہی تھی۔ ساری جیبیں ٹٹول چکا تھا۔ دراز تک کھنگال لیے تھے۔ اب واشنگ مشین کے پاس کھڑا تھا۔ اور گندی شرٹس کی پاکٹس ٹٹولی جا رہی تھیں۔

"اللہ نہ کرے۔" اماں حسب معمول دہل اٹھیں۔

"ذرا زبان سنبھال کر بات کیا کرو۔"

"اماں! زبان بھی کسی مست دوشیزہ کی طرح ہے۔ سنبھالے نہیں سنبھلتی۔" اس نے مشین کو ٹھڈا مارا تھا۔ اب وہ باورچی خانے کے دراز کھول کر دیکھ رہا تھا۔ مگر چابی وہاں ہوتی تو ملتی۔ خیر سے ثریا جہاں کے گھٹنے کے نیچے دبی پڑی تھی اور وہ بھی اس کی جھنجلاہٹ سے حظ اٹھا رہی تھیں۔ راحت بیگم بھی اسے تلاش و بسیار میں مگن دیکھ کر بیٹھ چکی تھیں۔

"اماں! آپ نے چابی تو نہیں دیکھی۔" ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے اماں کی طرف رجوع کیا۔

"مجھے کیا خبر' میرے ہاتھ میں پکڑا کر جاتے ہو۔" وہ بھی صاف مکر گئی تھیں۔

وہ چابی کی تلاش کا ارادہ ترک کر کے کچن میں گھسا جام شیریں بنانے لگا تھا۔

ادھر راحت بیگم بھی جلی بیٹھی تھیں۔ نظر گویا گھڑی کی سوئیوں میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ واپس آ کر انہوں نے زمیلہ کے سسرال کا چکر بھی لگانا تھا۔

وہ جگ اور گلاس اٹھائے کچن سے باہر آیا تھا۔ ایک گلاس بھر کے راحت بیگم کی خدمت میں پیش کیا تھا اور دوسرا ثریا جہاں کے۔

وہ پورا جگ خالی کر چکا تھا اور ایک دفعہ پھر اسکوٹر کی چابی تلاش کی جا رہی تھی۔

"شاہ بیٹا! تم تردد نہ کرو۔ میں رکشا کروا لیتی ہوں۔" گھڑی کی آگے بڑھتی سوئیوں کو دیکھتے ہوئے راحت بیگم نے تحمل سے کہا تھا۔ ادھر ثریا جہاں بھی

بری طرح سے چونک گئیں۔

"تم کہیں جارہی ہو؟"

"آپ کو نیا نکور چکن کا سوٹ پہننے کا مقصد دکھائی نہیں دے رہا۔ خالہ جان کہیں جانے کے لیے تیار بیٹھی ہیں اور ماہدولت انہیں ساتھ لے جانے کی آفر کر چکنے کے بعد اب بائیک کی چابی کو رو رہے ہیں۔" شاہنواز کی بھنائی سی آواز سنائی دی تھی۔

"تو پہلے بتانا تھا نا کہ راحت کو کہیں لے کر جانا ہے۔" ثریا جہاں نے گویا دانت پیس لیے تھے۔

"بتانے سے بھلا کیا حاصل۔" شاہنواز نے ٹھنڈی آہ بھرلی۔

"آپ سے کسی نیکی کے کام کی امید کی جاسکتی ہے۔"

"تمہاری نیکیوں کے تو گویا رجسٹر بھرے پڑے ہیں۔" وہ جل کر رہ گئیں۔

"نیکیوں کے یہ رجسٹر ایک دو آپ بھی مجھ سے ادھار لے لیجیے۔ شاید تب ہی آپ کا دل تھوڑا پسیج جائے اور بائیک کی چابی آپ مجھے دے دیں۔"

"میرے پاس کہاں سے آئی اس لڑکے کا دماغ دیکھو خوامخواہ الزام لگا رہا ہے۔" انہیں گویا تپ چڑھ گئی تھی۔

"تمہارے ابا سے شکایت لگاتی ہوں۔" ان کا انداز دھمکانے والا تھا۔

"ابا بے چارے اسی کام کے لیے تو رہ گئے ہیں۔ ویسے پیاری اماں! میرے بے مثل 'لاثانی' بے نظیر ٹائپ کے ابا کو ہماری جنگ میں شمولیت کی دعوت مت دیا کریں۔ وہ بے چارے تو نہ ایک میں ہیں نہ گیارہ میں ہیں۔" اس نے گویا ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ سوکن کی اولاد بھی سوکن ہوتی ہے بلکہ سوکن سے بڑھ کے۔" انہوں نے فتوا دے دیا تھا۔ شاہنواز کو بے تحاشا ہنسی آگئی۔ شاہنواز نے گویا خوب ہی لطف لیا۔ اگرچہ اسے احساس تھا کہ خالہ جان بار بار پہلو بدل رہی ہیں۔ گھڑی کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ مگر مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ اماں سے چابی کے بارے میں اگلوا کر ہی جانا چاہتا تھا۔ خالہ جان کو چھوڑ کر اس نے اپنے ایک دوست کی والدہ کی احوال پرسی کی غرض سے ہسپتال جانا تھا اور بڑی پرابلم یہ تھی کہ شاہنواز کو گدھے اور رکشے کی سواری ایک برابر لگتی تھی۔ اور ان دونوں کی خدمات سے وہ بری طرح سے خار کھاتا تھا۔

"تم تو ہو ہی ناشکرے۔ بے فیض' پالنے پوسنے کا اچھا صلہ دیتے ہو۔ چار لوگوں کے درمیان بے عزت کر کے رکھ دیتے ہو۔" انہوں نے خوامخواہ کی رقت خود پہ طاری کرلی۔

"تم نے کبھی ڈھنگ کی بات کی ہے۔ میرے ساتھ فساد ڈال کے بیٹھ جایا کرو۔ آج تک یہ نہیں ہوسکا۔ کوئی ڈھنگ کی لڑکی ڈھونڈ کر شادی کرلیتے۔ مجھے بھی کچھ سکھ کی سانسیں میسر آتیں۔"

"اپنی پسند سے شادی کرلیتا اور آپ مجھے اور میری بیوی کو اٹھا کر گھر سے باہر پھینک آتیں۔ اتنا نا سمجھ تو نہ سمجھیں مجھے۔" شاہنواز رباب والے جھوٹے قصے کا حوالہ دے رہا تھا۔ انہوں نے گویا ناک پر سے مکھی اڑائی تھی۔

"ڈھنگ کی لڑکی سے شادی کر کے دکھاؤ تو مانوں۔ جو سگھڑ ہو' سلیقہ مند ہو' گھر سجانا' بنانا اور سنوارنا جانتی ہو۔ گھر کی آرائش و زیبائش کرنے والی ہو' دانش مند ہو' دانا ہو' فہم رکھتی ہو' خاندان برادری ہو۔ جس کی کسی چمارن کو پکڑ لے آؤ گے تو اس کا تو میں حشر نشر کردوں گی۔" انہوں نے اپنے نیک ارادوں سے اسے اچھی طرح سے آگاہ کردیا تھا۔ کب سے خاموش تماشائی بنی راحت بیگم کو بھی بالآخر بولنا پڑا۔

"تم بھی تو کوشش کرو۔ خیر سے شاہ ہے کی شادی کی عمر ہے۔ میرے ماہیر سے صرف تین دن ہی تو بڑا ہے۔"

"تو اور کیا۔" شاہنواز بھلا کیوں خاموش رہتا۔

"ویسے خالہ جان! اماں کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میرے لیے لڑکی تلاشنے کا۔"

"اماں کی تو جان بخشو۔" ان کا پارہ پھر سے چڑھ گیا۔





"ہماری پسند کی لڑکی تمہیں کہاں بھا سکتی ہے۔" ان کا لہجہ حسرت زدہ سا ہو گیا تھا۔

"غم نہ کھائیں اماں! بہو تو آپ کی چن کر لاؤں گا بالکل سورج کی طرح ہو گی۔" شاہنواز کو الٹا سیدھا ہانکنے کی عادت تھی۔ اب وہ بڑے لاڈ سے اماں کے گرد بازو حمائل کر کے بیٹھ گیا تھا۔

"لوگ چاند جیسی لڑکی ڈھونڈتے ہیں اور ہمارے لڑکے کی مت ماری گئی ہے۔ آگ اگلتے گولے کو اٹھا کر گھر لے آئے گا تاکہ جس کے بھی منہ لگے اسے جلا کر راکھ ہی کردے۔ بھئی مجھے ایسی بہو نہیں چاہیے۔" انہوں نے تنک کر کہا ساتھ راحت بیگم سے پوچھا۔

"کہاں جارہی ہو؟"

"جانا تو فیفا کی خیریت پوچھنے تھا۔ مگر نہ جانے کس منحوس گھڑی میں کرایہ بچانے کے لالچ میں ادھر آگئی تھی۔" وہ جل کر بولی تھیں۔

"دیکھا اماں! ناراض کردیا ہے نا' خالہ جان کو۔" شاہنواز بھی روٹھ گیا۔

"یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔"

"میں نے بھلا کیا کیا ہے؟" وہ حیران ہی تو رہ گئیں۔

"آپ نے کچھ نہیں کیا۔ سارا قصور آپ کے اس گھٹنے کا ہے۔ جس کے نیچے اسکوٹر کی چابی دبی ہے۔"

"ہیں.... کہاں؟" وہ اچھل کر پیچھے ہٹی تھیں۔ اس قدر اچانک کہ چابی شاہنواز کی نظروں کے سامنے آگئی تھی اور اس نے بہت پھرتی کے ساتھ چابی اٹھالی۔

"بہت سنبھال کر رکھی تھی اماں آپ نے۔ تھینک یو ویری مچ.... یو آر گریٹ ماں! آئی لو یو سو مچ" وہ ان کے ماتھے کو چومتا لمحے کے ہزارویں حصے میں باہر کی طرف لپکا تھا جہاں راحت بیگم رکشے والے سے حساب کتاب میں الجھ رہی تھیں۔

"خالہ جان! آجایئے۔" وہ سیاہ گلاسز لگائے مسکرا رہا تھا۔

"توبہ' یہ ثریا تو مقابلہ لگا کے بیٹھ جاتی ہے۔" راحت بیگم خوب جل رہی تھیں۔ شاہنواز ہنوز مسکراتا رہا۔ پورے سفر میں راحت بیگم جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی منزل بھی آگئی۔

"آپ کا کافی وقت ضائع ہوا ہے۔ اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔"

"ارے' نہیں تو۔" وہ خوامخواہ شرمندہ ہو گئیں۔ شاہنواز نے بائیک سے اتر کر ڈور بیل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ ایک حسینہ روئی روئی آنکھیں لیے نمودار ہوئی تھی۔ ماتھے پر سلوٹیں سجائے۔ خشک ہونٹوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا چیخ کر بولی تھی۔

"قبرستان کے مردوں کو جگانا تھا؟" اس کا اشارہ ڈور بیل کی طرف تھا۔ شاہنواز نے کچھ پشیمان ہو کر ہاتھ فوراً" ہٹالیا۔

"اگر میرے بیل بجانے اور شور کرنے پر ہمارے پیارے اٹھ سکتے تو اس سے بڑی بھلا کیا خوش نصیبی تھی۔ بہرحال نفیسہ خالہ کی وفات کا بہت دکھ ہوا ہے۔ افسوس تو بہت چھوٹا لفظ ہے مگر پھر بھی اس کے بغیر پرسہ مکمل نہیں ہوتا۔ چلتا ہوں' خالہ جان کو چھوڑنے کے لیے آیا تھا۔" وہ گیٹ کے سامنے سے ہٹ گیا تھا تاکہ راحت بیگم کو فیفا دیکھ سکتی۔ ادھر فیفا اتنے دن بعد کسی اپنے کی صورت دیکھ کر گویا صبر اور ضبط کی تمام ترطنابیں چھوڑ بیٹھی تھی۔ مامی کے سینے سے لگی' دھاڑیں مار مار کر روتی فیفا ایک دم ہی ان کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

"ہائے اللہ۔" وہ ہوش و حواس سے بے گانہ فیفا کو دیکھ کر گھبرا اٹھیں۔ ادھر شاہنواز پھر سے بائیک لیے پلٹ آیا تھا۔ راحت بیگم کی چیخ نما آواز بھی وہ سن چکا تھا اور فیفا کو بھی راحت بیگم کے بازوؤں میں جھولتے اس نے دیکھ لیا تھا۔

"خالہ جان! کیا ہوا؟" وہ تیزی سے ان کے قریب چلا آیا۔

"فیفا بے ہوش ہو گئی ہے۔" ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ شاہنواز نے آگے بڑھ کر احتیاط سے فیفا کو سہارا دیا تھا اور پھر اسی احتیاط سے اٹھا

کر اندر لے آیا۔

”خالہ جان! آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔“ اس نے حسب معمول بری طرح سے حواس باختہ راحت بیگم کو تسلی دی تھی اور پھر تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ حالانکہ اس کے قدموں کے نیچے بہت سے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مسلے جارہے تھے تاہم اس کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ جا بجا بکھرے ان کاغذ کے ٹکڑوں پر کچھ غور کر لیتا۔ جبکہ راحت بیگم فیفا کے منہ پر پانی چھڑکتے ہوئے بھی حیرانی سے پورے لاؤنج میں بکھرے ان ننھے ننھے کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اسی پل پڑوس سے ایک عورت اور بچہ آگیا تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ وہ لاؤنج کی ابتر حالت اور جا بجا بکھرے کاغذات کو دیکھ کر اپنا تجسس چھپا نہیں پائی تھیں۔

”ارے، آپ کو نہیں پتا۔“ پڑوس سے آئی عورت نے تحیر کے مارے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔ راحت بیگم کا بے اختیار سر نفی میں ہلتا چلا گیا۔

”بہن جی! عفیفا کو اس کے شوہر نے طلاق نامہ بھجوا دیا ہے۔ ہائے، ہائے چند دنوں کی بیاہی کے ماتھے پر داغ سج گیا۔“ پڑوسن اب خوب خوب تاسف کا اظہار کر رہی تھی۔ سہیل کو کوسے جارہی تھی۔ جبکہ راحت بیگم تو ٹھنڈی ٹھار ہو کر رہ گئی تھیں۔ اور لاؤنج کے دروازے میں کھڑا شاہنواز بھی حق دق بکھری بکھری سی اس ہوش سے بے گانہ لڑکی کو دیکھے جارہا تھا۔ جس کی مانگ کے سارے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئے تھے۔ اور اس کے سیاہ بالوں والے سر پر ذلتوں کی دھول اڑنے والی تھی۔ ادھر پڑوسن کہے جارہی تھی۔

”سنا ہے۔ اس کے شوہر نے بدکرداری کے الزام میں عفیفا کو طلاق دی ہے۔ تبھی تو ماں بھی صدمے سے مر گئی۔“ ایک تیز آندھی کے بگولوں میں ذلتوں کی گرد اڑ رہی تھی۔ اڑتی جارہی تھی اور اس کی چبھن نے کئی آنکھوں کو زخم زخم کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

”سہیل سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔ اتنا کان کا کچا مرد۔“ راحت بیگم سہیل کو غائبانہ کوس چکنے کے بعد اب ٹھنڈی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ شاہنواز ڈاکٹر کو اس کے کلینک تک چھوڑنے کے لیے گیا تھا۔ فیفا کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی اور وہ خود پر ٹوٹنے والی قیامت کا سارا متن من و عن سنا کر گویا تھک کر بیٹھ گئی تھی۔ آنکھیں بھی آنسو بہا بہا کر خشک ہو چکی تھیں۔

”میں اب تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گی۔ سامان سمیٹو اور میرے ساتھ چلو۔“ وہ گویا فیصلہ کر چکی تھیں۔ عفیفا نے کچھ چونک کر راحت بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ ایکدم بے حد مضطرب ہو گئی تھی۔

”مگر ماں! میں کیسے جا سکتی ہوں۔ گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ میرا وہاں رہنا کسی بھی طور مناسب نہیں۔“

”کیوں مناسب نہیں۔“ وہ خفگی سے سر جھٹک کر رہ گئیں۔

”گھر کو لاک کرو۔ ضروری سامان بیگ میں بھرو اور اٹھو میں تمہیں لیے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ وہ گویا پختہ ارادہ کر چکی تھیں۔ ویسے بھی وہ تو پہلے ہی فیفا کے تنہا اتنے بڑے گھر میں رہنے کے حق میں نہیں تھیں۔ مگر انہیں فیفا کے اصرار اور ضد کی وجہ سے ماننا ہی پڑا تھا۔ تاہم اب وہ بالکل بھی اسے اس گھر اور محلے میں نہیں رہنے دینا چاہتی تھیں۔

”اٹھ بھی چکو..... رات گہری ہو رہی ہے۔ شاہنواز کو بھی دیر ہو جائے گی۔“ ان کے اصرار بلکہ ضدی انداز پر بالآخر عفیفا کو اٹھنا ہی پڑا۔ جلدی جلدی ضرورت کی چیزیں اکٹھے کرتے کرتے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے تھے اور ساتھ ساتھ راحت بیگم کی فکر بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

”ابھی تک شاہنواز نہیں آیا۔“ انہوں نے کوئی دسویں دفعہ یہی بات دوہرائی تھی۔ بھلا عفیفا اس بات کا کیا جواب دیتی۔ بس اثبات میں سر ہلا کر سامان سمیٹتی رہی۔

”ذرا فون تو کرو نہ جانے کہاں رہ گیا ہے۔“ وہ



بے حد فکر مند بھی تھیں۔

”نمبر بتائیں۔“ وہ خاموشی سے موبائل اٹھا لائی۔

”نمبر تو مجھے یاد نہیں۔“ انہوں نے پر سوچ انداز میں عفیفا کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ اسی اثنا میں شاہنواز بولتا ہوا چلا آیا۔

”خالہ جان! آج کی پوری رات کیا تیمارداری ہی کرنا ہے۔ واپس جانے کا کیا ارادہ نہیں ہے؟“

”الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ خود نہ جانے کہاں رہ گئے تھے۔ ہم تو کب سے انتظار میں بیٹھے ہیں۔“ وہ شاہنواز کو دیکھ کر کھل اٹھی تھیں۔

”کیسا ذمہ دار بچہ ہے۔ لینے بھی آگیا۔“ انہوں نے دل سے سوچا۔

”ہیں..... بھلا کون چور؟“ شاہنواز چونکا۔

”آپ نے مجھے چور کہا۔ ہائے، خالہ جان! آپ سے تو یہ امید نہیں تھی۔ آپ نے تو مجھے چور بنا دیا۔ ہائے جن پر تکیہ تھا، وہی پتے ہوا دینے لگے۔“

”توبہ ہے شاہنواز۔“ راحت بیگم بے اختیار ہنس پڑیں۔

”میں نے تو محاورہ بولا ہے۔“

”او، سمجھ گیا۔ پہلے وضاحت کر دیتیں۔ میرا ڈیڑھ پاؤ خون تو نہ جلتا۔“ شاہنواز گویا ٹھنڈی سانس خارج کی۔

”ان کے لیے چائے لاؤں۔“ وہ اجازت طلب نظروں سے راحت بیگم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اب گھر آئے مہمان کو بغیر چائے پانی کے بھیجنا بد اخلاقی کے زمرے میں آتا تھا۔ مہمان بھی ایسا جو کہ ڈاکٹر کی فیس کے علاوہ دوائیاں وغیرہ بھی اپنے پاس سے لایا تھا۔

”ضرور لے آئیے۔ نیکی کرنے سے پہلے پوچھتے نہیں۔ ویسے میں چائے پیتا تو نہیں آپ اگر اصرار کرتی ہیں تو پی لوں گا۔“ اس سفید جھوٹ پر راحت بیگم ہکا بکا رہ گئیں۔ شاہنواز تو لیٹر کے حساب سے چائے پیتا تھا۔ ہر آدھے گھنٹے بعد اسے چائے کی طلب ستانے لگتی تھی۔

”تم نے چائے پینا چھوڑ دی ہے بیٹا۔“ وہ سادگی سے پوچھ رہی تھیں۔

”بس خالہ جان! کوشش کر رہا ہوں۔ پہلے آدھے گھنٹے بعد پی لیا کرتا تھا۔ اب انتالیس منٹ بعد پیتا ہوں۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ ڈیڑھ کپ چائے پیوں، پورے دو کپ نہ ہی پیوں مگر پھر رہا نہیں جاتا۔“ اس کا لہجہ راحت بیگم سے بھی زیادہ سادگی لیے ہوئے تھے اور فیفا کو اس بلا کی سادگی پر بے اختیار ہنسی آگئی تھی۔ چائے کے اس نشئی کے لیے وہ فل سائز مگ بھر کے لائی تھی جسے پکڑتے ہوئے شاہنواز کی آنکھوں سے تشکر چھلک پڑا۔

”آپ تو اپنی مزاج آشنا لگتی ہیں۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھے سر کو تھوڑا خم دے کر بولا۔

”کہاں رہ گئے تھے تم؟ میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی۔“ راحت بیگم نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے پوچھا۔

”اپنے دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ میں نے سوچا، آپ کھل کر عفیفا سے دکھ سکھ کر لیں۔ میرے سامنے تو یہ جھجک کا شکار رہیں گی۔“ وہ بڑے سلیقے کے ساتھ گفتگو کو کسی بھی طرف موڑ سکتا تھا۔

”ویسے میری بات کا غصہ مت کیجیے گا۔ یہ بات میں پورے خلوص کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ کسی بھی غم کو خود پر اس حد تک طاری نہیں کرتے کہ زندگی بوجھ ہی لگنے لگے۔“

”کوئی کیا جانے۔ کیسے کیسے گھاؤ لگے ہیں بچی کے ناتواں دل میں۔“ راحت بیگم آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

”وقت کی تیز آندھی کیا کچھ اڑا کر لے گئی۔“

”کوئی کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا نہ آندھیاں نہ طوفان بس کنڈیشنز (حالات) کو بدلنے کا حوصلہ خود میں ہونا چاہیے۔ بیسٹ ٹروتھ یہ ہے کہ زندگی نہ تو کسی کے مر جانے سے ختم ہوتی ہے نہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے سے۔ آپ کی اپنی ذات خاص ہے۔ کسی اور کے لیے نہ سہی خود آپ کے لیے اور اس زندگی کو رب تعالیٰ کی امانت کہا جاتا ہے اور اس کی حفاظت آپ کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ جو آپ کی ذات کو ان کلین کر گیا۔

جس نے آپ کو ڈی گریڈ کیا۔ اس کے دیے گئے زخم کو یاد رکھنا در حقیقت آپ کی سب سے بڑی ناکامی ہے۔ آپ کو ایک دفعہ پھر سے انرجیٹک ہونا پڑے گا۔ عام طور پر ایسے حالات کا شکار خواتین خود کو سائیکی کیس بنا لیتی ہیں۔ یہ آپ کی اپنے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی ہے۔ جس سوسائٹی کا ہم لوگ حصہ ہیں۔ جس معاشرے میں ہم لوگ سانس لے رہے ہیں۔ وہاں ایک عورت کی ڈائیورس کے بعد رونما ہونے والے واقعات اور ڈائیورس کے ریزنز پر جی بھر کے کرس کیا جاتا ہے۔ خود کو ایک دفعہ پھر سے ہرے بھرے ماحول میں فیل کیجیے۔ یوں سمجھیے کہ آپ کے ساتھ کچھ بھی انہونا یا غیر معمولی نہیں ہوا۔ آپ ایک دفعہ پھر سے خود کو تازہ سمجھیں گی۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ یقین کیجیے کہ میں خود بھی کبھی کبھار اصلی اور حقیقی دنیا سے تھوڑی دیر کے لیے دور چلا جاتا ہوں اور یہ چیز میرے اندر موجود جذبے کو وارم کرتی ہے۔ گرما دیتی ہے۔

موجودہ تلخ ترین وقت کو اپنے ہاتھ سے بدلا جا سکتا ہے۔ بہرحال آپ بہت اچھی چائے بناتی ہیں۔ کسی دن پھر ایسی ہی مہربانی فرما کر اپنے نامہ اعمال میں ایک اور نیکی کا اضافہ کر لیجیے گا۔

اب چونکہ آپ ہمارے گھر کے اوپر والے حصے کا فرد بننے جا رہی ہیں۔ تو کچھ پیشگی باتیں ابھی ذہن نشین کر لیجیے گا۔ ایک بات تو یہ ہے کہ پلیز آنسوؤں کی سوغات کو ادھر مت لے کر جائیے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ اس گھر میں آپ کا واسطہ پڑے گا ایک بہت ہی جھگڑالو قسم کی خاتون سے تاہم آپ خوف سے نیلی پیلی مت ہوئیے گا۔ ان خاتون کے تمام تر ڈفرنسز اور ڈسپوٹس میری ذات کے ساتھ کنیکٹڈ ہیں۔ آپ کو غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

مجھے آپ اپنا سچا اور مخلص ہمدرد پائیں گی اور میں مخصوص اوقات کے علاوہ بھی سوشل ورک کے لیے تیار رہتا ہوں۔ آپ جب چاہیں میری خدمات حاصل کر سکتی ہیں۔ بس میری کچھ شرائط ہیں۔ جن پر آپ کو ضرور غور کرنا پڑے گا۔ ایک تو بڑی پرابلم یہ ہے کہ مجھے روتے بسورتے چہرے قطعاً" نہیں بھاتے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں زبردستی کا مہمان بھی بن جاتا ہوں۔ سو اوپر والے حصے کے مکین تو مجھے برداشت کر ہی لیتے ہیں۔ میں بہت کم بولتا ہوں یہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ اپنے جیسے ہی کم بولنے والے لوگ مجھے پسند ہیں۔ اب میرا خیال ہے کہ ایک اور کپ چائے کا تو مجھے مل نہیں سکتا، سو اب چلنے کی تیاری کریں۔ میں ٹیکسی لے آتا ہوں۔"

شاہنواز کی نان اسٹاپ چلتی زبان لمحہ بھر کو رکی تھی۔ اور یہ دونوں خواتین بھی گویا نیند سے ایک دم جاگ گئیں۔ عجیب سا ایک طلسم طاری ہو گیا تھا۔ ایسے نرم الفاظ اور ٹھہری ٹھہری سی ــــ گفتگو، جس میں اپنائیت کا ایک زندہ احساس سانس لے رہا تھا۔ عفیفا گویا ابھی تک اس کی گفتگو کے زیر اثر تھی۔ بہت بولنا، اور بے تحاشا بولنا تو سبھی کو آتا ہے۔ دل موہ لینے کا فن اور درد کو بانٹ لینے کا سلیقہ کسی کسی کے پاس ہوتا ہے۔

اگرچہ شاہنواز عفیفا کے لیے کوئی ایسا اجنبی بھی نہیں تھا مگر سالوں بعد کی اس پہلی ملاقات نے فیفا کو بہت کچھ یاد دلا دیا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ شاہنواز بے حد بدل گیا ہے۔ شاید یہ وقت ہی انسان کی شخصیت کے بدلاؤ میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے اور یہی بات عفیفا نے راحت بیگم سے کہہ بھی دی تھی۔

"مامی جی! شاہنواز تو بہت بدل گیا ہے۔" وہ سچ مچ حیران تھی۔ وہ پہلے والا جھوٹا سا شاہنواز تو ہرگز نہیں تھا ــــ جسے بات بہ بات جھوٹ بولنے پر ماہیر اسے بیٹ کے ساتھ مارتا تھا۔

"یہ بھی آپ نے خوب کہی، عفیفا مختار صاحبہ۔" وہ اٹھتے اٹھتے پھر سے بیٹھ گیا تھا۔ اگرچہ فیفا کی آواز خاصی دھیمی تھی تاہم شاہنواز کی قوتِ سماعت بھی بلا کی تیز تھی۔ وہ تو ملتے پتے کی آواز بھی سن لیتا تھا۔

"لوگ تو مجھ جیسے سچے انسان کو ابھی تک بلا کا جھوٹا کہتے ہیں۔" اس کا اشارہ ماہیر کی طرف تھا کیونکہ ماہیر اب بھی اسے شاہنواز کی بجائے جھوٹے شاہے کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔



"اب بیٹا! یہ کوے کی طرح کا سفید جھوٹ تو نہ بولو۔" راحت بیگم بھی جتائے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔ بیٹے بے چارے نے خوامخواہ پہلو بدل لیا تھا۔ عفیفا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"مسکراتی رہا کریں خاتون! بھلا نہ مسکرانے پر کیا کنجوسی کا ایوارڈ لینا۔" وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ عفیفا، راحت بیگم کی طرف اس کے نکلتے ہی متوجہ ہو گئی تھی۔

"مامی جی! شاہنواز کیا واپس آ گیا ہے؟"

"تو اور کیا.... اس کا اپنا گھر ہے۔" وہ اس کے سوال کا متن سمجھے بغیر اثبات میں سر ہلانے لگی تھیں۔

"ثریا خالہ نے اسے گھر میں کیسے گھسنے دیا تھا؟" فیفا حیران تھی کیونکہ شاہنواز کے رباب سے شادی والے کارنامے سے وہ بھی اچھی طرح سے آگاہ تھی۔

"بچہ صاحب اختیار ہے۔ ثریا بھلا اسے کیسے روک سکتی تھی۔" وہ عفیفا کا لایا گیا بیگ اس کی کتابوں اور ضروری رسائل سے بھر رہی تھیں۔ فیفا لاؤنج کی چیزیں ٹھکانے لگا رہی تھی۔ تاہم اس کا سارا دھیان راحت بیگم کی طرف تھا۔

"اور شاہنواز کی بیوی، بچی وغیرہ.... وہ کہاں ہیں؟" بالکل آخر جھجکتے ہوئے اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کاہے کی بیوی اور کہاں کی بچی۔" انہوں نے کتابیں ٹھونس ٹھانس کر زپ کو ایک جھٹکے کے ساتھ بند کر کے ہاتھ جھاڑے۔

"کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔" فیفا الجھی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"بھئی، شاہنواز نے جھوٹ بولا تھا۔ محض ثریا کو تپانے کے لیے نہ کوئی رباب ہے اور نہ ہی رباب کا کوئی وجود ہے۔" انہوں نے خاصی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سارا قصہ عفیفا کے گوش گزار کیا تھا اور ساتھ ساتھ وہ فیفا کا دھیان بٹ جانے پر شکر بھی ادا کر رہی تھیں۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ شاہنواز بدل گیا ہے۔ جھوٹ بولنا چھوڑ چکا ہے مگر۔"

"دیکھیے جی! میں جھوٹ ہرگز نہیں بولتا۔ اس معاملے میں مجھے بدنام ہرگز نہ کیا جائے۔" وہ لاؤنج میں داخل ہو رہا تھا۔ پھر اس نے بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈال لیے۔

"جھوٹ تو بولتے ہیں میرے دشمن جن کا ازل سے میرے ساتھ بیر ہے۔ اسکوٹر کی چابی گھٹنے کے نیچے چھپا کر صاف مکر جاتے ہیں۔" اس کا اشارہ ثریا خالہ کی طرف تھا۔ عفیفا نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا تھا۔ شاہنواز نے سیل کان سے لگا رکھا تھا۔ اور وہ ان سے بات کرنے کے ساتھ ساتھ فون پر بھی مصروف تھا۔

"بس ابھی آ رہا ہوں۔ کیوں پریشان ہونے کی ایکٹنگ کر رہی ہیں۔ کہیں والد بزرگوار آپ کے پاس تو نہیں بیٹھے ہوئے۔" "یقیناً" دوسری طرف ثریا جہاں تھیں۔ تبھی تو شاہنواز کے لبوں سے مسکراہٹ ہٹ نہیں رہی تھی۔ نہ جانے دوسری طرف مزید کیا ارشاد کیا گیا تھا۔ شاہنواز نے مسکراتے ہوئے آف کا بٹن دبا دیا۔

"آئیے خواتین! ٹیکسی آپ کی منتظر ہے۔"

"مامی جی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" وہ ایک دم ہی مضطرب سی ہو گئی تھی۔ شاہنواز بھی چونک گیا۔ فیفا کی نظریں کالے اور نیلے رنگ کے بیگز پر تھیں۔ اس کا دل ایک دم ہی مٹھی میں آ گیا۔

"بولو نا.... چپ کیوں ہو گئیں۔"

"مامی جی! اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں صبح سویرے آ جاؤں گی۔ بس ایک رات کی بات ہے۔ میں خود کو بھی ذہنی طور پر تیار کر لوں گی۔" اس کا لہجہ التجائیہ قسم کا تھا۔ آنکھوں کی نمی اور آواز کا بوجھل پن شاہنواز کو بے حد محسوس ہوا تھا۔ راحت بیگم کچھ کہنا چاہتی ہی تھیں جب شاہنواز ایک دم بول پڑا۔

"خالہ جان کو کیوں برا لگے گا۔ ایک رات کی تو بات ہے۔ ہم آپ کا سامان لے چلتے ہیں اور صبح سویرے میں آپ کو لینے کے لیے آ جاؤں گا۔ کل تک کے لیے اللہ حافظ، چلیے خالہ جان۔" وہ بیگز اٹھا کے بولتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ اب مزید کچھ کہنے کی گنجائش کہاں رہی

تھی۔ سوراحت بیگم عفیفا کو پیار کرنے کے بعد دروازہ بند کرنے کی تاکید کر کے چلی گئی تھیں اور ادھر گویا عفیفا کے ضبط کی تمام ترطنابیں چھوٹ گئی تھیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اور پھر روتی ہی چلی گئی۔

کوچ کا وقت قریب تھا اور مسافر کو بالآخر سفر کے لیے نکلنا ہی تھا۔ اس گھر کے مانوس درودیوار سے اچھی اور بری یادیں سمیٹے وہ بیتے کل کو یاد کر رہی تھی۔ اس کی سوچیں آج کی شام کے اردگرد بھی گھوم رہی تھیں اور شاہنواز کی کئی باتوں نے اس کے دل میں اچھا مقام بنا لیا تھا۔ اس نے سچ ہی کہا تھا۔ کھیل تماشے جیسی اس زندگی میں کچھ بھی انہونا یا غیر معمولی نہیں ہوتا۔ ہاں ہمارے دکھ اور غم کی نوعیت ضرور مختلف ہوتی ہے اور زندگی کی یہ لمبی طویل دوڑ کبھی سورج کی تپش لے آتی تھی۔ کبھی غموں کی بارش بن کر برسنے لگتی اور کبھی خوشی کا ساون بن جاتی ہے۔ ہر اندھیرے میں کہیں نہ کہیں

ضرور کوئی نہ کوئی جگنو چمکتا ہے۔ ہر رات کے بعد ایک سویر بھی منتظر ہوتی ہے تو پھر کیوں نہ وقت کو صبر سکون اور برداشت کے ساتھ برتا جائے۔

مختصر سے لمحے وقت کا ایک طویل ترین دور تشکیل دیتے ہیں۔ چاہے یہ دور غم کی المناک کہانی سے عبارت ہو یا خوشیوں کا پیامبر بنتا رہے۔ وقت کی ہر چال اور کروٹ تجربات کا ایک نیا باب اک نیا سبق ناصرف کھولتی ہے بلکہ بغیر کسی چاہ اور خوشی کے اس چال کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ رحم اور فضل سے بڑی کوئی مٹھاس نہیں۔ جو رحم کرنا جانتا ہے۔ وہ فضیلت کا درجہ خود بخود پالیتا ہے۔ نرمی اور شفقت کے اعمال مردہ دلوں کو "سانس" بخشتے ہیں محبت کے مختصر جملے کسی کا گلستان دل آباد کر دیتے ہیں۔ دردل کی بنجر اراضی پر ایسا بیج خود بخود جم جاتا ہے جس کے ہر دانے سے ایک پودا نکلتا ہے اور ہر ایک پودا اور اس کی ہر شاخ ہریالی بن کر آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ سوکھی دھرتی جیسے دل پر محبت کی شبنم کا ایک قطرہ بھی موسلا دھار بارش سے کم نہیں ہوتا۔

تو کیا اسے شبنم کے ایک قطرے کا انتظار تھا؟ یا پھر محبت کی صرف ایک بوند کا؟ دل میں ڈوبتی ابھرتی ایک شبیہ کو سختی سے دور، بہت دور جھٹکتی وہ سخت اذیت کا شکار تھی۔ بہت عرصہ ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا گویا زمانے بیت گئے ہیں۔ صدیاں نکل گئی ہیں۔ بہت پہلے وہ شخص جب کسی اور کا ہو گیا تھا تب عفیفا مختار نے اسے ناصرف دل سے بلکہ سوچ اور ذہن کے ہر کونے سے نکال دیا تھا۔

اس نے دل میں سمو چکی اس محبت کو رات کی ایک رانی کے سپرد کر دیا تھا۔ رات کو محبت کی طرح مہک اٹھنے والی یہ پھلواری صبح کو یوں ہر شے سے بے نیاز اور بے گانہ ہو جاتی تھی۔ اپنی خوشبو تک کو خود میں چھپا کر بے پروا ہو جاتی تھی مگر رات کے کئی پہر اس خوشبو کے ہر آنسو، ہر دکھ، ہر غم کے گواہ تھے۔ اس محبت کی خوشبو میں کرلاتی جوانی دور دور تک خوشبو کی صورت میں بکھر بکھر جاتی ہے اور شاید یہ خوشبو کئی لوگوں کو چونکا کر بھی رکھ دیتی ہے۔ ہاں اگر کوئی بے خبر تھا۔ انجان تھا لاپروا تھا تو وہ صرف اور صرف ماہیر عالم تھا۔ جو کسی اور کا نصیب کیا بنا تھا۔ عفیفا مختار نے اسے دل سے، نظر سے، یاد سے، حتیٰ کہ سوچ تک سے نکال دیا تھا۔ اسے نہ سوچنا بھی وفا کی نہ جانے کون سی کڑی تھی۔ مگر شرط وفا کے ایک ایک حرف پر وہ ایمان رکھتی تھی۔ محبوب کو بغیر اس کی مرضی سے چاہنا بھی وفا کے اصولوں کے خلاف تھا اور عفیفا مختار تھی کہ اصولوں پر جان دیتی تھی۔ شادمانی اور بلا کا سرور بھی اہل وفا کو خود کو قربان کر کے ہی نصیب ہوتا تھا اور اس نے روشن ستاروں جیسی تاباں، درخشاں سی اس محبت کو دل کے نہاں خانوں سے بھی چپکے سے نکال دیا تھا کہ محبت کسی کے دل کو زبردستی اپنے بس میں کر لینے کا نام نہیں تھی۔

محبت تو چراغ کی ایک بتی کی طرح تھی جس سے ذرا سا شعلہ نظر ملاتا تو کئی اور چراغ بھی جل اٹھتے تھے۔ محبت فیض، فائدے اور نفع و نقصان کے حساب کتاب میں الجھ کر خود کو بے مول نہیں کرتی تھی۔ محبت



کامیابی، کامرانی، خوش نصیبی، خوش قسمتی میں ہمیشہ عجزوں کی دعا کے لیے ایک سجدے میں عمر بتا دیتی تھی۔

ہر محبت کی کہانی کا انجام سرخ روشنائی سے نہ جانے کیوں لکھا جاتا ہے۔ ہجر اور جدائی کے اختتامی الفاظ پوری زندگی کا سفر ایک لمحے میں کیسے بڑھاپے کی آخری سرحد پر لے جاتے ہیں۔ جدائی کا غم اور ہجر کا ایک پل جوانی کا سارا رس نچوڑ لیتا ہے۔ اور پھر بھی نادان دل محبت کرنے سے نہ چوکتا ہے نہ باز آتا ہے۔ نہ جانے پھر بھی کیوں لوگ محبت کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ محبت کی روگی آنکھ، عیش و نشاط، عشرت، آرام، راحت و سکون سے خالی ہو جاتی ہے۔ نیند نے کبھی تھکی تھکی آنکھوں میں آسودگی نہیں بھری تھی اور وقت کبھی دل وحشی پر مہربان نہیں ہوتا تھا۔ ہجر کا صحرا ابر رحمت کی بوند بوند کو ترستا تھا مگر کاسئہ دل ہمیشہ محب و محبوب کے درمیان جیتی بازی کو بھی چپکے سے ہار جاتا تھا کہ محبت کسی کے دل پر زبردستی کا تسلط جما لینے کا بھی تو نام نہیں۔

جنون سفر کو محبت جیسے ـــــ نرم، مٹھاس بھرے شیریں جذبے کا نام دینا دراصل محبت کے ساتھ ظلم عظیم ہے۔ محبت اور جنون دو الگ داستانوں کے عنوان ہیں۔ محبت جو بقا کی جنگ میں عشق مجاز سے عشق حقیقی سے ملا دیتی ہے۔ جو محبت کی معراج کو سمجھ گیا سو وہ کامیابی و کامرانی کی منزلوں کی قدم بوسی کر آیا اور جس نے جنون کی سرحد پر سجدہ کیا۔ جنون کی دہلیز کو چوم لیا۔ سو وہ ہاتھ آئی نعمتوں کو بھی گنواتا رہا۔

اور عفیفا مختار اس لحاظ سے خود کو خوش قسمت سمجھتی تھی کہ اس نے بہتی چاندنی جیسی دل میں چھپی خاموش محبت کو جنون نہیں بننے دیا تھا۔

"بھلا محبت کو جنون کا روپ کس نے دیا تھا؟ کون محبت اور عشق کی سرحدوں کو کراس کیے جنون کی راہ کی مسافر بنی تھی؟ کس نے دل کی سرزمین کو عرب کے تپتے صحراؤں کی ریت سے لبالب بھر لیا تھا؟ وہ بھلا کون تھی؟ کون تھی؟ کہاں تھی؟ کس نگر، کس جہاں میں تھی؟ کس برِاعظم کو آباد کیے ہوئے تھی؟ یا پھر وہ زندہ تھی یا سچ مچ مر چکی تھی۔ مگر وہ تھی کون؟" رات کی رانی کی ـــــــ دلفریب خوشبو چپکے سے دریچے میں اتر آئی تھی۔

اور بڑی سوز بھری آواز میں سوال کر رہی تھی۔ پوچھ رہی تھی۔

"کچی کلیوں سی مہک رکھنے والی کاسئہ دل کو ہاتھ میں پکڑے تنہا، اداس کھڑی وہ لڑکی بھلا کون تھی؟ کہاں تھی؟ محبت اور وقت نے جسے اسی موڑ پر منجمد کر دیا تھا جہاں سے سفرِ لاحاصل کی ابتدا ہوتی تھی۔ وہ محبت کی مختوم کہاں تھی جس کے دل پر ماہیر عالم کے نام کی مہر لگی ہوئی تھی۔ وہ بھلا کون تھی۔" رات کی رانی دریچے کی دہلیز پر سر پٹخ پٹخ کر رو رہی تھی۔

"وہ بھلا کون تھی؟" عفیفا مختار کے خاموش لبوں سے نوحہ برآمد ہوا تھا۔

"زوبار یہ درانی اور بھلا کون۔" رات کی رانی کے لہجے میں سناٹوں کا بڑا گہرا شور تھا۔ عفیفا مختار گویا سر سے لے کر پیروں تک پتھر ہو گئی تھی۔

باقی آئندہ شمارے میں

عبیرہ گل

## ناولٹ

سنہری شام کی ڈوبتی نبضوں کے باعث عروہ کو کرسی سے اٹھنا ہی پڑا کمر سیدھی کرکے اس نے مسودے کے تمام صفحات جمع کرکے پن لگائی ان پر پیپرویٹ رکھا گلاس ونڈو سے پردہ ہٹا کر اس نے نیچے کی صورت حال جاننا چاہی۔

حسب معمول نچلی منزل کے لاؤنج میں بابا کے اسٹوڈنٹس موجود تھے "عجیب اکیڈمی کھولی ہے بابا نے کوئی وقت ہی نہیں ہے جسے دیکھو جب دیکھو چلا آتا ہے۔" لائٹس چلانے پر بھی کمرے کا بوجھل پن ختم نہ ہوا تو وہ عفرا کو دیکھنے کے لیے اس کے کمرے میں گئی لیکن وہ غائب تھی کچھ کھانے کے خیال سے وہ کچن کی جانب گئی جہاں شیریا پہلے سے موجود تھی۔

"وہ میں نے سر کے لیے کافی بنائی تھی۔" شیریا نے وضاحت دی وہ کچھ کہے بغیر اوپر کی جانب سیڑھیاں چڑھنے لگی کبھی کبھار بابا کی اسٹوڈنٹس شیریا کی بے تکلفی اسے عجیب لگتی تھی وہ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے تیسری منزل پر آپہنچی جہاں پر بابا نے لائبریری اور نگار خانہ بنوا رکھا تھا دروازے کے باہر کھڑی ویلکم کرتی عورت ایک لمحے کو زندہ ہی لگتی تھی بابا کے بنائے ہوئے اسکیچ پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا تو اندر اندھیرے میں کینڈل لائٹنز جلتی ہوئی پائیں وہ آہستگی سے چلتی ہوئی ایزل پر جھکی عفرا کے پیچھے آکھڑی ہوئی اور سوئچ بورڈ پر ہاتھ رکھ دیا لمحے میں پورا نگار خانہ جگمگا اٹھا۔

"اوہ تم۔" عفرا نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"عفرا میں بہت بور ہو رہی ہوں نہیں بلکہ فرسٹریٹ ہو رہی ہوں میرے ساتھ واک پر چل لو۔"

"تو سوری میں کہیں نہیں جاسکتی۔" عفرا نے صاف انکار کردیا۔

"تمہیں پتا بھی ہے کہ جب تک میں اپنی پینٹنگ کمپلیٹ نہیں کرلیتی باہر نہیں نکلتی۔" عفرا کے لہجے میں قطعیت تھی نہ جانے دل کی کیا کیفیت تھی جو عفرا کے انکار نے اس کے دل پر بہت اثر کیا۔

"ہاں ہم انسانوں سے زیادہ اپنے آس پاس کی بے جان اشیاء کو وقت اور محبتیں دینے لگے ہیں۔" عروہ کا لہجہ مدھم ہوگیا۔

کوئی خاص کیفیت ہوتی ہے دل کی جب انسان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی دل پر لے لیتا ہے وہ بابا جانی کے بنائے ہوئے مور کے اسکیچ پر بے دھیانی سے ہاتھ پھیرنے لگی۔

"خیریت تو ہے۔" عفرا نے مڑے بغیر بھی عروہ کی یاسیت کو محسوس کرلیا تھا بہن تھی آخر۔

"کچھ بھی نہیں کچھ ہو بھی کیا سکتا ہے ہماری زندگی میں۔"

"واو امیزنگ مس عروہ اے بیسٹ رائٹر جن کا قلم لوگوں کو مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر امیدوں کی دنیا میں لے آتا ہے وہ اور مایوسی کی باتیں۔" عفرا ابھی بھی بدستور ایزل پر جھکی ہوئی تھی۔

"ہاں شاید میں کچھ زیادہ ہی رنجیدہ ہو رہی ہوں

لیکن عفرا کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہم انسانوں سے الگ ہیں ہماری روٹین بہت عجیب ہے۔" کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھتی عروہ قنوطیت کی شکار ہو رہی تھی۔

"کبھی کبھی! مجھے تو ہمیشہ سے ہی محسوس ہوتا ہے۔" عفرا بولی عروہ نے اسے نا سمجھ آنے والی نظروں سے دیکھا۔

"عروہ تمہیں نہیں لگتا کہ یہ گھر آسیب زدہ ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب آسیب زدہ۔"

"ہاں آسیب زدہ اور یہاں ہم دو روحیں رہتی ہیں جو ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جب تھک جاتی ہیں تو بے مصروف کاموں میں مصروف ہو جاتی ہیں عروہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ ہر طرف رکھی ہوئی مورتیوں کی طرح میں اور تم بھی پتھر کی نہ ہو جائیں اور یہ بوڑھی دیواریں جو کسی تازہ ہنسی، کسی پیار بھری ڈانٹ، معصوم سی سرگوشی، بے تکلف قہقہوں سے محروم ہو گئی ہیں ہماری طرح اندر سے ریزہ ریزہ ہو رہی ہیں مجھے ان در و دیوار سے خوف آتا ہے یہاں ہر طرف تصویریں، مورتیاں ہیں اور کیا تمہیں واقعی لگتا ہے کہ تم زندہ سانس لیتی لڑکی ہو شاید ہم دونوں بھی ان بے جان مورتیوں کی طرح ہیں بے جان جن کی کوئی خواہش ہے نہ امنگ۔" عفرا کسی ٹرانس میں تھی ذرا سا سانس لینے کو رکی۔

"اور عروہ یہ جو تم انسانی کردار تخلیق کرتی ہو تو تمہیں کبھی احساس ہوتا ہے کہ ہیروئن کی جگہ تم بھی ہو سکتی ہو میں بھی، ہماری زندگی میں کیا ہے۔ عروہ جو ہم عام لوگوں کی طرح سے نہیں جی سکتے ہمارے والد مایہ ناز پروفیسر ہماری والدہ بہت بڑی آرٹسٹ تمہیں ہماری بہن مشہور سنگر بھائی ایک مانا ہوا میوزک انسٹرکٹر تم تم ایک دلپسند قلمکار۔ میں لوگ کہتے ہیں کہ بہت بڑی مصورہ ہوں میرے اسٹروک تصویر میں جان ڈالتے ہیں میرے ہاتھوں میں جادو ہے لیکن کسی کو یہ نہیں معلوم کہ عفرا کے پاس ایک دل بھی ہے وہ کوئی مورتی یا دیوی نہیں ہے جسے محض تعظیم دی جائے سراہا جائے اتنی کم عمر آرٹسٹ۔" اپنی پینٹنگ پر ہاتھ پھیرتی عفرا اپنے ماحول سے بہت دور پہنچ گئی تھی عروہ نے بے اختیار اس کا کندھا جھنجھوڑا۔

"عفرا یہ تم کیسا فیل کر رہی ہو لیکن ہم دونوں فٹ ہیں یہ صحیح کہ ہم ایک الگ لائف گزار رہے ہیں لیکن خوف پر فخر کرو۔"

"تھک گئی ہوں میں پراوڈ کرتے کرتے مجھے نارمل زندگی گزارنی ہے مجھے ایک ایسی پرخلوص رفاقت کی ضرورت ہے جو بن کہے مجھے جان لے۔" عفرا نے عروہ کا ہاتھ کندھے سے ہٹایا۔

"تم کسی کو بن کہے جان سکتی ہو جو یہ تمنا کر رہی ہو۔" عروہ اسے لتاڑ کر باہر کی طرف جانے لگی۔

"تم کچھ بھی کہو لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی ہو جو صرف مجھ سے پیار کرے مجھے چاہے میری تعریف کرے میرے فن کی نہیں۔" ایزل پر جھکی بولتی عفرا کو عروہ نے پلٹ کر عجیب نظروں سے دیکھا اور لاحول پڑھتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگی۔

✲ ✲ ✲

کمرے میں پہنچ کر بھی اس کا دھیان عفرا کی بکواس میں الجھا رہا عفرا کیسے اول فول بول رہی تھی اس نے عفرا کی باتوں کو ذہن سے جھٹکنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکی ________ اس نے تنگ آ کر زوردار آواز میں ریکارڈ کھول دیا۔

"عروہ کبھی تمہیں احساس ہوا کہ تم بھی ایک لڑکی ہو تمہارے پاس بھی ایک دل ہے۔" عفرا کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"یہ عفرا بھی نا بالکل پاگل ہو گئی ہے۔" وہ جھنجھلا سی گئی۔

"بابا جانی سے بات کرتی ہوں۔" نیچے کی جانب جاتے ہوئے اسے اپنی درد کرتی ٹانگوں کا احساس ہوا۔

"اوپر نیچے کے چکروں میں میری ٹانگیں تو شل ہو گئی ہیں شاید میں واقعی بوڑھی ہو رہی ہوں۔" بابا جانی کے کمرے کا دروازہ کھولتے کھولتے دروازے پر رکھے اس کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔

"شیریا بس کیجیے کچھ نہیں تو کم از کم میرے اور اپنے رشتے کا ہی احساس کر لیجیے ہم آپ کے استاد ہیں یہ مت بھولیں۔"

"سر دیکھیں پلیز آپ میرے ساتھ ایسے روڈلی بی ہیو مت کریں سر میں آپ سے محبت کرتی ہوں شادی کرنا چاہتی ہوں۔" شیریا کی آواز آئی اس کے سر میں دھماکے ہونے لگے۔

"شیریا ایسا نہ ہو کہ میں آپ پر ہاتھ اٹھا دوں آپ یہاں سے فوراً" چلی جائیں آئندہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"سر پلیز سر ہم آپ کے قدموں میں پڑتے ہیں ہم آپ سے کچھ نہیں مانگیں گے۔"

"شیریا میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ تم یہاں سے اپنے اور میرے درمیان کا فرق دیکھا ہے بیٹی جیسی ہو تم میری، شرم آنی چاہیے تمہیں ہمیں تو آج تک احساس ہی نہیں ہوا آپ کی ذہنیت کا ورنہ یہ نوبت ہی نہ آنے دیتے۔"

"سر خدا کے لیے آپ یوں توہین تو نہ کریں میری میں آپ سے پیار کرتی ہوں بیٹی جیسی ہونے اور بیٹی ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"شیریا تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ میرا سر پھٹ جائے گا۔" شیریا کی سسکیاں دروازے کے قریب آتی محسوس ہوئیں تو وہ پلر کے پیچھے جا چھپی شیریا کی چاپ مدھم پڑی تو وہ سکتے کے عالم میں پلر کے ساتھ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

"واہ مولا واہ ایک ہی دن میں دو دو جھٹکے میری ننھی سی جان اتنی حیرتوں کی متحمل کیسے ہو گی اتنا عرصہ کہاں بے خبری کے عالم میں گزر گیا مہینے بھر کی بیماری پھر کتاب پبلش کروانے کی مصروفیات میں کیا اتنا وقت بیت گیا جو اتنے تغیر رونما ہو گئے اف میرے اللہ عفرا سے ڈسکس کروں.... نہیں وہ پہلے ہی ڈپریس ہے اور رات میں غنوی آپی سے نیٹ پر باتیں کرتے ہوئے اس نے ایسے ہی لکھ بھیجا، آپی اگر ہم بابا کی شادی کر دیں تو۔"

"ہاں اس میں حرج ہی کیا ہے آخر انہوں نے اتنا وقت تنہا گزارا ہے اور ویسے بھی تم دونوں کی شادیوں کے بعد تو ضروری ہے کہ کوئی گھر کو دیکھنے والا ہو لیکن تمہیں یہ خیال کیوں آیا۔"

"بس ایسے ہی۔" اس نے اس وقت بات کو ایسے ہی ٹال دیا بابا جانی کو اندازہ نہیں ہے کہ ان کی اولاد کتنی سیٹلڈ لائف گزار رہی ہے اور جب انہوں نے اتنا عرصہ تنہا گزار لیا تو یہ تو ان کا حق بنتا ہے حیرت ہے ہمیں پہلے خیال کیوں نہیں آیا اور پھر وہ کل ہی غزنی بھائی سے بات کرنے کا فیصلہ کر کے سو گئی۔

✲ ✲ ✲

کافی کی ٹرے نیلگوں پتھروں کی بنی ہوئی میز پر زوردار آواز میں رکھ کر اس نے بابا کی طرف دیکھا جو بدستور کسی سوچ میں غرق تھے۔

یہ سوچیں بھی کیسی ہوتی ہیں آدمی کو اپنے ماحول سے غافل کر دیتی ہیں۔

"بابا ہم کافی لائے ہیں۔" اس نے کافی کے کپ

میں چمچہ چلاتے ہوئے بابا کو متوجہ کیا۔
"ہاں عروہ بیٹی آئی ہے۔" وہ ہر کسی کا اسی طرح پُرجوش استقبال کرتے تھے۔
"بابا آپ کس الجھن میں ہیں۔" اس نے بابا کے چہرے کا بغور مطالعہ کیا۔
"نہیں تمہیں کیوں لگا۔"
"ایسے ہی بس مجھے لگا کہ آپ کسی الجھن میں ہیں۔" بابا خاموش رہے لیکن وہ اس الجھن کو جان چکی تھی تھوڑی ہی دیر میں اس کے آس پاس صوفوں کشنز قالین پر بابا کے اسٹوڈنٹس جمع ہوگئے فن تو بابا کا وہ سرمایہ تھا جسے وہ جتنا بھی بانٹتے کم نہ ہوتا آرٹ اینڈ فن کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد وائٹ پیلس کی نچلی منزل آرٹ اکیڈمی میں تبدیل ہوچکی تھی اور اس میں وہ کسی سے فیس لینا بھی فن کی توہین سمجھتے تھے کہتے تھے میری فیس بس یہی ہے کہ فن معیاری ہو فنکار اپنے فن کا درست استعمال کرے بابا کی کلاس شروع ہوچکی تھی لیکن وہ اسی سستی کے ساتھ بابا کے ساتھ بیٹھی رہی۔
"خداداد صلاحیت بھی خام مال کی طرح ہوتی ہے بے ترشے ہوئے پتھر کی طرح پتھر تراشنے کے لیے مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور مہارت ریاضت لگن سے ممکن ہے اور جدتِ خیال آفرینی سے ایک تخلیق کار مسلسل تخلیق کی حالت میں نہیں رہتا کبھی وہ بنجر ہوجاتا ہے زمین کی طرح خزاں کا یہ موسم برسوں پر محیط ہوسکتا ہے تخلیق کے دورے پڑتے ہیں کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ تمہارے پاس سب کچھ ہے یکسوئی، آمادگی، مہارت اور وقت لیکن خیال قابو میں نہیں آتا یہ وقت بڑے کرب کا ہوتا ہے جوڑ جوڑ میں ٹیسیں اٹھتی ہیں، دیوانگی سی طاری رہتی ہے وہ غصے میں کبھی رنگ الٹ دیتا ہے برش توڑ دیتا ہے کینوس پھاڑ دیتا ہے یا پھر اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچانے کے درپے ہوجاتا ہے۔" بابا لیکچر دے رہے تھے۔
"سر کبھی آپ پر ایسا وقت آیا۔" کمرے کے آخر سے سوال آیا۔
"اوہ کیوں نہیں ایک تخلیق کار کی طرح میرے اوپر ایسا وقت بارہا آیا ہے۔"
"پھر آپ ایسے وقت میں کیا کرتے ہیں۔"
"یہ تو غلبہ طاری کرنے والی کیفیات ہوتی ہیں لیکن اس دور کا اخیر نتیجہ نہایت عمدہ تخلیق ہوتی ہے الحمدللہ مجھے ایسا ماحول ملا میری بیوی نہال عمدہ مصورہ تھیں میرے بچے فن کی دنیا میں اونچے مقام پر ہیں سازگار ماحول ہونے کی وجہ سے میری کیفیات دیر تک نہیں رہتیں یہی شاید میرے کیریئر کی کا راز ہے۔"
"سر آپ کے گھر آتے ہیں تو واقعی محسوس ہوتا ہے کہ فنکار کی وادی ہے سر کتنا سکون ہے نا یہاں آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے سر۔"
"یہ پورا گھر میری بیوی نے سجایا تھا۔" بابا اب اپنے اسٹوڈنٹس سے معمول کی باتیں کرنے لگے تھے اور عروہ کافی دیر سے پرانی جینز اور پرانی ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنی شیریا کا مطالعہ کر رہی تھی جس کی سوجی سوجی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات بھر روتی رہی ہے۔
"کیا ہوا عروہ بیٹا آج آپ کا بھی لیکچر سننے کا موڈ تھا۔"
"نہیں، لیکن بابا آپ بہت اچھے استاد ہیں میں سوچ رہی تھی کہ عفرا کو کہوں گی کہ وہ بھی اپنا وقت یہاں گزار لے تو وقت اچھی طرح کٹ سکتا ہے مزا آیا مجھے۔" آہستہ آہستہ سارے اسٹوڈنٹس اٹھ گئے کوئی چلا گیا کوئی اپنے کل کے اسکیچز کو شیپ دینے لگا کوئی مٹی گوندھنے لگا۔
"بابا میں سوچ رہی تھی کہ ہم کہیں چلتے ہیں مثلاً غزنی بھیا کے ہاں۔"
"ہاں تم لوگ جاؤ لیکن میں نہ جاسکوں گا ظاہر ہے گھر کو یوں چھوڑ کر تو نہیں جایا جاسکتا۔"
"اگر آپ نہیں جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گی اصل میں میں تو عفرا کی وجہ سے کہہ رہی تھی وہ بہت قنوطیت کا شکار ہو رہی ہے آج کل۔"



"ہاں تو تم اس سے پوچھ لو میں ٹکٹ منگوا دوں گی۔" بابا سے باتیں کرتے ہوئے اس کی نظر گیٹ سے نکلتی شیریا پر پڑی اس کے من میں نجانے کیا آئی کہ بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے گئی۔
"شیریا! رکو بات سنو مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے تمہارے پاس وقت ہے۔"
"ہاں وقت تو ہے لیکن کیسی بات۔"
"چلو اوپر چلو اوپر چل کر بات کرتے ہیں۔" وہ شیریا کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آئی۔
"تم بابا کی بہت چہیتی اسٹوڈنٹس ہو تو اسی لیے دل چاہا کہ تم سے میں بھی دوستی کروں۔"
"اوہ کیوں نہیں میں تو تم لوگوں کو اپنا ہی سمجھتی ہوں۔" شیریا کے چہرے پر اداس مسکراہٹ ابھری۔
"تم کہاں رہتی ہو۔"
"میں ہاسٹل میں۔" ایک ہی رات میں شیریا کی حالت بے جان ہوگئی تھی عروہ کو اس پر ترس آیا۔
"کیوں تمہارے پیرنٹس کسی دوسرے شہر میں ہیں۔"
"میرے پیرنٹس میں سپریشن ہوگئی تھی بہت پہلے جب سے میں ہاسٹل لائف گزارتی آرہی ہوں کیونکہ میرے ڈیڈ بھی سیکنڈ میرج کے بعد سیٹلڈ لائف گزار رہے ہیں اور مما بھی۔"
"اور تمہارا کوئی بہن بھائی۔" عروہ کو صحیح معنوں میں جھٹکا لگا۔
"ہاں ایک بھائی ہے ابروڈ میں ہوتا ہے آج کل۔" ابھی الجھی سی شیریا سے اسے بڑی ہمدردی محسوس ہوئی۔
"آئی ایم سوری مجھے پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"
"ارے کوئی بات نہیں یہ تو ہماری زندگی ہمارا نصیب ہے۔" اور چند ایسی ہی باتیں کرکے شیریا جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھوڑی ہی دیر میں ان کی بہت اچھی فرینڈشپ ہوگئی تھی جاتے جاتے گلے لگ کر شیریا کافی ہلکی ہوگئی تھی۔
"پتا ہے عروہ آدمی بھی شجر کی مانند ہوتے ہیں۔ جن

کی اپنی اپنی چھاؤں ہیں ان کے ظرف کے مطابق اور عروہ تمہاری چھاؤں بہت گھنی ہے شفقت والی' ماں کی مانند یقین مانو مجھے ایسا سکون کسی اور کی صحبت میں نہیں ملا۔"

"یہ تمہارا حسن نظر اور محبت ہے شیریا۔" عروہ نے مسکراتے ہوئے اس کا کندھا تھپکا۔

"نہیں یہ میری محبت نہیں ہے یہ جو تمہارے چہرے کی نرم مسکراہٹ ہے نا یہ دوسروں کو تمہاری طرف مائل کرتی ہے۔"

"اچھا اچھا بناؤ مت۔" اور شیریا اسے الوداع کہہ کر نیچے کی جانب اتر گئی۔

☼ ☼ ☼

"عفرا تو کینیڈا چلی گئی تھی غزنی بھیا کے پاس اور اتنے عرصے میں اس کی زندگی کا شاید واحد یہی مقصد رہ گیا تھا کہ روز جاکر بابا کا دماغ کھاتی انہیں منانے کی کوشش کرتی۔

"بابا آپ کیوں نہیں سمجھتے کہ ہم سب بہن بھائی دل و جان سے چاہتے ہیں کہ آپ دوسری شادی کرلیں۔"

"عروہ بیٹا یہ بالکل بھی مناسب نہیں ہے میری سمجھ سے باہر ہے کہ یہ خناس تمہارے دماغ میں آیا کیسے۔"

"پلیز اب مان بھی لیں نا۔" عروہ نے تنگ آئے لہجے میں کہا۔

"عروہ آپ کو پتا ہے نا کہ میری تمہاری ام جان کی لو میرج تھی بہت پیار کرتی تھی مجھ سے اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایران سے میرے ساتھ آگئی تھی میری ماں کی اتنی خدمت کی تھی اس نے یہ گھر اس کے چپے چپے پر اس کے نشان ہیں یہ تصویر وہ پینٹنگ' وہ گلدان یہ سب آج بھی اس کی بنائی ہوئی جگہوں پر رکھی ہیں غنوی نے ایک دفعہ صفائی کی غرض سے ان چیزوں کو ادھر ادھر کردیا تھا مجھے اس وقت تک نیند نہیں آئی تھی جب تک چیزوں کو ان کے مقام پر نہ رکھ دیا اس گھر کو بنانے اور سنوارنے میں اس نے بڑی محنت کی تھی۔"

بابا جان ام جان کی یادوں میں کھو چکے تھے یہ سچ تھا بابا اور ام جان کی محبت مثالی تھی لیکن ام جان انتقال کو بھی گیارہ سال ہوچکے تھے۔

☼ ☼ ☼

ایک طرف شیریا کی حالت دوسری طرف عروہ کا اصرار بابا کو آخر ماننا ہی پڑا سب بہن بھائیوں میں صرف عفرا کا ہی رویہ سرد تھا ورنہ باقی سب نے شیریا کو بہت اچھی طرح ویلکم کیا عروہ بابا کی زندگی کی طرف سے پرسکون ہوئی تو تھوڑے ہی عرصے بعد عفرا اس کے کمرے میں آئی ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد وہ خاموش ہوگئی پھر بولی۔

"عروہ۔"

"ہاں۔" عروہ نے لکھتے لکھتے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جو کھڑکی کے باہر نجانے کیا تلاش کررہی تھی۔

"عروہ۔" وہ پھر مخاطب ہوئی۔

"بولو بھی آگے کیا کہنا ہے۔" عروہ جھلا اٹھی ایک تو لکھنے کے درمیان آکر ڈسٹرب کیا اور بات بھی نہیں کررہی۔

"عروہ میں نے ایک دفعہ تم سے کہا تھا نا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی ایسا ہو جو میری تعریف کرے میرے فن کی نہیں مجھے ایسا بندہ مل گیا ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"اور تمہیں کیا لگتا ہے کہ کیا واقعی وہ تم سے محبت کرتا ہے۔" عروہ قلم پکڑے پکڑے ہی اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔

"ہاں میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا ہے۔"

"خدا کرے تمہارا گمان درست ہو بیسٹ آف لک کہاں ملا کون ہے بائیوڈیٹا تو بتاؤ۔" عروہ نے عفرا کو کھڑکی کی طرف سے گھما کر گلے لگایا۔

"بابا کو برا تو نہیں لگے گا۔" عفرا کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔

"نہیں میرے خیال سے نہیں اور ہونی بھی نہیں



ہے آخر کو غنوی آپی اور غزنی بھیا اور خود بابا نے پسند کی شادی کی ہے تم کل ہی اسے چائے پر بلا لو۔" آدھی رات عفرا سے باتیں کرتے کرتے بیت گئی عفرا اچھے موڈ میں کم ہی ملتی تھی۔

"اللہ تمہارے چہرے کی تازگی یوں ہی قائم رکھے۔" عروہ نے اسے دل ہی دل میں دعا دی۔

☼ ☼ ☼

دروازے پر بجتی مسلسل گھنٹی نے اس کی کوفت کو غصے میں تبدیل کردیا۔

"توبہ ہے کیا ڈھیٹ آدمی ہے کوئی دروازہ نہیں کھول رہا تو سمجھ لے کہ نہیں ہے کوئی گھر میں اور ایک انٹرکام بھی ابھی خراب ہونا تھا اب اتر کے نیچے جاؤ اور گیٹ تک جاؤ یا اللہ کتنا بڑا گھر ہے ہمارا اور اس چوکیدار کو بھی آج ہی جانا تھا۔" وہ سیڑھیاں اترتی بلکہ بھاگتی ہوئی گیٹ تک پہنچی دھاڑ سے گیٹ کھولا اور خشمگین نظروں سے آنے والے کو گھورا جو پلٹنے ہی والا تھا گورا چٹا بلیک پینٹ کوٹ میں ملبوس آدمی بھی کچھ کم غصے میں نہ تھا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو"

"میں شیر سے ملنے آیا ہوں۔"

"کیا شیر سے ملنے۔" عروہ کے ذہن میں فوری طور پر ایک ہاتھوں کا بنا ہوا شیر آیا۔

"ہاں میں شیر سے ملنے آیا ہوں۔ یہ پروفیسر خیام کا ہی گھر ہے نا۔"

"ہاں گھر تو ان کا ہی ہے لیکن کیا آپ واقعی شیر سے ملنے آئے ہیں۔" عروہ شیر کے نقطے کو سمجھ نہیں پارہی تھی۔

"جی کتنی مرتبہ دہراؤں۔"

"اچھا اچھا آجائیے۔" اسے مزید مہمان کو باہر کھڑا رکھنا اچھا نہ لگا لاؤنج میں بٹھا کر اس نے آنے والے کو کافی دی۔

"جی وہ شیر۔"

"وہ سر اصل میں میں اسے اٹھا کر لا نہیں سکتی آپ خود بابا کے کمرے میں چلے چلیں۔" عروہ بے چارگی سے بولی۔

"اٹھا کے نہیں لاسکتیں کیا شیر کو کچھ ہوا ہے۔" آنے والا بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا عروہ تنگ آگئی۔ ایک تو یہ بابا کے ملنے والے بھی۔

"ایکسکیوزمی سر ہم نے جاندار شیر نہیں پالے ہوئے جو خود چل کر آپ کے پاس آجائیں۔"

"شیر۔"

"ہاں ہاں شیر Loin" آنے والا عجیب نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"آپ کون ہیں پروفیسر صاحب کی۔" عروہ کو اس کے لہجے میں تمسخر لگا۔

"آپ کو اس سے مطلب؟"

"میں جاننا چاہتا تھا کہ پروفیسر صاحب کے گھر میں ایسے نادر نمونے کہاں سے آئے۔" اب کے عروہ خاموش استفسار کرتی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی کہ وہ کن نمونوں کی بات کررہا ہے۔

"میں پروفیسر خیام کی مسز شیریا' سے ملنے آیا ہوں میں اس کا بھائی ہوں علی حسنین اسے بتا دیجیے گا۔" اجنبی دروازے کے رستے باہر چلا گیا اور وہ سکتے کے عالم میں بیٹھتی چلی گئی۔

"ہائے اللہ اتنی ساری بے عزتی اور وہ بھی اتنے آرام سے کر گیا ہائے کیا کروں اف خدایا میں کتنی پاگل ہوں نہیں میں کیوں پاگل ہوں پاگل ہوگا وہ خود ہی اچھے خاصے نام کو شیر کردیا تنگ بنانا ہی تھا تو شیری کردیتے ہر ذی فہم انسان تو شیر کو شیر ہی سمجھے گا' توبہ ہے بیٹھے بٹھائے اپنے ہی گھر میں اتنی ساری بے عزتی کیا سوچتا ہوگا وہ بندہ اتنی بڑی رائٹر حد ہوگئی یعنی شیریا کا شیر یہ بھی نہیں تھا کہ کوئی دور کا بندہ ہو شیریا کا بھائی ہے اب تو آنا جانا بھی ہوگا اس گھر میں کیسے سامنا کروں گی۔" عروہ اپنے سر پر ہاتھ دھرے اپنی بے وقوفی کا ماتم کرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

ایک خوبصورت شام میں عفرا نے احمد بلال کو گھر

آنے کی دعوت دی عروہ عفرا کی پسند کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی باادب لوگ ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہے تھے اور احمد بلال تو نہایت عمدہ ادبی ذوق رکھتا تھا بابا نے بھی عفرا کی پسند کو پسندیدگی کی سند دے دی تھوڑی دیر میں بابا اٹھ کر چلے گئے تو عروہ نے اسے نگار خانے میں چلنے کی دعوت دی گول گول لکڑی کی سیڑھیوں پر اوپر کی جانب جاتے ہوئے احمد بلال نے ان کے گھر کی خوب تعریف کی۔

"مکان اپنے مکینوں کے ذوق کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے مزاج اور عادات کی ترجمانی کرتے ہیں اور آپ لوگوں کے گھر میں تو جو شے جس مقام پر ہے وہ اسی مقام کے لئے بنی ہے اتنی سجاوٹی اشیاء کے باوجود اشیاء کی بھرمار محسوس نہیں ہوتی میں بہت متاثر ہوا یہ گھر باہر سے جتنا خوبصورت نظر آتا ہے اندر سے اس سے زیادہ حسین ہے۔" احمد بلال حالانکہ خود بھی بہت ویل آف فیملی سے تعلق رکھتا تھا لیکن وہ وائٹ پیلس کے مکینوں سے متاثر نظر آتا تھا شاید یہ اس کے گمان سے زیادہ تھا۔

"اس گھر کی خوبصورتی کا سارا کریڈٹ ام جان کو جاتا ہے۔" وہ نگار خانے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو احمد بلال دنگ رہ گیا۔

"کیا یہ سب واقعی عفرا کے ہاتھوں کے شاہکار ہیں۔" اس کے انداز میں بھی تحیر نمایاں تھا۔

"یہ سب تو بہت عمدہ ہے۔ انٹرنیشنل گیلری میں رکھنے کے قابل۔"

"ہاں عفرا کئی انٹرنیشنل کمپیٹیشن جیت چکی ہے۔"

"میرے لیے یہ سب بہت حیران کن ہے کیونکہ عفرا نے مجھے بتایا تو تھا کہ وہ مصورہ ہیں لیکن اتنی مہارت اتنی زندہ تصویریں از ریئلی امیزنگ دیکھنے میں وہ لگتی ہی نہیں ہے کہ وہ اتنی بڑی آرٹسٹ ہے ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہونے والی عفرا یہ سب کیسے کر سکتی ہے۔" احمد بلال حیرت کے عالم میں پینٹنگز دیکھ رہا تھا عروہ نے مسکراتے ہوئے پیچھے کھڑی عفرا کی طرف دیکھا۔

"آپ کو مصوری سے کوئی نسبت ہے۔" عروہ نے احمد بلال سے پوچھا۔

"اور اک نہیں شوق ضرور ہے یہ تصویریں محض صناعی اور مصوری نہیں ان میں اس کا خیال اس کا احساس اس کی فکر کا اضطراب جھلکتا ہے لگتا ہے درون خانہ کچھ سلگ رہا ہے کوئی شورش سی بپا ہے جو تصویروں کے خالق کو بے چین کیے ہوئے ہے کچھ تلاش سی ہے جو کچھ نظر آرہا ہے جوں کا توں قبول نہیں ہے اور یہ تصویر۔" احمد بلال نے اس تصویر کی طرف اشارہ کیا جس میں چبوترے پر چیتھڑوں میں ملبوس لڑکی کے پاس رکھے کشکول میں تین گلاب کے پھول پڑے تھے۔

"اگر اسے کسی انٹرنیشنل گیلری میں رکھا جائے تو یہ پہلے نمبر پر ہوگی۔"

"ہاں مجھے بھی یہ بے حد پسند ہے۔"

کافی وقت گزار کر نیچے کی جانب آتے ہوئے احمد بلال بولا۔

"میں اپنے گھر میں بھی عفرا کے لیے ایسا ہال بنواؤں گا یہ جگہ واقعی ایسی ہے جو بھلائی نہ جاسکے لیکن میں اسے ایسا ہی گھر دینے کی کوشش ضرور کروں گا۔" جاتے جاتے عروہ اسے روک کر بولی۔

"بلال عفرا کو کسی اونچے محل کی خواہش نہیں ہے وہ عام لڑکیوں سے مختلف ہے گھر تو مکینوں کے خلوص مروت سے تشکیل پاتے ہیں گھروں کی خوبصورتی تو گھر والوں سے ہوتی ہے اور عفرا کو اسی خوبصورت کی ضرورت ہے۔" وہ احمد بلال کو گیٹ تک چھوڑنے گئی۔

✡ ✡ ✡

اگلے دن ناشتے کی میز پر شیریا کی شکل دیکھتے ہی اسے کل والے اجنبی کی یاد آگئی۔

"وہ شیریا کل آپ کے بھائی صاحب آئے تھے علی حسنین۔" عروہ نے توسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے بتایا۔

"علی علی آیا تھا ریئلی یہاں پر کس وقت۔" شیریا



خوشی اور حیرت کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں کوئی شام ڈھلے۔" عروہ نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

"اسٹیٹ سے کب آیا اتنے دنوں سے اس سے بات بھی نہیں ہوئی ضرور کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوگا نہیں بتایا تھا اس نے۔"

"نہیں۔" عروہ مختصر سا جواب دے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور شیریا فون پر مصروف ہوگئی بابا نے لنچ پر ہی علی حسنین کو انوائٹ کرلیا اور اسے اپنے قیمتی دو گھنٹے حمیدہ بی بی کے ساتھ برباد کرنے پڑے موڈ کے بغیر کھانا پکاتے ہوئے اسے بابا کی آفر ٹھکرانے پر پچھتاوا ہوا بابا کتنا کہتے تھے کہ عروہ کوئی شیف رکھوا دیتا ہوں کیونکہ حمیدہ بی بی اٹالین چائنیز کھانے نہیں بنا پاتی تھیں لیکن اس نے اس وقت تو بڑے آرام سے بابا کو منع کردیا تھا لیکن اب غصہ آرہا تھا عروہ کو ویسے بھی گھر میں غیر ضروری ملازموں کی فوج سے وحشت ہوتی تھی ٹیبل سیٹ کرکے وہ اوپر اپنے کمرے میں چلی آئی تھوڑی دیر بعد ہی بوا نے انٹرکام پر اسے بتایا۔

"جی مہمان آگئے ہیں صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" عروہ نے بابا کے حکم کو درخور اعتنا نہ جانا اور کانوں میں ہیڈ فون چڑھا کر مزے سے راکنگ چیئر پر جھولنے لگی اسی اثناء میں عفرا کمرے کا دروازہ کھول کر کہنے لگی۔

"عروہ! بابا نیچے بلا رہے ہیں شیریا کا بھائی آیا ہے۔ خاصی ڈیشنگ پرسنالٹی ہے۔ ہائیٹ بھی غضب کی ہے۔" عفرا خاصی متاثر نظر آرہی تھی۔

"سوری عفرا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" عروہ کے مزاج میں بیزاریت نمایاں تھی۔

وہ ابھی تین چار کمرے کے چکر کاٹ کر بیٹھی ہی تھی کہ بابا خود آگئے۔

"مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ آپ کی طبیعت کیسی ہے اور چاہے طبیعت کیسی بھی ہو اگر باپ بلا رہا ہے تو کیا قباحت ہے آنے میں کیا سوچ رہا ہوگا کتنی دفعہ کہلوا چکا ہوں اب فوراً نیچے آؤ۔" بابا پلٹے پھر مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"اور حلیہ ٹھیک کرکے آنا۔" بابا اپنی سنا کے چلے گئے اور وہ شدید غصے کے عالم میں آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"حلیہ ٹھیک کرلینا ہونہہ کیا ہوا ہے میرے حلیے کو۔" بلیک جینز جو غزنی اس کے لیے تین سال پہلے دبئی سے لایا تھا بلیو شرٹ اس نے برش بالوں میں پھیر کر اونچی سے پونی بنائی اور وارڈروب سے اسکارف نکال کر گلے میں ڈالا اور نیچے آگئی آنے والا شاید اس کی تکریم میں کھڑا ہوا تھا لیکن وہ زوردار آواز میں اجتماعی سلام کرکے چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گئی لاپرواہی سے پلیٹ میں چاول اور سلاد نکالنے لگی بابا نے غصے سے اسے گھورا لیکن وہ بے پرواہی رہی جیسے اس کے سوا کوئی اور موجود ہی نہ ہو۔

"علی یہ عروہ ہے میری بیٹی اور رائٹر بھی ہے دو کتابیں پبلش ہوچکی ہیں۔" بابا نے اس کے رویے پر پردہ ڈالنے کے لیے بات چیت شروع کی۔

"اوہ امیزنگ۔" بابا کا کوئی ملنے والا آگیا تھا وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے وہ دونوں بہن بھائی باتیں کرتے رہے شیریا نے اسے بھی گفتگو میں شریک کرنا چاہا لیکن اس نے ہوں ہاں سے زیادہ جوابات نہیں دیے اور تھوڑی دیر میں ایکسکیوز کرکے اوپر چلی آئی۔

✡ ✡ ✡

آہستہ آہستہ اسے نجانے کیا ہوگیا ایک مہینے میں وہ تین چار تحریریں تو باآسانی لکھ ہی لیا کرتی تھی اب پورے مہینے میں ایک بھی کہانی نہیں لکھی گئی روز نئی کہانی شروع کرتی اور بیچ میں چھوڑ کر پین سے کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں ڈالتی رہتی عجیب سی بے چینی اور بے سکونی تھی جس نے اسے پابہ زنجیر کیا ہوا تھا مزاج میں چڑچڑاپن شامل ہوتا جارہا تھا دل و دماغ کی کشمکش نے اس کی تخلیقی صلاحیت کو کمزور کرڈالا تھا جوڑ جوڑ میں ٹیسیں اٹھتیں اندھیری راتوں میں سکون ملتا نہ چاندنی راتوں میں مزا رہا صبحیں تازگی دے رہی تھیں

نہ سرخ شامیں کوئی رنگ۔
عفرا کی شادی کا غلغلہ اٹھا غزنی بھیا' بھابھی' غنوی آپی سب گھر آئے ہوئے تھے سب خوش باش چمکتے چہروں کے ساتھ تھے لیکن اب وہ نجانے کیوں صرف ایک شخص کی وجہ سے وہ یہ سب اس طرح انجوائے نہیں کرپارہی تھی' جس طرح اس کا مزاج تھا وہ جو ایک لمحہ ہوتا ہے نا جو کبھی کبھار پوری زندگی کو لپیٹ میں لے لیتا ہے عروہ کے ساتھ بھی کچھ یوں ہوا علی حسنین سے پہلی ملاقات پر ہونے والی بے عزتی وہ چاہ کر بھی نہیں بھول پاتی اور ایک چھوٹی سی بات کو لے کر قنوطیت کا شکار ہورہی تھی وہ جتنا علی حسنین سے خار کھاتی بابا اور غزنی بھیا اسے اتنی ہی امپورٹنس دیتے تھے خیرو خوبی کے ساتھ عفرا کی شادی اختتام پر پہنچی عفرا کے چہرے پر کھلتی بہار' احمد بلال کی چاہتوں کی غماز تھی عفرا کی شادی کے ہفتہ بھر بعد ہی غزنی بھیا اور غنوی آپی نے جانے کی تیاریاں پکڑیں۔
بابا کے ساتھ صبح واک سے واپس آتے ہوئے بابا نے اس سے بات کرنے کی ٹھانی۔
"اصولاً تو عروہ بیٹی تم بڑی ہو تمہاری پہلے شادی ہونی چاہیے تھی لیکن قدرت کے نظام میں ہر چیز کا وقت مقرر ہے جس طرح تمہارے اور بہن بھائیوں بلکہ تمہارے خود باپ نے اپنے لائف پارٹنرز خود سلیکٹ کیے ہیں اگر آپ کو بھی کوئی پسند ہو تو بتاؤ۔"
"نہیں بابا ایسی تو کوئی بات نہیں۔" عروہ باپ سے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے جھجک گئی۔
"پھر بھی کسی سے انڈر اسٹینڈنگ ہو۔"
"نہیں بابا میں نے کبھی کسی کو اس نظر سے نہ دیکھا اور نہ سوچا۔"
"گڈ تو پھر کیا سوچا ہے شادی کے بارے میں۔"
"بابا یہ تو آپ کا ہیڈک ہے۔" عروہ نے بابا کو معتبر کیا۔
"جسے میں پسند کروں گا اس پر آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔"
بابا خوش تھے۔

"نہیں۔" عروہ نے نفی میں جواب دے کر ان کی خوشی کو اور بڑھا دیا گھر آکر شاور لیتے ہوئے اس کے دل و دماغ کو سکون نصیب ہوا رات بھر جاگ کر ناول مکمل کرکے اس کے اندر کی آگ پر چھینٹا پڑا تھا اور اب وہ بھرپور ناشتا کرکے سونے کے لیے لیٹی تو رات کی خبر لائی' رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ شیریا دروازہ ناک کرکے سلیپنگ سوٹ میں اس کے کمرے میں آکر بیڈ پر بیٹھ گئی عروہ اپنے ناول کے صفحوں کو اکھٹا کرکے پنھی لگارہی تھی۔
"خیریت شیریا۔"
"ہاں خیریت تو ہے۔" شیریا نے اپنے چہرے پر جبری مسکراہٹ سجائی عروہ نے چند لمحے ٹھہر کر اس کا چہرہ کھوجا اور پھر سے اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔
"وہ عروہ سر نے تم سے پوچھا تو ہوگا۔" شیریا کی ہچکچاہٹ عروہ کی سمجھ سے باہر تھی۔
"کس بارے میں"
"وہی شادی کے لیے"
"ہاں بابا نے بات کی تھی۔"
"اور تم نے ہاں کردی۔" شیریا کے انداز میں حیرانی نمایاں تھی۔
"ہاں اس میں حیرانی کی کیا بات ہے وہ میرے والد ہیں میرے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے وہ میرے لیے اچھا بہتر ہی ثابت ہوگا۔" عروہ کے لہجے میں اطمینان تھا۔
"لیکن ...... اچھا مجھے پتا نہیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ تم علی کو پسند نہیں کرتی ہو۔"
"علی ...... علی حسنین کا یہاں کیا ذکر۔" وہ چونک سی گئی ہے۔
"کیا مطلب کیا تم لاعلم ہو کہ سر نے تمہارا رشتہ علی سے طے کردیا ہے۔" اب کے چونکنے کی باری شیریا کی تھی۔
"علی حسنین تمہارا بھائی نا۔" عروہ بے اختیار کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے'



عروہ کے ہر ہر عضو سے پریشانی جھانک رہی تھی۔
"عروہ ایسا ہوچکا ہے مجھے یہ تو پتا تھا کہ سر اور علی کے درمیان اس قسم کی بات چیت چل رہی ہے لیکن آج شام کو سر کے ساتھ علی کے گھر گئی تو سر نے علی کو بتایا کہ عروہ راضی ہے علی نے مٹھائی بھی منگوالی تھی۔"
"بابا نے بات کرلی تھی مجھ سے میں نے کہا کہ وہ جسے میرے لیے پسند کریں گے وہ مجھے قبول ہوگا لیکن بابا کو نام تو بتانا چاہیے تھا اور علی حسنین کے ساتھ میں کیسے شیریا۔" وہ شیریا کی جانب پلٹی --- اور شیریا خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی اس نے عروہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا جو رفتہ رفتہ ٹھنڈے پڑتے جارہے تھے۔
"شیریا میں اس شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی کبھی بھی نہیں۔" شدید پریشانی کا عالم تھا۔
"عروہ میری مانو تم سر کو منع کردو۔" شیریا کی بات نے عروہ کو چونکایا۔
"لیکن تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو شیریا وہ تو تمہارا بھائی ہے۔"
"ہاں وہ میرا بھائی ضرور ہے لیکن تم مجھے علی سے زیادہ عزیز ہو۔ لہٰذا میں نہیں چاہتی کہ تم جیسی نازک احساسات کی مالک لڑکی کو کوئی غم ملے عروہ تم اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکو گی مجھے معلوم ہے۔" شیریا کمرے کی کھڑکی سے باہر سیاہ اندھیرے کو کھوجتے ہوئے بولی۔
"مجھے صاف لفظوں میں بتاؤ شیریا تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"
"مما ڈیڈ کی سیپریشن کا ہم دونوں پر ہی بہت اثر ہوا لیکن میں تو پھر بھی سنبھل گئی تھی کیونکہ مما نے مجھے تو کچھ عرصے اپنے پاس رکھا تھا لیکن علی کو ہاسٹل میں ایڈمٹ کروادیا تھا پھر اس نے ہمیشہ ہی ہاسٹل لائف گزاری ہے بعض اوقات اس کا بی ہیویر کچھ عجیب سا ہوجاتا ہے مما' ڈیڈ کی وائف ان سب سے تو یہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا میں اس کی بہن ہوں اس لیے وہ مجھ سے کچھ فری ہے دوسرے معنوں میں تم کہہ لو کہ

وہ سائیکی ہے عورت ذات سے پوری طرح بدظن ہے میں تو خود حیران ہوں کہ اس نے شادی کی ہامی کیسے بھرلی۔" شیریا' عروہ کی جانب سے رخ بدستور موڑے ہوئی تھی۔
"لیکن صرف اپنے والدین کی وجہ سے اتنا ڈس ہارٹ ہونا سمجھ سے بالاتر ہے کیا کوئی اور حادثہ بھی ہوا ہے اس کے ساتھ۔" عروہ کے لہجے میں یقین تھا آخر وہ ایک رائٹر بھی تو تھی شیریا کی خاموشی میں ہی اس کی ہاں شامل تھی۔
"ہاں اسٹیٹ میں مما نے مجھے بتایا تھا کہ علی کسی لڑکی میں بری طرح انوالو ہوگیا تھا لیکن بعد میں اس لڑکی نے علی کو چھوڑ دیا تھا جب سے علی بالکل چینج ہوگیا ہے۔" شیریا نے حقیقت واضح کی کمرے میں خاموشی کی برف جم گئی وہ دونوں اپنی اپنی جگہ ساکت ہوگئیں گھڑی کی ٹک ٹک بھی سماعت پر گراں گزر رہی تھی۔
"یہ سب بہت غلط ہونے جارہا ہے لیکن اب اب کچھ نہیں ہوسکتا۔" عروہ نے سکوت کو توڑا۔
"کیوں کیوں کچھ نہیں ہوسکتا عروہ یہ صحیح نہیں ہورہا ہے عروہ میں علی کو بہت اچھے طریقے سے جانتی ہوں۔" شیریا نے تیزی سے بڑھ کر اسے بازوؤں سے جھنجھوڑا۔
"نہیں شیریا جب میں نے بابا کو کہہ دیا تھا کہ وہ جسے میرے لیے پسند کریں گے مجھے قبول ہوگا تب بابا کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوئی تھی شیریا تم نے وہ چمک نہیں دیکھی میں نے دیکھی تھی' وہ مان صرف میں نے عروہ خیام نے انہیں دیا ہے وہ خوشی میں ان سے نہیں چھین سکتی کبھی بھی نہیں۔" ایسا لگا جیسے وہ زیر لب دہرا کر خود کو بھی یقین دہانی کرارہی ہے۔
"تو کیا تم صرف سر کی وجہ سے اپنی پوری زندگی برباد کرلوگی۔" شیریا کے ہاتھ گر گئے اس کے انداز میں بے یقینی تھی۔
"ہاں میں بابا کو انکار نہیں کرسکتی۔" عروہ کے اندر کی پرعزم لڑکی بے دار ہوگئی۔
"اور جبکہ انہوں نے بات بھی کرلی ہے۔" عروہ

فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"لیکن عروہ یہ تمہاری زندگی کی بات ہے اور علی کو میں جانتی ہوں۔ اس کے لیے شادی صرف کھیل ہے مما اور ڈیڈ کی طرح تم یہ سب برداشت نہیں کرپاؤ گی کبھی کبھی وہ بالکل آپے سے باہر ہوجاتا ہے۔" شیریا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بابا نے اسے اگر میرے لیے چنا ہے تو یقیناً" اس میں کوئی کوالٹی دیکھی ہوگی جو ہمیں نظر نہیں آرہی۔" عروہ پرسکون ہوتی جارہی تھی۔

"بابا میرا برا نہیں چاہتے وہ مجھے آباد دیکھنا چاہتے ہیں تو میں آباد ہوکر دکھاؤں گی۔" عروہ کے اندر حوصلے امید کی نئی کرن پیدا ہوئی۔ شیریا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔

"نہیں شیریا میرے اندر کی امید حوصلے کو تمہاری دعاؤں' نیک تمناؤں کے سائبان کی ضرورت ہے بعض لوگ دنیا میں شاید دوسروں کی تکمیل کے لیے بھیجے جاتے ہیں' شاید میرا شمار انہی میں ہے۔" شیریا بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

دوسرے روز کی بات تھی وہ کمرے سے نکل کر لائبریری کی طرف جارہی تھی کہ ریک پر رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی اس نے ریسیور اٹھا کر ہیلو' کہا دوسری طرف علی حسنین تھا۔

"جی فرمائیے۔" عروہ کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

"کیسے ہوگا عروہ تمہارا گزارا جس شخص کی آواز ہی تمہاری سماعت پر گراں ہے اس سے عمر بھر کا رشتہ۔" ایک سوچ نے اس کے اندر دم توڑ دیا۔

"عروہ خانم بات کررہی ہیں۔" ہمیشہ کی طرح عروہ کو لگا کہ اس نے 'ع' پر طاقت صرف کی ہے نجانے کیوں اسے باربار محسوس ہوتا تھا کہ علی حسنین ان ڈائریکٹ طریقے سے اس کا مذاق اڑاتا ہے۔

"جی۔"

"پہچان گئی ہوں گی آپ ہمیں۔"

"جی۔" عروہ نے ابھی بھی جی کہنے پر اکتفا کیا۔

"ہاں کیسے کردی آپ نے۔" علی حسنین کا ڈائریکٹ انداز عروہ کو حد درجہ برا لگا۔

"جواب دینا ضروری ہے۔" اس نے کوشش کی دل میں پیدا ہونے والے خیالات کا اثر لہجے پر نہ پڑے۔

"ہاں میں نے اسی لیے فون کیا ہے یہ فیصلہ آپ کی رضامندی سے ہوا ہے نا۔"

"اور میں پوچھوں کہ آپ نے پرپوزل کیسے بھجوادیا تو۔"

"کسی سے تو شادی کرنی ہی ہوتی ہے نا تو سوچا کہ پروفیسر صاحب کی صاحبزادی سے ہی شادی کرلیتے ہیں۔" عروہ کا وہم تھا یا حقیقت لیکن اسے ابھی بھی علی حسنین کے انداز میں تمسخر لگا۔

"میرا جواب بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔"

"گویا آپ کو لپیٹنا بھی آتا ہے۔"

"مجھے اور بھی بہت کچھ آتا ہے۔" عروہ بولی۔

"چلیں آہستہ آہستہ سب علم میں آجائے گا لیکن آپ کا راضی ہونا ہمارے لیے باعث حیرت ہے۔" عروہ نے خاموشی کا سہارا لیا۔

"پھر کیا خیال ہے یہ شادی جلد نہ ہوجائے یہ نہ ہو کہ میرا خیال بدل جائے یا آپ کا ارادہ۔"

"اگر شادی سے پہلے ہی آپ کا خیال بدلنے کا اندیشہ ہے تو پھر شادی کے بعد کی کیا گارنٹی ہے۔" عروہ آرام سے دیوار کے ساتھ رکھے کاؤچ پر ٹانگ رکھ کر فرصت سے بیٹھ گئی۔

"گارنٹی تو کسی بھی چیز کی نہیں ہوسکتی عروہ خیام۔" علی حسنین کی بات نے عروہ کو سنجیدہ کردیا۔

"حسنین صاحب دیکھنے میں تو آپ خاصے پریکٹیکل لگتے ہیں آپ کے لیے یہ شادی کھیل یا وقتی معاہدہ ہوسکتی ہے لیکن عروہ خیام کے لیے نہیں یہ فیصلہ میری پوری لائف پر اثر انداز ہوا ہے۔"

"ویٹس گڈ! بات کچھ یوں ہے کہ آپ نے زندگی کچھ اور طرح برتی ہے اور میں نے کچھ اور میرے آس پاس شادی ایک کھیل ہی سمجھی جاتی ہے لیکن۔ اگر آپ میرے ساتھ مخلص ہوں تو میں یہ تجربہ اپنی پوری زندگی پر محیط کرسکتا ہوں۔" علی حسنین کی باتیں سن کر عروہ کا دل لرزنے لگا جس شخص کے پہلے ہی ایسے خیالات ہوں وہ بعد میں کیا کرے گا بابا نے کیا دیکھا تھا اس میں۔

"میرا ساتھ آپ کے اس تجربے کو خوشگوار بنادے گا۔" عروہ نے بالآخر اپنے آپ کو یہ جملہ کہنے پر مجبور کیا زندگی میں مصلحتوں اور ڈپلومیسی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

"ویٹس گڈ تم ایک اچھی رائٹر ہو یہ تم سے بات کرنے پر پتا چلا۔" پوری گفتگو میں یہ شاید واحد جملہ تھا جس نے عروہ کو اطمینان بخشا تھا فون بند کرنے کے بعد عروہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا جس شخص سے صرف دس منٹ بات کرکے ہی اندر تک تھکن ہوگئی ہے اس سے رشتہ' وہ بے چارگی سے نیلے آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

پھر آخر وہ گھڑی آگئی جب اس کی زندگی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگیا شیریا نے اسے کمرے تک پہنچایا چند لمحے صوفے پر بیٹھنے کے بعد وہ سنگھار میز کی کرسی پر جا بیٹھی پتا نہیں آخر کیا کیا گل افشانیاں کرے گا اس نے زیور اتارنا شروع کیا تھا کہ دروازے کا لاک کھلا قدموں کی چاپ اس کی کرسی کے پیچھے آکر رک گئی گلے سے گلوبند اتارتے عروہ کے ہاتھ ساکت ہوگئے سامنے آئینے میں نظر آنے والے عکس کو دیکھا اور نگاہ جھکالی علی حسنین اس سادہ سی لڑکی کو اتنا بدلا ہوا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

گھڑی اتار کر میز پر ڈالی اس کے ساتھ ہی ایک اور ڈبیا جیب سے نکال کر اس کی گود میں ڈال کر چینج کرنے چلا گیا یہ یقیناً" اس کی رونمائی کا گفٹ تھا سب کچھ ویسا ہورہا تھا جیسا عروہ نے تصور کیا تھا لیکن سینے میں موجود اس دھڑکتے لوتھڑے کا کیا کرتی جس کے بھی کچھ ارمان تھے۔

وہ بھی چینج کرکے اس جہازی سائز بیڈ کے دوسری جانب آلیٹی اس کے بائیں طرف لیٹے شخص پر نیند کی پریاں مہربان ہوچکی تھیں اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

"یہ نارسائی کا کرب تو تم نے خود چنا ہے اپنے لیے عروہ۔" شیریا کی باتیں ایک ایک کرکے اس کے ذہن میں جاگنے لگیں۔

"تم نے کبھی کسی صنف نازک کو چاہا ہوگا یقین نہیں آتا حسنین علی۔" عروہ نے پرنم آنکھوں سے علی کی طرف دیکھا۔

☼ ☼ ☼

علی حسنین نے نجانے کیا سوچا ہوا تھا اور کیا سوچ کر عروہ سے شادی کی تھی۔ وہ دن کو جلے پیر کی بلی کی مانند پورے گھر میں پھرا کرتی اور رات گئے علی حسنین گھر آتا تو اس سے کچھ کہنے کی خواہش دل میں لیے سوجاتی' ایڈیٹرز کا فون آتا۔

"کیا حسنین صاحب نے ہم سے ہماری ماہر ناز ادیب کو چھین لیا ہے۔" اور وہ ریسیور رکھ کر رہ جاتی وہ کرسی پر بیٹھ کر قلم ہاتھ میں لیتی لیکن دنیا الفاظ سوچوں کا سارا خزانہ صرف دو الفاظ کے سامنے آکر ڈھیر ہوجاتا' علی حسنین' علی حسنین کبھی وہ اتنا مہربان ہوتا کہ وہ حیرت زدہ رہ جاتی حیرت کے بادل چھٹتے تو وہ اجنبی بن جاتا اور وہ سراب اور حقیقت' گمان اور یقین کے بھنور میں پھنس کر رہ جاتی اس کا ہاتھ ہوا میں معلق رہ جاتا اور وہ بیچ بھنور میں اس کا ہاتھ تھام لیتا اور جیسے ہی وہ توازن برقرار کرتی تو وہ پھر دامن بچا جاتا وہ اس آنکھ مچولی کے کھیل سے تنگ آگئی تھی۔

"اس گھر میں میری حیثیت کیا ہے علی حسنین؟" عروہ شاید صورت حال سے فیڈاپ ہوچکی تھی۔

"کیا مطلب ہے اس سوال کا' یہ گھر آپ کا ہے آپ میری بیوی ہیں کیا یہ کافی نہیں۔" علی حسنین کے الفاظ میں اپنائیت لیکن انداز سرد تھا۔

"میں آپ سے یہ پوچھ رہی ہوں کہ اس شادی کا

مقصد کیا ہے۔" عروہ تیز لہجے میں بولی۔
"کیا بے کار باتیں کررہی ہیں عروہ سب شادی کرتے ہیں میں نے بھی کرلی۔"
"سب شادی کرتے ہیں تو فرائض بھی ادا کرتے ہیں علی صاحب۔" عروہ بولی۔
"میں کون سے فرض سے کوتاہی کررہا ہوں گھر کا سودا موجود ہوتا ہے آپ کے اکاؤنٹ میں پیسے جمع ہوجاتے ہیں۔"
"روپے پیسے سے آگے بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں علی صاحب جن کا علم ہے آپ کو۔" عروہ بولی علی حسنین کے ماتھے پر شکن آگئی۔
"صاف صاف بات کریں عروہ مجھ سے بے زار ہوگئی ہیں۔ اس گھر سے جانا چاہتی ہیں تو بتادیں مجھ کو میں نے کبھی آپ کو پاؤنڈ نہیں کیا۔" علی حسنین کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ چکا تھا۔
"میری باتوں کا الٹا مطلب کیوں نکالتے ہیں؟"
"میں اچھی طرح جانتا ہوں تم لوگوں کی فطرت کو زہر دیتی ہو قند میں چھپا کے۔" علی حسنین دھاڑا عروہ دم بخود اس کا یہ روپ دیکھتی رہی جو پہلی مرتبہ اس کے سامنے آرہا تھا۔
"ایک فرد کی بے وفائی کو یاد رکھ کر پوری صنف سے بدظن ہوجانا کہاں کی عقل مندی ہے علی حسنین۔" عروہ نے سر کے درد سے بے حال حسنین کو چائے کا کپ اور پین کلر پکڑاتے ہوئے کہا علی حسنین نے نگاہ اٹھا کر سرخ سرخ نظروں سے اسے گھورا عروہ بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔
"سنو ایسا کرو تم اپنا سامان سمیٹو اور اپنے باپ کے ہاں چلی جاؤ۔ یہی تمہارے لیے بھی بہتر ہے اور میرے لیے بھی۔" عروہ کو تو لحہ بھر کے لیے سکتہ ہوگیا اس کی آنکھیں دکھ اور حیرانی کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
"دیکھ کیا رہی ہو سامان سمیٹو ڈرائیور چھوڑ آئے گا تمہیں۔" علی حسنین بازو آنکھوں پر رکھے اس ظالم جادوگر کی مانند لگا جو ایک کے بعد ایک درد کی سوئیاں چبھو رہا تھا۔
"لیکن علی تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو ٹھیک ہے میں نے بہت کچھ الٹا سیدھا کہہ دیا تھا لیکن ذرا سی بات پر گھر کو کیوں برباد کررہے ہو آئی ایم سوری علی لیکن......"
"میں نے کہا نا کہ دفع ہوجاؤ گیٹ لاسٹ۔" عروہ دکھ کے آخری لمحوں کو پار کررہی تھی وہ الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل آئی۔
"گیٹ لاسٹ گیٹ لاسٹ گیٹ لاسٹ" اس کے دماغ میں آواز گونجی اور وہ کانوں پر ہاتھ رکھے دوڑتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

شیریا کو اس کا چہرہ دیکھتے ہی انہونی کا احساس ہوا ایک وحشت کی آگ تھی جو عروہ کو گھیرے ہوئے تھی شیریا جیسے بن بنے ہی سب کچھ سمجھ گئی کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی شیریا نے اسے دودھ کے ساتھ سلیپنگ پلز دے دیں تھوڑی دیر میں عروہ موت کی عارضی وادیوں میں کھو گئی آنکھ کھلتے ہی شعور اور لاشعور کے سارے پردے ہٹتے چلے گئے جو ہوگیا تھا اس کا دکھ اور اب جو ہوگا اس کا ڈر اس کے رگ و پے میں سرائیت کرگیا۔ اسی اثناء میں شیریا دروازہ کھول کر اندر آگئی کھانے کی ٹرالی میز کے پاس کھسکا کر وہ ہاتھ مسلتے ہوئے عروہ کے سامنے آبیٹھی بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگاتی عروہ نے پشیمانی میں مبتلا شیریا کو دکھ بھری نظروں سے دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔
"بابا کو......" عروہ چند لمحے رک گئی کیسے پوچھے۔
"کیا بابا جانتے ہیں کہ میں یہاں آگئی ہوں۔" عروہ نے جھجکتے جھجکتے پوچھا شیریا نے اثبات میں گردن ہلائی۔
"ہوا کیا تھا؟" شیریا کی آواز مدھم تھی۔
"اس نے مجھے کہا گیٹ لاسٹ اور میں.......... میں گیٹ لاسٹ ہوگئی۔" عروہ جملے کے اختتام پر خود اذیتی والی ہنسی ہنس دی۔



"میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ وہ عجیب شخص ہے۔" شیریا بولی۔
"شیریا کسی کو الزام مت دو بعض دکھ تو مقدر کے لکھے ہوتے ہیں جتنی کوشش کرلو جتنی دیواریں کھڑی کرلو یہ تو آپ کے نصیب بن جاتے ہیں لاکھ دامن چھڑاؤ مقدر کا لکھا نہیں ٹلتا پلیز شیریا مجھے تنہائی کی ضرورت ہے مجھے سوچنے تو دو کہ خسارے کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا اور کب تک جاری رہے گا شیریا نہیں معلوم ہے عورت ذات کی کیا وقعت ہوتی ہے اس کی عمر بھر کی ریاضت کو مرد تین حرفوں سے خاک میں ملا سکتا ہے۔" عروہ خود ترسی کے نجانے کون سے مرحلے پر تھی۔
"شیریا بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ جتنی خدمت اطاعت ہم اپنے مردوں کی کرتے ہیں اس کی آدھی بھی اگر ہم اپنے پروردگار کی کرلیں تو ہماری تو دنیا و عاقبت سنور جائے لیکن ہم ہم واقعی ناقص العقل ہیں۔" عروہ چند لمحے خاموش ہوگئی۔
"یہ جو ازدواجی زندگی کے قوانین ہیں نا ان میں مرد و عورت کے حقوق و فرائض یکساں ہوتے ہیں لیکن مشرق کے خودساختہ قوانین نے توازن کو ختم کرکے زندگیوں کو تلخ بنادیا ہے۔" عروہ کی ذہنی رو آپس میں مل نہیں رہی تھی اس کی باتیں بے ربط انداز اس کی اعصابی کمزوری کو ظاہر کررہا تھا شیریا اٹھ کر اس کا سر سہلانے لگی اور عروہ تو جیسے ایسے ہی کسی ہمدرد کے انتظار میں تھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی شیریا نے بھی ان آنسوؤں کا بہہ جانا ہی بہتر سمجھا۔
"تم ٹینشن نہ لو عروہ سر ابھی جارہے ہیں علی بھیا کی طرف۔" شیریا بولی عروہ تڑپ کر اس سے علیحدہ ہوئی۔
"نہیں شیریا تمہیں میری قسم تم بابا کو منع کردو وہ وہاں نہیں جائیں گے۔" عروہ کا لہجہ سخت تھا۔
"اور پلیز مجھے تنہا چھوڑ دو ڈسٹرب نہ کرو۔" عروہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے بولی شیریا کمرے سے باہر نکل گئی عروہ رات تک کمرے سے باہر نہ نکلی نہ ہی شیریا نے اسے ڈسٹرب کیا حمیدہ بوا دودھ کا گلاس لے کر آئیں تو انہوں نے جھجکتے ہوئے بتایا۔
"نیچے علی بابو آئے ہوئے ہیں۔" عروہ کے ہاتھ سے دودھ چھلک گیا اور وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔
"کیوں؟"
"بیٹا ہم کو یہ تو نہیں علم۔" حمیدہ بوا کہہ کر چلی گئیں اور عروہ پر بے سکونی چھاگئی۔
"اتنی جلدی کیسے آگیا اتنی جلدی تو نہیں آسکتا۔" وہ کسی خدشے کے تحت کانپ گئی اس نے بیڈ پر پڑا دوپٹہ گلے میں ڈالا اور تیزی سے بھاگتی ہوئی نچلی منزل کی طرف دوڑی آخری زینے سے اترتے ہوئے وہ یکدم ساکت ہوگئی۔
"مجھے بہت افسوس ہے سر میں آپ کی امیدوں پر پورا نہیں اتر سکا۔" عروہ نے حیرانی سے علی حسنین کو یہ جملہ ادا کرتے ہوئے سنا اس نے بابا کی طرف دیکھا جن پر ایک ہی دن میں بڑھاپے کی دھوپ چھاگئی تھی۔
"لیکن علی بھیا آپ صرف یہ کہہ کر خود کو بری نہیں کرسکتے آخر یہ عروہ کی زندگی کا معاملہ ہے۔" شیریا بولی عروہ کا دل سکڑ کر پھیلا۔
"کیا یہ کوئی فیصلہ کرنے آیا ہے؟"
"علی بیٹا دیکھو یہ معاملات اس طرح جلد بازی میں طے نہیں ہوتے تم بیٹھو تو سہی اطمینان سے تمہیں اور عروہ کو ایک دوسرے سے جو شکایت ہو اسے سلجھاؤ مجھے بتاؤ اس طرح تو بگاڑ پیدا ہوجائے گا۔" بابا نے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"سوری سر مجھے عروہ سے کوئی بھی شکایت نہیں ہے بلکہ وہ تو بہت اچھی ہے یوں سمجھیے کہ میں ہی ان کے قابل نہیں ہوں مجھے اجازت دیجیے چلتا ہوں۔" علی حسنین نے بریف کیس کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔
"بالکل صحیح کہا آپ نے علی بھیا آپ ہی عروہ کے قابل نہیں ہیں ہیرے اور پتھر کا جوڑ بھلا کیسے بن سکتا ہے لیکن آپ عروہ کو رسی پر لٹکا کر نہیں جاسکتے کوئی فیصلہ کریں آر یا پار۔"
"شیریا۔" عروہ زوردار آواز میں چیخی کتنی آسانی

سے میری زندگی کی قیمت لگا رہے ہیں یہ دونوں بہن بھائی۔

"کیا پاگل پن ہے شیریا نہایت جذباتی ہیں آپ۔" پروفیسر خیام کو بھی اس پر غصہ آیا علی حسنین نے سیڑھیوں کے آخری اسٹیپ پر کھڑی عروہ کو دیکھا جو شکستہ قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اسے دیکھ کر وہ سب ہی خاموش ہو گئے عروہ نے صوفے کی بیک پکڑ کر خود کو سہارا دیا سامنے کھڑے علی حسنین کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا کافی وقت خاموشی کی نذر ہو گیا۔

"میں واپس اسٹیٹ جا رہا ہوں۔" خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا تھا لیکن عروہ کسی اور طلسم میں گرفتار رہ گئی تھی بابا اور شیریا نجانے کب کے لاؤنج چھوڑ گئے تھے۔

"کب؟" عروہ کے ساکت لب ہلے۔

"آج شام۔"

"اچھا۔" عروہ دھیمے لہجے میں بولی علی حسنین باہر نکلا عروہ اس کے ہم قدم تھی گاڑی کا دروازہ کھول کر علی حسنین سیٹ پر بیٹھا گاڑی اسٹارٹ کی اس کی ہر حرکت عروہ کی ہارٹ بیٹ مس کرتی جا رہی تھی کچھ دیر تک علی حسنین اسٹیئرنگ پر یونہی ہاتھ دھرے بیٹھا رہا پھر بے اختیار دروازہ واپس کھول کر عروہ کی طرف بڑھا۔

"کچھ کہو گی نہیں مجھ سے۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟" عروہ چند لمحے ٹھہری۔

"کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں واپس پلٹنا ہے۔" اس نے اس کے بلیک بوٹوں سے نظر اٹھا کر آنکھوں میں تحیر لیے علی حسنین کو دیکھا علی حسنین نے حیرت سے الجھے بال بغیر چپل اجڑی ہوئی حالت والی عروہ کے لہجے کے یقین کو ناپا اور واپس گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھا دی عروہ کافی دیر تک پیچھے رہ جانے والی دھول کو دیکھتی رہی۔

"کہیں میں بھی پیچھے رہ جانے والی دھول ہی نہ بن جاؤں۔" خدشے نے ذہن میں جڑ پکڑی عروہ نے سر جھٹک دیا اور گھر کے دروازے سے اندر آ گئی۔

اس کی چال میں خود بہ خود ہی توازن پیدا ہو گیا تھا نہ جانے کیسا یقین اس کے دل میں سما گیا تھا کمرے میں آ کر اپنے رب سے اپنی استقامت کی دعا مانگی اپنے لیے عافیت طلب کی اللہ کا فضل مانگا دل کا چین و سکون مانگا اور پھر وہ پرسکون ہوتی چلی گئی اس کی نمازیں لمبی اور رب سے اس کا خصوصی تعلق بن گیا۔

"میں سوچتی تھی علی حسنین کی ہمراہی مجھے دکھ کے سوا کیا دے گی لیکن میرے رب کا مجھ پر فضل دیکھو مجھے تو دولت دو جہاں مل گئی۔ اس نے مجھے اپنا قرب دے دیا یقین کی دولت سے نواز دیا دل کا چین دے دیا لوگ کہتے ہیں کہ عروہ کی قسمت اچھی نہیں لیکن دراصل اب ہی تو عروہ آباد ہوئی تھی۔" شیریا اپنے آپ کو اس کا مجرم سمجھنے لگی تھی عروہ ہر ممکن طریقے سے اسے اس احساس سے نکالنا چاہتی گزرتے ماہ و سال نے عروہ کی تحریروں میں اور بھی نکھار پیدا کر دیا تھا۔ لیکن گزرتے وقت میں کبھی کبھی کوئی لمحہ ایسا بھی آ جاتا جب اس کے زور آور خیالات اسے عدم سے موجود کر دیتے اس کا تخیل اتنا مکمل ہو جاتا کہ وہ اسے اٹھتا بیٹھتا چلتا پھرتا دکھائی دینے لگتا۔

مہینے سال میں اور سال سالوں میں بدل گئے لیکن نہ ہوائیں اس کا کوئی سندیسہ لائیں اور نہ وہ خود پلٹا بابا کو اس کی فکر نے بستر سے لگا دیا خزاں کا موسم تو لگتا تھا ساری زندگی پر محیط ہو گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

زندگی کسی اداس زرد شام کی طرح مستقل ٹھہر گئی تھی کتنا سارا وقت کیسے بیت گیا سوچو تو لگے جیسے صدیاں گزر گئیں آٹھویں سال کا تیسرا ماہ چل رہا تھا کل ہی تو اس کی چوتھی کتاب "شب انتظار" مارکیٹ میں آئی تھی وہ کھڑکی سے ہٹ کر رائٹنگ ٹیبل کی کرسی پر آ بیٹھی سردیوں کا موسم تو عروہ کو ویسے بھی اداس لگتا تھا لگتا ہے جیسے ٹھنڈ جوڑوں میں بیٹھ گئی ہے اس نے بیڈ سے کمبل اٹھا کر گھٹنوں پر ڈالا۔

"ہم پر تو بڑھاپا بھی آ گیا علی حسنین کب آؤ گے۔" لکھنے کا دل نہ چاہا تو ہاتھ بڑھا کر شیلف سے اپنی نئی



ب "شب انتظار" کھولی۔

ا سا بھی یقین دنیائے فانی میں بڑی شے ہے
ان کتنا ہی بڑھ جائے گمان سے کچھ نہیں ہوتا
ر ہو آستان سے ربط دل تب بات بنتی ہے
ربط جبین و آستان سے کچھ نہیں ہوتا

پہلے صفحہ پر لکھا شعر اس کے دل کو بھایا

"امیدوں کے چراغ تو جلتے بجھتے رہتے ہیں لیکن وصلے کو بجھتے دیئے کے ساتھ نہیں ہار دینا چاہیے۔"

یسری لائن پر اس کی نگاہ اٹک گئی اس نے بے دلی سے فحات پلٹے۔

آخری صفحے پر لکھی نظم نے اس کے دل کو چھو لیا۔

اب دور آسمان ہے نہ دور حیات ہے
اے درد ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے
ظلمت سے نور سے یہ الگ کائنات ہے
حیرت سرائے عشق میں دن ہے نہ رات ہے
جینا جو آ گیا تو اجل بھی حیات ہے
اور یوں تو عمر خضر بھی بے ثبات ہے
کیوں انتہائے ہوش کو کہتے ہو بے خودی
خورشید ہی کی آخری منزل تو رات ہے
توڑا ہے لامکاں کی حدود کو عشق نے
زندان عقل تیری تو کیا کائنات ہے
حیرت سرائے عشق میں دن ہے نہ رات ہے

اس نے کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹا کیچو نہ ہونے کی صورت میں وہ دوبارہ کھل گیا بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے کیچو اٹھانے کے لیے وہ جھکی دروازہ کھلنے کی آواز ہوئی ڈھلکتی ہوئی شال دوبارہ کندھے پر ڈالتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھی تو نظر ساکت ہو گئی اس کا عدم وجود میں آ گیا تھا سراب تھا یا حقیقت وہ چلتا ہوا اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا وہ سنبھل سی گئی اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پر رکھی بالوں کو ادھ کھلا چھوڑ کر کیچو لگایا۔ میز پر پڑے کاغذات ایک طرف کیے پنوں کی ڈبیا دراز میں ڈالی اس نے چور نظروں سے دیکھا وہ ابھی تک موجود تھا یعنی کہ وہ واقعی تھا اس نے کرسی کی پشت سے کمر ٹکائی اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"کب آئے۔"

"آج شام۔" وہ بولا۔

"اچھا۔" عروہ نے بات مکمل کی۔

"کچھ کہو گی نہیں۔"

"نہیں۔"

"پوچھو گی نہیں کیوں آئے ہو۔"

"نہیں۔"

علی حسنین خاموش رہ گیا۔

"کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے لینے آئے ہو" عروہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"پھر چلو۔" علی حسنین اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں چلو۔" عروہ اس کے ہم قدم ہوتی گیٹ سے باہر نکل کر اس نے چوکیدار سے کہا۔

"بابا کو بتا دینا کہ میں حسنین کے ساتھ جا رہی ہوں۔" شال لپیٹتی ہوئی وہ گاڑی میں آ بیٹھی۔

"تمہیں اتنا یقین کیوں ہوتا ہے مجھ پر کہ میں وہی کروں گا جو تم کہو گی۔"

"مجھے تم پر نہیں اپنے آپ پر یقین ہے علی۔"

"کیوں؟"

"کیوں۔ یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم بس یہ میرے دل کی گواہی ہوتی ہے۔" عروہ کچھ سوچتے ہوئے بولی گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔

"تمہارے زیادہ تر ناولوں کے نام میں شب ضرور لگا ہوتا ہے۔ جیسے شب انتظار، شب آرزو، شکست شب، شب ہجر۔" علی حسنین نے پوچھا۔

"ہاں پتا نہیں کیوں؟"

"لیکن اب جو میرا ناول چھپے گا تا پتا ہے حسنین اس کا کیا نام ہو گا۔" عروہ نے سوالیہ انداز اختیار کیا۔

"شب ختم ہو گئی۔" علی حسنین نے اندازہ لگایا۔

"نہیں سحر ہونے کو ہے۔" گاڑی اپنے درست سفر پر گامزن تھی خزاں کا موسم ختم ہو چکا تھا زندگی زرد شام سے سنہری صبح میں تبدیل ہو گئی تھی یعنی سحر ہونے کو تھی۔

☆ ☆

مکمل ناول

ضوباریہ ساجد

تیسری قسط ۳

بس جو ہوا لحظ بھر میں ہو گزرا۔ اس کا رخ مخالف سمت تھا اور دروازے کے دائیں بائیں کھڑے دونوں مسلح افراد کی پیشانیوں سے خون کا فوارہ سا ابل پڑا۔

سمترا کا رخ عقبی سمت کیسے اور کب ہوا اور دروازے پر تعینات افراد کی پیشانیوں سے خون کیسے ابل پڑا کچھ سمجھ ہی نہ آسکا تھا۔ یقیناً "اس سب کے دوران میری پلک جھپک گئی ہوگی۔ بجلی ایک بار پھر چمکی۔ وہ دونوں ابھی عقبی دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر رہے تھے کہ سمترا دائیں پاؤں کی ایڑی پر گھومی اور بغلی دیوار کے ساتھ ہکا بکا کھڑا گن مین بھی پیشانی میں روزن لیے فرش پر آرہا۔

ہماری تو خیر کیا خود ان لوگوں کی اپنی عقل میں نہ آسکا کہ یہ سب کیا ہوا ہے؟ ہم سب اپنی جگہ مبہوت تھے اور زندہ بچنے والے دونوں اپنی جگہ سکتے کی کیفیت کا شکار تھے۔ میرا تو خیال تھا کہ اختر اپنے ہی خون میں نہایا ہوگا مگر یہاں یکا یک بساط ہی پلٹ گئی تھی۔ پھر اس سے قبل کی سمترا ان دنوں میں سے کسی کو نشانہ بناتی ویر چندر نے اٹھتے ہوئے رائفل کی نال پر ہاتھ ڈال دیا۔

ٹھیک اس لمحے عقب میں موجود شخص نے سمترا کے گلے میں بازو ڈال کر اسے دبوچ لیا۔ سمترا نے دائیں ہاتھ سے اپنی گردن کے گرد کسے بازو کو پکڑا اور ساتھ ہی ایک ٹھوکر ویر چندر کے جما دی۔ اس کے منہ سے ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی سی آواز نکلی اور وہ منہ کے بل جھکتا چلا گیا۔ سمترا نے ایک ذرا خود کو سامنے کی جانب جھکایا' اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس شخص کے جبڑوں کے نیچے پیوست ہوتی محسوس ہوئیں

دوسرے ہی لمحے وہ شخص سمترا کے اوپر سے ہوتا ہوا سامنے کی دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور سر کے بل نیچے فرش پر آگیا۔ ایک "چیخ" کی آواز بلند ہوئی غالباً "اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

سمترا کو نرغے میں آتا دیکھ کر عارب بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھا تھا مگر پل جھپکنے کی دیر میں سمترا نرغے سے بھی نکل گئی بلکہ میدان بھی صاف ہوا پڑا تھا۔

عارب ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سمترا کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب اس نازک اندام لڑکی ہی کی کارستانی ہے۔

میری طرح ڈاکٹر عقیل' اختر اور پروفیسر بھی بے یقینی کے سے انداز میں کبھی سمترا کی طرف دیکھ رہے تھے اور کبھی آڑے ترچھے پڑے ان اجسام کی طرف۔

عارب نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ کر فرش پر پڑی رائفل اٹھالی ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے میری نظریں سمترا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے لاشعور میں ایک ہلچل سی بپا تھی۔

"یہ کون ہے؟... اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟"

"دیوی جی! یہ سب کیا ہے؟ آپ نے اپنے ساتھیوں کو کیوں مار ڈالا؟" اختر نے پوچھا۔

"تمہاری محبت کا پاگل پن ہے یہ۔" سمترا نے اس کی طرف دیکھے بغیر سنجیدگی سے کہا۔

"اب کوئی فضول سوال نہیں کرنا یہ رائفلیں سنبھال لو۔" اور ہم نے ایک ایک رائفل اٹھالی البتہ

پروفیسر اپنی جگہ کھڑے رہے۔ سمترا نے ویریندر کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر تکلیف اور آنکھوں میں خوف کے سائے سمٹ آئے تھے۔

"بس... سمترا تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو... یہ کیا کیا تم نے... اپنے ہی آدمیوں کو مار ڈالا۔"

"ہاں! اب تمہاری باری ہے۔" سمترا نے سپاٹ انداز میں کہا۔

"کک... کیا مطلب... تت... تم ہوش میں تو ہو۔" ویریندر کی حالت خراب ہو گئی۔

"نہیں محبت کے زیر اثر ہوں۔ مجھے شما کر دیجیے گا۔" پھر اس سے پہلے کہ ویریندر مزید کچھ کہتا سمترا نے اس کا بھی وہی انجام کیا جو تینوں کا کیا تھا۔

سمترا نے ایک تجزیاتی نظر سے ہمارے چہروں کا جائزہ لیا پھر کھلے ہوئے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔ سیاہ گھنی زلفوں کی آبشار کمر سے بھی نیچے گر رہی تھی۔

"میرے پیچھے آجاؤ۔"

"ٹھہرو... پہلے ہمیں یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟" عارب کی آواز پر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر عارب کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"آپ مجھے سمترا دیوی کہہ سکتے ہیں۔"

"میں نے لطیفوں کی فرمائش نہیں کی۔" عارب نے خشک لہجے میں کہا۔

"میں بھی فرمائش پوری کرنے کی روادار نہیں۔" سمترا کی کشادہ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہو گئیں۔ اور وہ آگے بڑھ گئی۔

"رک جاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔" عارب کا لہجہ سخت ہو گیا۔ سمترا نے پلٹ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟"

"ہاں آپ ہی سے مخاطب ہوں۔" عارب نے رائفل سیدھی کر لی۔

"عارب کیا حماقت ہے یہ..." پروفیسر پہلی بار گویا ہوئے۔

"سمترا ہماری محسن ہے۔ اس نے ہماری زندگیاں بچائی ہیں اور تم اسی پر رائفل سیدھی کیے ہوئے ہو ہٹاؤ اسے پاگل نہیں بنو۔"

"پروفیسر میں بھی ان کا یہ احسان مانتا ہوں مگر صورت حال کا آپ کو بھی مکمل علم ہے۔ کچھ دیر پہلے تک یہ ہماری دشمن تھیں اور گرگٹ کی طرح لمحوں میں رنگ بدلا ہے انہوں نے۔ ذہن میں یہی پھانس ہے کہ نہ جان نہ پہچان ان کو ہمارے لیے ایسا انتہائی قدم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک مصیبت سے انہوں نے ہمیں نجات دلائی ہے تو دوبارہ وہ خود کہیں اس سے بھی بڑی مصیبت میں نہ پھنسا دیں! جب تک یہ اپنی طرف سے ہمیں مطمئن نہیں کر دیتیں میں رائفل کا رخ نہیں ہٹاؤں گا۔"

"یہی سوال اخلاق اور دوستی کے دائرے میں رہ کر بھی تو کیا جاسکتا ہے۔" پروفیسر نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ابھی تک میں نے کوئی بداخلاقی یا دشمنی نہیں کی ان سے۔"

"عارب!" میں نے ملائمت سے عارب کو مخاطب کیا۔ "پروفیسر کی بات درست ہے تم رائفل نیچے کر لو۔" پھر میں سمترا سے مخاطب ہوا۔

"براہ کرم آپ ہمیں اپنے بارے میں کچھ بتا دیں تاکہ ہماری الجھن اور پریشانی رفع ہو سکے۔" چند لمحے تک سمترا خاموش کھڑی رہی پھر گہری سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"دیکھیں ڈاکٹرز حضرات! میں قبل از وقت کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔ اسے آپ لوگ چاہیں تو میری مجبوری سمجھ لیں چاہے مصلحت، ہاں اتنا کہہ دیتی ہوں کہ میں دوستوں میں سے ہوں اگر تو میری بات کا یقین کر سکیں تو میرے ساتھ آجائیں بصورت دیگر آپ میری پیٹھ پر گولی چلا کر اپنے ذہنوں میں پلنے والے اندیشوں سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔" سمترا نے ایک ایک نظر ہم سب پر ڈالی پھر پلٹ کر کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئی۔ چند لمحے تک ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کرتے رہے پھر سب سے پہلے عارب ہی آگے بڑھا اور ہم نے بھی اس کی تقلید کی اور کمرے سے باہر نکل آئے۔

یہ ایک مختصر سی راہداری تھی۔ بائیں ہاتھ سے مکمل طور پر بند تھی اور دائیں ہاتھ میں چند قدم کے فاصلے پر جہاں راہداری کا اختتام ہوتا تھا وہاں سے یہ دائیں ہاتھ گھومتی تھی اور اس کونے میں ہی سمترا غالباً ہمارے ہی انتظار میں کھڑی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اتر آئی۔

"میں اس اعتماد پر آپ لوگوں کی شکر گزار ہوں۔" ہمارے قریب پہنچتے ہی وہ گویا ہوئی۔

"ہم نے آپ کو اپنا کمانڈر تسلیم کیا ہے۔ اب آگے بتائیں کیا کرنا ہے؟" عارب نے کہا۔

"شکریہ مسٹر عارب!" ایک ذرا توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

"یہاں آگے ایک کمرہ ہے اور اس کمرے کی دوسری سمت ایک مختصر سا ہال جہاں سے لفٹ اوپر ہوٹل تک جاتی ہے اس ہال میں ویریندر کے دو ذاتی گارڈ موجود ہیں۔ میں انہیں اندر کمرے میں بلاؤں گی آپ لوگوں نے ان پر قابو پانا ہے۔"

"تو کیا وہ ابھی تک وہاں موجود ہوں گے...؟ میرا مطلب ہے فائرنگ کی آواز...!" ڈاکٹر عقیل نے اپنا خدشہ ظاہر کرنا چاہا مگر سمترا نے درمیان سے ہی ان کی بات کاٹ دی۔

"فائرنگ کی آواز ان تک نہیں پہنچی ہوگی یہ جگہ ساؤنڈ پروف ہے۔"

"ٹھیک ہے! ہم تیار ہیں... آگے بڑھیں۔" عارب نے لاپروائی سے کہا اور سمترا راہداری میں مڑ گئی۔ دو قدم ہی کے فاصلے پر دروازہ تھا۔ سمترا نے اطمینان سے دروازہ کھولا اور اس کے پیچھے پیچھے ہم بھی اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک سجا سجایا کمرہ تھا۔ کسی عالیشان محل کی خوابگاہ جیسا۔ ایک طرف کونے میں منقش لکڑی کا دروازہ تھا۔ سمترا اسی دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

"تم لوگ دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے کہا اور ہم دو دو کی صورت میں دروازے کے دائیں بائیں دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر کھڑے ہو گئے۔ سمترا نے دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ کہیں قریب ہی سے ہلکی ہلکی باتوں کی آواز آنے لگی مگر باتوں کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ہماری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ نہ جانے وہ ان سے کیا کہہ رہی تھی اعصاب ایک تناؤ کا شکار ہو گئے۔ چند لمحے گزرنے کے بعد دروازے کے قریب آہٹ ہوئی اور سمترا اندر آگئی اور مطمئن انداز میں سیدھی آگے بڑھ گئی۔ اور پھر وہ دونوں بھی اندر آگئے جن کی گھات میں ہم چھپے کھڑے تھے۔ اور وہ جیسے ہی اندر آئے ہم نے انہیں قابو میں کر لیا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ دونوں ہی منہ کے بل گر پڑے۔ سمترا حیرت انگیز پھرتی سے پلٹی اور دونوں کی گردن مروڑ دی۔ وہ دونوں ہی بغیر کوئی آواز نکالے کارپٹ پر ڈھیر ہو گئے۔ سمترا ہمیں اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی ہم بھی فوراً ہی اس کے پیچھے لپکے۔

یہ ایک اچھا خاصا ہال تھا جس کی دیواروں پر کئی دروازے نظر آرہے تھے۔ سمترا کوئی بات کیے بغیر لفٹ کی جانب بڑھ گئی۔ لفٹ کا دروازہ بند کرنے کے بعد جب لفٹ ہلکے سے ارتعاش کے بعد حرکت میں آگئی تب عارب اختر سے مخاطب ہوا۔

"اختر! تم تو بالکل ہی خاموش ہوگئے ہو۔"

"کیا بولوں عارب بھائی۔ جو کچھ دیکھا ہے وہ دیکھنے کے بعد بھی کیا مجھے کچھ بولنا چاہیے؟" اختر ترچھی نظروں سے سمترا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں تو دیوی جی کو ایک عام سی دوشیزہ سمجھ رہا تھا۔ مگر... انہوں نے تو ہماری بولتی ہی بند کردی ہے اب آپ ہی بتائیں بھلا میں وہ دل گردہ کہاں سے لاؤں کہ جس پر بھروسہ کرتے ہوئے میں دیوی جی سے اظہار محبت کرسکوں؟" سمترا کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا وہ سنجیدگی کا شکار تھی۔

"دیوی جی!" اختر براہ راست سمترا سے مخاطب ہوا۔

"خیریت تو ہے آپ کچھ متفکر دکھائی دے رہی ہیں۔ اگر آپ کو میری باتیں ناگوار گزر رہی ہیں تو میں معذرت خواہ ہوں۔" سمترا نے بھنویں قدرے اوپر اٹھالیں۔

"میں بچوں کی باتوں پر ناگواری محسوس نہیں کرتی۔"

"اچھا... تو پھر آپ کی پریشانی کا محرک کیا ہے' دادی ماں؟" سمترا نے ایک ذرا اختر کو گھورا پھر نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

"جو ہوا اچھا نہیں ہوا... میں مہاراج کی نظروں میں آگئی ہوں اور پھر اس کے سات' سات آدمیوں کا قتل۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

"تو کیا ہوا... مہاراج کیا بندے کھاتا ہے؟" سمترا کے ہونٹوں پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔

"آپ لوگ مہاراج کے متعلق کچھ جانتے نہیں کہ وہ کیا بلا ہے... جب اسے اس واقعے کا علم ہوگا تو لپیار لازماً آئے گا اور کوئی بعید نہیں کہ اس کو سارے واقعے کی خبر بھی ہوگئی ہو۔"

"اتنی جلدی خبر بھی ہوگئی۔ وہ کیا کوئی جن ہے؟"

"ہاں البتہ تشبیہ اس کے لیے بالکل مناسب ہے۔" لفٹ ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

"یہ رائفلیں یہیں ڈال دیں' آگے یہ ہمارے لیے مسئلہ پیدا کرسکتی ہیں۔" سمترا کے کہنے پر رائفلیں ہم نے لفٹ کے ایک کونے میں ڈھیر کردیں۔ اور لفٹ سے باہر نکل آئے۔ یہ بھی ایک خوبصورت آرائشی کمرہ تھا جس میں ایک طرف دیوار گیر ریک میں امپورٹڈ برانڈ کی شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ سمترا نے آگے بڑھ کر سامنے کی دیوار میں نظر آنے والے دروازے کی "کی ہول" سے آنکھ لگادی پھر مطمئن سا سانس لے کر سیدھی ہوگئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور ہم باہر نکل آئے۔ یہ ایک صاف ستھری چمچماتی راہداری تھی جس کے دونوں طرف دروازے تھے۔ یقیناً ہم زیر زمین تہہ خانوں سے نکل کر اوپر ہوٹل پر پہنچ آئے تھے۔

"اب کدھر کا پروگرام ہے؟" عارب نے سمترا کو مخاطب کیا۔

"بس آپ میرے ساتھ آجائیں ہمیں جلد از جلد اس ہوٹل سے نکلنا ہے اور ہم سیڑھیوں کے رستے نیچے جائیں گے کیونکہ لفٹ کے ذریعے نیچے جانا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

"اور ہمارا سامان..."

"زندگیاں بچ گئی ہیں عقیل میاں! اس ذات کا شکر ادا کرو' سامان کی فکر چھوڑو۔" پروفیسر نے عقیل کی بات درمیان میں سے ہی قطع کرتے ہوئے کہا۔

"سامان کی طرف سے بھی بے فکر ہوجائیں وہ میرے آدمی لے جاچکے ہیں۔" سمترا نے کہا۔

"آخر آپ بتا کیوں نہیں دیتیں کہ آپ کیا چیز ہیں؟" ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

"چیز... ؟ عقیل صاحب میں ایک عام سی لڑکی ہوں اور بس۔"



ہم سیڑھیوں کے رستے نیچے پہنچے اور عقبی طرف پورچ میں کھلنے والے گلاس ڈور سے پورچ میں پہنچ گئے۔ ٹھیک اسی وقت ایک لینڈ کروزر قطار در قطار کھڑی گاڑیوں میں سے نکلی اور ہمارے سامنے آرکی۔ ایک لمحے کو ہمارے دل اچھل کر حلق میں آگئے۔ ڈرائیور سیٹ پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ بریک پر پاؤں رکھتے ہی وہ سمترا کی طرف دیکھ کر بولا۔

"السلام علیکم میڈم۔"

"وعلیکم السلام' کہو عبدل کیا حالات ہیں۔"

"امن...۔" عبدل نے مختصر جواب دیا اور سمترا ہمیں اشارہ کرتی ہوئی گاڑی کی دوسری جانب گھوم گئی اور اس کے ساتھ ہم بھی گاڑی میں سوار ہوگئے۔ پردے کھینچ دیے گئے اور گاڑی پورچ سے نکل کر دہلی کی معروف شاہراہ پر آگئی۔ ایک جگہ سے ہم نے گاڑی تبدیل کی۔ اس گاڑی میں بھی سمترا کا ہی آدمی تھا۔ کچھ فاصلہ دو ٹیکسیوں میں طے کیا گیا پھر ہم ایک کھٹارا سی ویگن کے عقب میں سوار ہوئے' راستے بھر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ میرا ذہن سمترا کی ذات میں الجھا ہوا تھا۔ بڑی اونچی چیز تھی۔ بظاہر خود کو ایک عام اور بے ضرر سی لڑکی کہتی تھی مگر ساتھ ہی حقیقت بھی ہمارے سامنے تھی۔ اس کی چال کا وقار' لہجے کا اعتماد آنکھوں سے چھلکتی ذہانت کی چمک اور اس کے لڑنے کی تکنیک اور... اور پھر جدید اور آٹومیٹک رائفل بھی اس نے اس طرح چلائی تھی جیسے کہ کھلونا بندوق۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ اس نے جہاں سے بھی حاصل کی تھی زبردست تربیت حاصل کی تھی مگر ہمارے لیے الجھن کی بات یہ تھی کہ اس کی سپورٹ پر کون ہے اور وہ ہمارے لیے اتنا کچھ کیوں کررہی ہے؟ میں انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں تھا کہ ویگن ایک پرانی طرز کی عمارت کے گیٹ پر پہنچ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا تو کچھ دیر کے انتظار کے بعد گیٹ کھل گیا۔ گیٹ کھولنے والا ایک دیو قامت آدمی تھا۔

ڈرائیور ویگن کو سیدھا اندر لے گیا جب ایک کونے میں ویگن رک گئی تو ہم سب نیچے اتر آئے۔ اب بھی کچھ کمی تو نہ تھی تاہم کسی دور میں یہ عمارت بڑی پرشکوہ رہی ہوگی۔ ایک طرف گارڈن چیئر پر ایک نوجوان بیٹھا غالباً اپنی نصابی کتابوں کی اسٹڈی کررہا تھا اور اس سے تھوڑے فاصلے پر مالی رمبی سنبھالے پودوں کی گوڈی کررہا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نوجوان نہ تو کالج اسٹوڈنٹ ہے اور نہ دوسرا مالی بلکہ دونوں اپنی اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں اور وقت پڑنے پر وہ نوجوان کتاب سے لاش گرا سکتا ہے اور مالی کی "رمبی" سے گولی بھی نکل سکتی ہے۔

"میڈم میرے لیے کیا حکم ہے؟" عبدل نے سمترا کو مخاطب کیا۔

"تم فی الحال یہیں رکو... ہوسکتا ہے تمہاری ضرورت پڑجائے۔"

"اوکے!" ہم سمترا کے ساتھ اندرونی جانب بڑھ گئے۔

"السلام علیکم مالی بابا۔"

"وعلیکم السلام بیٹا رانی! کیسی ہو؟"

"بابا! آپ کی دعاؤں کے سائے میں ہوں۔"

"جیتی رہو..." بابا جی ایک سرسری سی نظر ہم پر ڈال کر دوبارہ اپنے کام میں مگن ہوگئے ان کی سرسری سی نظر بھی یوں لگی تھی جیسے اندر سے روح تک کو ٹٹول آئی ہو۔

"ہیلو! تمہاری اسٹڈی کیسی چل رہی ہے؟" سمترا اس نوجوان سے مخاطب ہوئی۔

"شدید بوریت ہورہی ہے آپی! آپ مجھے کالج میں ایڈمیشن... دلادیں نا میں اس چار دیواری کی تعلیم سے تنگ آچکا ہوں۔"

"ابھی چار دیواری سے ہی سبق لو۔ کالج کی کھلی فضاؤں میں ابھی نہیں چل پاؤ گے۔" عجیب انداز تھا ان کی بات چیت کا لہجوں میں مدوجزر ہی نہ تھا۔ جیسے روڈ کے رستے رٹائے جملے دہرائے جارہے ہوں یا کوڈ ورڈ چل رہے ہوں۔

"تم اپنا رونا دھونا چھوڑو اور انکل کی سناؤ۔"

"انکل کی کیا سناؤں صبح سے مقبرے کی زیارت کرنے گئے ہوئے ہیں۔"
"اور مہمانوں کا سامان آیا تھا کس کمرے میں رکھا ہے؟"
"جڑواں...."
"ٹھیک ہے پڑھو تم۔" سمترا نے سرہلاتے ہوئے کہا اور اس نے دوبارہ کتاب اٹھالی۔ ہم سمترا کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ عمارت تین منزلہ تھی۔ سمترا ہمیں دوسری منزل پر واقع ایک ایسے کمرے میں لے آئی جس کے اندر سے ایک دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ یعنی دونوں کمرے ایک دوسرے سے اٹیچ تھے۔
"ہاں تو ڈاکٹرز حضرات! یہ جڑواں کمرے آپ کے استعمال میں رہیں گے اور اب آپ رہیں گے بھی یہیں اسی عمارت میں! یہاں سے آپ نیچے تو آسکتے ہیں مگر اوپر کی منزل پر جانے سے گریز کیجیے گا اس...." عارب نے سمترا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"اور اگر ہم یہاں نہ رہنا چاہیں تو؟"
"تو...." سمترا نے گال اندر کی جانب کھینچے، ایڑیاں اٹھاتے ہوئے ایک ذرا پنجوں کے بل جھولا سا کھایا اور مطمئن انداز میں گویا ہوئی۔
"اس الماری میں آپ لوگوں کا سامان پڑا ہے۔" اس نے دیوار گیر الماری کی طرف اشارہ کیا۔
"فریش ہونا چاہیں تو وہ کونے والا دروازہ باتھ روم میں کھلے گا۔ فریش ہو کر چینج کرلیں تاکہ آپ لوگوں کا حلیہ ذرا شریفانہ لگے کچھ دیر بعد کھانے کی ٹیبل پر ملاقات ہوگی۔ کھانا ہمارے ساتھ کھائیے گا اس کے بعد اگر آپ جانا چاہیں گے تو جہاں آپ کہیں گے آپ کو پہنچا دیا جائے گا اور اگر آپ خود ہی کہیں جانا چاہیں گے تو بھی آپ کو زبردستی روکنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔"
"اور اگر ہم کھانا بھی نہ کھانا چاہیں؟ کیونکہ پہلے ہی ایک دفعہ کا کھانا بہت مہنگا پڑا ہے ہم مزید مہنگائی برداشت کرنے کے حق میں نہیں۔"
"تو.... اس میں بھی کوئی زور زبردستی نہیں! البتہ کھانے کی ٹیبل پر آپ کو لازمی آنا پڑے گا۔"
"اور اگر ہم ابھی اس وقت یہاں سے جانا چاہیں؟"
"سوری! یہ ممکن نہیں۔ نہ ہی اس کی مجھے اجازت ہے کہ آپ کو یوں جانے کی اجازت دے دوں۔" اس دفعہ عارب کے بولنے سے پہلے میں بول پڑا۔
"آپ بتا کیوں نہیں دیتیں کہ آپ کون ہیں اور ہم سے کیا چاہتی ہیں؟" سمترا واپسی کے لیے مڑی تھی کہ میری بات سن کر رک گئی اور وہیں سے گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے بولی۔
"آپ فریش ہو لیں کچھ دیر بعد آپ کے ذہن میں کوئی سوال تشنہ نہیں رہے گا۔" سمترا دروازے تک پہنچی تھی کہ اختر بول پڑا۔
"دیوی جی....!" سمترا نے رکتے ہوئے بڑی تیکھی نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔
"مجھے بھی اپنے ساتھ لیتی جائیں۔"
"کہاں؟"
"جہاں آپ جارہی ہیں۔"
"میں جہنم میں جارہی ہوں۔"
"کوئی بات نہیں۔ مجھے دروازے پر بٹھا دیجیے گا۔ تیرا سنگ نہ سہی سنگ آستاں ہی سہی۔" سمترا کوئی جواب دیے بغیر دروازہ ایک دھماکے سے بند کرتی ہوئی چلی گئی۔ اختر بے اختیار مسکرا دیا۔
"انسان ہو یا کارٹون۔" عارب نے اسے گھورا۔
"کیوں؟ کیا ہو گیا؟"
"لگتا ہے ہندوستان کی آب و ہوا نے تمہارے دماغ پر اثر ڈالا ہے۔"
"دماغ پر نہیں عارب بھائی دل پر اثر ڈالا ہے یہاں کی آب ہوا نے، دھڑکنیں سینے میں گدگداہٹ سی مچائے ہوئے ہیں اور دل پر تو رقص کی سی کیفیت طاری ہے۔"
"اس کیفیت پر فوراً قابو پالو ورنہ سینے میں دل ہی نہیں چھوڑے گی وہ۔" عارب مسکرا دیا۔



"تو ہم بھی تو یہی چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے دل کا تحفہ قبول کرلے مگر ظالم پتھر کا کلیجہ لے کر پیدا ہوئی ہوگی۔ ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے کچا ہی چبا جائے گی۔"
"غالباً کھانے کی ٹیبل پر ان سب کا یہی پروگرام ہے۔" ڈاکٹر عقیل نے متفکر لہجے میں کہا۔
"عقیل صاحب آپ کو متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو تو یہ لوگ کھا نہیں سکیں گے اور اگر بزور دندان و معدہ ایسا کر گزرے تو یقیناً آپ کو ہضم نہیں کرپائیں گے اور یوں آپ کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔" عارب کی بات پر ڈاکٹر عقیل بھڑک اٹھے۔
"بدتمیز.... تم مجھ سے کلام ہی نہیں کیا کرو.... نامعقول انسان.... کوڑھ مغز.... یہاں جان عذاب میں پڑی ہوئی ہے اور انہیں خرمستیاں سوجھ رہی ہیں۔"
"جی ہاں بقول شاعر....
تمہیں خرمستیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں
اختر نے فوراً ان کی تائید کی۔
"ٹھیک ہے تم لوگوں کو اگر بے زار ہونے کا کچھ زیادہ ہی گریز ہے تو ہوتے رہو بے زار ہمیں تو بے زار ہونا نہیں آتا۔ جب تک ہاتھ پیر سلامت ہیں تب تک بے زار ہونا پسند بھی نہیں کریں گے، جو ہوگا بھگت لیں گے۔" عارب نے الماری میں سے اپنا سامان نکالا اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ اختر نے بھی ان کی تقلید میں اپنا سامان لیا اور مسکراتا ہوا ان کے پیچھے ہی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں پروفیسر اور ڈاکٹر عقیل صورت حال کا تجزیہ کرنے لگے مگر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات تھی۔ سمترا کہہ گئی تھی کہ سوال جواب بعد میں پہلے فریش ہو لیں سو کچھ دیر کے لیے ذہنی الجھاؤ کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ پروفیسر کا تجزیہ تھا کہ سمترا دوستوں میں سے ہے دشمنوں کا رویہ ایسا نہیں ہوا کرتا جبکہ ڈاکٹر عقیل کا کہنا تھا کہ منافقوں کا رویہ تو ایسا ہو سکتا ہے نا۔
تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم سب چینج وغیرہ کرنے کے بعد فریش ہو بیٹھے تھے اور ہم سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اگر حالات ذرا بھی ہمارے خلاف ہوتے نظر آئے تو لڑ مریں گے! ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ایک کرخت صورت عورت اندر آ گئی۔
"کھانا لگا دیا گیا ہے کیا آپ لوگ تیار ہیں؟"
"جی ہاں ہم اچھی طرح دانت تیز کر چکے ہیں۔" اختر نے جلدی سے کہا۔
"تو پھر آجائیں۔" عورت نے ایک نظر قہربار اختر پر ڈالی۔ اس کے بولنے کا انداز بھی اس کی شخصیت کی طرح روکھا اور کرخت تھا۔ حلیے سے وہ "جھاڑو پوچھے" والی لگتی تھی۔ ہم اس کی معیت میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئے دو راہداریوں کے بعد وہ ہمیں ایک بند دروازے پر چھوڑ کر واپس چلی گئی۔
"اندر چلے جائیں۔" ہم نے ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر میں سب سے پہلے اندر داخل ہوا۔ خوبصورت آرائشی ڈائننگ ہال تھا۔ بالکل سامنے ایک جہازی سائز ٹیبل پر کھانے کے برتن سجے ہوئے تھے۔ تمام کرسیاں خالی تھیں صرف ایک کرسی پر سمترا بیٹھی تھی۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"آئیے....! ڈاکٹرز حضرات آپ لوگوں کا ہی انتظار تھا۔" اس کے ہونٹوں پر ایک پرفریب مسکراہٹ تھی۔
"سب کا یا صرف میرا؟" اختر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔
"آپ اس قابل نہیں کہ آپ کا انتظار کیا جائے۔" سمترا نے بڑی متانت سے جواب دیا تو اختر برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔
"آئیں تشریف رکھیں۔" اس دفعہ اس کا تخاطب میں اور پروفیسر تھے۔
"شکریہ۔" ہم نے ایک ایک کرسی سنبھال لی۔ ہمارے بیٹھنے کے بعد سمترا خود بھی بیٹھ گئی۔
"ابھی انکل آجاتے ہیں تو کھانا شروع کرتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔
"آپ اپنے انکل کی کچھ تعریف کرنا پسند کریں

گی۔" عارب نے کہا۔

"بالکل نہیں۔۔۔"

"کیا وجہ۔۔۔؟"

"انکل اپنی تعریف آپ ہیں سو مجھے ان کی تعریف کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ان کی تعریف کے لیے میرے پاس موزوں الفاظ ہیں۔" دوٹوک جواب پر عارب خاموش ہو رہا۔

"سمترا! ویسے تو شاید آپ نے کچھ نہ بتانے کی قسم کھا رکھی ہے لیکن اگر خالصتاً" آپ کی ذات کے متعلق کوئی سوال کیا جائے یعنی اس صورت حال سے ہٹ کر تو کیا آپ اس کا جواب دینا پسند کریں گی؟" میں نے سنجیدگی سے کہا تو سمترا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"یہ بھی سوال کی نوعیت پر منحصر ہے۔ بہت سی ذاتی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کو بتانا انسان مناسب نہیں سمجھتا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو۔۔۔ پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے آپ کے نام پر شبہ ہے۔" سمترا بے اختیار مسکرا دی۔

"مجھے نہیں لگتا کہ آپ کا تعلق سمترا کے مسلک سے ہے۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔ الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔"

"ہررے"۔۔۔ اختر کی قلقاری پر سمترا۔۔۔ یا جو بھی۔۔۔ کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

"تمہیں کیا دورہ پڑا ہے؟" عارب نے اختر کو گھورا۔

"عارب بھائی ایک بہت بڑی رکاوٹ بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا قدرت کی طرف سے۔" اختر چہکا۔ میں سمترا کا نام پوچھنا چاہتا تھا ٹھیک اسی وقت دائیں طرف کی دیوار میں نظر آنے والے دروازے پر دستک ہوئی۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں۔" بے اختیار ہم سب کی نظریں اس سمت اٹھ گئیں۔ سمترا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے انکل! یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ آئیں نا۔"

انکل ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ دبلے پتلے لمبا قد۔۔۔ چمکدار مسکراتی آنکھیں تیکھی ناک نوکیلی ٹھوڑی باریک ہونٹ موچھیں داڑھی گو صفاچٹ تھی ہی پیشانی بھی کافی حد تک گنجے پن کی طرف مائل تھی۔ اسی باعث یہ تمیز کرنا کافی دقیق مسئلہ تھا کہ ان کی پیشانی کہاں ختم ہوتی ہے اور سر کہاں سے شروع۔ وہ مسکراتے ہوئے اندر آگئے۔

"ہیلو ایوری باڈی! ہاؤ آر یو؟" ان کے انداز ان کی آواز سے بے پناہ اعتماد اور تمکنت مترشح تھی۔ وہ ہماری طرف آئے اور ڈاکٹر عقیل کے سامنے آرکے۔ آنکھوں میں ایک شرارت اور ہونٹوں پر دلچسپی کی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"ہیلو مسٹر عقیل بن عاص۔۔۔!" انکل نے عاص کو عجیب لمبا اور کھینچ کر ادا کیا۔

"او شلندر! یہ۔۔۔ یہ تم ہو؟" ڈاکٹر عقیل نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا اور جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں شدید حیرت در آئی تھی۔

"ہاں میری جان یہ میں ہی ہوں۔" شلندر نے دونوں بازو کھولتے ہوئے کہا اور وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ تو سمترا۔۔۔ یعنی سمترا کے روپ میں جو قیامت تھی وہ شلندر کے لیے کام کرتی تھی! چند لمحوں میں تمام سوالوں کے جواب مل گئے۔ یوں لگا جیسے اعصاب سے۔۔۔ دماغ سے منوں وزن پل بھر میں سرک گیا ہو۔

"اور اتنے برس بیت جانے کے باوجود عقیل بن عاص۔۔۔ کی ذات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔" ان کا جوش اور مسرت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کسی دور میں ان دونوں کے درمیان کیسی گہری محبت رہی ہو گی۔ کچھ دیر کے لیے جیسے وہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھے تھے پھر شلندر کو ہی خیال آیا اور وہ ڈاکٹر عقیل سے الگ ہوتے ہوئے ہم لوگوں سے مخاطب ہوا۔

"سوری فرینڈز۔۔۔ میں آپ لوگوں کو بالکل ہی بھول گیا۔ دراصل ایک طویل عرصے کے بعد اپنے جگری متر۔۔۔ دوست سے ملا ہوں۔ سو آئی ایم ایکسٹریملی ایکسائیٹڈ۔"

"شلندر صاحب آپ دونوں کی محبت دیکھ کر ہمیں خود بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ان کا تعارف کروا دوں۔" ڈاکٹر عقیل نے تعارف کرانا چاہا تو شلندر نے جلدی سے انہیں منع کر دیا۔

"ایک منٹ۔۔۔ جسٹ آمنٹ!" پھر وہ پروفیسر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"سرٹنلی ہی از پروفیسر۔۔۔ پروفیسر فاضل بصاری۔۔۔ ایم آئی رائٹ؟"

"ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ۔" پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ میری جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

"ڈاکٹر شلیل ظفر!"

"یس۔۔۔" میں نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔ اس نے پلٹ کر ایک ایک نظر اختر اور عارب کی طرف دیکھا۔

"اختر انصاری!" خلاف توقع اختر نے بڑی سنجیدگی سے ہاتھ ملایا۔

"ڈاکٹر عارب۔"

"جی ہاں!" عارب نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔

"حیرت انگیز بات ہے کہ آپ نے اتنے وثوق سے ہماری شناخت کیسے کرلی۔"

"آپ لوگوں کے نام تو پہلے ہی میرے علم میں تھے اور ناموں کا شخصیت پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ آپ۔۔۔ آپ لوگ بیٹھیں نا کھانا شروع کریں۔" شلندر گھوم کر ہمارے مقابل بیٹھ گیا۔

"یہ ایٹی کیٹس کے خلاف ہے۔" اختر بیٹھتے ہوئے شلندر سے مخاطب ہوا۔

"ہمارا تعارف تو آپ نے خود ہی حاصل کر لیا مگر اپنا مکمل تعارف نہیں کروایا۔" اختر نے ترچھی نظروں سے اس سماوی بجلی کو دیکھا۔

"کیا مطلب؟" شلندر نے حیرت سے کہا پھر اختر کا زاویہ نگاہ دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"اوہ۔۔۔ یہ میری بھتیجی ہے۔ نفسیات میں ماسٹر کے بعد اس فیلڈ میں آگئی۔ مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ ہے تھری ڈان باقی کی تربیت میں نے خود دی ہے۔ اس کا والد میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اس نے میرے ادارے سے اٹیچ ہونے کی ضد کی میں یہ ضد پوری کرنے کے حق میں نہ تھا مگر اپنے دوست کا کہنا نہ ٹال سکا اب سوچتا ہوں کہ اسے اپنی ایجنسی میں شامل کر کے میں نے بہت اچھا کیا ہے۔"

"کیا ان کا کوئی اسم گرامی نہیں ہے؟" اختر نے ڈونگا اپنی جانب سرکایا۔

"آپ مجھے دیدی کہہ لیا کریں۔" شلندر کے بولنے سے پہلے ہی اس شعلہ جوالہ نے ترش لہجے میں کہا۔

"آپ سے کہہ رہی ہیں۔" اختر نے عارب سے کہا۔

"لگتا ہے کہ آپ لوگوں کا ایک دوسرے سے خاصا گہرا تعارف ہو چکا ہے۔" شلندر نے قہقہہ لگایا۔

"بہرحال۔ بات آگئی ہے اسم مبارک تک تو آپ لوگ ہماری بھتیجی کو "مہرجی" کہہ سکتے ہیں۔"

"مہرجی۔۔۔! کچھ عجیب سا نام ہے۔" اختر نے بھنویں سکیڑیں۔

"ہاں یہ "جی" تو پریم سے ساتھ لگایا ہے ویسے "مہر" کے آگے کچھ اور آتا ہے لیکن شما کیجیے گا پورا نام ہم نہیں بتا سکتے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو چاچا حضور کے ہاتھوں ہماری شامت آجائے گی۔"

"کون چاچا حضور؟"

"بھئی شہر والوں کے لیے تو وہ ماما ہیں مگر ہمارے چاچا ہیں۔"

"چلیں کوئی بات نہیں ہم آدھے نام سے ہی گزارہ کرلیں گے۔" اختر نے درویشانہ انداز میں کہا تو شلندر

قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"ویسے شلندر صاحب آپ کی بھتیجی "مہرجی" نے ہمیں خاصا الجھن میں ڈالے رکھا ہے۔ ان کی وجہ سے ہم بہت سے شکوک و شبہات کا شکار ہوتے رہے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہم باتیں بھی کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ کھانا بھی کھا رہے تھے۔

"یہ فطری عمل تھا۔ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ آپ یہاں کھانے کی ٹیبل پر لڑنے مرنے کا سوچ کر آئے تھے ویسے مجھے وشواس ہے کہ عقیل بن عاص۔۔۔ کو اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا ہو گا کہ ہمارے رویے کھوٹ سے پوتر ہیں ان میں منافقت کی ملاوٹ نہیں۔" یقیناً" جس کمرے سے ہم آ رہے تھے وہاں کہیں کوئی مائیک پوشیدہ تھا جو شلندر ہماری باتیں ہمیں سنا رہا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ تم ہماری ہی جاسوسی کرتے رہے ہو! بڑے شیطان ہو۔" ڈاکٹر عقیل نے اسے گھورا۔

"بھئی جب ہم مقبرے میں ہوتے ہیں تو ہمارے کان، آنکھیں ہزاروں کی تعداد میں ہو جاتے ہیں یہاں کے دیوار و در دیکھتے بھی ہیں اور بولتے بھی ہیں۔"

"ویسے حقیقت پوچھو تو مجھے یقین نہیں آتا کہ تم وہی شلندر رائے ہر بچہ ہو جو کالج میں بھی "شرلاک ہومز" کے ناول ساتھ لے کر آیا کرتا تھا اور خود کو پراسرار ظاہر کرنے کے لیے عجیب احمقانہ حرکتیں کیا کرتا تھا۔"

"مسٹر عقیل! پورے ہندوستان میں تمہارے دوست کا نام سراغ رسانی میں ایک مقام رکھتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آج میں اس مقام پر ہوں تو اس میں سب سے پہلا عمل دخل شرلاک ہومز کو ہی ہے۔ آج بھی میں انہیں اپنا روحانی استاد تسلیم کرتا ہوں۔"

"جب کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تم خود کسی شرلاک ہومز سے کم نہیں۔"

"یہ تمہاری سوچ ہے۔ میں خود پر اعتماد ضرور کرتا ہوں مگر اپنے کام سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں کوئی انسان اپنے کام سے مطمئن ہو جاتا ہے وہاں سے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور کچھ نہ بھی سہی تو اس کا ارتقائی سفر رک جاتا ہے، صلاحیتوں کو زنگ لگنے لگتا ہے۔" باتوں کے دوران ہم کھانا کھا چکے تھے نامعلوم ملازم کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ آیا اور خاموشی سے برتن سمیٹ کر لے گیا کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور ٹیبل پر کافی کے برتن سجا گیا۔ مہر جی نے ایک ایک کپ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ پروفیسر نے کپ اٹھایا اتفاقاً" میری نظر ان کی طرف اٹھ گئی وہ گھونٹ بھرنا چاہتے تھے کہ رک گئے انہوں نے ناک سکوڑ کر کپ سے اٹھتی بھاپ کو سونگھا۔ ان کے چہرے پر شدید کراہیت کے آثار پھیل گئے کپ انہوں نے ٹیبل پر رکھ دیا اور سر اٹھا کر کچھ سونگھنے کی کوشش کرنے لگے۔

"کیا بات ہے پروفیسر! آپ کچھ مضطرب لگ رہے ہیں۔" میں نے ان کو مخاطب کیا۔

"خون۔۔۔ ! فضا میں خون کی بو رچ گئی ہے۔۔۔ ابھی۔۔۔ اچانک۔" انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"پروفیسر! خیال کریں ہم تنہا نہیں بیٹھے۔ یہاں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کریں کہ ہمارے میزبانوں کو ہم پر ہنسنے کا موقع میسر آئے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ سب باتوں میں مصروف تھے سو کسی کی خصوصی توجہ ہماری طرف نہ ہوئی۔

"شلندر! یقین جانو وہ لمحات ایسے تھے کہ میں تو زندہ بچنے کی امید ہی چھوڑ بیٹھا تھا۔" ڈاکٹر عقیل ۔ شلندر سے کہہ رہے تھے۔

"میں نے تو دل ہی دل میں کلام پاک پڑھنا شروع کر دیا تھا کہ آخری وقت آگیا ہے اور جب ہماری بھتیجی نے اختر پر رائفل سیدھی کی میرا تو دل ہی ڈوب گیا تھا۔ وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ ہماری دشمن نہیں بلکہ ہماری زندگیوں کی محافظ ہے اور۔۔۔ اور پھر جو کچھ ہم نے دیکھا ذہن ابھی تک اس سب پر یقین کرنے کو تیار نہیں کہ ایک نازک اندام لڑکی نے پلک جھپکنے کی دیر میں پانچ آدمیوں کو ڈھیر کر دیا۔۔۔!" ڈاکٹر عقیل کی بات پر شلندر کی آنکھوں میں مہرجی کے لیے اپنائیت اور تفاخر کے آثار ابھر آئے۔

"عقیل مجھے اپنی بھتیجی پر بڑا ناز، بڑا فخر ہے۔ میرے تمام آدمی ایک طرف اور یہ تن تنہا ایک طرف۔ پھر بھی یہ سب پر بھاری پڑے گی اور مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ میں نے ایک عرصہ جو اس پر محنت کی، وہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ تمہارے کام کے علاوہ بھی مہاراجہ رام پرشاد سے میرا کچھ حساب کتاب چل رہا ہے اس سلسلے میں۔ مہرجی کے علاوہ ایک عورت اور میرے دو آدمی بھی "راج محل" میں ہی موجود ہیں ان چاروں کو میں نے کسی طرح راج محل میں ایڈجسٹ کیا تھا یہ ایک الگ بحث ہے لیکن اب مہرجی وہاں جا نہیں سکتی اس لیے یوں سمجھو کہ میرے جو کارندے وہاں موجود ہیں مہرجی کی غیر موجودگی میں ان کی اہمیت آدھی سے بھی کم رہ گئی ہے۔ مہاراج کے سات آدمی مارے گئے یہ میرے لیے کوئی فکر مندی کی بات نہیں۔ اب تک ان کی لاشیں اسی تہہ خانے میں دفن بھی کر دی گئی ہوں گی۔" بات کرتے کرتے شلندر خاموش ہو گیا اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور آنکھوں میں کسی قدر فکر مندی کی جھلک تھی۔

"تو پھر فکر مندی کی بات کیا ہے؟" ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

"فکر مندی کی بات یہ ہے کہ اب مہاراج بہت زیادہ محتاط ہو جائے گا۔۔۔ تم لوگ جب وہاں مصر سے یہاں کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو شیخ حارث نے مہاراج کو مطلع کر دیا تھا کہ تم لوگ ہندوستان پہنچ رہے ہو اور کیا مقصد لے کر آ رہے ہو۔ اسی باعث تم لوگ پہلے قدم پر ہی ان کے جال میں جکڑے گئے۔ اگر مجھے تم لوگوں کی فلائٹ کا علم ہوتا تو پھر شاید ایسا نہ ہوتا پھر جب ویرچندر تم لوگوں کی طرف نکلا تو اتفاق سے مہرجی کو علم ہو گیا سو یہ بھی ان کے ساتھ ہو لی مگر وہاں جو کچھ ہوا وہ مناسب نہیں ہوا۔ اب راج محل سے تابوت نکال لانا بڑا کٹھن ثابت ہو گا۔" شلندر ہونٹ کاٹنے لگا۔

"انکل وہاں صورت حال ہی ایسی ہو گئی تھی کہ اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔" مہرجی نے جلدی سے کہا اختر کی نظریں فوراً" اس کی سمت اٹھ گئیں۔

"ہاں۔۔۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ تمہیں یہ قدم اٹھانا پڑا تو یقیناً" اور کوئی راستہ نہیں بچا ہو گا۔"

"مگر اب بڑی مشکلیں پیدا ہو گئی ہیں اور۔۔۔ تم میری بات یاد رکھنا کہ میری اجازت کے بغیر اب تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی۔ مہاراج کے آدمی پاگل کتوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔"

"یہ ریاست رام پور یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ریاست رام پور یہاں سے تقریباً" کوئی ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ اچھی خاصی ریاست ہے۔"

"اور یہ مہاراج رام پرشاد کیا کوئی بہت پہنچی ہوئی

چیز ہے؟؟"

"بہت بڑا خبیث ہے وہ۔ بہت لمبے ہاتھ ہیں اس کے.... بڑا شاطر اور مکار آدمی ہے۔" شلندر نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

"اس.... تابوت کے متعلق کوئی کلیو ملا.... !کہاں رکھا ہے.... مہاراج نے اس کا کیا کیا ہے؟؟"

"ہاں.... محل کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے.... مہاراج کا عجائب خانہ نوادرات کا ایک خزانہ ہے۔ وہ تابوت بھی وہیں ہے مگر میرے آدمیوں کی رسائی ابھی وہاں تک نہیں ہوئی۔"

"کیا آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ تابوت وہیں ہے؟؟"

"سو فیصدی.... تابوت میں سے سونے کا مجسمہ نکال کر تابوت کے اوپر ایستادہ کیا گیا ہے۔ مہاراج کو علم ہے کہ اس کے اندر ایک ہزاروں سال پرانی لاش ہے مگر باوجود کوشش کے وہ مجسمے کو کھولنے کا طریقہ نہیں جان سکے اور مجسمہ کاٹ کر وہ نایاب مجسمے کو ضائع کرنے کے حق میں نہیں سو مجسمہ ویسے کا ویسا ہے اور مہاراجہ اپنے دوستوں اور آنے والے مہمانوں کو بڑی خوشی اور بڑے فخر سے وہ مجسمہ دکھاتا ہے۔"

"اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ مجسمے کے اندر ممی ہے؟" پروفیسر نے پہلی بار درمیان میں مداخلت کی۔

"آپ کی تحریر سے۔" شلندر پروفیسر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"مجسمے پر کندہ تحریر کا جو ادھورا سا ترجمہ آپ نے کیا تھا وہ کاغذ بھی تابوت کے ساتھ ہی مہاراج تک پہنچا تھا اور.... اس کے بعد وہ کاغذ مجھ تک پہنچ گئے تھے۔" شلندر کے آخری الفاظ پر ہم سبھی چونک پڑے۔

"آپ کے پاس! آپ کے پاس وہ کیسے پہنچے؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔ شلندر نے مہر جی کی طرف دیکھا وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"وہ میں نے چرائے تھے۔ بعد ازاں بڑی مشکلوں سے مہاراج نے ایک ایسا شخص ڈھونڈا تھا جو علم "فقلولوجی" پر مکمل عبور رکھتا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ مجسمے پر کندہ تحریر کا ترجمہ کرتا ہمارے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب مہاراج نے مجسمے کی مووی بنا کر شیخ حارث طہابی کو بھیجی ہے اب وہ وہاں سے مجسمے پر کندہ تحریر کا ترجمہ مہاراج تک پہنچا دے گا۔ دراصل مہاراج ممی دیکھنے کے جنون میں مبتلا ہے۔ اور چند دن تک ترجمہ مہاراج تک پہنچ جائے گا۔"

"یہ.... یہ اچھا نہیں ہوگا۔" پروفیسر مضطرب لہجے میں بولے۔

"وہ کاغذ اب کہاں ہیں جو آپ نے وہاں سے چرائے تھے۔" مہر جی سے سرک کر میری نگاہ شلندر پر آٹھہری۔

"وہ تو میں نے ضائع کر دیئے تھے۔" شلندر نے لاپروائی سے کہا۔

"اوہ نو.... !" مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

"یہ آپ نے بہت برا کیا شلندر صاحب۔ یہ آپ نے بہت ہی برا کیا۔"

"مگر وہ تحریر میرے پاس محفوظ ہے۔" شلندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے وہ.... میں.... میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے بے چینی سے کہا۔

"مقبرے میں۔"

"مقبرہ.... کیسے مقبرے میں؟"

"آئیں سب آجائیں۔ آپ کو ہم مقبرے کی سیر بھی کرا دیتے ہیں حالانکہ مہر جی کے علاوہ آج تک وہاں کوئی اور نہیں گیا۔" شلندر اٹھا تو ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

شلندر جس دروازے سے اندر داخل ہوا تھا ہم سب اسی میں داخل ہوگئے وہ غالباً" بیڈ روم تھا دوسرے دروازے سے نکل کر ہم ایک مختصر سی گیلری میں پہنچے اور بائیں کونے والے دروازے سے اندر داخل ہوگئے یہ ایک اچھی خاصی لائبریری تھی۔ شلندر نے آگے بڑھ کر ایک جہازی سائز الماری کے



پٹ کھولے۔ الماری میں موٹی موٹی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ شلندر نے کتابوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں ایک ذرا دھکیلا۔ الماری کا عقبی حصہ کتابوں سمیت کسی گیٹ کی صورت دائیں طرف کھل گیا۔

"آئیں.... !" شلندر نے ہمیں مخاطب کیا اور خود الماری میں داخل ہو کر اندھیرے میں مدغم ہوگیا۔ ہلکی سی "چیخ" کی آواز ابھری اور اندھیرا روشنی میں بدل گیا۔ غالباً" شلندر نے کوئی بٹن پش کیا تھا۔ ہم سب اندر داخل ہوگئے تو مہر جی نے عقب میں الماری والا دروازہ بند کر کے باقاعدہ چٹخنی چڑھا دی۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے ایک طرف کونے سے تنگی سیڑھیاں نیچے کہیں اندھیرے میں گم ہو رہی تھیں۔ شلندر آگے بڑھ کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ ہم نے بھی اس کی تقلید کی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ کی دیوار سے ایک اور بٹن پش کیا اور وہ تہہ خانہ روشنی سے چمک اٹھا۔ تقریباً" پچیس زینے طے کرنے کے بعد ہم ایک جہان حیرت میں پہنچ گئے۔

یہ ایک ہال کمرہ تھا جس میں انتہائی دبیز کارپٹ بچھا ہوا تھا جس پر قدم رکھتے ہی یوں احساس ہوا کہ ابھی گردن تک دھنس جائیں گے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ قطار کی صورت الماریاں نظر آرہی تھیں تعداد میں وہ سات تھیں جن میں سے تین تو مکمل اسٹیل کی تھیں جب کہ چار میں شیشے لگے ہوئے تھے اور ان میں کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف کی دیوار میں مختلف اسکرینیں نظر آرہی تھیں جن کے نیچے ایک طویل ٹیبل تھی جس میں مختلف کلر کے بٹن، ہیڈ فون، مائیک تھے۔ ایک طرف تین چار رنگوں کے ٹیلیفون سیٹ پڑے تھے اس ٹیبل کے سامنے چار ریوالونگ چیئرز تھیں۔ تھوڑا ہٹ کر ایک جہازی سائز ٹیبل تھی جس پر تین کمپیوٹر رکھے تھے۔ ان کے برابر دو اسکینرز اور تین پرنٹر پڑے تھے۔ کچھ فائلیں تھیں، ٹیبل کی بائیں طرف انتہائی نفیس صوفے سجائے گئے تھے۔ عقبی طرف دیوار میں ایک دروازہ تھا اور چوتھی دیوار میں دو دروازے نظر آرہے تھے۔ شلندر نے کیا کیا اکٹھا کر رکھا تھا۔

"یہ ہے جی ہمارا مقبرہ۔" شلندر نے ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ تو کوئی سائنس ریسرچ سینٹر معلوم ہوتا ہے۔ حیرت ہے کہ اتنا جدید سیٹ اپ اور اتنا قدیم نام۔" عارب نے کہا۔

شلندر ٹیبل والی کرسی پر بیٹھ گیا اور ہم برابر والے صوفے پر.... ڈاکٹر عقیل اور عارب صوفے پر تھے ہمارے دائیں ہاتھ والے صوفے پر مہر جی بیٹھ گئی اور بائیں ہاتھ والے پر پروفیسر اختر یعنی وہ اور مہر جی ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

شلندر نے ایک کمپیوٹر آن کیا اور مانیٹر کا رخ قدرے ہماری طرف کر دیا اور خود دوسرا کمپیوٹر آن

کر کے اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ پہلے کی طرف متوجہ ہوگیا اس نے ماؤس سنبھالا اور پروگرامنگ چیک کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد اک فائل سامنے آگئی۔ ہمیں بالکل واضح دکھائی دے رہا تھا۔ فائل نیم تھا "دی سرچ آف ممی" شلندر اپنی جگہ سے اٹھ کر دیوار سے متصل ٹیبل کے سامنے سے مختلف بٹن پریس کرنے لگا سب سے پہلے وسط کی اسکرین روشن ہوئی اور اس میں وہی چوکور خانے دکھائی دینے لگے جو ٹیبل پر آن کمپیوٹر میں دکھائی دے رہے تھے پھر یکے بعد دیگرے اس اسکرین کے دائیں بائیں دو دو اسکرینیں روشن ہوگئیں مگر ان پر کوئی منظر نہیں تھا۔ شلندر نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور مطمئن انداز میں سر جھکا کر دوبارہ کچھ بٹن پریس کردیے۔

"شکیل صاحب! ملاحظہ کریں۔" ساتھ ہی کرسی گھومی اور اس نے آدھا رخ ہماری جانب کرلیا۔ اس کا بایاں ہاتھ بدستور ٹیبل پر تھا۔ دائیں طرف کی اوپر اسکرین نے جھما کا سالیا اور اس پر چند الفاظ واضح ہوگئے۔ ایک طرف کونے میں لکھا تھا۔ (تابوت کی تحریر)

"مریاقس"

حرماں نصیب ماں کی حرماں نصیب بیٹی

"مریاقس"

"جو مردہ ہے نہ زندہ ہے۔"

پروفیسر بے اختیار بول پڑے۔

"یہی ہے.....! سو فیصدی یہی ہے یہ عبارت تابوت پر باریک ہیرے جڑ کر رقم کی گئی تھی بلاشبہ یہ وہی تحریر ہے تابوت والی!" شلندر نے ٹیبل پر ایک سبز بٹن پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور وہ تحریر اوپر چلی گئی اور چند اور الفاظ اسکرین پر دکھائی دینے لگے۔

مجسمے کی تحریر

"اے مسیحا!

اے موت کو شکست دے کر انسان کو دوبارہ زندہ کردینے والے "تیری نگاہ مقدس جسموں کے اندر تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے مجھے معلوم ہے کہ یہ تو ہی ہے۔"

کہ تیرے سوا کوئی دوسرا اس تابوت اور مجسمے تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔ میں تجھے خبر کرتی ہوں کہ یہ مجسمہ محض مجسمہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک زندہ وجود ہے میری لخت جگر.....

"مریاقس"

وہ سو رہی ہے۔ عذاب جھیل رہی ہے محض..... "یک دم عبارت ختم ہوگئی۔

"آگے.....؟" میں نے مضطرب انداز میں کہا۔

"بس یہی تحریر تھی۔" شلندر نے ایک بٹن پریس کیا اور وہ تحریر اسکرین سے غائب ہوگئی۔ میں نے پروفیسر کی طرف رخ کیا۔

"پروفیسر!..... کیا آپ کو یاد ہے کہ مجسمے پر اور کیا تحریر تھی؟"

"نہیں۔" پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے اتنا ہی ترجمہ کیا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ انتظامیہ کے کچھ آفیسر آئے ہیں اور ڈاکٹر شکیل سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم اس وقت آئی سی یو میں بے ہوش پڑے تھے' سو میں تمہارے پاس آگیا بعد میں تمہیں بھی علم ہے کہ یہ کاغذ تابوت کے ساتھ ہی چوری ہوگئے تھے۔" پروفیسر کے جواب پر میرے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔

میں نے بہت زیادہ بے چینی محسوس کی اس مختصر سی تحریر کے مفہوم سے اتنی تو سمجھ آتی تھی کہ اشارہ میری طرف ہی ہے مگر بہت سے جواب طلب سوال ایسے تھے جو میری ذات میں انتشار بپا کر گئے تھے۔ وثوق کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ کہ "مجھے معلوم ہے کہ یہ تو ہی ہے کہ تیرے سوا کوئی دوسرا اس تابوت اور مجسمے تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔" یقیناً" یہ تحریر یوسا کی طرف سے تھی ہزاروں سال قبل انہیں میرے متعلق علم ہوگیا تھا۔ مجھ سے پہلے جو بوڑھا وہاں کھدائی کروا رہا تھا وہ خوفزدہ ہو کر کامیابی سے پہلے ہی بھاگ نکلا تھا اور..... اور یوساف جو مجھ سے پہلے اہرام میں داخل ہوا تھا وہ بھی تابوت تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ مگر اصل



کہانی کا ابھی تک کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مریاقس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ہزاروں سال قبل اسے کیا حادثہ پیش آیا..... وہ کس عذاب کا شکار ہے اور میں..... میں اسے کس عذاب سے کس طرح نجات دلا سکتا ہوں؟ تجسس نے میری نس نس میں اضطراب جگا دیا تھا۔ میں مریاقس سے ایک شدید قسم کا قلبی تعلق محسوس کر رہا تھا اور میں خود اپنی اس کیفیت پر حیران و ششدر تھا۔

"شکیل صاحب۔" شلندر کی آواز پر میں چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"پریشان نہ ہوں ہم بہت جلد وہ تابوت ممی سمیت راج محل سے نکال لائیں گے۔"

"ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"مجھے یقین ہے شلندر صاحب کہ آپ جو کہہ رہے ہیں ویسے ہی ہوگا۔"

"لگتا ہے کہ آپ اس تابوت اور اس میں موجود ممی کے لیے بہت کونشس ہیں۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں شلندر صاحب! اس ممی کے ساتھ میری سانسوں کی ڈور لپٹی ہوئی ہے۔"

"شلندر! اب یہ بتاؤ کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہوگا؟" ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

"آج رات تو آپ لوگ آرام کریں' صبح ہم ریاست رام پور جائیں گے۔ شکیل صاحب' ممی کے لیے میری توقع سے زیادہ بے کل ہیں اب ہمیں جلد از جلد ممی والا تابوت حاصل کرنا ہے۔"

"ہاں یہ مشن میں خود پورا کروں گا..... تم ایسا کرو ایک ایک کپ کافی اور پلا دو۔" مہرجی اٹھی سامنے کی دیوار میں نظر آنے والے دو دروازوں میں سے ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

"جب تک کافی آتی ہے میں آپ لوگوں کو راج محل کے متعلق بریف کیے دیتا ہوں۔"

شلندر نے کہا اور ایک بار پھر مختلف بٹن پریس کرنے لگا۔ درمیانی اسکرین پر ایک خوبصورت اور پرشکوہ محل کی عمارت نظر آنے لگی۔

"یہ ہے راج محل۔" شلندر نے کہا۔ وہ بدستور اپنے سامنے موجود ٹیبل کی جانب متوجہ تھا۔ باقی چاروں اسکرینوں پر بھی مختلف مناظر آگئے۔

"یہ پہلی اسکرین پر محل کے عقبی حصے اور بائیں باغ کا منظر ہے۔ تہہ خانے کو جانے والا واحد راستہ مہاراج کی خواب گاہ سے جاتا ہے اور مہاراج کی خوابگاہ کی کھڑکی بائیں باغ میں کھلتی ہے۔ دوسری اسکرین میں محل کا ایک بغلی گوشہ ہے جس میں ملازموں کے رہائشی کوارٹر دکھائی دے رہے ہیں۔ تیسری اسکرین میں محل کا سامنے والا حصہ ہے صدر دروازے پر چوبیس گھنٹے دو مسلح پہرے دار موجود رہتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ بیسیوں پہرے دار اور ہیں جو بدروحوں کی مانند محل کے چاروں اطراف چکراتے رہتے ہیں۔ محل کے خفیہ راستوں کے علاوہ محل کے پانچ دروازے ہیں۔ خفیہ راستوں کے متعلق ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا..... اور یہ چوتھا منظر مہاراج کی خوابگاہ کے دروازے کا ہے یہاں بھی چوبیس گھنٹے دو دربان موجود رہتے ہیں۔ محل کی عمارت کا آخری حصہ زنان خانے کا ہے اور محل کا بایاں حصہ مہمانوں کے رقص و سرود کی محفلوں کے لیے مخصوص ہے۔"

مہرجی ایک ٹرے میں کافی کے کپ رکھ لائی تھی سو چند لمحوں کے لیے ہمارا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ہم نے ایک ایک کپ اٹھالیا۔ شلندر کو کپ پکڑانے کے بعد مہرجی ایک کپ سنبھال کر اپنی جگہ بیٹھ گئی تو شلندر دوبارہ گویا ہوا۔

"اب ذرا راج محل کے باسیوں سے تعارف حاصل کرتے ہیں۔" شلندر نے مسکراتے ہوئے کہا اور دوبارہ بٹنوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔

درمیانی اسکرین پر ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ شخص کا چہرہ آگیا۔ انتہائی گھنی اور موٹی موٹی بھنویں' ہلکی ہلکی کھچڑی داڑھی' موٹے اور بھدے ہونٹ' آنکھوں میں خباثت اور چہرے پر کرختگی کے تاثرات جیسے ثبت ہوکر رہ گئے تھے اس کی زلفیں اس کے کندھوں کو چھو رہی تھیں۔

"یہ ہیں مہاراج رام پرشاد ریاست رام پور کے

مہاراج "شلندر نے چند بٹن اور پریس کیے تو باقی چاروں اسکرینوں پر بھی چہرے دکھائی دینے لگے۔

"چار اہم عورتیں۔" شلندر نے ہماری طرف رخ بدلتے ہوئے کہا اور پھر پہلی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

"مہارانی' کملاوتی جس کا کہا مہاراج بھی پوری توجہ سے سنتے ہیں۔ نیچے مہاراج کی سسٹر' نرتادیوی' ہر دل عزیز شخصیت۔ تیسرے نمبر پر "امرتا" مہاراج کی "دوست" جس کی اجازت کے بغیر سانس لینا بھی مہاراج پاپ سمجھتے ہیں بہت شاطر اور مکار عورت ہے۔ چوتھے نمبر پر مہاراج کی چھوٹی بیٹی "پاروتی" سبھی کی لاڈلی اور سرچڑھی۔" شلندر نے رخ بدل کر چند بٹن پریس کیے اور عورتوں کی جگہ چار مردوں کے چہرے آ گئے۔

"یہ پہلے نمبر پر شام پرشاد جی ہیں مہاراج کے بعد راج پاٹ پر انہی کا حق ہوگا۔ انتہائی شرابی اور کم ظرف سا انسان ہے آگے مہاراج کا سرچڑھا "خواجہ سرا" ہے "آگے "بھیم سنگھ" محل کے اندرونی انتظامی امور اس کے ذمے ہیں بہت کڑک قسم کا۔۔۔" ایک کرخت سی گھنٹی کی آواز نے شلندر کو جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ شلندر نے چونک کر دائیں طرف دیکھا بیل ایک بار پھر بجی۔ شلندر نے ہاتھ بڑھا کر سرخ ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا۔

"ہولو۔۔۔!" اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ کچھ دیر سنتا رہا پھر گویا ہوا۔

"اس نے مزید کچھ کہا؟" کچھ دیر کی خاموشی۔

"ٹھیک ہے ڈائننگ ہال میں پہنچا دو۔" پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"انکل خیریت ہے؟" مہر جی نے فوراً" پوچھا۔ شلندر کے چہرے پر قدرے فکرمندی کے تاثرات پھیل گئے تھے۔

"کوئی شخص چوکیدار کو میرے نام کا پیکٹ دے کر گیا ہے۔۔۔ وہ ڈائننگ ہال میں پہنچ رہا ہے تم جا کر یہیں اٹھالاؤ۔"

"او کے!" مہر جی فوراً" اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اور شلندر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مہر جی کے آنے تک ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ تقریباً" پانچ منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو اس نے کوئی دو مربع فٹ گتے کا ایک کارٹن اٹھا رکھا تھا وہ اس نے ٹیبل پر لا رکھا۔ شلندر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کارٹن کے قریب پہنچا تو ہم بھی اٹھ کر ٹیبل کے قریب جا کھڑے ہوئے۔

اس کے اوپر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"عظیم جاسوس مہاراج شلندر رائے ہر یجہ کے لیے۔"

اس کے نیچے لکھا تھا "آئی وش یو"

شلندر نے ٹیپ ہٹائی اور اس کا منہ کھول دیا اس کے اندر بھی کوئی ڈبا نما چیز تھی جس پر کالے رنگ کا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ شلندر نے ایک لمحے کو سوچا اور وہ بھی ڈبا نکال ٹیبل پر رکھ دیا کوئی ٹھوس اور سخت چیز تھی شاید لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ شلندر نے اس کے نیچے سے کپڑے کو نکالا اور کپڑا ہٹا دیا۔

کیس کی نچلی سطح خون سے رنگین تھی اور اطراف کے شیشوں پر بھی سرخ سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ کیس کے اوپر ایک سفید لفافہ کسی چیز کی مدد سے چپکایا گیا تھا جس پر شلندر کا نام لکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہم بھی سکتے کی سی کیفیت کا شکار ہو گئے یقیناً" شلندر اور مہر جی کو تو توقع نہ تھی کہ اس پیکٹ میں کچھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ انہیں کتنا زبردست شاک پہنچا تھا اس کا اندازہ ان کے چہروں کے تاثرات دیکھ کر ہو رہا تھا۔

شلندر نے خود کو سنبھالا اور کیس پر چپکا ہوا لفافہ اٹھا لیا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور اس میں موجود کاغذ نکال کر پڑھنے لگا۔ وہ خط پڑھنے کے بعد اس نے مہر جی کی طرف بڑھا دیا۔ خط پڑھنے کے بعد مہر جی سوالیہ نظروں سے شلندر کی طرف دیکھنے لگی اس کی سوالیہ نظروں میں چنگاریاں سی بھری ہوئی تھیں۔ شلندر کے جبڑے بھی سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ خط مہر جی کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ



شلندر کے نام تھا۔

مہاراج شلندر رائے ہر یجہ
نمستے!

"پہلی جیت کی بہت بہت بدھائی ہو۔ اس جیت پر ہماری طرف سے یہ حقیر سا تحفہ سویکار کیجیے۔ بہت بڑھیا کھیل کھیلے ہیں آپ "ہمیں بھی ایسے کھیلوں میں بڑا آنند ملتا ہے۔ سات آپ نے مارے تو دو پیادے ہم نے بھی مار ڈالے۔ ہماری آنکھیں تو کھل گئی ہیں وشواس ہے کہ اب آپ بھی آنکھیں کھول کر کھیلیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم کو خبر بھی نہ ہوتی اور آپ ہمیں مات دے جاتے مگر آپ نے اس کڑکتی بجلی کو درمیان میں لا کر غلطی کی وہ محل تک رہتی تو آپ کے حق میں بہتر تھا۔ ہم پورے دیش کو تو نہیں جانتے نا! مگر باہر کی دنیا میں تو جان پہچان نکل ہی آتی ہے۔ ہے نا؟ بہرحال کھیل کا آغاز ہو گیا ہے۔ آپ کی آئندہ چال کا انتظار رہے گا۔

دھنے واد!

"بھگوان آپ کی سہاتا کرے"

(شاہ)

خط میرے ہاتھ سے عقیل نے لے لیا۔ میں نے شلندر کی طرف دیکھا کہ وہ کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ یک ٹک ٹیبل پر پڑے کیس کو گھور رہا تھا۔ میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ اس وقت اس کی ذہنی کیفیت کیا رہی ہوگی مگر میں کوئی رسمی سا جملہ کہہ کر تکلف کی کوئی دیوار نہیں اٹھانا چاہتا تھا سو خاموشی سے اپنی جگہ واپس بیٹھ گیا۔

کافی دیر ہمارے درمیان خاموشی رہی یہاں تک کہ بوجھل خاموشی گراں گزرنے لگی تو میں بول پڑا۔

"شلندر صاحب! مجھے افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے آپ کے دو آدمی موت کا شکار ہو گئے۔"

"نہیں۔۔۔" شلندر نے میری بات کاٹ دی۔

"شکیل صاحب! ایسی تکلفانہ باتیں نہیں کریں۔" وہ ایک ذرا خاموش ہوا اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ اتر آئی۔

"کھیل میں ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے' پیادے پٹتے ہیں مگر ہار جیت کا فیصلہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کسی ایک حریف کو شہ مات نہ ہو جائے۔۔۔ اب کے باری ہماری ہے اور ہم دو پیادوں کے بدلے سیدھی شہ مات کی چال چلیں گے۔" شلندر کا لہجہ بہت زہریلا ہو گیا تھا۔

"انکل! رام پرشاد کی گردن میں اپنے ہاتھوں سے مروڑوں گی۔" مہر جی نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا تو شلندر کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

"نہیں بیا! ایسے کھیل جذباتی ہو کر نہیں کھیلا کرتے۔ مہاراج نے مجھے چیلنج کیا ہے اب ہم ڈھائی گھر کی چال چلیں گے اس بار پیادے سامنے نہیں آئیں گے "سوار" میدان مارے گا۔" شلندر نے ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ لوگ اب جا کر آرام کریں! عقیل بن عاص۔۔۔ میرا مشورہ مانیں تو آپ لوگ اب ایک طرف بیٹھ کر کھیل دیکھیں اور مجھے تنہا کھیلنے دیں چند روز۔۔۔ صرف چند روز میں تابوت اور ممی آپ لوگوں کی تحویل میں ہوگی۔" عقیل کے بولنے سے پہلے ہی میں بول پڑا۔

"شلندر صاحب یہ کسی صورت ممکن نہیں' ہم مصر سے یہاں تک کا سفر طے کر کے صرف بیٹھنے نہیں آئے ہم ہر قدم آپ کے ساتھ طے کریں گے اور اگر آپ ہمیں ساتھ نہیں رکھنا چاہیں گے تو ہم صبح ہی واپس چلے جائیں گے۔"

"شکیل درست کہہ رہا ہے۔ ہم بیٹھ کر کھیل نہیں دیکھیں گے بلکہ تمہارے ساتھ یہ کھیل کھیلیں گے۔" ڈاکٹر عقیل نے کہا تو شلندر نے کندھے اچکا دیے۔

"جیسے آپ لوگوں کی مرضی' فی الحال تو آرام کریں' میں نے پورا پلان بدل دیا ہے اب نئی بساط بچھائی ہے اور ابھی مجھے اس پر مہرے ترتیب دینے ہیں۔ صبح ہم رام پور جا رہے ہیں ممکن ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد ہمیں آرام کا ذرا بھی موقع نہ ملے۔" پھر وہ رخ بدل کر

مہرجی سے مخاطب ہوا۔

"مہر! انہیں ان کے کمروں تک چھوڑ آؤ! آج کی رات بے فکری سے گزار لیں۔" شلندر ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا اور ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے اور جب جانے کے لیے مڑ کر مہرجی کے پیچھے چلے تو شلندر نے کہا۔

"اللہ حافظ! شب بخیر۔" بے اختیار میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے پلٹ کر حیرت سے شلندر کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔ میری متحیر اور سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں بنیاد پرست لوگوں میں سے نہیں ہوں، میرا اصول ہے کہ جس رنگ کا کوئی ملے اس سے اسی رنگ میں ملو۔" اس کی بات کو سمجھتے ہوئے میں نے مسکرا کر قدم آگے بڑھا دیے۔ ہم "مقبرے" سے باہر نکل آئے ہمارے کمروں تک مہرجی ہمارے ساتھ آئی جب وہ واپس جانے لگی تو اس نے پلٹتے ہوئے اختر کی طرف دیکھا اختر بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لاشعوری طور پر مہرجی کے قدم رک گئے جیسے اسے یقین تھا کہ اختر اپنی عادت کے مطابق ضرور کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑے گا مگر وہ نہ جانے کیا سوچ کر مہرجی کی طرف دیکھتے ہوئے صرف مسکرا کر رہ گیا اور مہرجی برا سا منہ بنا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

عارب، عقیل اور اختر تو ساتھ والے کمرے میں چلے گئے میں اور پروفیسر اسی کمرے میں لیٹ گئے۔ ہمارے درمیان کوئی خاص بات نہ ہوئی لیکن نیند جلد نہ آئی غالباً" نصف رات گزر چکی تھی جب نیند کی دیوی مہربان ہوئی۔

صبح ابھی دن کا اجالا نہیں پھیلا تھا کہ ایک تیز گھنٹی کی آواز نے ہماری نیند غارت کردی۔ میرے ساتھ ساتھ پروفیسر بھی بے دار ہو گئے۔ گھنٹی کی آواز ایک تسلسل کے ساتھ کمرے ہی کے کسی گوشے سے بلند ہو رہی تھی مگر یہ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے کچھ دیر بعد آواز آنا بند ہو گئی۔ ٹھیک اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ایک پختہ عمر عورت دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی اور جب بولی تو میں ششدر رہ گیا۔

"آپ لوگ فریش ہو جائیں کچھ دیر بعد ہم رام پور کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔" وہ آواز سو فیصد مہرجی کی تھی۔ ٹھیک اسی وقت اختر درمیانی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس عورت اور اس کی آواز پر ایک لمحے کو وہ ٹھٹکا پھر مسکراتے ہوئے فریفتہ انداز میں بولا۔

"آپ جس روپ میں بھی آئیں گی ہم قبول کریں گے۔" عورت نے جو یقیناً" مہرجی تھی اور جس نے میک اپ میں اپنی اصل صورت چھپالی تھی بڑی خونخوار نظروں سے اختر کو گھورا۔

"لگتا ہے کہ تم حرام موت مرنا چاہتے ہو۔"

"زہے نصیب اگر آپ کے ہاتھوں موت ملے۔" اختر نے خوشدلی سے کہا۔

"منہ بند رکھو۔"

"آپ کے لیے ہم نے اپنے دل کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ کبھی اس دل کو عزت بخشیں نا۔"

"میں گندے مقامات کو عزت بخشنے کی عادی نہیں۔"

"آپ اپنا شیڈول بتائیں ہم جھاڑو پونچھا کرلیں گے۔" اختر نے بے ساختہ کہا تو مجھے ہنسی آ گئی۔

"تم انتہائی نامعقول انسان ہو۔"

"آپ نے کب پرکھا؟"

"بدتمیز میں کہتی ہوں بکواس بند کرلو۔"

"پہلے آپ تمیز سکھائیں۔"

"مائی فٹ!" مہرجی پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اختر مسکراتا ہوا آگے بڑھ آیا اس کے عقب میں عقیل اور عارب بھی آ گئے۔ عارب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں اس بے چاری کو زچ کرنے پر تلے رہتے ہو۔"

"اس کمبخت دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔" اختر نے ایک سرد آہ بھری۔



"اور جس دن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی اس دن تمہاری ہڈی پسلیوں کی کوئی ضمانت نہیں لے گا یہ بھی یاد رکھنا۔"

"وہ کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھائے گی۔" اختر نے یقین سے کہا۔

"تم جس قدر اسے زچ کر رہے ہو اس میں ایسی خوش فہمیوں کو نہیں پالو۔"

"یہ خوش فہمیاں نہیں میرا یقین ہے۔"

"تم کیا یہاں لڑکیاں پھانسنے آئے ہو؟" ڈاکٹر عقیل نے ناگواری سے کہا۔

"سیدھی سی بات ہے عقیل صاحب کہ وہاں مصر میں تو کسی نے ہمیں رستہ دینا نہیں یہاں اگر ہماری دال گل جائے تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

"تو ٹھیک ہے بھائی گلاتے رہو دالیں ہم کیوں اعتراض کرنے لگے۔" اس کے بعد ہم سب نے باری باری غسل کیا اور ڈریس چینج کر کے بیٹھ گئے۔ وہی کل والی عورت آئی اور ہمیں ڈائننگ ہال تک لے گئی۔ شلندر پہلے سے وہاں موجود تھا مگر گزشتہ رات والے شلندر سے بالکل مختلف۔ اس نے بھی اپنی اصل صورت میک اپ کی تہہ کے نیچے چھپائی ہوئی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ ہمیں مقبرے میں لے گیا۔ ہمارے "بوتھوں" پر اس نے تقریباً" ڈیڑھ گھنٹہ محنت کی اور کافی حد تک ہماری صورتیں بدل گئیں۔ طے یہ پایا تھا کہ شلندر، ڈاکٹر عقیل اور عارب یہاں سے ویگن میں نکلیں گے جب کہ میں، پروفیسر، اختر اور مہرجی ہم لینڈ کروزر میں روانہ ہوں گے اور دونوں گروپ الگ الگ مرکز تک پہنچیں گے ایک طرف کمانڈر شلندر خود تھا دوسری طرف مہرجی! اختر کی ہمراہی کی وجہ سے مہرجی نے کچھ حیل و حجت کی مگر شلندر کے دو الفاظ پر خاموش ہو رہی۔

"مہر ہم ایک مہم پر نکل رہے ہیں پکنک کے لیے نہیں۔ ذہن و دل پر قابو پانا سیکھو تمہارا کمزور پہلو صرف یہی ہے۔" اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولی۔

"تم سب ذہنی طور پر تیار ہیں؟" شلندر نے ہمیں مخاطب کیا۔ اس کا لب و لہجہ بھی تبدیل ہو چکا تھا۔

"پوری طرح۔" ڈاکٹر عارب نے کہا۔

"ہوں۔۔۔ مہر! ہم لوگ نکل رہے ہیں ٹھیک پندرہ منٹ بعد تم بھی چل دینا۔"

"او کے!" مہرجی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ شلندر نے ایک بریف کیس اٹھایا اور ایک بیگ کندھے سے لٹکاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر عقیل اور عارب بھی اس کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے۔ وہ باہر نکل گئے تو مہرجی نے درزیدہ نظروں سے اختر کی طرف دیکھا وہ لاتعلق ہوا بیٹھا تھا۔ میں نے پروفیسر کی طرف دیکھا وہ قدرے متذبذب نظر آ رہے تھے۔

"پروفیسر! کیا بات ہے آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔" میں نے انہیں مخاطب کیا۔

"ہاں! کہہ سکتے ہو۔۔۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

"کیا۔۔۔ کوئی اندیشہ محسوس کر رہے ہیں آپ؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا، بس میرا وجدان مجھے کسی ان دیکھی مصیبت کا احساس دلا رہا ہے۔۔۔ ایک۔۔۔ ایک ایسی مصیبت جس میں ہم الجھنے والے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں پروفیسر اللہ بہتر کرے گا۔" میں نے تسلی دی۔

جب ہم لینڈ کروز میں بیٹھ کر نکلے اس وقت مشرق سے شاہ خاور سر اٹھا رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی تھی۔ پروفیسر میرے برابر بیٹھے تھے اختر اور مہرجی عقبی سیٹوں پر۔ وہ مجھے راستوں کا بتاتی جا رہی تھی اور میں گاڑی کو اڑائے لیے جا رہا تھا۔

تقریباً" دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد میں نے نوٹ کرلیا کہ ہم کسی مخصوص سمت سفر طے نہیں کر رہے بلکہ مہرجی یونہی ادھر ادھر بھگوا رہی ہے۔ غالباً" وہ تعاقب کا اندازہ لگا رہی تھی جب اسے پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا تو اس نے مطمئن انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے! اب رائٹ ہینڈ ٹرن لیں اور سیدھے چلتے رہیں۔" میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور گاڑی کو دائیں ہاتھ آنے والی سڑک پر ڈال دیا یقیناً" یہ سڑک شہر سے باہر جاتی تھی۔ کیونکہ اس سڑک پر زیادہ تر ہیوی ٹرانسپورٹ ہی آجا رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد ایک اور سڑک پر ٹرن لیا گیا۔

"بس اب سیدھے چلتے جائیں۔" مہر جی نے کہا اور میں نے سر ہلا دیا اتنی دیر اختر پہلی بار مہر جی سے مخاطب ہوا۔

"مہر! آپ کا پورا نام کیا ہے؟" اس کا انداز بہت سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

"کیوں.....؟"

"بس یونہی..... جاننا چاہتا ہوں۔"

"تمہیں میرے نام سے کیا مطلب؟"

"مہر جی! میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اپنی فضول باتوں سے بہت زیادہ پریشان کرتا ہوں اگر میرے الفاظ سے آپ کی دل آزاری ہوتی رہی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں کہ میرا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔" خلاف توقع اختر سنجیدہ لہجے میں بول رہا تھا اور یہ انہونی تھی۔ میں نے بیک مرر ان کی جانب سیٹ کر لیا۔ مہر جی بڑی گہری نظروں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔

"میں ایسی باتیں محض اس لیے کرتا رہا ہوں کہ طبیعت ذرا فریش رہے' ذہن و دل پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے رویے میں ذرا لچک پیدا کریں کیونکہ آپ کے ایسے سرد مہر اور کرخت رویے سے میری دل آزاری ہوتی ہے' رہی بات یہ کہ مجھے آپ کے نام سے کیا مطلب تو میرا خیال ہے کہ میں نے ایسی کوئی بات یا خواہش نہیں کی جو غیر اخلاقی ہونے کے باعث آپ کی ناگواری کا باعث بنے۔" اختر "برانیک پروین" بنا بیٹھا تھا۔

"سوری جب انکل نے میرا نام آپ لوگوں کو بتانا مناسب نہیں سمجھا تو میں بھی نہیں بتا سکتی۔" مہر جی نے سپاٹ انداز میں کہا۔

"اچھا چلیں یہ ہی بتائیں کہ آپ نے مجھ میں کوئی ایسی بری عادت دیکھی جس سے آپ کو یہ اندازہ ہوا ہو کہ میں ایک بد قماش انسان ہوں؟ یا میرے کردار میں کوئی خامی نظر آئی ہو یا..... میں نے کوئی غیر اخلاقی اور گری ہوئی بات یا حرکت کی ہو آپ سے؟"

"نہیں....." مہر جی کا لہجہ محتاط تھا۔

"پھر براہ کرم میرے ساتھ اپنا رویہ درست کر لیں۔ میں بھی اب کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جو آپ کو ناگوار گزرے۔" مہر جی چند لمحے اختر کو نظروں ہی نظروں میں ٹٹولتی رہی پھر بولی۔

"لگتا ہے کہ اب تم انسانوں کی جون میں آرہے ہو۔"

"شکریہ! اب ایک سوال کا جواب دیں۔"

"بولو۔"

"اگر میں آپ کو "پرپوز" کروں تو آپ غصہ تو نہیں ہوں گی۔"

"شٹ اپ۔" مہر جی یک دم بھڑک اٹھی اور اختر اپنی سیٹ پر اچھل کر رہ گیا۔

"عجیب تماشا ہے ذرا دھیمے سے شٹ اپ کہہ لیں۔ کانوں کے پردے کیوں پھاڑ رہی ہیں؟ میں نے شادی ہی کا تو پوچھا ہے کوئی ایٹم بم تو آپ کی گود میں نہیں ڈال دیا۔"

"تم کتے کی دم سے بھی زیادہ ڈھیٹ ہو کبھی انسان نہیں بنو گے۔" مہر جی نے بھنائے ہوئے انداز میں کہا۔ بے اختیار میں مسکرا دیا مجھ سے پہلے ہی اختر کی سنجیدگی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"اب میں انسان بننا چاہتا ہوں' انسان بننے میں کیا آپ میری کچھ مدد کریں گی؟" اختر کا جملہ بڑا گہرا معنی خیز تھا۔ مہر جی صرف اسے گھورتی رہی۔

"کمال ہے! آپ ایسے کیوں گھور رہی ہیں مجھے۔ کیا محبت کرنا یا شادی کرنا کوئی گناہ یا جرم ہے؟"

"جو جی میں آئے کرو مگر مجھ سے اس طرح کی بے ہودہ بکواس نہیں کرو' سمجھے!"

"تو پھر کس قسم کی بکواس کروں آپ ہی بتا دیں۔"



"یہ سڑک چھاپ عاشقوں والی حرکتیں مجھے زہر سے بھی زیادہ بری لگتی ہیں۔"

"آپ کو عاشقوں کی کون سی کیٹیگری پسند ہے آپ بتا دیں میں اپنی ٹیوننگ کروالوں گا۔"

"تم یہ عاشقی معشوقی کی بکواس ختم کردو۔"

"لگتا ہے کہ آپ "بکواس فوبیا" کی مریضہ ہیں تبھی آپ کو میری ایسی فصیح و بلیغ گفتگو بھی بکواس معلوم ہو رہی ہے۔ آپ کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے' خوش ہونا چاہیے کہ کوئی عقل کا اندھا آپ سے اظہار محبت کر رہا ہے ورنہ کون پاگل کا پتر ہو گا جو خود سے' اپنی ہڈیوں پسلیوں سے دشمنی کرتا ہوا آپ جیسی "بروسلا" قسم کی لڑکی سے اظہار محبت کرے گا اور آپ ہیں کہ الٹا مجھے جھاڑ جھنکار پلا رہی ہیں' افسوس ہے باخدا ڈوب مرنے کا مقام ہے۔" اختر نے حد درجہ اداسی سے کہا۔

"تو ڈوب مرو کہیں..... احسان ہو گا تمہارا مجھ غریب پر۔"

"یہ ڈوب مرنے کی بات میں نے اپنے لیے نہیں کہی۔" اختر نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ مہر جی دانت کچکچا کر رہ گئی۔ وہ ضبط کر رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اختر کو چلتی گاڑی سے اٹھا کر باہر پھینک دیتی۔ اختر خاموش ہو گیا۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد مہر جی نے گاڑی بائیں رخ موڑنے کو کہا۔

"یہ سڑک ہمیں رام پور لے کر جائے گی۔" میں نے گاڑی اس سڑک پر ڈال دی۔ سامنے کچھ دوری پر پہاڑ دکھائی دے رہے تھے اچھا خاصا پہاڑی سلسلہ معلوم ہو رہا تھا۔

"آگے پہاڑی علاقہ شروع ہو رہا ہے اور یہاں سے ریاست رام پور تقریباً" بارہ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ریاست ایسے ہی پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ رام پور سے پہلے ایک قصبہ آتا ہے جسے "سبتی گجہ" کہا جاتا ہے گاڑی ہم وہاں چھوڑ دیں گے ہمارا آدمی وہاں پہلے سے موجود ہو گا۔ اس سے آگے کوئی چار کلو میٹر کا سفر ہے وہ ہم "ٹو کل" بس کے ذریعے طے کریں گے۔" مہر جی نے کہا۔

یہ سڑک تقریباً" ویران تھی' کوئی بھولی بھٹکی گاڑی دکھائی دے رہی تھی اسی لیے میں اچھی خاصی اسپیڈ سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ چار پانچ منٹ میں ہی ہماری گاڑی پہاڑی سلسلے میں داخل ہو گئی۔ بھورے رنگ کے بلند و بالا پہاڑ جو قدرتی طور پر جھاڑیوں سے لدے ہوئے تھے۔

میری دھڑکنوں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ مریاقس کا وجود مجھ سے چند میل کی دوری پر تھا اور ہر لحظہ یہ فاصلہ سمٹتا جا رہا تھا صرف چند روز کی بات تھی پھر وہ میری دسترس میں ہوتا۔ ایک خمار سا تھا جو میرے وجود کو اپنے حصار میں جکڑتا جا رہا تھا۔ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور اسٹیئرنگ میرے ہاتھوں میں سے خود بخود دائیں طرف کو گھوم گیا۔ کسی ان دیکھے دشمن نے گولی چلا کر گاڑی کا عقبی دایاں ٹائر برسٹ کر دیا تھا۔ مجھ سمیت کوئی بھی اس افتاد ناگہانی کے لیے تیار نہ تھا اس لیے ہم سبھی بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے۔ میری ذرا سی غفلت سب کو موت کے حوالے کر سکتی تھی کیونکہ گاڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی ایسے میں اگر میں بریک لگانے کی کوشش کرتا تو گاڑی الٹ جاتی اور کم از کم آٹھ دس پلٹیاں کھاتی ہوئی کسی پہاڑ سے ٹکرا جاتی اور ہم سب کا گاڑی کے اندر ہی قیمہ بن جاتا۔ گاڑی سڑک سے نیچے اتر کر پتھروں پر گھس گئی مگر میں نے بریک پر پاؤں نہیں رکھا البتہ ایکسیلیٹر سے پاؤں اٹھا لیا' اور ہیوی انجن لینڈ کروزر پتھروں پر اچھلتی ڈگمگاتی آگے بڑھتی چلی گئی۔

مجھے کسی قدر اندازہ تھا کہ گولی کس طرف سے چلائی گئی ہے اس لیے میں نے گاڑی کا رخ قدرے ترچھا کر دیا۔ یہ پہاڑ قدرتی طور پر اس انداز میں کھڑا تھا کہ نوے کا زاویہ بنا رہا تھا اور دوسری سمت کونے کے ساتھ سے ایک اور پہاڑ سے متصل ہوتا تھا جو محض چند قدم کے فاصلے پر تھا اور میں نے گاڑی کا رخ اسی سمت کر رکھا تھا۔ اس طرح ان دو پہاڑوں کے اتصال سے

دونوں کے درمیان ایک خلیج کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ خلیج دونوں پہاڑوں کے اندر کافی آگے تک چلی گئی تھی ہم سب وقتی طور پر اس خلیج نما درے میں گھس کر خود کو اپنے دشمن کی گولیوں سے محفوظ کر سکتے تھے۔ میں نے آئینے میں سے عقبی سیٹوں کا جائزہ لینا چاہا اسی وقت گاڑی ایک بڑے پتھر سے اچھلی۔ بس ایک جھلک۔۔۔ میں ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا۔ اختر مضبوطی سے سیٹ تھامے ہوئے تھا جبکہ مہرجی کے ہاتھ میں پسٹل تھا اور اس کا رخ دائیں طرف کے شیشوں کی جانب تھا غالباً" وہ فائر کرنے والے کو دیکھ چکی تھی۔ یہ سب میں نے ایک ہلکی سی جھلک کے دوران ہی دیکھ لیا تھا آئندہ ہی پل مہرجی نے کسی پر گولی چلا دی۔ پتھروں میں سے اتر آنے کے باعث گاڑی کی اسپیڈ از خود بہت کم ہو گئی تھی پہاڑ بالکل سامنے آ گیا تھا جبکہ محض چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو میں نے بریک پر پاؤں رکھ دیا ایک جھٹکا' ایک ہلکا سا دھماکہ' گاڑی پہاڑ سے ٹکرا گئی۔ اس کے سیف گارڈ اور بونٹ وغیرہ پچک گئے جھٹکے کے باعث پروفیسر اچھلے ان کی ڈیش بورڈ سے اچھی خاصی ٹکر ہو گئی تھی۔ میں نے اترنے میں دیر نہیں کی اور ساتھ ہی چیختے ہوئے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔

"اترو۔۔۔ جلدی اترو!" مہرجی اور اختر تو جیسے گاڑی رکنے کے ہی منتظر تھے پروفیسر بھی پیشانی مسلتے ہوئے اتر آئے۔ ٹکر کی وجہ سے ان کی پیشانی پر آلو سا ابھر آیا تھا۔

"ادھر اس طرف۔۔۔" میں نے تیز لہجے میں کہا اور خلیج نما درے کی جانب دوڑ پڑا وہ سب بھی میرے پیچھے تھے۔ دونوں پہاڑوں کے درمیان یہ راستہ کوئی نصف فرلانگ تک اندر چلا گیا تھا اور آگے جا کر دونوں پہاڑ آپس میں مل گئے تھے۔ چند قدم دوڑنے کے بعد مہرجی کسی خیال کے تحت رک گئی۔ اس کے رکتے ہی ہم تینوں بھی رک گئے۔ یہاں تین اطراف سے محفوظ تھے دشمن صرف سڑک کی' پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کی طرف ہمارا نشانہ لے سکتا تھا۔

"تم تینوں اوپر چڑھنے کی کوشش کرو میں ان کا راستہ روکتی ہوں؟" مہرجی نے ہمیں مخاطب کیا۔

"تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔" اختر نے جواب دیا۔

"اکٹھے جائیں گے تو چاروں مارے جائیں گے میں یہاں رک کر وقفے وقفے سے فائر کروں گی تو ان کی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہو گی۔"

"تو پھر پسٹل مجھے دو یہ کام میں کروں گا تم اوپر چڑھنے کی کوشش کرو۔" اختر نے آگے بڑھ کر مہرجی کا پسٹل والا ہاتھ پکڑ لیا۔

"پاگل نہیں بنو جو کہہ رہی ہوں وہ کرو یہ کام میں تم سے بہتر کر سکوں گی۔" مہرجی نے اختر کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"مہرجی! کیا ہمارے پاس اور اسلحہ نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"ہے مگر گاڑی کے خفیہ خانے میں وہاں سے اسلحہ نکالنے کے لیے تھوڑا سا وقت چاہیے اور ہم پر کوئی ایک لمحہ بھی موت بن کر جھپٹ سکتا ہے اس لیے وہ نہیں نکالا جا سکتا۔"

"کیا تم نے گولی چلانے والے کو دیکھا تھا؟"

"ہاں۔۔۔ ہماری پوزیشن بہت خراب تھی ورنہ اسے تو میں نے ڈھیر کر دیا ہوتا۔ پانچ افراد کو تو میں نے دیکھا ہے مقامی ہی ہیں ویسے مجھے یقین ہے کہ ان کی تعداد اچھی خاصی ہو گی۔" اس نے ایک نظر اختر کو دیکھا جو یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا پھر وہ نظریں چراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"پلیز شکیل صاحب! آپ لوگ جائیں۔ آپ کا واسطہ پہلی دفعہ ایسے حالات سے پڑ رہا ہے جب کہ میں یہ سب بیسیوں دفعہ فیس کر چکی ہوں۔ آپ لوگ چوٹی پر چڑھنے کی کوشش کریں کچھ دیر بعد میں بھی آپ لوگوں سے آملوں گی۔"

"ٹھیک ہے' اختر۔" میں نے اختر کو آواز دی مگر وہ اسی انداز میں کھڑا مہرجی کو دیکھتا رہا۔

"اب جاؤ بھی میری صورت کیا تک رہے ہو احمق انسان۔۔۔" مہرجی نے غصیلے لہجے میں کہا نہ جانے مجھے

ایسا کیوں لگا کہ اس کا غصیلا لہجہ کھوکھلا سا ہے۔

"آپ۔۔۔ بہت سندر ہیں!" اختر نے مسکراتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور ہماری طرف پلٹ پڑا۔ مہرجی تو واپس دوڑ پڑی جب کہ ہم تینوں درے کی اندرونی جانب بڑھ گئے۔

"پروفیسر! آپ ٹھیک ہیں نا۔" مجھے پروفیسر صاحب کی طرف سے فکر ہو رہی تھی۔

"ہاں! میں ٹھیک ہوں مجھے کیا ہونا تھا۔" پروفیسر نے مضبوط لہجے میں کہا۔ یہ راستہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا آگے سے تنگ ہو رہا تھا۔ چند قدم کے بعد میں رک گیا۔

"میرا خیال ہے یہاں سے ہمیں اوپر کی جانب چڑھنا چاہیے۔" ہم تینوں نے پلٹ کر دیکھا۔ جہاں سے ہم اس درے میں داخل ہوئے تھے اس جگہ وہ ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ مجھے اس کی طرف سے تشویش ہونے لگی وہ تنہا تھی اور اس کے پاس تھا بھی صرف ایک پسٹل جبکہ دشمن تعداد میں بھی زیادہ تھے اور یقیناً" وہ تھے بھی جدید اسلحہ سے لیس۔

ہمیں اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے ہمیں اوپر چڑھنے کا اشارہ کیا اور خود پتھر کی اوٹ سے دوسری سمت جھانکنے لگی۔۔۔ بجلی کے کوندے کی طرح اٹھی اور فائر کر کے دوبارہ بیٹھ گئی۔ تین گولیاں ضائع اب پسٹل میں زیادہ سے زیادہ چھ گولیاں باقی تھیں۔

"آؤ۔۔۔" میں نے پروفیسر اور اختر کو مخاطب کیا اور ہم تینوں اوپر کی جانب چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ گو کہ پہاڑ کا یہ حصہ زیادہ ڈھلوان میں نہ تھا اور یوں اوپر چڑھنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا مگر ہمارے پاس اور کوئی راستہ بھی نہ تھا اس لیے ہم احتیاط مگر ممکنہ تیزی سے اوپر چڑھتے رہے۔ ہمارے سانس بری طرح پھول گئے مگر ہم لحظہ بھر کو بھی نہیں رکے اور بیس منٹ بعد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہے تھے اور پسینے سے ہم تینوں کی حالت تو اتنی دگرگوں تھی کہ وہ وہیں لمبے لیٹ کر گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ میں نے ایک نظر دیکھا مہرجی اسی پتھر کی اوٹ میں دبکی بیٹھی تھی۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں چونک پڑا۔

"پروفیسر۔۔۔! اٹھیں' جلدی یہاں رکنا ہمارے لیے خطرناک ہو گا۔" میں نے تیز لہجے میں کہا اور پروفیسر جیسا بوڑھا آدمی بھی جس تیزی سے اٹھا وہ قابل دید تھا۔ میرے ہونٹوں کی ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر پروفیسر فوراً" بولے۔

"میں اپنے شوق سے اس مہم پر نکلا تھا کہیں بھی تمہارے لیے پریشانی کا باعث نہیں بنوں گا اور نہ تم مجھے اپنے سے پیچھے پاؤ گے۔"

"شکریہ! آئیں میرے ساتھ۔" میں پہاڑ کی دوسری سمت کی ڈھلان کی جانب بڑھ گیا۔ میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ دشمن بھی ہماری طرح پہاڑ کے اوپر آ سکتا ہے تاکہ ہمارا شکار پورے اطمینان سے کر سکے۔

"شکیل صاحب مہرجی۔۔۔" اختر اتنا ہی کہہ پایا۔

"اس بے چاری کی زندگی چاہتے ہو تو جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔" اختر خاموش رہا۔ ڈھلوان شروع ہوتے ہی ہم تینوں گھنی جھاڑیوں کے جھنڈ کے عقب میں بیٹھ گئے۔ یہاں بیٹھ کر ہم اطراف کی تمام پہاڑیوں کا بخوبی جائزہ بھی لے سکتے تھے اور جھاڑیاں اس قدر گھنی تھیں کہ ہمیں دیکھ لیے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔

وہاں بیٹھے ہمیں بمشکل چند لمحے ہی گزرے تھے کہ میرا اندیشہ درست ثابت ہو گیا۔ درے کی دوسری جانب سے دو آدمی اوپر چڑھ آئے تھے۔

"پروفیسر! آپ یہیں بیٹھیں! اختر تم میرے ساتھ آؤ۔" میں محتاط انداز میں آہستہ آہستہ عقبی جانب ڈھلان میں اترنے لگا' اختر بھی میری تقلید کر رہا تھا۔

"احتیاط سے ان کی نظر نہ پڑ جائے۔" چند گز اترنے کے بعد میں بے ترتیب پتھروں پر کھڑا ہو گیا اب ہمارے دیکھ لیے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔

"آؤ۔۔۔" میں نے اختر سے کہا اور جھکے جھکے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ اختر میرے پیچھے تھا۔ اچانک اس



کا پاؤں لگنے سے ایک چھوٹا سا پتھر نیچے لڑھک گیا۔

"احتیاط۔۔۔ آنکھیں کھلی رکھو اگر ان کو ذرا بھی آہٹ سنائی دے گئی تو یہاں ہماری لاشوں کو گدھ نوچیں گے۔" اختر بولتے بولتے چپ کر گیا۔ اسے بھی صورت حال کی سنگینی کا پورا احساس تھا۔ ہم اندازے سے پہاڑ کے گرد ایک مخصوص فاصلے تک آگے بڑھنے کے بعد رک گئے۔ میں نے اختر کو پوری احتیاط کا اشارہ کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ایک ایک قدم اوپر چڑھنے لگے۔ خون کی گردش کنپٹیوں میں ٹھوکریں مار رہی تھی اور اعصاب ایک تناؤ کا شکار تھے۔ میں نے اختر کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود مزید ایک قدم اوپر چڑھ کر دیکھا دونوں درے کے اوپر پہنچ کر نیچے جھانک رہے تھے۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ ان کی پشت ہماری سمت تھی۔

"ارے یہ جناور کی بچی تو تنہا بیٹھ گولیاں چلائے ہے! ای کے باقی یار کدر روے؟؟"

"ہوویں گے یہیں کہیں پتھراں میں چھپے' دیکھ جرا گور سے دیکھ۔"

"ارے ناہیں ہیں نا۔۔۔ ہویں تو کا نجر نہ آویں گے۔"

"چھار رک جرا پہلے مائیں ای کا بھیجا تو باہر نکالوں ای کے یاروں کی بعد ماں دیکھ لئی گے۔"

میں نے اختر کو اشارہ کیا اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا میری نگاہیں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔

"ارے رک۔ کوڑھ مغج پہلے ای ـــــ کو دیکھ۔" دوسرے نے مہرجی کی طرف اٹھی اپنے ساتھی کی رائفل نیچے کر دی۔ ہم بالکل ان کے سر پر پہنچ چکے تھے اور ہم نے کوئی آواز بھی پیدا نہیں ہونے دی تھی مگر شاید ان کی چھٹی حس نے انہیں اپنے عقب میں ہماری موجودگی کا احساس دلا دیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ ہی پلٹے تھے۔ انہوں نے رائفلیں سیدھی کرنا چاہیں ہم نے ان کی رائفلوں پر ہی ہاتھ ڈالے کیوں کہ سارا خطرہ اسی کا تھا' میں نے بایاں ہاتھ رائفل پر ڈالا اور دائیں ہاتھ کا گھونسہ اس کے چہرے پر رسید کر دیا مگر بہت ڈھیٹ صرف ایک قدم لڑکھڑایا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ ادھر اختر اور اس کے حریف کے درمیان رائفل کی کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ اچانک اختر نے اپنے حریف کے پوری قوت سے گھٹنا جما دیا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ منہ سے "اوخ" کی آواز نکالتا ہوا رکوع کے بل ہو گیا۔ اختر نے آئندہ پل اس کی گردن پر لات ماری اور وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف گر پڑا۔ اس کی بدقسمتی کہ وہ درے کے کنارے گرا اور پلٹا کھا گیا۔ سنبھلنے کی کوشش تو اس نے کی مگر سنبھل نہ پایا اور نیچے لڑھک گیا اس کی دہشت ناک چیخ سے پہاڑ گونج کر رہ گئے۔

اختر نے میرے مدمقابل پر رائفل سیدھی کی تو اس نے مجھے جھٹکا دے کر اپنے سامنے کر لیا اختر نے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ لیا وہ لاٹھی کی طرح رائفل اس کے سر میں مارنا چاہتا تھا کہ اس نے دوبارہ مجھے سامنے کر دیا۔ اختر نے رائفل کچھ فاصلے پر رکھی اور عقب میں آ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ ایک ذرا رخ بدلتے ہوئے اسے جھٹکا دے کر چھوڑ دیا اور وہ بھی چیختا ہوا درے کی گہرائیوں میں لڑھک گیا۔

اختر نے فوراً" رائفل اٹھالی' جدید ترین رائفلیں تھیں۔

ہم نے تیزی سے آگے بڑھ کر نیچے جھانکا دونوں نیچے گہرائیوں میں بے حس و حرکت پڑے تھے۔ مہرجی کی طرف نظر اٹھی تو ہمارے دل دھک سے رہ گئے۔ وہ پتھر کے ساتھ دبکی بیٹھی تھی اور پتھر کی دوسری سمت سے چھ سات مسلح افراد اس کی سمت بڑھ رہے تھے اور غالباً" وہ ان کی موجودگی سے بے خبر تھی۔

ہم پر نظر پڑتے ہی اس نے گہرائی میں بے حس و حرکت پڑے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شکریہ کا سلام کیا پھر پسٹل دکھا کر ہاتھ ہلانے لگی۔ یقیناً" گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ مگر ہم اس کی طرف زیادہ دیر توجہ نہ کر پائے۔ بیک وقت ہم دونوں نے رائفلیں سیدھی کیں بیک وقت ہی دو دھماکے ہوئے

تھے۔ نشانہ تو کسی کا کیا لینا تھا بس ان شکاری کتوں کا راستہ روکنا مقصود تھا۔ وہ سب بدحواس ہو کر واپس بھاگ پڑے۔ مہرجی کچھ مزید دب کر بیٹھ گئی۔

"اختر تم یہیں ٹھہرو میں دوسری سمت جاتا ہوں۔" میں نے تیز لہجے میں کہا اور درے کے گرد چکر لگا کر درے کی دوسری سمت آگیا اور رکنے کے بجائے جہاں سے درہ شروع ہوتا تھا اس طرف بڑھ گیا۔

پہاڑ کے کنارے پہنچ کر میں نے نیچے جھانکا ایک طرف ہماری خستہ حال گاڑی کھڑی تھی تو دوسری طرف قدرے درے کے اندرونی طرف مہرجی پتھر کی اوٹ لیے بیٹھی تھی اور سر اٹھائے اوپر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ میں بھی ایک پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ میری اور اختر کی پوزیشن اب ایسی ہو گئی تھی کہ ہم دونوں مل کر مہرجی کو اطمینان سے اوپر آنے میں سپورٹ کر سکتے تھے۔

پتھر کی اوٹ میں بیٹھنے کے بعد میں نے اسے اشارہ دیا تو وہ اٹھ کر درے کی اندرونی جانب دوڑ پڑی۔ میں عقابی نظروں سے نیچے کا جائزہ لینے لگا۔

میں نے مہرجی کی طرف دیکھا تو میری آنکھیں حیرت و بے یقینی سے پھیل گئیں۔ وہ ایسی برق رفتاری سے بلندی کی جانب چڑھ رہی تھی کہ یقین نہ آئے یوں جیسے وہ ہموار اور سیدھی سڑک پر دوڑ رہی ہو۔ ایک بجلی سی چھوٹے بڑے پتھروں کے درمیان چمکتی ہوئی بلندی کی جانب آرہی تھی۔ میری طرح اختر بھی حیرت کے عالم میں وہ منظر دیکھ رہا تھا اور کچھ ہی دیر بعد وہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی تھی۔

"یاالٰہی یہ تو نے لڑکی بنائی ہے یا کوئی بلا؟" میں بے اختیار زیر لب بڑبڑایا۔ میں نے ایک ذرا دوبارہ جائزہ لیا اور اٹھ کر مہرجی کی طرف بڑھ گیا۔ اختر نے بھی اپنا مورچہ چھوڑ دیا۔

پروفیسر جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل آئے۔

"آئیں اب جلد از جلد ہمیں اس جگہ سے دور نکلنا ہے۔" ہمارے قریب پہنچتے ہی مہرجی نے تیز لہجے میں کہا۔

"ہمارا یہاں ایک لمحے کے لیے رکنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ دشمن تیس پینتیس کی تعداد میں ہیں۔" وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کا آتشی رنگ و روپ کچھ اور دہک اٹھا تھا۔

موٹی سیاہ ناگن کی سی چٹیا اس کی کمر سے بھی نیچے جھول رہی تھی پسینے کے باعث اس کی پیشانی اور کنپٹیوں سے چپکے ہوئے چند بال اتنے بھلے لگ رہے تھے کہ انسان بے خودی کا شکار ہو کے..... بس کٹ مرے.....! اپنا سر اتار کر اس کے قدموں میں ڈال دے۔ وہ کیا چیز تھی اسے خود احساس نہ تھا۔ وہ تو پہلے ہی اختر نے اپنے تمام جملہ حقوق اس کے نام کر دیے تھے وگرنہ شاید یہ کوشش میں کر ڈالتا۔

"ادھر اس طرف سے نیچے اترتے ہیں۔" اختر نے ایک قدر صاف اور کم دشوار گزار ڈھلوان کی طرف اشارہ کیا تو مہرجی نے اس کی رائے رد کر دی۔

"نیچے اترنے کی حماقت نہیں کرنی ہمیں بس یونہی آگے بڑھتے رہو۔" تیز رفتاری سے چلتے ہوئے مہرجی جوگنگ والے انداز میں دوڑنے لگی اور میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

ان لمحات میں میرے ذہن و دل کی حالت کیسی ناگفتہ رہی ہوگی اس کا اندازہ صرف وہی شخص لگا سکتا ہے جسے کسی پر فضا پہاڑی مقام میں کسی بلند و بالا پہاڑ کی ناہموار اور چھوٹے بڑے پتھروں سے اٹی چوٹی پر کسی خوبصورت اور مقناطیسی حسن کی حامل لڑکی کے ساتھ جوگنگ کرنے کا اتفاق پیش آیا ہو۔ اور لڑکی بھی ایسی جو قیامت خیز سراپے کی مالک ہو

جس کی کشادہ پیشانی پر روشنیاں رقص کرتی محسوس ہوں۔ موٹی موٹی آنکھوں میں پگھلی ہوئی چاندی کی سی چمک ہو اور اس چمک میں سرمگیں پتلیاں، لمبی گھنی اور سیاہ پلکیں ہوں کمانوں جیسے ابرو جن میں تلوار کی سی کاٹ معلوم ہو جس کے ہونٹ دیکھتے ہی ذہن میں دیار جمن کے سرخ





شفیق گردش کرنے لگیں، جس کے گال مکھن کی طرح نرم و ملائم قندھار کے اناروں کی طرح سرخ اور انگاروں کی طرح دہکتے ہوں اور جوگنگ کے باعث ان گالوں میں ایک ایسا ارتعاش بپا ہو کہ نظر پڑے.... تو پھسل جائے..... بس..... جس کے ساتھ ایسا اتفاق پیش آیا ہوگا میری اس وقت کی کیفیت کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے۔

برا ہو اختر کا جو میرا راستہ کاٹ گیا تھا۔

اس آتشیں پیکر کے کندھے سے کندھا ملا کر بھاگنا میرے بس کی بات نہ تھی سو میں چند قدم آگے نکل گیا۔ ایک رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور دوسری اختر کے۔

"پروفیسر!" بھاگنے کے دوران ہی اختر نے اپنے برابر بھاگتے پروفیسر صاحب کو مخاطب کیا۔

"شکیل صاحب بہت سمجھدار ہیں آپ بھی کچھ سمجھداری کا ثبوت دیں۔"

"برخوردار میں حافظ قرآن ہوں شرعی مسائل سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ الحمدللہ کلمے بھی سارے آتے ہیں۔ تالی بجانا چاہتے ہو تو دوسرا ہاتھ تو ہاتھ کے برابر لاؤ پھر ہم سمجھ داری کا ثبوت بھی دیں گے۔" پروفیسر نے فصاحت سے جواب دیا۔ مہرجی شاید پروفیسر کی بات کے معنی نہ سمجھ سکی تھی جبکہ اختر مسرت سے قلقاریاں مارنے لگا۔

"مولا آپ کو خوش رکھے پروفیسر! یہ ممی کا مسئلہ حل کر لیں پھر یہ معمہ حل کرنے کی کوشش کریں گے....." مہرجی اختر کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"اختر فار گاڈ سیک! اس وقت اپنی چونچ بند کر لو میری ذہنی حالت بہت خراب ہے۔ خدا جانے انکل صحیح سلامت مقررہ مقام تک پہنچ پائے ہیں یا نہیں۔"

"او کے.... ایز یو وش۔" اختر خاموش ہو گیا۔ ہم اسی انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ سورج عین سروں کے اوپر پہنچ آیا تھا اور ماحول اچھا خاصا تپ گیا تھا۔ پیاس سے حلق خشک ہو گیا تھا اور پسینے سے کپڑے جسم کے ساتھ چپک کر رہ گئے تھے۔ وقفے وقفے سے ہم پلٹ کر پیچھے دیکھ لیتے دشمنوں کا کہیں نام و نشان دکھائی نہ دے رہا تھا۔ کبھی تو ہم تیز تیز چلنے لگتے کبھی آہستہ آہستہ دوڑنے لگتے۔ اسی انداز میں آگے بڑھتے ہوئے ہم چار پہاڑوں کا فاصلہ طے کر آئے۔ آدمی ہونے کے باوجود ہماری ہمتیں جواب دے گئیں ٹانگیں بے جان ہو گئیں اور سانس بغاوت کرنے پر اتر آئی مگر مہرجی..... کمبخت نہ جانے کس ڈھیٹ مٹی کی بنی ہوئی تھی بالکل تازہ دم اور چاق و چوبند دکھائی دے رہی تھی۔

ہم پانچویں پہاڑ کی ڈھلوان پر اتر رہے تھے کہ قدرتی طور پر ایک ایسے وسیع کٹاؤ پر پہنچ گئے جہاں اچھا خاصا سایہ تھا، پروفیسر بے دم سے ہو کر بیٹھ گئے۔

"مہرجی! آپ اتنا سفر کر کے تھک تو نہیں گئیں؟" اختر نے مہرجی کو مخاطب کیا۔

"بالکل نہیں۔"

"مجھ سا سیاہ بخت بھی کوئی نہیں ہوگا۔" اختر نے گہری یاسیت سے کہا۔

"کیوں بھئی! اب کیا ہو گیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے شکیل صاحب! سوچا تھا کہ مہرجی ان پہاڑوں سے بھاگ دوڑ سے تھک گئی ہوں گی سو اسی بہانے انہیں کندھوں پر بٹھا کر چل لیں گے مگر لگتا ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ ڈھیٹ مٹی کی واقع ہوئی ہیں۔"

"خیال کرنا اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تم میرے ہاتھوں اپنی مٹی خراب کروا کر ہی دم لو گے۔" مہرجی کا انداز تنبیہی تھا۔

"یہ شرف آپ ہمیں کب بخش رہی ہیں؟"

"اگر تمہارا حال یہی رہا تو بہت جلد۔"

ترے وعدے پہ جیے تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

"اور جو درگت تمہاری میں بناؤں گی اس کے بعد تم کیا کرو گے؟"

کرتے ہیں۔" ہم چاروں بائیں طرف کو چل پڑے کبھی ہم کسی پہاڑی چوٹی پر پہنچ جاتے اور کبھی ڈھلوانوں کا سفر طے کرنے لگتے۔ خودرو پہاڑی جھاڑیاں کہیں تو بالکل ہی کم ہو جاتیں اور کہیں کہیں اس درجہ گھنی ہو جاتیں کہ آگے بڑھنا انتہائی دشوار ہو جاتا۔ بعض مقامات پر یہی جھاڑیاں بلند و بالا درختوں کی صورت اختیار کر جاتیں۔ ہم مسلسل تین گھنٹے چلتے رہے مگر سڑک کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا ایسے لگتا تھا کہ سڑک کو یہ بلند و بالا پہاڑ نگل گئے ہیں۔

دور افق پر سورج پہاڑ کی فلک بوس چوٹیوں کے عقب میں اتر رہا تھا۔ پہاڑوں پر ایک مضمحل اور اداس سی خاموشی مسلط تھی۔ ہم چاروں ایک جگہ پتھروں پر نڈھال سے بیٹھ گئے ہم سب کی حالت خراب تھی جسم تھے کہ پھوڑا بنے ہوئے تھے کپڑوں سے پسینے کی بو کے بھبکے سے اٹھ رہے تھے اور بھوک پیاس نے ایک مردنی طاری کر رکھی تھی۔

"دیوی جی! کیا دنیا کے آخری کونے تک جانے کا ارادہ ہے؟" اختر نے مضمحل انداز میں کہا۔

"ہم راستہ بھٹک کر اس مقام سے کافی آگے نکل آئے ہیں جہاں سے سڑک رام پور کی طرف گھومتی ہے اور جتنا سفر ہم طے کر چکے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ہم رام پور کے گرد و نواح میں ہی کہیں موجود ہیں۔" مہرجی نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا رام پور کی بجائے رام پور کے گرد و نواح میں ہی ذلیل ہو کر گزارہ کرنے کا ارادہ ہے مجھے تو بھوک بھی انتہائی لگی ہوئی ہے۔"

"فی الحال تو پتھر کھا کر ہی صبر و شکر کرو کیونکہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

"میرا خیال ہے کہ اب ہم ذرا سا رخ ترچھا کر کے سفر کریں کم از کم سڑک تک تو پہنچیں پھر آگے کا کچھ سوچیں گے۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"تین گھنٹے سے مسلسل چل رہے ہیں ابھی تو فی الحال ہم کسی طرف کو بھی رخ کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔" پروفیسر نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔

"کچھ دیر سستا لینے میں کوئی حرج نہیں۔" مہرجی نے کہا اور چونک پڑی اس کی نظر جنوبی مغربی سمت اٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو مہرجی کے چونکنے کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔ دور ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک دھندلی سی عمارت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ... یہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔ اختر اور پروفیسر بھی اسی جانب متوجہ ہو گئے۔ مہرجی اپنی جگہ اٹھ کھڑی ہو گئی۔

"یہ تو غالباً" کوئی عمارت ہے۔" پروفیسر نے اپنی رائے دی۔

"ہمیں جلد سے جلد وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے یقیناً" اس طرف قریب ہی کوئی آبادی ہوگی اور بہتر ہو گا کہ ہم لوگ اندھیرا پھیلنے سے قبل کسی آبادی تک پہنچ جائیں۔" مہرجی نے اضطراری لہجے میں کہا۔ اس کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ جنوبی شرقی سمت سے فائرنگ کی آواز بلند ہوئی۔ پہاڑوں کا سکوت کرچی کرچی ہو گیا۔ مہرجی کے حلق سے گھٹی گھٹی سی کراہ خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گر پڑی۔ ایک گولی سائیں کی آواز سے میرے کان کے قریب سے گزری اور میں لاشعوری طور پر عقبی جانب لیٹے ہوئے ڈھلوان کی سمت لڑھک گیا۔ پروفیسر اور اختر نے بھی اسی ترکیب پر عمل کیا جب کہ مہرجی ہم سے پہلے ہی پتھروں پر پلٹیاں کھاتی ہوئی ڈھلوان میں کافی نیچے چلی گئی تھی یقیناً" اسے گولی لگ گئی تھی۔

لیٹتے وقت میں نے ایک ذرا دیکھا تھا فائرنگ کرنے والے دس سے کسی طرح بھی کم نہ تھے۔ وہی دشمن تھے جن کے چنگل سے نکل کر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔

چند ہلٹیوں کے بعد ہم چاروں مختلف پتھروں کی اوٹ میں ہو گئے۔ ٹھیک اسی وقت عقبی سمت سے بھی گولیوں کا ایک قافلہ ہماری سمت بڑھا اور پتھروں سے ٹکرا کر رخ بدل گیا۔ اختر جو اٹھ کر مہرجی کی طرف بڑھنا چاہتا تھا اپنی جگہ دبک کر رہ گیا۔ دشمن نے دو طرف سے گھیر لیا تھا۔ مہرجی دو بڑے پتھروں کی آغوش میں



ہمیں یہ بھی تھا غنیمت جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

"نہیں مجھے یقین ہے کہ آپ کے ہاتھوں درگت بننے کے بعد ہم کچھ یوں گویا ہوا کریں گے۔

عشق نے یک ٹنگا غالب کر دیا
ورنہ ہم تھے آدمی دو ٹانگ کے

اس کے انداز پر بے اختیار مہرجی ہنس پڑی اس کے خوبصورت گالوں میں نمودار ہونے والے بھنور بڑے دلکش تھے۔

"پروفیسر صاحب لڑکی ہنس پڑی۔ آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟" اختر نے جلدی سے پروفیسر کو مخاطب کیا۔

"دو باتیں... نمبر ایک پتھر دل میں جونک لگ رہی ہے اور نمبر دو کہ "بجلی" دکھا کر "کبھی" مارے گی اور چودہ طبق روشن کر دے گی۔"

"یعنی... ففٹی ففٹی چانس۔"

"یس! کوشش جاری رکھو۔ ہمت مرداں مدد خدا۔" شاید پروفیسر بھی اب ان دونوں کی نوک جھوک سے محظوظ ہونے لگے تھے۔ پروفیسر کی بات پر مہرجی نے مصنوعی غصے سے انہیں گھورا۔

"پروفیسر! آپ بھی اس شیطان کے ساتھ مل گئے۔"

"نہیں بھئی! وہ تو بچے نے ایک سوال پوچھا اور ہم نے اپنے تجربے کی روشنی میں اسے جواب دے دیا۔"

"ہاں! اور جواب کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ مشورہ بھی "ہمت مرداں مدد خدا۔" میں نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

"تو کیا فرق پڑ گیا پروفیسر نے مشورہ ہی دیا ہے نا کوئی تعویذ تو نہیں دے دیا۔"

"پروفیسر کے مشوروں پر عمل کرو گے تو کچھ نہیں ہونے والا کیونکہ پروفیسر اگر ایسے کاموں کے متعلق کچھ جانتے ہوتے تو آج تک کنوارے نہ بیٹھے ہوتے۔"

"سچ پروفیسر! کیا آپ نے شادی نہیں کی؟" مہرجی نے شدید حیرت سے پوچھا۔

"ہاں... ہم نے بھی محبت کی تھی۔ اس حسن کی دیوی سے شادی ہوئی نہیں اور کسی سے شادی کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی سو آج تک کنوارے ہیں۔"

"اور جس سے آپ نے محبت کی تھی کیا وہ بھی آپ سے محبت کرتی تھیں؟"

"میری محبت سے دو گنا زیادہ... کہتی تو وہ یہی تھی۔"

"پھر اب وہ کہاں ہیں۔" پروفیسر نے ایک گہری سانس لی۔

"چودہ بچوں کے ہجوم میں۔ آج کل پندرہویں کے استقبال کی تیاریوں میں مگن تھی۔"

پروفیسر کا لہجہ ایسا غمناک ہو گیا کہ اختر اور مہرجی دونوں ہی سنجیدہ اور افسردہ سے ہو گئے۔ جبکہ پروفیسر کی ایسی شاندار اداکاری پر میرے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیے!" اختر نے گہری سنجیدگی سے کہا تو مہرجی نے ایک جھٹکے سے اس کی طرف دیکھا مگر منہ سے کچھ بولی نہیں اور پھر ہم سب اٹھ کر آگے کے سفر پر چل پڑے۔ تاحد نظر پہاڑوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ نہ کوئی جانور نہ پرندہ نہ ہی کوئی انسان۔

"لگتا ہے کہ ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔" مہرجی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"کسی غلط سمت نکل آئے ہیں۔ ذرا غور کریں سڑک کا بھی کہیں نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا۔ رام پور بائیں ہاتھ آتا ہے اور یہ سڑک رام پور تک ہی جاتی ہے۔ اب یہ بھی ممکن ہے کہ سڑک کہیں پیچھے سے بائیں ہاتھ ٹرن کر گئی ہو اور ہم اس راستے سے آگے نکل آئے ہوں۔"

"بالکل ممکن ہے بے دھیانی میں ہم لوگوں نے سفر بھی تو اچھا خاصا طے کر لیا ہے اور مجھے تو پیاس بھی لگی ہوئی ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"یہاں پانی ملنا مشکل ہے... آئیں سڑک کی تلاش

پڑی تھی۔ اس کی لمبی ناگن سی چوٹی اس کی کمر کے گرد کسی ناگن کی طرح ہی لپٹی ہوئی تھی۔

"مہر جی آپ..... آپ ٹھیک تو ہیں؟" اختر نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ہم تینوں کی نظریں مہر جی کے وجود کو ٹٹول رہی تھیں۔ میری نظریں اس کے دائیں پاؤں سے چپک کر رہ گئیں جو جوتے سمیت سرخ ہو رہا تھا۔ اور پھر وہاں سے رینگتی ہوئی اس کی ران پر آکر ٹھہر گئیں۔ گولی اس کے دائیں گھٹنے سے تھوڑا اوپر ران میں لگی تھی اور وہاں سے بہنے والا خون اس کی پینٹ کو رنگین کرتا ہوا پاؤں تک نچڑ رہا تھا اور نیچے پتھر بھی سرخ ہو رہے تھے۔

مہر جی ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا۔

"ہاں بچت ہو گئی ہے۔" اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ اختر چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر رائفل سنبھالتا ہوا محتاط انداز میں عقبی سمت پلٹ گیا۔

"اختر ٹھہرو!" مہر جی نے تیز لہجے میں کہا تو وہ دوبارہ پلٹ کر سوالیہ نظروں سے مہر جی کی طرف دیکھنے لگا۔

"رائفل مجھے دے دو ہمارے پاس یہی گنتی کی چند گولیاں ہیں ان میں سے ایک گولی بھی ضائع نہیں ہونی چاہیے۔"

"مگر مہر جی....." مہر جی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"فکر نہیں کرو میں بالکل ٹھیک ہوں رائفل مجھے دے دو۔" اختر نے ہونٹ بھینچتے ہوئے رائفل اس کی طرف اچھال دی جو اس نے قریب آتے ہی تھام لی پھر وہ ان دو پتھروں کی اوٹ سے نکل کر کہنیوں کے بل رینگتی ہوئی تھوڑا سا بلندی کی جانب آکر ایک ایسے پتھر کی اوٹ میں بائیں پہلو لیٹ گئی جو جھاڑیوں کی لپیٹ میں تھا۔

جہاں سے وہ رینگ کر آگے بڑھی تھی وہاں کے پتھر خون سے سرخ ہو گئے تھے۔ مجھے تشویش نے آگھیرا اس قدر خون کا زیاں وہ بھی ایسے مقام پر جہاں کہ طبی امداد مل جانے کے بھی امکان نہ تھے بہت خطرناک تھا اس میں اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔ اختر بھی سختی سے ہونٹ بھینچے پریشان نظروں سے اس کو تکے جا رہا تھا۔ پروفیسر بھی اپنی جگہ پریشان اور مضطرب دکھائی دے رہے تھے۔

مہر جی کی توجہ مخالف سمت تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے رائفل کی نال جھاڑیوں سے نکالی اور دو فائر داغ دیئے۔ اور فوراً" دبک کر بیٹھ گئی۔ توقع کے مطابق پہاڑ دھماکوں سے گونج اٹھے۔ کئی گولیاں اس پتھر اور جھاڑیوں سے آٹکرائیں جہاں مہر جی دبکی بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ اتر آئی۔ چند لمحے وہ دوبارہ دوسری سمت جھانکنے لگی۔ میری نظر اختر پر پڑی وہ شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا شرٹ اتارنے کے بعد اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کھڑا ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ سو وہ رینگتا ہوا مہر جی کی طرف بڑھ گیا۔ مہر جی دوسری جانب متوجہ تھی جب اختر نے قریب پہنچ کر اس کی ران پر ہاتھ رکھا۔ اس کے ہاتھ رکھتے ہی وہ ناگن کی طرح پلٹی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو..... اپنی جگہ پر جاؤ۔" وہ غصے سے پھنکاری۔

"مجھے زخم دیکھنے دو۔" اختر نے سنجیدگی سے کہا۔

مہر جی نے فوراً" ٹانگیں سمیٹ لیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی اور نہ ہی میں ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ تم اپنی جگہ پر جاؤ۔"

"یاد رہے میں ڈاکٹر بھی ہوں۔ ضرورت ہے یا نہیں میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ مجھے زخم دکھاؤ۔" اختر نے ہاتھ بڑھایا تو مہر جی بھڑک اٹھی۔

"خبردار! میں کہتی ہوں پرے ہٹ جاؤ۔"

"مہر جی اختر ٹھیک کہہ رہا ہے اسے زخم دیکھنے دو خون بہت زیادہ بہہ رہا ہے جو خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا خطرناک ہے اور کیا نہیں اس کی سینس مجھے بھی ہے براہ کرم اپنے دوست کو اپنے پاس بلا لیجیے۔" مہر جی نے خشک لہجے میں کہا اور میں خاموش ہو رہا۔

"دیکھو مہر! پاگل نہیں بنو بارود کا زہر پھیل گیا تو تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔ مجھے زخم کا جائزہ لینے دو۔ پلیز....." اختر کا لہجہ التجائیہ تھا۔

"فار گاڈ سیک! وقت ضائع نہیں کرو دشمن سر پر پہنچ جائیں گے۔ میرا خون بہہ رہا ہے تا بہنے دو..... جان جاتی ہے جانے دو۔ تم واپس اپنی جگہ پر جاؤ۔ اٹھو یہاں سے۔"

"تو کیا تمہارا اس طرح خون بہتا دیکھتا رہوں..... تمہیں موت کے منہ جاتا دیکھتا رہوں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھا رہوں؟" اختر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی نظریں مہر جی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"نہیں مہر! یہ میرے اختیار کی بات نہیں اس سے تو بہتر سمجھتا ہوں کہ پہلے میں خود مر جاؤں۔" اختر کا لہجہ اور انداز کچھ ایسا تھا کہ مہر جی کچھ بھی نہ کہہ پائی بس خاموش بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اختر بھی چند لمحے خاموش نظروں سے اس کی سمت دیکھتا رہا پھر اچانک اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"اختر نیچے بیٹھ جاؤ۔" میں اور پروفیسر یک بارہی جھپٹے تھے۔ مہر جی اپنی جگہ بجلی کی طرح تڑپی اور اس نے اختر کو بازوؤں سے پکڑ کر جھٹکا دے کر نیچے گرا لیا۔

"کیا حماقت ہے یہ۔" مہر جی نے غصیلے انداز میں کہا مگر اس کے لہجے نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

"جب تم خود موت کے منہ میں جانا چاہتی ہو تو تم سے پہلے میں کیوں نہیں؟"

"مہر جی اختر ٹھیک کہہ رہا ہے اسے زخم دیکھنے دیں۔" میں نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔

"کوئی حرج نہیں ہے بیٹا۔ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تمہارا خون بہہ رہا ہے۔ اختر کو زخم دیکھنے دو۔ یہ ڈاکٹر ہے اگر کوئی حل ہوتا ہے تو اسے کرنے دو۔" پروفیسر نے بھی ہماری تائید کر دی۔ مہر جی چند لمحے اختر کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے رضامندی میں سر ہلایا اور دوبارہ دوسری جانب متوجہ ہو گئی ٹانگیں اس نے سیدھی کر دی تھیں۔ اختر وہیں پہلو کے بل لیٹ گیا۔ مہر جی کی ران میں جہاں گولی لگی تھی پینٹ کے اس سوراخ میں اختر نے انگلیاں ڈال کر جھٹکا دیا اور شگاف کر ڈالا۔ ران کا گوشت گاڑھے سرخ خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

اختر نے شرٹ کی ایک آستین پھاڑی اور اس سے خون صاف کرنے لگا وہ اپنے کام میں منہمک تھا اور مہر جی بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"شکیل! رائفل ادھر..... مجھے دو۔" پروفیسر نے مجھے مخاطب کیا تو میں ان کی سمت متوجہ ہو گیا۔

"پروفیسر آپ..... آپ کیا کریں گے؟"

"تم رائفل تو دو۔" پروفیسر نے کہا اور میں نے رائفل ان کی طرف اچھال دی۔

"پروفیسر صاحب ہمارے پاس یہی اسلحہ ہے گولیاں ضائع نہیں کیجیے گا۔" مہر جی نے کہا تو پروفیسر اس کی طرف دیکھ کر بزرگانہ انداز میں مسکرا دیے۔ پھر وہ رینگتے ہوئے قدرے بلندی پر پڑے ایک پتھر کی طرف بڑھ گئے۔

"پروفیسر یہ آپ کیا کر رہے ہیں واپس آجائیں!" میں نے پریشانی سے کہا۔

"تم اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہو۔" پروفیسر اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے اور اس پتھر کی اوٹ لے کر بیٹھ گئے۔ چند لمحے پتھر کی اوٹ سے دوسری سمت جھانکنے کے بعد انہوں نے رائفل سیدھی کی اور فائر کھول دیا۔ مہر جی بھی دوسری جانب متوجہ تھی پروفیسر کے فائر کرتے ہی وہ تیزی سے سیدھی ہوئی اور پروفیسر کی طرف دیکھ کر متحیرانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"پروفیسر..... کمال ہے..... آپ..... آپ تو غضب کا نشانہ رکھتے ہیں۔"

"کیوں کیا ہو گیا؟" پروفیسر مسکرائے۔

"پروفیسر دو آدمی گرے ہیں اور جس انداز میں گرے ہیں یقیناً" دوبارہ نہیں اٹھ سکیں گے۔" پروفیسر مسکرا کر دوبارہ سر کی اوٹ سے جھانکنے لگے۔ میں اختر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ زخم کپڑے سے صاف

کر رہا تھا۔

"اختر! کیا زخم زیادہ گہرا ہے؟" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"بچاؤ ہو گیا ہے شکیل صاحب! گولی صرف چھو کر گزری ہے البتہ گوشت پر ایک انچ بڑا کٹ چھوڑ گیا ہے اسی باعث بلیڈنگ اتنی زیادہ ہو رہی ہے۔"

"یعنی خطرے والی بات نہیں۔"

"گولیاں ختم ہو گئیں۔" مہرجی کا لہجہ تشویش سے پر تھا۔

"پھر اب ہمیں فوراً یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" میں نے رائے دی۔ ہاں اور کوئی چارہ بھی نہیں۔

"ایک منٹ...." اختر نے کہا اور ایک طرف پڑی شرٹ اٹھالی۔ اس نے شرٹ کی دوسری آستین الگ کی اور مہرجی کی ران کے گرد لپیٹ دی پھر اس نے شرٹ سے ایک باریک سی پٹی اتاری اور مہرجی کی ران کے اوپر اچھی طرح کسنے کے بعد مضبوطی سے دو تین گرہیں لگائیں۔

"چلیں پروفیسر اب نکلنے کی کوشش کریں۔" مہرجی نے پروفیسر کو مخاطب کیا اور پھر ہم سب محتاط انداز میں پتھروں پر رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ زخمی ٹانگ کے باعث مہرجی کو پتھروں پر رینگنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کے غماز تھے مگر وہ ہمارے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی دشمن اب بھی وقفے وقفے سے فائر کر رہے تھے۔

"گولیاں ختم ہو گئی ہیں تو یہ رائفل پھینک دینا تھی۔" اختر نے مہرجی کے ہاتھوں میں پکڑی رائفل کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں تاکہ موت کے ہرکارے جان جاتے کہ ہم خالی ہو چکے ہیں اور وہ بے دھڑک آکر ہمارے وجود چھلنی کر دیتے۔" مہرجی نے منہ بنایا۔

تقریباً بیس میٹر تک رینگتے رہنے کے بعد ہم پہاڑ کی ڈھلوان تک پہنچ گئے۔ نیچے بہت گہرائی میں ایک قدرتی نالا دکھائی دے رہا تھا جو اس اور سامنے والے دونوں پہاڑوں کے درمیان سے جنوب کی سمت بہہ رہا تھا۔ نالے کے دونوں اطراف انتہائی زیادہ گھنی جھاڑیاں اور درختوں کا سلسلہ نالے کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف آگے جاتا تھا۔ پانی نظر آتے ہی ہم چاروں کے چہروں پر رونق پھیل گئی ساتھ ہی حلق کچھ مزید خشک محسوس ہونے لگے۔

"صاف ستھرا پانی ہے۔"

"چلو بھوک نہ سہی پیاس کا تدارک تو ہو۔"

"ہمیں جلد از جلد اس نالے کی دوسری جانب پہنچنا ہے۔" مہرجی نے تیز لہجے میں کہا۔

"تو چلو پھر نیچے اتریں انتظار کس بات کا ہے؟" میں نے کہا ڈھلوان پر آنے کے بعد ہم چاروں اٹھ کر کھڑے ہو گئے کیونکہ یہاں سے دیکھ لیے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ ہم تیز رفتاری سے نیچے کی جانب اترنے لگے۔ مہرجی کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی۔ غیر محسوس سی۔

ہم نیچے اتر رہے تھے اور پلٹ پلٹ کر اپنے عقب میں بھی دیکھ رہے تھے کہ کہیں دشمن تو سر پر نہیں آگئے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم اس نالے کے کنارے پھیلے درختوں اور جھاڑیوں تک پہنچ گئے۔

"رکیں نہیں آگے بڑھیں ہمیں فوراً دوسری جانب پہنچنا ہے۔" مہرجی نے تیز لہجے میں کہا اور قدم جھاڑیوں کی طرف بڑھا دیے ہم بھی اس کے پیچھے بڑھ گئے۔

جھاڑیاں اس قدر گھنی تھیں کہ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال ہم نالے کے بالکل کنارے پر پہنچ گئے۔ پانی بالکل صاف اور شفاف تھا یہاں تک کہ تھوڑے فاصلے پر نالے کے درمیان سطح آب پہ نیچے پڑے پتھر تک دکھائی دے رہے تھے۔

"ادھر پانی کم ہے ادھر سے دوسری طرف جاتے ہیں۔" مہرجی نے انہی پتھروں کی جانب اشارہ کیا اور ہم اس طرف بڑھ گئے۔

"پہلے پانی پی لیں پیاس سے جان لبوں پر آرہی ہے۔" پروفیسر نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہاں پیاس تو واقعی لگ رہی ہے.... یہیں سے پی لیتے ہیں۔"

ہم چاروں ہی قطار میں بیٹھ گئے اور ہاتھوں کی مدد سے پانی پینے لگے۔ پانی اس قدر ٹھنڈا اور لطیف تھا کہ طبیعت نکھر گئی یوں لگا جیسے روح تک تر و تازہ ہو گئی ہو۔ مہرجی نے سر اٹھا کر عقبی پہاڑ کی چوٹی کی جانب دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا دشمن شاید ابھی تک وہیں تھے۔ ان کے چند ساتھی بھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے اس لیے یقین تھا کہ وہ ایک ایک قدم بڑا سوچ سمجھ کر آگے بڑھائیں گے۔

"آئیں...." مہرجی نالے میں اتر گئی۔ نالے کی گہرائی اچھی خاصی تھی لیکن یہاں سے پانی صرف ڈیڑھ دو فٹ گہرا تھا۔ شفاف پانی کی تہ میں بجری جیسے پتھروں کا بچھا فرش بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا کہیں کہیں ایسے بڑے پتھر بھی پڑے تھے جن کے سر پانی سے باہر تھے اور جو ابھی تک ٹکڑوں میں منقسم نہیں ہوئے تھے۔ ایسے پتھروں سے رگڑ کھانے کے باعث پانی میں سے ایسی آوازیں بلند ہو رہی تھیں جیسے جلترنگ بج رہا ہو۔

ہم ان پتھروں پر آگے بڑھتے رہے تقریباً نصف نالا طے کرنے کے بعد پتھروں کا یہ فرش ختم ہو گیا۔ آگے پانی کی گہرائی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا یقیناً یہاں سے گہرائی زیادہ تھی۔ مہرجی چونکہ ہم سے آگے تھی اس لیے پہلے وہی آگے بڑھی اور پانی اس کی کمر تک آگیا۔

"آجائیں پانی اتنا ہی گہرا ہے۔" مہرجی نے پلٹ کر کہا اور ہم تینوں آگے بڑھ گئے۔ ویسے یہ بھی ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا تھا۔ پانی اچھا خاصا سرد تھا اور اسی باعث مہرجی کی ران سے رسنے والا خون بالکل ہی تھم جاتا۔

"کیا ستم ہے کہ ایک لاش کی محبت میں ہم کہاں کہاں خوار ہوتے پھر رہے ہیں۔" اختر نے ایک دردیلی سرآہ بھر کر کہا۔

"اس میں لاش کا کوئی قصور نہیں بعض لوگوں کی قسمت میں ہی خواری لکھی ہوتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے چوٹ کی۔

"ہاں یہ بھی آپ نے ٹھیک ہی کہا۔ آپ نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا کہ آپ کے ساتھ یہ کچھ ہو سکتا ہے۔" اختر نے حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔

"میں اپنی نہیں تمہاری بات کر رہا ہوں۔"

"میں تو ایک جیتی جاگتی ہستی کی محبت میں خوار ہو رہا ہوں، صرف اس امید پر کہ کبھی تو وہ پتھر دل موم ہو گا.... اگر یہ امید نہ ہوتی شکیل صاحب تو میں کب کا ممی کے قصے پر لعنت بھیج کر واپس چلا گیا ہوتا۔"

"بکواس بند کرو۔" پروفیسر اچانک ہی اختر پر دھاڑے۔

"دریدہ دہن، منہ سے کچھ نکالنے سے پہلے کچھ سوچ سمجھ لیا کرو۔"

"کیوں میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے؟" اختر نے حیرت سے کہا۔

"کس پر.... کس کے قصے پر لعنت بھیج رہے ہو کچھ اندازہ ہے تمہیں! کیوں عذاب کو دعوت دے رہے ہو؟"

"لو کر لو بات! پروفیسر آپ بھی نا بس کمال کرتے ہیں۔ بھلا ایک صدیوں پرانی لاش کے متعلق کچھ کہہ دیا تو اس میں عذاب کو دعوت دینے کی کیا بات ہوئی۔"

"بس تم اپنا منہ بند کر لو۔ خبردار مریاقس کو لاش یا اس کے متعلق کچھ اور کہا تو...."

"واہ پروفیسر واہ! آپ تو یوں بگڑنے لگے جیسے مریاقس آپ کی محبوبہ ہو۔"

"اوہ.... او ملعون میں.... میں کہتا ہوں اپنا منہ بند کر لے۔ اپنی جان کے دشمن کیوں.... کیوں اپنی موت کو پکار رہا ہے۔" پروفیسر پھٹ پڑے۔

باقی آئندہ شمارے میں

★ "تو کیا کوئی ٹریننگ نہیں ہوئی اور پہلا پروگرام کیا تھا؟"

☼ "میرے پہلے پروگرام میں میرے ساتھ ایک اور کو ہوسٹ تھیں اور انہوں نے میرے ساتھ ہی جوائن کیا تھا اور ان کا نام بینش تھا اور ہمیں کہا گیا کہ آپ کو آن ایر جانا ہے.... البتہ ایک دن پہلے فون کر کے بتایا جاتا تھا کہ آپ کو کل آنا ہے۔ کیونکہ ہم لوگ ٹرننگ پہ تھے یہ ٹرننگ پریڈ نو مہینے چلا اور مجھے یاد ہے میں نے ان نو ماہ میں ایک دن بھی چھٹی نہیں کی' کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ میں شو کر کے گھر پہنچتی تھی کہ مجھے کال آجاتی تھی کہ فضا آپ فارغ ہیں تو آجائیے۔ ریکارڈنگ ہے۔ تو میں فوراً" چلی جاتی تھی اور آپ کو بتاؤں کہ اس ٹرننگ پریڈ میں آپ کو نہ تو سیلری ملتی ہے اور نہ ہی کوئی اور سہولت دی جاتی ہے تو میں نے تو اس نو ماہ کے پریڈ کو مکمل کر لیا جبکہ میری ساتھی چھوڑ کر چلی گئی۔ کافی ٹف پریڈ تھا۔ سب نے تعاون بھی بہت کیا اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملا"

★ "اور جب ٹریننگ ہوگئی اور مستقل ہوگئیں تو پھر کچھ ہینڈسم سیلری ملی کہ نہیں؟"

☼ "جب میرا ٹریننگ پریڈ پورا ہوا تو میں نے وہاں کے بلو بھائی سے بات کی تو انہوں نے ایف ایم 103 کے ڈائریکٹر سے بات کی (عمران باجوہ) اور جب میرے ہاتھ میں انہوں نے پہلا سیلری چیک دیا تھا وہ آٹھ ہزار کا تھا اور اس کو پا کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ وہ نو ماہ کی ٹف محنت کے بعد میری پہلی کمائی تھی۔ اس چیک کو میں نے کیش کرایا اور گھر جا کر وہ پیسے جب میں نے امی کے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ تو اس خوشی کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی کہ جو میری امی کو اور مجھے حاصل ہوئی تھی۔ 2005ء میں میں نے جوائن کیا اور اس سال کو میں کبھی نہ بھلا پاؤں گی۔"

★ "آپ کے پروگرام کا فارمیٹ کیا ہے؟"

☼ "فارمیٹ کچھ یوں ہے کہ پیر کا پروگرام ڈرائیو ٹائم ہوتا ہے اس میں فاسٹ میوزک اور تھوڑا رومانٹک میوزک ہوتا۔ مگر بالکل میلوڈی نہیں ہوتا۔ ساتھ ساتھ ٹریفک کے بارے میں بھی بتاتے جاتے ہیں۔ کوئی نئی ریسرچ آئی ہوئی ہوتی ہے تو اس کے بارے میں بتاتے ہیں اس شو میں میری کوشش ہوتی ہے کہ کم سے کم بولوں کیونکہ لوگ پہلے ہی بہت تھکے ہوئے گھر جا رہے ہوتے ہیں۔

منگل کے شو میں ایک گھنٹہ صرف میوزک کے لیے ہوتا ہے اس سے اگلے گھنٹے میں میرے فینز آتے ہیں۔ جو میرے شو میں میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ ہر ہفتے میرے ساتھ میرا ایک فین ہوتا ہے۔ جو میرے ساتھ آن ایئر جاتا ہے اور اس سے ہم کچھ تفریحی اور کچھ معلوماتی سوالات کرتے ہیں اور یہ سوالات ہمارے پروڈکشن انجینئر بنا کر دیتے ہیں۔ ہفتے کا پروگرام مکمل طور پر پاکستانی پاپ میوزک کا ہوتا ہے۔ اس میں نئے پرانے پاپ سونگ سنواتے ہیں۔ ساتھ ہی خواتین کے لیے کچن' میک اپ اور صحت کی اپ ڈیٹس معلومات بھی دیتے جاتے ہیں۔"

★ "اسکرپٹ پہلے سے تیار کرتی ہیں یا فی البدیہہ



بولتی ہیں؟"

☼ "FM-103 کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ ہمیں کبھی بھی اسکرپٹ کے لیے زور نہیں دیا جاتا بس ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کریں۔ اس کے لیے ہمارے پاس ہیلپر موجود ہوتے ہیں۔ جن کے ساتھ ایک گھنٹہ بیٹھ کر ہم ڈسکس کر لیتے ہیں۔"

★ "موڈ کا کچھ اثر ہوتا ہے؟"

☼ "بالکل ہوتا ہے۔ کبھی موڈ بہت اچھا ہوتا ہے اور شو کی تھیم جو ڈیزائن کی ہوئی ہے وہ سنجیدہ ہوتی ہے تو مکمل طور پر سنجیدہ تھیم نہیں لے جا پاتے اس طرح اگر موڈ سنجیدہ ہے دل اداس ہے اور شو کی تھیم بہت شوخ ہے تو ہم ایسا نہیں کر پاتے۔ تو اس لیے میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ میں گھنٹہ پہلے اپنے موڈ کے حساب سے ڈیسائیڈ کروں کہ مجھے شو میں کرنا کیا ہے۔"

★ "لائیو کالز بھی لیتی ہیں کیا؟ لوگ کس طرح بات کرتے ہیں؟"

☼ "ہاں جی بالکل لیتی ہوں۔ کبھی آپریٹر کے ذریعے سے اور کبھی ڈائریکٹ لے لیتی ہوں.... لوگ بہت پیار محبت سے بات کرتے ہیں۔ کبھی کسی نے غلط بات نہیں کی۔ کبھی کالرز اپنی بات کر لیتے ہیں کبھی ہم ان سے اپنی بات کر لیتے ہیں۔ لوگ اپنی پرسنل باتیں ہم سے شیئر کرتے ہیں اور ہم اپنے طریقے سے ان کو سمجھاتے ہیں۔ ہینڈل کرتے ہیں اور بڑے پیار سے ان کو واپس پروگرام کی طرف لے آتے ہیں اور جب بات نہیں سنبھل رہی ہوتی تو پھر کال ڈراپ کر دیتے ہیں۔"

★ "ایک آر جے میں کن خوبیوں کا ہونا بہت ضروری ہے؟"

☼ "ایک آر جے میں سمجھ داری کی ضرورت ہے۔ اعتماد کی ضرورت ہے اور اچھی آبزرویشن کی ضرورت ہے۔ مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ میں نیوز پیپرز کا مطالعہ کرتی ہوں۔ آن لائن ریسرچز کا مطالعہ بہت غور سے کرتی ہوں اور سب سے اچھا مشاہدہ تو یہ ہوتا ہے کہ گھر سے آفس تک آنے کے دوران روڈ پر جو چیز مجھے نظر آتی ہے خواہ وہ بسوں اور رکشوں پہ لکھے ہوئے

اشعار ہوں یا بل بورڈز ہوں۔ فقیر ہوں یا خاک روب ہوں سب کا بہت گہری نظر سے ــــ مشاہدہ کرتی ہوں ..... اس مشاہدے سے بہت سی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔"

★ "ہمارے یہاں ٹریفک بہت زیادہ ہوتا ہے کبھی ایسا ہوا کہ وقت پر ریڈیو نہیں پہنچ پائیں ایسے موقع پر کیا کرتی ہیں؟"

✳ "اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ٹریفک بہت ہوتا ہے۔ لیکن ہم گھر سے نکلتے وقت مارجن رکھ کر نکلتے ہیں۔ اگر مجھے چار بجے تک ریڈیو پہنچنا ہے تو میں ڈھائی پونے تین بجے گھر سے نکلتی ہوں۔ جبکہ ریڈیو اور میرے گھر کا راستہ 20' 25 منٹ کا ہی ہے اور اگر ایسا ہو کہ میں وقت پر نہ پہنچ سکوں تو پھر پروگرام آن ایئر نہیں جاتا۔ بلکہ بیک ٹو بیک میوزک لگا دیتے ہیں۔"

★ "گھر سے نکلتے وقت عین وقت پر ایسی کوئی بات ہو جائے جو ٹینشن کا باعث ہو تو پھر کیا کرتی ہیں؟"

✳ "پھر اس کے لیے ایک ہی طریقہ ہے کیونکہ میں بھی آخر انسان ہوں' تو موڈ کو بالکل نارمل کرنے کے لیے میں یہ کرتی ہوں کہ جب میں گھر کا دروازہ بند کر کے نکلتی ہوں تو اس کے بعد میرے کانوں میں ہیڈ فون ہوتے ہیں اور پھر میں اپنی مرضی کا میوزک سنتی ہوں اور پھر ٹینشن والی باتیں واش آؤٹ ہو جاتی ہیں اور گھر سے ریڈیو تک کا جو 20' 25 منٹ کا ٹائم ہوتا ہے وہ بہت ہوتا ہے اپنے آپ کو "کام ڈاؤن" کرنے کے لیے اور جب آفس پہنچتی ہوں تو نارمل ہو چکی ہوتی ہوں۔"

★ "ایف ایم سننے والوں میں زیادہ تعداد کن لوگوں کی ہوتی ہے۔ بزرگ' جوان یا بچے؟"

✳ "ایف ایم سننے والوں میں ینگ لوگ جو کالج یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں ان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ یا پھر وہ نوجوان جو جاب پہ جاتے ہیں وہ زیادہ سنتے ہیں اور میرا پروگرام "ڈرائیو ٹائم" تو بہت زیادہ سنا جاتا ہے۔ ہاں اگر ایلیٹ کلاس اور بزنس کلاس لوگوں کی بات کریں تو ان کے اسٹینڈرڈ مختلف ہوتے ہیں۔ باقی جو نارمل مڈل کلاس کے لوگ ہوتے ہیں وہ ایف ایم بہت زیادہ شوق سے سنتے ہیں۔"

★ "پہچان ہر انسان کی کمزوری ہوتی ہے اور جب کسی میڈیا سے تعلق ہو تو ضرور دل چاہتا ہے کہ لوگ ہمیں پہچانیں..... آپ کو آواز سے کسی نے پہچانا؟"

✳ "ایسا نہیں ہے کہ لوگ نہیں پہچانتے۔ مجھے کبھی کبھی لوگ میری آواز سے بھی پہچان لیتے ہیں اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور فون پر بات کرتے وقت انداز تھوڑا مختلف ہوتا ہے تو کہیں کھڑی ہو کر بات کر رہی ہوتی ہوں تو لوگ پہچان لیتے ہیں کہ ان کو ریڈیو پہ سنا ہے اور اس کے علاوہ ویب سائیڈ پر میرے انٹرویوز کے ساتھ میری تصاویر بہت ہیں تو جن لوگوں نے تصاویر دیکھی ہوتی ہیں وہ بھی پہچان لیتے ہیں۔"

★ "موڈی ہیں غصہ زیادہ آتا ہے یا کم.....؟"

✳ "مزاج کی نارمل ہوں' نہ بہت موڈی ہوں' نہ بہت زیادہ غصہ آتا ہے اور نہ بہت زیادہ برداشت ہے۔ غصہ آتا ہے تو کوشش کرتی ہوں کہ جلد از جلد ختم کر دوں ہاں اگر کسی کی بات بری لگ جائے تو دل میں رہ جاتی ہے اور اتنی جلدی نہیں جاتی کیوں میں بھی انسان ہوں اور دل سے کدورتیں دور کرنے میں وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔"

★ "گھرداری سے لگاؤ ہے؟"

✳ "بھئی یہ سوال تو آپ میری اماں اور میری ساس سے پوچھیں کہ وہ مجھے برداشت کرتی ہیں امی کے گھر میں ہمیشہ کچن میں کام خود ہی کیا۔ سسرال میں جا کر آرام مل گیا کیونکہ ساس یہ کام کرنے نہیں دیتیں۔ سسرال میں ملازم بھی ہیں' خانساماں بھی ہیں تو سسرال میں تو اپنی ساس سے درخواست کر کے کہ آج میں کھانا پکالوں کھانا پکاتی ہوں۔ سسرال میں تو میں بڑے مزے میں ہوں کوئی کام نہیں ہوتا مجھے۔"

★ "خوب..... شادی پسند کی ہے؟"

✳ "آدھی پسند ہے' آدھی ارینج ہے۔ کیونکہ میرے شوہر کزن ہیں اور بہت زمانہ ہو گیا تھا ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا' یہ کوئی 2003ء کی بات ہے کہ ایک شادی میں انہوں نے مجھے پسند کیا تھا اور میری پسندیدگی بھی کچھ ان کی طرف تھی۔ چونکہ عمریں کچی تھیں لہٰذا بڑوں تک بات نہ پہنچ سکی۔ پھر جب 2009ء میں میری دادی کا انتقال ہوا اور دادی کے بعد جو پہلی عید تھی اس میں یہ سب لوگ آئے تھے۔ تب میری ساس نے مجھے دیکھ کر فوراً" میرے امی ابو سے بات کی اور تقریباً" ایک ہفتے کے بعد ہماری بات پکی ہو گئی اور عید الاضحیٰ کی چاند رات کو ہماری منگنی ہو گئی۔ میرے میاں صاحب کا نام عابد جمیل ہے اور پراپرٹی کا بزنس ہے ان کا۔"

★ "زندگی کو کس انداز میں دیکھتی ہیں؟"

✳ "زندگی کے بارے میں یہ کہنا چاہوں گی کہ اب تک جتنی زندگی گزاری ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے اپنے حساب سے انسان کی زندگی بنتی ہے۔ یعنی بہت کچھ انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ اگر میں چاہوں کہ میری زندگی آسان ہو جائے تو آسان ہو جائے گی اور میں چاہوں گی کہ میری زندگی مشکل لگے تو وہ مشکل ہوتی جائے گی۔"

★ "سیاست' کھیل ان سے کچھ لگاؤ ہے؟"

✳ "میرے میاں صاحب سیاست کو بہت پسند کرتے ہیں' بہت انوالو رہتے ہیں۔ انہیں کھیلوں سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ آپ ہر وقت ان سے ان موضوعات پہ بات کر سکتے ہیں۔ جبکہ میں ان سب معاملات سے دور رہتی ہوں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے سیاست سے اور کھیلوں سے' ملک کے حالات کے بارے میں میں کچھ بھی سوچوں ـــــ اس کا فائدہ نہیں ہے' جب بڑے بڑے دانشور کچھ نہیں کر پا رہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔"

★ "وائس اوور کرنے کا اتفاق ہوا؟"

✳ "جی بالکل ہوا' وائس اوور کیا بھی ہے اور کرتی بھی ہوں۔ ہمارے ریڈیو کے لیے جو کمرشلز آتے ہیں ان میں اکثر میں میری آواز ہوتی ہے اور ریڈیو سے ہٹ کر کمرشلز نہیں کرتی البتہ اگر کوئی ڈاکومینٹری کے لیے کہتا ہے تو اس کے لیے وائس اوور کرتی ہوں۔"

★ "پیسہ ہے اس فیلڈ میں؟"

✳ "ہاں جی..... اس فیلڈ میں پیسہ بہت ہے لیکن اگر آپ ریڈیو کی حد تک رہیں گے تو کبھی بھی بہت پیسہ نہیں کما پائیں گے۔ کہتے ہیں کہ اگر میڈیا میں ترقی کرنی ہے تو ریڈیو اس کا پہلا قدم ہوتا ہے۔ پھر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ بہت وسیع فیلڈ ہے یہ۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو اس فیلڈ میں انوالو نہیں کیا ..... کیونکہ میں زیادہ وقت باہر نہیں گزار پاتی اور ابھی بھی جتنا وقت گزارتی ہوں مجھے لگتا ہے کہ بہت ہے۔"

★ "ریڈیو کی فیلڈ میں بھی بہت کشش ہے۔ لوگ اس میں آنا چاہتے ہیں کچھ کہنا چاہیں گی ان کے لیے؟"

✳ "ان کے لیے تو میں یہی کہوں گی کہ نوجوان ضرور آئیں اس فیلڈ میں کیونکہ جب تک نئے نہیں آئیں گے پرانے نہیں جا پائیں گے۔ لوگوں کو نئی آوازوں کی ضرورت ہے۔ یقیناً" آئیے اس لیے کہ ہر دور کے لوگ ہر دور میں نئے نئے آئیڈیاز کے ساتھ آتے ہیں تو لوگوں کی دلچسپی بڑھتی ہے اور لوگ زیادہ شوق سے ریڈیو سنتے ہیں بس ان کے لیے یہی کہوں گی کہ آئیے اپنے آئیڈیاز کے ساتھ' بھرپور اعتماد کے ساتھ اور جو بولنا چاہتے ہیں اعتماد کے ساتھ اور اچھے انداز کے ساتھ اس لیے کہ جو لوگ آپ کو سن رہے ہوتے ہیں۔ وہ بہت محبت سے آپ کو سنتے ہیں آپ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ ان کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بہت معنی رکھتا ہے۔"

★ "کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ آر جے تھوڑے روکھے انداز میں بھی بات کرتے ہیں تو لوگ تھوڑے سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں؟"

✳ "جی اس پوائنٹ پہ میں آنا چاہ رہی ہوں کہ اکثر و بیشتر ہم بہت روکھے ہو جاتے ہیں' بہت غلط باتیں بھی کر جاتے ہیں یہ سوچتے نہیں کہ آپ کو کوئی آئیڈیلائز کر کے بیٹھا ہے اور آپ کا کہا ہوا ایک ایک جملہ وہ اپنی زندگی میں اپلائی کرنے والا ہے تو اچھا بولیں اپنی زندگی بھی سدھاریں اور دوسروں کی بھی۔"

بہت شکریہ فضا۔

شعاع عمیر

## حدیث مبارکہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "سات گناہوں سے بچو۔

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا' جادو کرنا' کسی آدمی کا ناحق قتل' سود کھانا' یتیم کا مال ہڑپ کرنا' میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کرنا' پاک دامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگنا" (دوسروں کے ساتھ احسان کرنے سے انسان بری (حادثاتی) موت سے محفوظ رہتا ہے' پوشیدہ صدقہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا غصہ ختم ہوتا ہے اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے سے عمر میں برکت ہوتی ہے۔)

سونیا ربانی..... قاضیاں محلہ بالا

## عدالت کی نگاہ میں سب برابر ہیں

امام ابو یوسف عباسی سلطنت کے پہلے دور کے مشہور قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ ان کی عدالت میں ایک یہودی نے خلیفہ وقت ہارون رشید کے خلاف دعوا دائر کردیا۔ ہارون رشید کو مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ یہودی (مدعی) بھی موجود تھا لیکن وہ ہارون سے پیچھے ہٹ کر ایک طرف کھڑا تھا۔ مقدمہ کی سماعت سے پہلے امام ابو یوسف نے یہودی سے فرمایا۔

"تم آگے آکر مدعا علیہ کے برابر میں کھڑے ہو جاؤ۔ عدل و انصاف کی بارگاہ میں ایک کو دوسرے پر کوئی بڑائی حاصل نہیں۔ قانون عدل کے نزدیک سب لوگ برابر ہیں۔ آگے وہ ہوگا جسے اس کا حق آگے بڑھاوے۔"

اس مثالی کردار کے باوجود امام ابو یوسف کو اپنے منصب کی ذمہ داریوں کا کتنا احساس تھا۔ اس کا اندازہ اس دعا سے فرمائیے جو انہوں نے بالکل زندگی کے آخری لمحوں میں مانگی۔

"اے خدا! تو جانتا ہے کہ میں نے کسی مقدمہ میں کبھی کسی کی امارت و وجاہت یا سفارش کو ترجیح نہیں دی۔ کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا' عدل و انصاف کو قائم کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اے میرے مالک! اگر اس پر بھی مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے تو تیری بخشش و رحمت کا امیدوار ہوں۔"

ریحانہ علی..... کراچی

## خلیل جبران کا کہنا ہے

"جب میں ایک شفاف آئینہ بن کر تمہارے سامنے کھڑا ہوا تو تم مجھ کو دیر تک غور سے دیکھتے رہے اور تمہیں مجھ میں اپنی صورت نظر آئی' پھر تم نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں' لیکن در حقیقت تم نے مجھ میں اپنی ذات سے محبت کی ہے۔"

صبارانا سلیم..... ٹنڈو جان محمد

## کرنیں

☆ جب عقل کامل ہوتی ہے تو بولنا کم ہو جاتا ہے۔

(حضرت ابو بکر صدیقؓ)

☆ دعا مانگتے رہو کیونکہ ممکن اور ناممکن تو ہماری سوچ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔

(حضرت علیؓ)

☆ جس کا غصہ زیادہ ہے اس کے دوست کم ہیں۔

(حضرت داتا گنج بخش)

☆ کسی کے گرنے پر خوش نہ ہونا' کل پتا نہیں تیرے ساتھ کیا ہو۔

(حضرت علیؓ)

☆ جب دولت کی خواہش چھوڑ دو گے تو دولت مند بن جاؤ گے۔

(حضرت عبدالقادر جیلانی)

☆ عمر کی نصیحت کے لیے موت کافی ہے۔

(حضرت عمر فاروقؓ)

☆ تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے برے ہم نشین ہیں۔

(غوث اعظم)

سدرہ وزیر..... خوشاب بیل

## جنگ اور امن

کسی نے سقراط سے پوچھا۔

"جنگ کیا ہے؟ اور امن کیا ہے؟" سقراط نے جواب دیا۔

"امن وہ زمانہ ہے جب جوان بوڑھوں کی لاشوں کو کندھوں پر اٹھا کے قبرستان میں دفن کرتے ہیں۔"

اور جنگ وہ زمانہ ہے جب بوڑھے جوانوں کی لاشوں کو اپنے کمزور و نحیف کندھوں پر اٹھا کر قبرستان پہنچاتے ہیں۔

تمثیلہ اصغر..... گجرات

## عقل مندی کی باتیں

☆ غم کتنا ہی سنگین ہو' نیند سے پہلے تک ہے۔

☆ تنکے کو بھی حقیر نہ سمجھو' ورنہ وہ تمہاری آنکھ میں پڑ جائے گا۔

☆ اگر اللہ معاف کردے تو گناہ کیا ہے؟ اگر اللہ نامنظور کردے تو نیکی کیا ہے۔

☆ جب عذاب آنے والا ہو تو توبہ چھین لی جاتی ہے۔

☆ اگر انسان کو گناہ سے شرمندگی نہیں' تو توبہ سے کیا شرمندگی۔

☆ نصیحت کرنے والا مخلص نہ ہو تو' نصیحت بھی ایک پیشہ ہے۔

☆ ہر چیز کو عزت کے ساتھ رہنے دیا جائے تو اپنی عزت بھی قائم رہتی ہے۔

(واصف علی واصف کی "بات سے بات" سے انتخاب)

امبر گل..... جھنڈو

## راز

زندگی کچھ نہیں
احساس محبت کے بغیر
جیسے جنگل کی ہوا
کس نے پہچانا اسے
دیکھتا کوئی نہیں ہے اس کو
چاہتا کوئی نہیں ہے اس کو
تیری قربت میں

یہی راز کھلا ہے مجھ پر
آدمی خاک ہے چاہت کے بغیر
زندگی کچھ نہیں احساس محبت کے بغیر

(شاعر میر ظفر حسن)

آصفہ..... کراچی

## مشاعرہ

مشاعرہ ایک تقریب "ایک پروگرام" ایک تماشے کی حیثیت سے مختلف سامعین کے ذوق اور توفیق کی سطح پر ہماری تہذیبی زندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کوئی اس کا کم شوقین ہے' کوئی زیادہ' کوئی ٹکٹ بھر کر مشاعرہ دیکھتا اور سنتا ہے' کچھ لوگ ضبط اور بعض لوگ اصولاً" مشاعرے سے کتراتے ہیں۔ مثلاً" ہمارے "مصری خان گجر" حالانکہ خود شاعر ہیں' مگر مشاعرے کا نام سن کر خون ان کی رگوں میں جم جاتا ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ میں برے شعر کو تو گوارا کرلیتا ہوں' مگر مشاعرے میں شعر پڑھتے وقت بعض شاعروں کی مشکلوں کا مسخ ہونا میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ایک نحیف و نزار بڑے نامی "مشاعرہ اسٹار" شاعر کے بارے میں

فرماتے ہیں کہ جس جان کنی سے وہ اپنے مصرعوں کو اونچی سروں میں لاتے ہیں ڈر لگتا ہے کہ خود بھی کسی مصرعے کے ساتھ نہ اڑ جائیں یا دفعتاً" کمر سے ٹوٹ کرنہ گر پڑیں۔
(سید ضمیر جعفری کی تصنیف سے اقتباس)

سیدہ پریل شاہ ڈاڈاہی... بکیرا شریف سندھ

## بولتے لفظ

☆ انسان کا اللہ سے قریب ترین رشتہ آنسوؤں کا ہے۔
☆ آنسو قرب کا ثبوت ہیں' جب روح کا روح سے وصال ہوتا ہے تو آپ کے آنسو آجاتے ہیں۔
☆ لوگ دوست کو چھوڑ دیتے ہیں' بحث کو نہیں چھوڑتے۔
☆ لوگ حکمراں بننا چاہتے ہیں' لیکن بنے ہوئے حکمرانوں کے خلاف نفرت رکھتے ہیں۔
☆ زبان وہ بات کہہ ہی نہیں سکتی جو سلوک سے بیان ہوتا ہے۔
☆ آپ کسی کے الفاظ یا گفتگو سن کر یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس پیشے سے تعلق رکھتا ہے۔
☆ جب تک سچے لوگوں کی اکثریت نہیں ہوتی جمہوری فیصلے غلط ہیں۔
☆ بے بس کی آنکھ سے ٹپکنے والا آنسو کتنی ہی عبادتوں پر فوقیت لے جاتا ہے۔

تانی چوہدری... آکسفورڈ یوکے

## بھول جاؤ

بھول جاؤ کہ اپنے ماضی میں کیا رکھا ہے
یہی نا! دو چار ملاقاتیں
اور کچھ اداس شامیں
چند ٹوٹی ہوئی امنگیں
فون کی چند بے ربط کالیں
اور کیا ہے اپنی ماضی میں
بھول جاؤ

(علیم اقبال)

فوزیہ ثمریٹ... گجرات

## ہم غافل نہیں

کچھ دنوں تو ہم لوگوں سے سائنس اور صنعت و حرفت وغیرہ کی باتیں سنتے رہے' لیکن ایک دن ہم سے رہانہ گیا' ہم نے کہا کہ یہ کیا آپ لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اس میں بہت کام کیا ہے۔

ہمارے حکیم نے ایک صاحب کی بدہضمی کی فوراً" تشخیص کردی کہ تم نے تربوز بہت کھایا ہے' محض عقل اور قیافے کے زور سے اور محض یہ دیکھ کر مریض کے اردگرد تربوز کے چھلکے بکھرے تھے۔ اسٹرانومی یعنی علم ہیئت میں اب بے شک روس اور امریکہ وغیرہ کے حوصلے کھل گئے ہیں' کیونکہ ہم میدان میں نہیں رہے ہیں' ہماری توجہ دوسرے ضروری امور کی طرف ہے' ورنہ ہمارے مدرسوں میں درس نظامیہ میں علم ہیئت بھی پڑھاتے تھے۔ ایک صاحب کو دلچسپی پیدا ہوئی' بولے کہ یہ علم ہیئت کہلو اور کوپر وغیرہ والا؟ ہم نے استہزائیہ ہنسی ہنس کر کہا کہ یہ لوگ تو ابھی کل کی پیداوار ہیں' ہمارے حکماء نے ان سے صدیوں پہلے ستاروں اور سیاروں وغیرہ کا سراغ لگالیا تھا' بلکہ ستارے دیکھے ہی نہیں یہ بھی تحقیق کیا کہ ان کا رفتار زمانہ پر اور لوگوں کی قسمتوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے ہاں اب بھی بے شمار تصانیف از قسم جنتریاں موجود ہیں' بلکہ بعض ادارے تو سال کے سال نئی جنتریاں چھاپتے ہیں' جس میں برج حمل' برج عقرب وغیرہ کے ساتھ ساتھ خوابوں کی تعبیریں' فال نامے وغیرہ درج رہتے ہیں' جابجا زائچے بھی دیے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان میں صابن سازی اور بوٹ پالش بنانے اور پونڈ کریم اور قدرتی رنگ کا خضاب وغیرہ تیار کرنے کے نسخے بھی دیے ہوتے ہیں جس سے اس گماں کی ایک حد تک تردید ہوجانی چاہیے کہ ہماری توجہ صنعتوں کی طرف نہیں ہے اور ہم محض خیالی باتیں کرتے ہیں۔

(ابن انشاء کی کتاب... آوارہ گرد کی ڈائری سے اقتباس)

صبا... کراچی

## دولت اور بیوی !!

ایک ارب پتی نے اعتراف کیا انٹرویو کے دوران کہ اس کو دولت بیوی کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔
"دولت اور بیوی کی بدولت؟"
"جی ہاں میں یہ جاننے کے لیے ہمیشہ متمنی رہا کہ بیوی کو خوش اور مطمئن رکھنے کے لیے کتنی آمدنی ہونی چاہیے... ابھی تک متمنی ہوں۔"

اسماء... لاہور

## اشعار

جو پیرہن میں کوئی تار محتسب سے بچا
دراز دستی پیر مغاں کی نذر ہوا

اگر جراحت قاتل سے بخشوا لائے
تو دل سیاست' چارہ گراں کی نذر ہوا

ریحانہ علی احمد... کراچی

## ہری مرچیں

☆ ندا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہارا شوہر دیوالیہ ہوگیا ہے؟"
حنا۔ "صحیح سنا ہے اور اب وہ اتنے پریشان ہیں کہ غم غلط کرنے کے لیے مجھے اور بچوں کو لے کر دنیا کے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

☆ "تم اپنے اخراجات کا کس طرح سامنا کرتے ہو میرے دوست؟"
"میں نہ کسی کا سامنا کرتا ہوں' نہ پیچھا' یہ تو میری بیوی ہے جو روزانہ نت نئے اخراجات سے مجھے متعارف کراتی رہتی ہے۔"

ثنا معین... کراچی

## قوس قزح سے رنگ چرائیے

☆ دوسروں کی خوشیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر یہ مت بھولیں کہ آج جس عمارت کی بنیاد آپ نے چوری کی اینٹ پر رکھی ہے وہ کبھی نہ کبھی ضرور گرے گی۔ اور کسی کے اوپر نہیں بلکہ آپ کے اپنے اوپر۔
☆ دریا اور زندگی دونوں پر بند باندھنا پڑتا ہے' تاکہ وہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔ دریا پر مٹی کا بند اور پیکر خاکی پر ضبط کا بند درکار ہے۔
☆ امید ایک چھاؤں ہے' جو اپنے دامن میں انسان کو پناہ دے کر مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے سے بچاتی ہے۔
☆ بعض رشتے اتنے اہم ہوتے ہیں کہ جنہیں بدلتے ہوئے پل صراط پر سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔
☆ روح کی گہرائی سے نکلی ہوئی بات' روح کی گہرائی تک ضرور جاتی ہے۔
☆ عشق میں آدمی پاگل ہو سکتا ہے' مگر پاگل پن میں عشق نہیں ہو سکتا ہے۔
☆ خواہشیں اس تپتے صحرا کی طرح ہیں جس پر پاؤں رکھنے سے سوائے آبلوں کے کچھ نہیں ملتا۔
☆ ہر عمل کھوکھلا ہے جب تک محبت نہ ہو۔
☆ سمندر کی حدود ہوتی ہیں' لیکن جذبہ عشق لامحدود ہوتا ہے۔
☆ اپنے دوستوں کو آزمائش کے بعد محبت کی آہنی زنجیروں میں جکڑ لو' لیکن کسی ناآسودہ نئے ساتھی کے ساتھ ملاپ نہ رکھو۔
☆ مصروفیات اپنے اصل سے فرار کا دوسرا نام ہے۔

نوشین اقبال نوشی... گاؤں بدر مرجان

☆ ☆

مہوش ـــــــــــ کراچی

زباں سے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

امبر ـــــــــــ کراچی

محبت میں محبت کی گواہی دے رہے ہیں ہم
عجب آشنا ہے عذرِ آشنائی دے رہے ہیں ہم

مان جٹ، سدرہ سویٹی ـــــــــــ عبدالحکیم

ہر جرم میری ذات سے منسوب ہے محسن
کیا میرے سوا شہر میں معصوم تھے سارے

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــــــ گجرات

ہم نے ہر دکھ کو محبت کی عنایت سمجھا
ہم کوئی تم تھے کہ زمانے سے شکایت کرتے

ثمرہ، اقراء ـــــــــــ کراچی

ابھی خرید لیں دنیا کہاں کی مہنگی ہے
مگر ضمیر کا سودا برا لگتا ہے

راحیلہ ـــــــــــ لالہ موسیٰ

عدم خلوص کے بندوں میں اک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

شگفتہ خان ـــــــــــ بھلوال

گلے ملے، نہ میسر تمہاری دید ہوئی
تم ہی بتاؤ، یہ "محرم" ہوا کہ "عید" ہوئی

یاسمین کنول ـــــــــــ پسرور

جس کو معلوم نہیں منزلِ مقصود اپنی
کتنا بے کار ہے اس شخص کا چلتے رہنا

لائبہ، ایمن ـــــــــــ آزاد کشمیر

اک دل کا درد ہے کہ رہا زندگی کے ساتھ
اک دل کا چین تھا کہ سدا ڈھونڈتے رہے

عذرا ناصر ـــــــــــ کراچی

یوں تو پتھر کی بھی تقدیر بدل جاتی ہے
شرط یہ ہے کہ اسے دل سے تراشا جائے

اقصیٰ ـــــــــــ کراچی

ضرورت ہو نہ ہو اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے
جنہیں ہو مانگنا وہ حسب عادت مانگ لیتے ہیں
ابھی ہم خیریت بھی پوچھنے نہیں پاتے ان کی
اور وہ آتے ہی جانے کی اجازت مانگ لیتے ہیں

رباب آفاق ـــــــــــ کراچی

نہ راستے ہی میں ٹھہریں نہ اپنے گھر جائیں
یہ فیصلے کی گھڑی ہے، چلو بکھر جائیں
تیرا وجود بھی سچ ہے مگر ہمیں تجھ سے
وہ عشق ہے کہ تجھے سوچ کر ہی مر جائیں

جاسمہ مریم نوید ـــــــــــ کراچی

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

صغریٰ ـــــــــــ محراب پور

ذکر اس کا ہی سہی بزم میں بیٹھے ہو فراز
درد کیسا ہی اٹھے ہاتھ نہ دل پہ رکھنا

مہوش ـــــــــــ شیخوپورہ

مجھ سے وہ پوچھتے ہیں درد کہاں ہوتا ہے
اک جگہ ہو تو بتاؤں کہ یہاں ہوتا ہے

عظمیٰ ـــــــــــ کراچی

غم کی تصویر بنے درد کا افسانہ بنے
تیری دنیا میں چلے آئے تو کیا کیا نہ بنے

نسرین ـــــــــــ اسلام آباد

یار دو نئے موسم نے یہ احسان کیے ہیں
اب یاد مجھے درد پرانے نہیں آتے





تمثیلہ اصغر ـــــــــــ گجرات

دوستوں کے ہجوم میں ناصر
میرے اندر کا شخص تنہا ہے

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــــــ گجرات

سمو لیے ہیں زمانے کے غم تبسم میں
زمانہ اس پر بھی برہم ہے کیا کیا جائے
عظیم تر ہے عبادت شباب کی لیکن
یہی گناہ کا موسم ہے کیا کیا جائے

نزہت جاوید ـــــــــــ کراچی

تمام عمر عذابوں کا سلسلہ تو رہا
یہ کم نہیں ہمیں جینے کا حوصلہ تو رہا

صابرہ یار محمد ـــــــــــ اسلام آباد

کہا تھا کس نے کہ عہد وفا کرو اس سے
جو یوں کیا ہے تو پھر کیوں گلہ کرو اس سے
یہ اہلِ بزم تنک حوصلہ سہی پھر بھی
ذرا فسانہ دل ابتدا کرو اس سے

ثمرہ، اقراء ـــــــــــ کراچی

مرے خدا مجھے طارق کا حوصلہ ہو عطا
ضرورت آن پڑی کشتیاں جلانے کی

آسیہ جاوید ـــــــــــ علی پور چٹھہ

عزم راسخ ہو تو دیتی ہے صدا خود منزل
حوصلہ ہو تو کوئی راہ بھی دشوار نہیں

نسرین حنان ـــــــــــ کراچی

عین وصل میں بھی مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب

ریحانہ ـــــــــــ نواب شاہ

شکستہ دل تھے مگر حوصلہ نہ ہارا تھا
شکستہ دل ہیں مگر حوصلے بھی اب کے گئے

فرزانہ ـــــــــــ کراچی

زندگی پھیلی ہوئی تھی شامِ ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

سونیا ربانی ـــــــــــ قاضیاں محلہ بالا

اب تو ہاتھوں سے لکیریں بھی مٹی جاتی ہیں
اس کو کھو کر تو میرے پاس رہا کچھ بھی نہیں

انعم ـــــــــــ لاہور

اس شہرِ غم کو دیکھ کے دل ڈوبنے لگا
اپنے پہ ہی سہی، کوئی ہنستا دکھائی دے

ارم رومان ـــــــــــ عبدالحکیم

سردیاں، بارشیں، ہوا، چائے کا کپ
وہ تجھے یاد آ رہا ہو، شام ہو
یا الٰہی ایسے لمحے سے بچا
وہ مجھے یاد آ رہا ہو، شام ہو

سمیرا، عائشہ، فوزیہ ـــــــــــ ڈگری کالج ملتان

ہر اک شام نئے خواب اس پر کاڑھیں گے
ہمارے ہاتھ اگر تمہاری شال آ جائے
انہی دنوں وہ میرے ساتھ چائے پیتا تھا
کہیں سے کاش میرا پچھلا سال آ جائے

کرن فاطمہ ـــــــــــ تصور

زباں کا ورد ہوئے پر دل میں گھر نہ ہوئے
ہتھیلیوں پہ لکھے نام ہمسفر نہ ہوئے
عجب طریقہ ہے جاناں تجھے بھلانے کا
کہ تیری یاد سے اک پل بھی بے خبر نہ ہوئے

مریم سلیم ـــــــــــ ٹنڈو جان محمد

دل سے تیری یاد اتر رہی ہے
سیلاب کے بعد کا سماں ہے

عظمیٰ غلام نبی ـــــــــــ کراچی

ہم کو نہ دیکھو اس طرح، دیکھو ہمارے پاس تم
آئے تو تھے دریدہ دل، لوٹے تو بار فو گئے
ہم ہیں وہ نخلِ راستی، سائے میں جس کے تم کبھی
ٹھہرے تو ہم نفس ہوئے، گزرے تو مشکبو ہوئے

ندا، فضہ ـــــــــــ کراچی

خدا گواہ کہ خوشیاں بہت ملیں لیکن
میں کیا کروں جو اداسی ہی دل کے اندر ہو

نوشابہ منظور ـــــــــــ بھریا روڈ

ان کے آنے کا ہے امکان خدا خیر کرے
دل پر گزرے گا یہ طوفان خدا خیر کرے
وہ تو ہیں اونچے محلوں کے رہنے والے
اور میرا گھر ہے بیاباں خدا خیر کرے

بشریٰ محمود

رانی، کی ڈائری میں تحریر

ایک خوبصورت غزل

میری زندگی تو فراق ہے وہ ازل سے دل میں مکیں سہی
وہ نگاہِ شوق سے دور ہیں رگ جاں سے لاکھ قریں سہی

ہمیں جان دینی ہے ایک دن وہ کسی طرح وہ کہیں سہی
ہمیں آپ کھینچیے دار پر، جو نہیں کوئی تو ہمیں سہی

سر طور ہو سر حشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے
وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ کبھی سہی، وہ کہیں سہی

نہ ہو ان پہ جو مرا بس نہیں، کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں
میں ان ہی کا تھا ان ہی کا ہوں، وہ میرے نہیں تو نہیں سہی

جو ہو فیصلہ وہ سنائیے، اسے حشر پہ نہ اٹھائیے
جو کریں گے آپ ستم وہاں، وہ ابھی سہی وہ یہیں سہی

اسے دیکھنے کی جو لو لگی تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم
وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نشیں سہی

---

سدرہ وزیر، کی ڈائری میں تحریر

امجد اسلام امجد کی نظم

کوئی چاند چہرہ کشا ہوا،

کوئی چاند چہرہ کشا ہوا
وہ دھند تھی بکھر گئی
وہ جو حبس تھا وہ ہوا ہو
کوئی چاند چہرہ کشا ہوا تو سمٹ گئی
وہ جو تیرگی تھی چہار سو
وہ جو برف ٹھہری تھی روبرو
وہ جو بے دلی تھی صدف صدف
وہ جو خاک اڑتی تھی ہر طرف
مگر اک نگاہ سے جل اٹھے
وہ جو چراغ جاں تھے بجھے ہوئے
مگر اک سخن سے مہک اٹھے
میرے گلستاں، میرے آئینے
کسی جوشش نظر کے حصار میں
کسی خوش قدم کے جوار میں
کوئی چاند چہرہ کشا ہوا
میرا سارا باغ ہرا ہوا

---

آمنہ امتیاز، کی ڈائری میں تحریر

رفیع الدین کی غزل

محبتوں پہ بڑا قرض ناشنا کا تھا
کہ ایک پل کا تعلق بھی کس بلا کا تھا

بڑی خوشی تھی کہ سرتاپا روشنی تھے ہمیں
مگر یہ صاعقہ عمرِ گریز پا کا تھا

اسے وداع کے منظر میں ڈھونڈ لائے تھے ہم
پھر اس کے بعد تو اک فیصلہ ہوا کا تھا

لپٹ گیا مرے قدموں سے ناچتا موسم
عجب نہیں جو یہی راستہ صبا کا تھا



مہک رہا ہے شرابور تن بدن سارا
شجر سے یوں تو بڑا فاصلہ گھٹا کا تھا

جھکا وہ چہرہ، وہ زلفیں سمیٹتے ہوئے ہاتھ
گرہ میں دائم کی حلقہ تری ادا کا تھا

---

صبا رانا سلیم، کی ڈائری میں تحریر

فرحت عباس شاہ کی نظم

فراز،

میں نے تمہاری یادوں کو

شہر کے گلی کوچوں میں تقسیم کر دیا ہے
تاکہ آنے جانے والے لوگوں کی دھول
انہیں دھندلا کر دے
میں نے تمہاری محبت کو
بہت سارے لوگوں میں بانٹ دیا ہے
تاکہ ریزہ ریزہ ہو کر کمزور پڑ جائے
اور میں نے خود کو بہت ساری آنکھوں کے لیے
الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے
تاکہ جدائی کا دکھ
مجھے تلاش کرتا رہے اور کبھی کامیاب
نہ ہو سکے

---

ارم، کی ڈائری میں تحریر

فاطمہ حسن کی غزل

وفا سرشت ہوں دوری میں بھی محبت ہے
اکیلے رہنے میں لیکن بڑی اذیت ہے

یہ جاگتی ہے تو پھر دیر تک جگاتی ہے
مرے وجود میں سوئی ہوئی جو وحشت ہے

جہاں پہ عشق کی سرحد جنوں سے ملتی ہے
وہاں پہ آ کے ملے وہ اگر محبت ہے

بہت ہیں خواب مگر خواب ہی سے کیا ہوگا
ہمارے بیچ جو حائل ہے وہ حقیقت ہے

وہ دور آیا کہ وہ بھی گھروں کو چھوڑ گئے
جو سوچتے تھے کہ اب مستقل سکونت ہے

سمجھ رہے تھے مسافر قیام کو منزل
خبر نہیں تھی کہ آگے بھی ایک ہجرت ہے

بہت سے لوگ دلوں میں چھپائے بیٹھے ہیں
یہ فاطمہ ہی نہیں ہے جسے شکایت ہے

---

تمثیلہ اصغر، کی ڈائری میں تحریر

سعد اللہ شاہ کی غزل

دل سمندر میرا قاتل ٹھہرا
میں کہ اجڑا ہوا ساحل ٹھہرا

ایک آنسو میں سمٹ آیا ہوں
زندگی! میں تیرا حاصل ٹھہرا

اک ہوسناک معمہ ہوں میں
مجھ کو سمجھو کہ میں جاہل ٹھہرا

تم ہی منظر کو بدل کر دیکھو
میں ہوں نادم کہ میں کاہل ٹھہرا

کیا حقیقت ہے آنکھوں میں میرے
ہر تصور تیرا باطل ٹھہرا

---

ڈاکٹر سعدیہ زمان، کی ڈائری میں تحریر
راشدہ ترین کی غزل

تنہا میری ذات کہیں سے آجاؤ
سُن لو میری بات کہیں سے آجاؤ

دُشمن بازی جیت رہا ہے چپکے سے
ہونے کو ہے مات کہیں سے آجاؤ

کچی اینٹیں اور عمارت گارے کی
اور اُس پر برسات کہیں سے آجاؤ

دل کی بستی پر ہے خوف اندھیروں کا
ہو جائے نہ رات کہیں سے آجاؤ

کچی عمر میں اُس پر خواب محبت کے
کیا کیا ہیں جذبات کہیں سے آجاؤ

آنکھیں رستہ دیکھ رہی ہیں مدت سے
گردش میں حالات کہیں سے آجاؤ

موسم موسم لوگ بدلتے ہیں راشد
دل پر ہیں صدمات کہیں سے آجاؤ

---

اسماء پروین، کی ڈائری میں تحریر
آئرین فرحت کی غزل

انا کے خول سے باہر بھی آ کر دیکھ لیتے ہیں
بھلا وہ کیوں منائے ہم منا کر دیکھ لیتے ہیں

سُنا ہے منزلوں سے جا کے رستے پھر نکلتے ہیں
کسی رستے کو ہم منزل بنا کر دیکھ لیتے ہیں

جُدائی کا یہ بھرتا زخم بھی اچھا نہیں لگتا
یہی سچ ہے تو پھر اُس کو بُلا کر دیکھ لیتے ہیں

محبت زرد موسم سے لپٹ کر جب بھی روتی ہے
تو بالوں میں گلابوں کو سجا کر دیکھ لیتے ہیں

سبھی کچھ جانتے ہو اور پھر الزام دیتے ہو
تو رسموں کی کوئی دیوار ڈھا کر دیکھ لیتے ہیں

رُباب آفاق، کی ڈائری میں تحریر
سحر انصاری کی نظم

## کبھی کبھی،

کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوا کرتا ہے
جیسے لفظ کے سارے رشتے بے معنی
لگتی ہے کانوں کو اکثر
خاموشی!
آواز کے سناٹے سے بہتر
سادہ کاغذ
لکھے ہوئے کاغذ سے اچھا لگتا ہے
خوابیدہ لفظوں کو آخر
جاگتی آنکھوں کی تصویر دکھائیں کیسے
پلکوں پر آواز سجائیں کیسے
کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے تم میری نظمیں ہو
جن کو پڑھ کر کبھی کبھی میں یوں بھی سوچا کرتا ہوں
لفظوں کے رشتے بے معنی ہوتے ہیں
لفظ کہاں جذبوں کے ثانی ہوتے ہیں

---

☼ ☼



ریحانہ امجد بخاری

# مسکراتی کرنیں

## خوش قسمت

"صائمہ کی شادی ہو رہی ہے۔" ایک شخص نے اپنے دوست کو بتایا۔

"کون ہے وہ خوش قسمت آدمی جس سے صائمہ کی شادی ہو رہی ہے۔" دوست نے پوچھا۔

"خوش قسمت تو میں ہوں، اس نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔

زینب.... سرگودھا

## ناقابل برداشت

دو عورتوں کی ملاقات ہوئی تو ایک نے دوسری کو بتایا۔

"بہن! تم نے کچھ سنا؟ شازیہ کے شوہر کا دورہ قلب سے انتقال ہو گیا۔"

"ارے.... وہ کیسے؟" دوسری عورت نے پوچھا۔

"دونوں میاں، بیوی میں لڑائی ہو رہی تھی، اس دوران شازیہ نے اپنے شوہر سے فوری طلاق کا مطالبہ کر دیا۔" پہلی عورت نے بتایا۔

"اچھا.... تو وہ صدمے سے مر گیا؟" دوسری عورت نے اظہار خیال کیا۔

"ارے نہیں.... وہ اتنی زیادہ خوشی اچانک برداشت نہ کر سکا۔" پہلی عورت نے جواب دیا۔

راشدہ.... لاہور

## انوکھی خواہش

ایک وکیل نے اپنے دوست کو اپنی زندگی کے پر لطف واقعات سناتے ہوئے ایک مقدمے کا ذکر کیا، جس میں ایک عورت نے نان نفقے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"جناب اعلا! مجھے اپنے شوہر سے کچھ نہیں چاہیے، میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ میرا شوہر مجھے اسی حالت میں چھوڑ دے، جس میں اس نے مجھے پایا تھا۔"

"اور وہ حالت کیا تھی۔" جج نے پوچھا۔

"میں بیوہ تھی۔" عورت نے سر جھکا کر کہا۔

سکینہ احمد.... لاہور

## نارمل عادت

ایک عورت نے نفسیاتی علاج کے ماہر ڈاکٹر سے کہا۔

"اللہ کے لیے میرے شوہر کو سدھارنے کے لیے کچھ کیجیے۔ وہ سارا سارا دن ایک بہت بڑا ڈھول بجاتے ہوئے گھومتے پھرتے ہیں۔" ڈاکٹر بولا۔

"اسے خبط تو نہیں کہا جا سکتا۔ بالکل نارمل عادت ہے یہ۔ میں خود بھی کبھی کبھی ایک بہت بڑا ڈھول بجاتا ہوں۔" عورت نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ڈھول کے اندر بیٹھ کر۔"

فوزیہ ثمر بٹ، رانیہ عمران.... گجرات

## مانگنے کا انداز

ایک پڑھا لکھا بھکاری سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان خوب صورت جوڑا، ایک دوسرے سے باتیں کرتا ہوا اس کی جانب چلا آرہا ہے۔ بھکاری نے انہیں دیکھ کر بلند آواز میں صدا لگائی۔

"خدا تمہارا بھلا کرے، بے پناہ حقیقی مسرتیں تم

دونوں کی تلاش میں رہیں اور دنیا بھر کی کامرانیاں تمہارے پیچھے آئیں۔" نوجوان جوڑا بھکاری کو نظر انداز کرتا آگے بڑھ گیا تو بھکاری بڑبڑایا۔
"مگر خدا کرے تم ان سے محروم رہو۔"
شازیہ حبیب... شاہ پور

## نیا ریکارڈ

ایک تربیتی طیارہ ویرانے میں گر کر تباہ ہو گیا۔ تاہم پائلٹ پیراشوٹ کے ذریعے نیچے کودنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ براہ راست زمین پر نہ اتر سکا' بلکہ ایک درخت کی شاخ میں پھنس گیا۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد وہ آخر کار درخت سے اترنے میں کامیاب ہو گیا۔ نیچے کھڑا ایک دیہاتی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔
"میں آج ایک ریکارڈ قائم کرنے کے ارادے سے جہاز لے کر نکلا تھا' لیکن قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔" پائلٹ نے ٹھنڈی سانس لے کر تھکے ہارے انداز میں زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"ایک ریکارڈ تو بہرحال تم نے قائم کر دیا ہے۔" دیہاتی بولا۔
"وہ کیا؟" پائلٹ نے چونک کر کہا۔
"تم ایک ایسے درخت سے اترے ہو جس پر تم چڑھے ہی نہیں تھے۔"
دیہاتی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
شازیہ حبیب... شاہ پور

## قانون کی پابندی

شکار پر پابندی کے باوجود ایک شخص مچھلی کا شکار کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ وارڈن نے کہا۔
"تمہیں معلوم نہیں کہ سال کے اس حصے میں شکار کھیلنا منع ہے؟"
"ہاں بالکل معلوم ہے۔" شکاری نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔
"پھر تم بھی تم شکار کر رہے ہو؟" وارڈن نے غصے سے کہا۔
"وجہ یہ ہے جناب۔" شکاری نے جواب دیا۔
"جب شکار کا موسم آتا ہے تو مچھلیاں اچانک غائب ہو جاتی ہیں' لیکن جب شکار کا موسم ختم ہو جاتا ہے تو دریا میں ہر طرف مچھلیاں ہی مچھلیاں نظر آتی ہیں۔ اب آپ بتائیے ایسے قانون کا کیا فائدہ جس کی پابندی مچھلیاں نہ کرتی ہوں۔"
عظمیٰ شکور... لاہور

## شریف وہ ہے جسے....

بیوی نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔
"یہ کیا بات ہے کہ آپ کے دوست گھر آتے ہیں تو آپ بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ ان کے گلے ملتے ہیں۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ مگر.... جب میری سہیلیاں آتی ہیں تو آپ ذرا خوش نہیں ہوتے؟"
شوہر نے کہا۔
"میں اس وقت اور بھی زیادہ خوشی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کر سکتا ہوں۔ مگر آپ مجھے اپنی سہیلیوں سے ملنے کا موقع تو دیں۔"
روزی فہیم... میرپور خاص

## تجریدی آرٹ

ایک مشہور آرٹسٹ تجریدی تصویریں نہیں بناتے تھے' لیکن ان کے ایک شناسا نے بڑے اصرار سے فرمائش کی کہ وہ ان کا تجریدی پورٹریٹ بنا دیں۔ انہوں نے پورٹریٹ تیار کر کے اسٹوڈیو میں رکھا ہوا تھا۔ ایک روز ان کا ایک شاگرد اسٹوڈیو میں آیا تو اس نے دیکھا استاد صاحب پورٹریٹ کے سامنے سر پکڑے بیٹھے ہیں۔
"کیا بات ہے سر! کیا ان صاحب کو پورٹریٹ پسند نہیں آیا۔" شاگرد نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔
"نہیں! پورٹریٹ تو پسند آ گیا تھا۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ ناک کچھ ٹھیک نہیں بنی' اسے ٹھیک کر دیں۔" آرٹسٹ نے مردہ لہجے میں کہا۔
"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے سر۔ آپ ناک



ٹھیک کر دیں۔" شاگرد بولا۔
"ٹھیک تو میں کب کا کر چکا ہوتا۔ لیکن مجھے اب یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں نے ناک بنائی کہاں تھی؟" آرٹسٹ نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔
اسماء... کراچی

## چار دن کی چاندنی

ایک آدمی کی شادی کو چند روز ہی ہوئے تھے۔ وہ سسرال والوں کے حسن و سلوک اور خاطر مدارات سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنے سسرال کے مکان کے مین گیٹ پر ایک تختی لگا دی جس پر لکھا تھا۔
"سسرال جنت ہے۔"
اسی گھر کے دوسرے داماد نے' جس کی شادی کو کچھ عرصہ گزر چکا تھا' وہ تختی پڑھی تو اسی تحریر کے نیچے لکھ دیا۔
"چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے۔"
نور العین... لاہور

## حفظ ماتقدم

ایک خوش حال تاجر کو کسی معمولی جرم میں دو ہفتے کی قید یا دس ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ تاجر نے قید بھگتنے کو ترجیح دی تو اس کا ایک قریبی دوست حیران رہ گیا۔ اس نے تاجر سے کہا۔
"ایسی بھی کیا کنجوسی' جرمانہ ادا کیوں نہیں کر دیتے۔"
"ارے بھئی.... کنجوسی کی بات نہیں ہے۔" تاجر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
"دراصل آج ہی ہمارے باورچی نے چھٹی لی ہے' گھر پر رہوں گا تو بیوی کے ہاتھ کا پکا کھانا کھانا پڑے گا۔"
مصباح... نارتھ کراچی

## قابل فخر

ایک پانچ سالہ بچی سے نئی پڑوسن نے پوچھا۔
"تمہارے گھر میں کتنے بچے ہیں؟" بچی نے انگلیوں پر حساب لگا کر کہا۔
"پندرہ...."
"او ہو پندرہ بچے۔" پڑوسن نے حیرت سے کہا۔
"ان پر تو بڑا خرچ آتا ہو گا۔" بچی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"ہم بچوں کو خریدتے تھوڑی ہیں جو ان پر کوئی خرچ آئے۔" پھر سینہ تان کر بولی۔
"ہم انہیں پیدا کرتے ہیں۔"
فاریہ شعیب... کراچی

## حسرت

ایک مالک کا اپنے کتے سے خطاب۔
پیارے کتے!
تم صرف ایک کتے ہو۔ تم نے کبھی یہ تمنا نہیں کی کہ تم انسان ہوتے' میں انسان ہوں مگر تمنا کرتا ہوں کہ میں ایک کتا ہوتا' تم سونے جاتے ہو تو تین بار گدے کے چکر لگاتے ہو اور لیٹ کر گہری نیند سو جاتے ہو۔ مجھے سونے سے پہلے دروازوں میں تالے ڈالنا پڑتے ہیں۔ گھڑی میں چابی بھرنا پڑتی ہے۔ بلی کو باہر نکالنا ہوتا ہے۔ کپڑے بدلنا پڑتے ہیں۔ میری بیوی جاگ جاتی ہے اور بکواس کرنا شروع کر دیتی ہے' پھر بچہ اٹھ جاتا ہے۔ مجھے بچے کو چپ کرانا پڑتا ہے۔ میں دیر تک اسے ٹہلاتا رہتا ہوں۔ جب وہ سو جاتا ہے تو میں سونے کے لیے لیٹتا ہوں۔
تم جاگتے ہو تو اپنا جسم پھیلاتے ہوئے۔ گردن اکڑاتے ہو اور اٹھ بیٹھتے ہو۔ مجھے آگ جلانی پڑتی ہے۔ چولہے پر کیتلی رکھنی پڑتی ہے۔ بیوی کی گالیاں سننی ہوتی ہیں۔ پھر میں ناشتا کرتا ہوں' تم دن بھر لیٹے ہوئے مزے کرتے رہتے ہو اور آرام و سکون کا خوب دل کھول کر لطف اٹھاتے ہو۔ مجھے تمام دن کام کرنا پڑتا ہے۔ لوگوں کی جلی کٹی باتیں سننا پڑتی ہیں۔ آرام کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آتا۔ جب تم مرو گے تو مر ہی جاؤ گے' لیکن میں مروں گا تو مرنے کے بعد مجھے کسی دوسری جگہ جانا پڑے گا اور میں جانتا ہوں کہ وہ کون سی جگہ ہو گی۔
رباب آفاق... کراچی

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں ۱۹۸۱ء کے شمارے کے سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

شاہدہ.... لاہور

س - اگر خوش قسمتی کا دیوتا آپ کا در کھٹکھٹا رہا ہے اور آپ مقفل کمرے میں گہری نیند کی وادیوں میں گم رہیں تو بے داری کے بعد جب صورت حال کا پتا چلے تو آپ کیا کریں گے؟

ج - سمجھوں گا میری قسمت میں نہ تھا ایسا کچھ۔

شاہدہ نورین.... رحیم یار خان

س - ذوالقرنین بھیا؟ یہ تو بتائیں کہ عورت اگر سکون چاہے تو میکے چلی جاتی ہے، لیکن اگر مرد سکون چاہے تو کہاں جا سکتا ہے؟

ج - ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر۔

فرزانہ سلیم.... میاں چنوں

س - بے یقین راستوں پر چلنے کا فائدہ؟

ج - یہ بزنس نہیں ہے کہ فائدہ اور نقصان دیکھا جائے۔

ام البنین سبحانی.... کراچی

س - انسان، ہمت کب ہار بیٹھتا ہے؟

ج - جب مستقل نہلے پہ دہلا میں سوالوں کے جواب دینے پڑیں۔

ساجدہ نورین.... راجن پور

س -

تیری سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم، وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

ج - بالکل صحیح سمجھیں آپ، میری یہ عادت ہی ہے۔ (تبسم اور تکلم)

ریحانہ صابو کر.... ٹھٹھہ

س - بھیا۔ کیا صرف حوصلے سے انسان آگے بڑھ سکتا ہے؟

ج - ہمارا یقین ہے اس پر۔

ممتاز یار محمد.... لاہور

س - نین جی! جن پر اعتماد ہوتا ہے، وہی لوگ دھوکہ دے جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ج - اپنے ساتھ تو ابھی تک ایسا اتفاق نہیں ہوا۔

صومیہ عنایت.... پشاور

س - کتے، بلی اور گھوڑے میں سے زیادہ وفادار جانور کون سا ہے؟

ج - اتنی سی بات نہیں پتا.... تمہیں.... یا بلی سے ویسے ہی کوئی دشمنی ہے۔

منزہ اختر.... گوجرانوالہ

س - بھیا۔ سنا ہے کہ آپ پچھلے جنم میں مجنوں تھے، کیا واقعی؟

ج - صرف پچھلے جنم میں ہی کیوں؟

حسینہ تجمل حیدری.... پنڈدادنخان

س - نفرت کو محبت میں بدلنے کا طریقہ تو عنایت فرمائیں؟

ج - محبت صرف محبت۔



عامرہ نیر اقبال.... فیصل آباد

س - بھیا جی! ذرا جلدی سے روتے ہوئے کو چپ کرانے کا آسان طریقہ بتا دیجیے؟

ج - خوب صورت سا کوئی جھوٹ بول دیجیے۔

شبنم ملک.... کراچی

س - مسٹر ذوالقرنین! کوئی آپ کی تعریف میں سوال کرے تو آپ خوش ہو کر اور کوئی آپ پر تنقیدی سوال کرے تو آپ اناتپ کے کیوں جواب دیتے ہیں۔ امید تو نہیں ایسے بھنائے ہوئے سوال کا جواب ملے کیوں؟

ج - جواب حاضر ہے اب کیا خیال ہے۔

ریحانہ پروین.... کراچی

س -

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

شعر کا جواب شعر میں دیں۔

ج - آئیے بیٹھیے کہیے کیا ہے جی آپ کو کام
آئندہ شعر میں جواب مانگو گی۔

سعدیہ سلیم.... ملتان

س - بھیا! دماغ کو غیر حاضر رکھ کر جواب دیں۔ شریف بدمعاش کسے کہتے ہیں؟

ج - فلم کے ہیرو کو۔

عظمی سعید.... لاہور

س - آپ کی شادی کے بعد کرن والے کرن کتاب 'شادی بیاہ کے گیت' میں آپ کی شادی کی تصاویر دیں گے، اور آخر میں لکھیں گے۔ بشکریہ ذوالقرنین' جنہوں نے ہمیں کرن کتاب کے لیے تصاویر عنایت کیں؟

ج - یہ کرن والوں سے ذاتی خط و کتابت کب شروع ہوئی پہلے یہ بتاؤ؟

فرحین کوثر.... علی پور چٹھہ

س - اگر آئینہ ایجاد نہ ہوتا تو عورتیں میک اپ کیسے کرتیں؟

ج - یہ عورت سے کیا جانے والا سوال مجھ سے کیوں؟ اپنے آپ سے پوچھیں۔

نسرین قادری.... ٹھٹھہ

س سنا ہے ایک لڑکی تم سے پیار کے بجائے صرف ادھار مانگ رہی ہے۔ دونوں میں سے کیا دینا آسان ہے، سوچیے مت جلد جواب دیں؟

ج - اتنی جلدی میں تو صرف ادھار۔

عامی.... گوجرانوالہ

س - نین! عورتوں کی حکومت آ گئی ہے۔ اب مردوں کو بھی چوڑیاں پہنائی جائیں گی۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ پہننے کے لیے؟

ج - پہنا کون رہا ہے، پہلے یہ بتاؤ؟

طاہرہ حمید.... حافظ آباد

س - گھریلو زندگی میں ضد کو ضد سے ضرب دینے پر کیا حاصل ہوتا ہے؟

ج - بے سکونی۔

✲ ✲

# حسن و صحت

ادارہ

پیر انسانی جسم کا ایک اہم حصہ ہیں صاف ستھرے پیر شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ پیروں کی صفائی رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کے پیر خراب ہیں تو آپ جتنا بھی میک اپ کر لیں کسی کام کا نہیں لہٰذا آپ پیروں کو نظر انداز مت کیجیے۔ ان کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔

## آپ کے پاؤں اور ان کی حفاظت :

پاؤں کی اگر ٹھیک طرح سے حفاظت کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے پاؤں خوب صورت اور صحت مند نہ ہوں 'ہوا اور دھوپ. جس طرح سارے جسم کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح ہوا اور دھوپ جب پاؤں پر لگتی ہے تو یہ پاؤں کی تندرستی میں اضافہ کرتی ہے۔ آپ اپنے پاؤں کو روزانہ دھوئیں اور ان پر میل بالکل نہ جمنے دیں۔ اگر پاؤں کو ہوا نہ لگے تو آپ کے پاؤں درد کرنے لگیں گے۔ اگر روزانہ خاص کر یہ کام صبح کے وقت کیا جائے۔ اگر بازار سے آئی اور بہت تھکن محسوس کر رہی ہیں تو آپ نیم گرم پانی میں تھوڑا سا نمک ملا کر اس میں اپنے پاؤں تقریباً" دس پندرہ منٹ تک رکھیں۔ اس سے ساری تھکن دور ہو جائے گی۔

## پاؤں کی رنگت نکھارنا :

اگر آپ اپنے پاؤں کی رنگت نکھارنا چاہتی ہیں تو ایمونیا اور بلیچنگ پاؤڈر لیں اور ان دونوں کو ملا کر ان کا لیپ اپنے پیروں پر کریں اور تقریباً" بیس منٹ بعد اسے دھولیں ضرور فائدہ ہو گا۔ آپ جب رات کو سونے لگیں تو کسی اچھی سی کولڈ کریم سے پیروں کی مالش کریں اور سو جائیں۔ اس سے آپ کے پیروں کی جلد نرم و ملائم رہے گی اور یہ جو بدنما نظر آتی تھی اب خوب صورت نظر آئے گی اگر آپ پاؤں میں مہندی لگائیں تو یہ آپ کو بہت فائدہ پہنچائے گی۔

## سردیوں میں پیروں کی حفاظت :

سردیوں کے موسم میں اکثر خواتین کے پیر خراب ہو جاتے ہیں اور جگہ جگہ سے پھٹ جاتے ہیں اور ان میں سے خون رسنے لگتا ہے اور ایسا تب ہی ہوتا ہے جب اپنے پاؤں کی حفاظت ٹھیک سے نہیں کی گئی ہو۔ جب آپ دیکھیں کہ سردیاں شروع ہونے والی ہیں تو پہلے ہی سے ان کی حفاظت کرنا شروع کر دیں۔ روزانہ جب پاؤں دھوئیں تو کسی ایسی جگہ. جو کھردری ہو اپنے پاؤں اس پر رگڑیں۔ بازار سے بھی آپ کو ایسا کھردرا پتھر (اسفنج یا نائلون) مل سکتا ہے۔ جو خاص کر پاؤں دھونے کے کام آتا ہے اس سے بھی آپ اپنے پاؤں کی میل ہٹا سکتی ہیں۔ اگر آپ کے پاؤں پر میل اکٹھی ہو جائے تو پاؤں پھٹ جائیں گے اور خاص کر ایڑیوں کی حفاظت ضرور کریں۔ زیادہ تر سردیوں میں پاؤں یہیں سے پھٹتے ہیں۔ یہ عمل آپ روزانہ کریں پاؤں دھونے کے بعد اگر آپ تھوڑا سا تیل یا پھر ویسلین پاؤں پر لگائیں تو اس سے پاؤں پھٹنے سے محفوظ رہتے ہیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ یہ چیزیں لگانے کے بعد موزے اور جوتے پہننا ضروری ہیں۔ ان چیزوں میں چکناہٹ ہوتی ہے اسی لیے ان پر گرد و غبار جمع ہوتے رہتے ہیں جس سے پاؤں پھٹ جاتے ہیں۔ لہٰذا پاؤں کی حفاظت سردیوں میں بڑی احتیاط سے کرنی چاہیے۔

## پاؤں میں جوتے اور موزے پہننا :

اکثر نوجوان مرد اور خواتین ایسے بھی ہیں۔ جو گرمیوں میں بھی گرم قسم کی جرابیں اور جوتے یا پھر انہی سے ملتی جلتی چیز پہنے رکھتی ہیں جو کہ سردیوں میں پہنے جاتے ہیں حالانکہ یہ تو آپ سب جانتی ہیں کہ ہر چیز کا ایک ٹائم ہوتا ہے اور وہ چیز اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہے لہٰذا ہمیں گرمیوں میں جوتے 'موزے' نائیلون کی چپلیں اور ایسی ہی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ورنہ پاؤں کے لیے سخت نقصان دہ ہیں کیونکہ جب جسم میں گرمی پیدا ہو جائے تو یہ گرمی پاؤں سے پورے جسم میں منتقل ہوتی ہے۔ انسان کمزور پڑ جاتا ہے رنگ پیلا پڑ جاتا ہے اسے بھوک وغیرہ نہیں لگتی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیروں پر چھالے نکل آتے ہیں۔ گرمیوں میں پاؤں کا پسینہ باہر ہی نکل جانا چاہیے آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب آپ اپنے پیروں سے موزے اتارتی ہیں تو آپ کے پاؤں گیلے گیلے محسوس ہوتے ہیں اور آپ کے موزوں سے بھی بدبو آنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ آپ کے پاؤں کا پسینہ اندر ہی رہا اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اس کی بہ نسبت اگر آپ سردیوں میں موزے اور جوتے پہنیں تو یہ آپ کے لیے فائدہ مند ہیں گرمیوں میں آپ صرف چپلیں استعمال کریں۔

## ناخن اور میک اپ :

آپ کے ناخن بھی آپ کے میک اپ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ کو چاہیے کہ انہیں صاف ستھرا رکھیں اور ہر ہفتے انہیں تراشیں اور اگر ان میں میل پھنسا ہے تو اسے بھی صاف کریں۔ خاص کر انگوٹھے کے ناخن ہفتے میں دو بار ضرور کاٹیں۔ جب آپ کے ناخن صاف ہو جائیں تو آپ ناخنوں پر اپنی پسند کے مطابق نیل پالش لگا سکتی ہیں۔ اگر آپ لباس کی مناسبت سے لگائیں تو بہتر ہے۔ کیونکہ آپ کی شلوار کے پائنچے یا ساڑھی آپ کے پاؤں کی ناخنوں پر پڑتی ہے۔ اگر نیل پالش کا کلر بھی ایسا ہو تو بہت بہتر معلوم ہو گا اور آپ کے حسن میں چار چاند لگ جائیں گے۔ اس بات کا خیال رکھیں کہ نیل پالش ادھر ادھر بکھرنے یا پھیلنے نہ پائے پاؤں کی انگلیوں کی جلد پر بالکل بھی نہ لگے۔ ورنہ ساری سجاوٹ خراب ہو جائے گی۔ پاؤں کے ناخنوں کا میک اپ پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ آپ پاؤں کے ناخن اور ہاتھ کے ناخنوں پر جس کلر کا آپ نے لباس پہنا ہے۔ اسی طرح کی نیل پالش لگائیں ایسا نہ کرنے سے آپ کا سارا میک اپ خراب لگے گا۔

## پیروں کی ورزشیں :

تمام جسم کی ورزشیں کرنا ضروری ہیں۔ پیروں کی ورزش انسانی جسم کو چاق و چوبند بنا دیتی ہے۔ آپ کو پیروں کی چند ضروری ورزشوں کے بارے میں ہدایت دی جا رہی ہے۔ جن کے کرنے سے آپ کے پاؤں خوب صورت رہیں گے۔

آپ زیادہ سے زیادہ پیدل چلنے کی کوشش کریں اور خاص کر صبح کے وقت آپ ننگے پاؤں گھاس پر کھڑے ہو کر تھوڑا زور اپنے پاؤں کی انگلیوں میں آگے کی طرف ڈالیں اور پھر سیدھے ہو جائیں پھر آگے کی طرف انگلیوں پر زور ڈالیں۔ اس سے آپ کی انگلیاں اور پاؤں کے تلوے دونوں کو حرکت ملے گی۔ آپ اپنی دونوں ٹانگیں سیدھی کر کے زمین پر بیٹھ جائیں۔ اب آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ پیروں کی طرف بڑھائیں اور پھر اپنے دونوں پاؤں پکڑ کر اپنی جانب کھینچیے 'پھر چھوڑ دیں 'پھر کھینچیے یہ عمل آپ روزانہ تقریباً" دس مرتبہ کریں۔ آپ صبح ہی صبح اس طرح کا کوئی کھیل کھیلیں جس سے آپ کی ٹانگوں کو حرکت مل سکے۔ اس سے آپ کی ٹانگیں تندرست رہیں گی اور پیروں کا دوران خون تیز ہو گا. جس سے پاؤں کی خوب صورتی میں اضافہ ہو گا۔ آپ کسی دوسرے مددگار کو کہیں کہ وہ آپ کے پاؤں اپنی طرف آہستہ آہستہ کھینچے اور اس کے پاؤں آپ اپنی طرف آہستہ آہستہ کھینچیں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ کر یہ ورزش کریں۔

☆ ☆

## صباحت یاسمین...... کھاریاں

اس دفعہ کرن پندرہ تاریخ کو ملا' موہنی سی صورت والی ماڈل کی آنکھوں میں انتظار سا دکھا۔ یوں لگا وہ منتظر نگاہوں سے کسی آنے والے کی راہ تک رہی ہو۔

اداریہ کا پیغام مختصر' جامع اور عام فہم تھا' "وقت کی قدر اور مثبت سوچ"

اللہ تعالیٰ اردو کے عظیم نام اور ہمارے سرمایہ افتخار کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

حمد و نعت سے آنکھیں کیا فیض یاب ہوئیں' تن من ہلکا ہو گیا۔ بشریٰ رحمٰن نے اس عقیدت سے لفظوں کی مالا بنائی کہ آنکھیں از راہ تعظیم جھکی بھی رہیں اور از راہ الفت نم بھی رہیں۔

"ملاقات' دو کا پہاڑہ" اور "مجھ سے ملیے" میں مہوش افتخار سے ملاقات کو سب سے زیادہ انجوائے کیا۔

"اترے میری خاک پہ ستارے" میں وہی بار بار کی دہرائی جانے والی باتیں تھیں جو ہم اپنے ستاروں کی زبانی کئی بار سن چکے ہیں' سب کے خیالات' نظریات' توقعات وہی کے وہی ہیں۔

"دردل" نے اداس کر دیا' زری کا یقین جو اسے دھوکہ دے گیا' چھوٹے نے بڑا کام کیا' منصور حسین کو انگلی پکڑ کر بڑے غیر محسوس انداز میں ثانوی کرداروں کے جھرمٹ سے نکال کر مرکزی کرداروں کی صف کی طرف لایا جا رہا ہے۔

امید تھی کہ "اورے پیا" میں کوئی سرپرائز ضرور ہو گا مگر یہاں تو سرپرائز نہیں شاک تھا! بہرکیف بہت خوبی سے ادا کر رہی نایاب اپنے قلم کا حق' یکدم ہی ماہیر کی ماں کے وہ الفاظ یاد آئے جن میں حریم کے بچے کے اعضا کے متعلق بڑی بے تابی سے انہوں نے ماہیر سے استفسار کیا تھا۔ منگنی کا بھی مزا آیا۔ زرجان غیر ارادی طور پہ ہی ہمارے لیے اہم ہو گیا ہے اور اس کا کریڈٹ جاتا ہے ہماری باصلاحیت قلم کار کو' ظاہر ہے یہ ان کی بے پناہ صلاحیتوں کا ہی اعجاز ہے کہ قاری کو سب کچھ ہو بہو نظر آ رہا ہے جیسا وہ دکھانا چاہتی ہیں۔ پتا نہیں حریم نے ماہیر کو تسلی دی یا اسے احساس ندامت سے نکالنے کی کوشش کی مگر اس کے الفاظ نے دل موہ لیا۔

"ضوبار یہ ساحر" اچھا لکھ رہی ہیں' ناول کے نقوش کچھ کچھ واضح ہونا شروع ہوئے ہیں' چند ایک مقامات پہ آ کر دلچسپی کا گراف بہت نیچے تک آ گیا مگر بہرحال یہ ایک اچھا ناول ہے۔

"محبت دعا جیسی" ایک اچھی کاوش تھی۔ مگر کچھ نیا نہ تھا کزنز' لگاؤ' غلط فہمی' معافی تلافی اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے..... قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس سب کے باوجود عائشہ کی کوشش کو سراہنے کو جی چاہتا ہے۔

ناولٹ میں "ضرب ضمیر" بہترین تھا' "شناخت" کا اختتامی حصہ پڑھ کر دل میں سکون اتر آیا کہ وردہ (حقیقی نام جو بھی ہے) اتنے اچھے ساتھی کی ہمراہی میں آ گئی۔

عشنا جی! کمال کر دیا' لکھا تو آپ نے مختصر مگر دل میں گھر کر گئیں۔ "کرن کرن خوشبو" میں اردو کی آخری کتاب سے اقتباس کی کیا ہی بات تھی۔

"پروین شاکر کی نظم جو کلثوم آصفہ کی ڈائری کا حصہ ہے مجھے بھی بہت پسند ہے" "مجھے یہ شعر پسند ہے" سے کچھ خاص پسند نہ آیا۔

"مسکراتی کرنیں" میں کرسی کے فائدے اور "دستر خوان" سے اٹالین نوڈلز بیف کباب مزے کے لگے۔



فوزیہ یاسمین کو مبارکباد' ذوالقرنین بھائی سے refreshing سی ملاقات کے بعد نامے میرے نام تک آئی۔ ثمرین حبیب! بہت شکریہ۔ "حسن و صحت" کو دور سے ہی سلام کرنے پہ معذرت۔ ماں جی نے گھر کے پانچوں افراد کے ستاروں کا احوال رٹ ڈالا۔

کرن کا پہلا منی آرڈر موصول ہو گیا ہے۔ ناقابل بیان سی خوشی ہوئی ہے۔ کرن کا فون نمبر کیا ہے ضرور بتائیے گا مجھے لوگ رائٹر کہنے لگے ہیں اور میری مسکراہٹ گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ دسمبر میں خط بھیجا تھا مگر جنوری کے شمارے میں وہ نہیں آیا' اداسی ہو گئی ہے۔ اب اجازت دیں۔

## فوزیہ ثمروٹ' ہانیہ عمران..... گجرات

سال نو کا نیا شمارہ پندرہ کو ملا۔ سرورق برائیڈل ماڈل سویٹ لگی۔ سب سے پہلے مدیرہ صاحبہ کی باتیں پڑھیں' حمد باری تعالیٰ' نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھا۔

انٹرویوز سو سو ہی رہے۔ کبھی کبھی پتا نہیں کیوں یکسانیت نظر آتی ہے۔ "مجھ سے ملیے" "مہوش افتخار کچھ جانی پہچانی لگیں۔ "نیند پہ سلوٹ" ان کا زبردست ناول تھا۔

مکمل ناول "اورے پیا" رائٹر صاحبہ اب اس میں کیا چاہتی ہیں اور یہ ماہیر' فیفا کے گھر کیا لینے گیا۔ کچھ خاص ہی بات ہو گی۔ جس کا اگلی اقساط میں انتظار رہے گا۔ موبی کے بارے میں ہمارے سارے اندازے غلط ثابت کر دیے نایاب جی نے' پچھلی دو' تین قسطوں سے ناول ایک ہی جگہ رکا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں اب اس تحریر کو وائنڈ اپ ہو جانا چاہیے۔

ماہیر کے لیے پہلے کم پرابلمز ہیں جو اب فلک ناز کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اب ان کو کیا مسئلہ در پیش آیا ہے۔ جو ماہیر کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ زرجان بے چارے کی بھی تختی معاف کر دیں۔ اس کو بھی کسی حریم جیسی پیاری لڑکی کا ہم سفر کر دیں۔

"محبت دعا جیسی" یہ تحریر بھی گزارے لائق تھی۔ سو بار کی پڑھی ہوئی تحریر "کزنز کی محبت' رنجش' گلے' شکوے غلط فہمیاں اور اینڈ میں کڑی منڈا راضی تے کی کرے قاضی" والی مثل ہو جاتی ہے۔ ناولٹ میں سر فہرست "تعلیم یافتہ" اور "ضرب ضمیر" رہا۔

"ضرب ضمیر" ہمارے آج کل نوجوانوں کے لیے باعث عبرت ہے۔ فاخر جیسے مرد ہوتے ہیں۔ جو عورت بحیثیت عورت تعظیم و احترام نہیں دیتے صرف عورت سے جڑے رشتے' ناتوں کا عزت و احترام کرتے ہیں فاخر جیسے لوگ جو فیس بک' ایس ایم ایس کے غلط استعمال کو صرف ٹائم پاس سمجھتے ہیں۔ انہیں جب تک ٹھوکر نہیں لگتی ان کی عقل ٹھکانے نہیں آسکتی۔ بہت اچھا سبق دیا رائٹر نے اور رخسار پہ بہت غصہ آیا۔ ایک طرف تو وہ اپنے بھائی کو اونچا درجہ بھی دیتی ہے۔ ان کا احترام کرتی ہے اور ان سے ڈرتی بھی ہے پھر بھی ایک غیر مرد سے ملنے کی غلطی کر بیٹھتی ہے۔

بہرکیف ہر برائی کو ختم کرنے کے لیے کسی ٹھوکر کا لگانا ضروری نہیں ہوتا۔ اللہ نے عقل و شعور بھی تو دیا ہے۔

"تعلیم یافتہ" آج کے دور کی ڈری سہمی عورت کی داستان' عورت ہی عورت کو اجاڑ رہی ہے۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں' کہیں ساس کا رشتہ ظلم کا باعث بنتا ہے تو کہیں بہو رانی کی اذیت ناک داستان رقم ہے۔

ام ثمینہ کی ساس بھی آج کے دور کی تھیں کہ پتا نہیں آنے والی بہو کیا کر ڈالے۔ زندگی کی جمع پونجی نہ لوٹ لے جائے اور کچھ فہمیدہ کی خود پہ بیتی کہانی سے سنجیدہ بیگم نے اپنا رویہ سخت تر کر لیا۔ یہ ام ثمینہ کی اچھی تربیت اور تعلیم کا شعور ہی تھا کہ اس نے ساس کے برا سلوک کے بدلے اچھا برتاؤ کیا۔ شاید وہ بھی جانتی تھی آج جو بوئے گی کل وہی کاٹے گی۔

"شناخت" اس بار یہ سلسلہ کچھ خاص متاثر نہ کر سکا۔

"میری ساس بری نہیں" عنیقہ بیگ کی اچھی کاوش تھی۔ سمجھ دار بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں سسرال میں ان کے ساتھ جو مرضی ہوتا رہے وہ میکے میں بس سب اچھا کا جھنڈا لہراتی ہیں۔ اس تحریر میں ساس صاحبہ کا ڈر خوف ہی تھا کہ کہیں ان کا بیٹا سارے کا سارا بیوی کا نہ ہو جائے۔ بہو کو بے قصور سولی پہ چڑھائے رکھتی ہیں یہ سوچے سمجھے بغیر کہ

یہ بھی کسی کی اولاد ہے۔ اپنے ماں باپ، بہن بھائی سب ایک ہستی کے لیے چھوڑ کے آتی ہے۔ ہمیں ان کو بھی محبت، احترام اور گھر کا ایک فرد بنانا اور سمجھنا ہے۔

"عزم سال نو" عظمٰی جی کون ایسا کرتا ہے۔ ہر برائی کی جڑ یہ ہائی سوسائٹی کے لوگ ہیں۔ اگر ایسا ہونے لگے تو یہ مہنگائی اور بے روزگاری سے خودکشیاں، یہ قتل و غارت ختم نہ ہو جائے۔

"محبت ربط ہے" عجیب سرپھری تھی عمارہ سید، پتا نہیں یہ ہائی کلاس کی لڑکیاں اتنی فرسٹریشن کا شکار کیوں ہوتی ہیں۔ بھئی یہاں لوگوں کو کھانے کو نہیں مل رہا اور انہیں سب سے قیمتی چیز مل رہی ہے محبت اور وہ ناشکری کر رہی ہیں۔

مستقل سلسلے بھی اس بار سو سو ہی رہے۔

"کرن کرن خوشبو" شاعری میں اپنی غیر حاضری اچھی نہیں لگی اجازت چاہوں گی اس امید کے ساتھ سال نو ہم سبھی کے لیے خوشیاں کا ضامن ہو اور یہ جو ہمارے ذہنوں میں ڈر، خوف کی تھکاوٹ ہے ختم ہو جائے۔

## ام رومان...... عبدالحکیم

جنوری کی طویل، ٹھٹھرتی اداس راتوں میں کرن کا ساتھ دل و نظر کو نہایت ہی بھلا محسوس ہوا۔ ٹائٹل بس اچھا لگا۔ اداریہ اور حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد سب سے پہلے فوزیہ یاسمین کا "دست کوزہ گر" ڈھونڈ مگر نہ ملا پچھلے ماہ نمل کی حماقت پر بہت غصہ آیا یہ لڑکیاں بھی جذبات میں آ کر جانے کیسے کیسے فیصلے کر لیتی ہیں اور رومیلہ کے بھائی ابرار پر بھی بے حد غصہ آیا ناحق بے چارے الیان کو پریشان کر رہا ہے اب جانے وہ رومیلہ کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ پلیز آپی جان! رومیلہ کے ساتھ سب اچھا ہی ہونا چاہیے اور نمل کی شادی بھی جلد از جلد کروا دیں۔ اس کے بعد نبیلہ عزیز (مائی فیورٹ آپی) کا ناول "دیرِ دل" پڑھا بہت اچھا جا رہا ہے نبیلہ جی کیپ اٹ اپ! آپ کے ناولز میں تو ہم قارئین کی جان ہوتی ہے۔

پھر نایاب جیلانی کا "اور رے پیا" پڑھا آپی جی ناول زیادہ ہی طویل ہو گیا ہے پلیز اسپیڈ پکڑ لیں اور جلدی سے اچھا سا اینڈ کر دیں یہ مومی تو اپنی باتوں سے دہلا ہی رہا ہے ہمیں،

ضوباریہ ساحر کی سحرزدہ تحریر "مقید خاک" بے حد دلچسپ لگی بالکل انوکھی اور مزے دار اسٹوری ہے اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا اور رشک حبیبہ کا ناولٹ "ضرب ضمیر" بھی اچھا لگا۔ "کرن خان" اور "نیہا" سے ملاقات دلچسپ لگی اور "مجھ سے ملیے" میں مہوش افتخار سے مل کر بے حد خوشی ہوئی، مستقل سلسلوں میں اپنی غیر موجودگی پر بے حد افسوس ہوا۔

آپی ایک فرمائش ہے اگر آپ پوری کر دیں تو ایف ایم 103 فیصل آباد کے جے آر "مان" کا انٹرویو ضرور لیں جو کہ میرے ہم نام ہیں۔ اللہ تعالیٰ پیارے پاکستان کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے اور اسے بہترین حکمران عطا کرے۔ (آمین)

## امبر گل...... جھڈو (سندھ)

نیا سفر ہے، نئی منزلیں، نئے حالات
نہ ڈھونڈو گزرے ہوئے کارواں کے نقش قدم

سال 2012ء کی آمد کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے ہی خیالات بھی ہو چکے ہیں کہ ہر گھڑی یونہی محسوس ہو رہا ہے کہ اب کچھ ہو گا، محسوس تو ہوتا ہے کچھ نہ کچھ نیا ضرور ہونے والا ہے، حکومت کے جانے کی باتیں، پرائم منسٹر کی تبدیلی، میموگیٹ کا معاملہ، تحریکِ انصاف کی بڑھتی ہوئی مقبولیت وغیرہ وغیرہ جیسے معاملات۔ فیملی کے ساتھ بیٹھ کر بحث کرتے ہوئے ذرا بھی یہ احساس نہیں تھا کہ نئے سال کے آغاز میں ہی ایک اور عظیم نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا وہ بھی ساری قوم کو، جی ہاں میں بات کر رہی ہوں پاکستان کی پہچان، ارفع کریم کی، جو اتنی چھوٹی سی عمر میں ہی ہمیں چھوڑ کر وہاں چل دی کہ جہاں سے کوئی بھی کبھی بھی واپس نہیں آ سکتا، مگر شاید اللہ کو یہی منظور تھا سو اس کی مرضی کے آگے ہم انسان تو بے بس ہی ہیں اور کر بھی کیا سکتے ہیں دعائے مغفرت کے سوا مگر اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی ذہانت، اتنی شہرت بھی تو کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے نہ جانے کس حاسد کی نظر لگ گئی اللہ تعالیٰ اسے جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

قارئین سے ارفع کریم کی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔



اب کچھ تبصرہ جنوری کی کرن پر۔ ٹائٹل گرل مجھے بہت ہی پیاری لگی دوسروں کا پتا نہیں، جیولری بہت اچھی لگ رہی تھی، سب سے پہلے تو سارے کرن کا سرسری جائزہ لے ڈالا، جس سے ایک خوشخبری بھی ملی کہ فوزیہ جی کے بھی قدموں تلے جنت آ گئی ہے فوزیہ جی کو ننھی پری کی آمد بہت بہت مبارک ہو، ہماری بھانجی کا نام ضرور بتایئے گا فروری کے کرن میں۔

مکمل ناول، ضوباریہ صاحبہ کا تو ابھی پڑھا نہیں ہے اور "اور رے پیا" میں ہر قسط میں کوئی نہ کوئی نیا انکشاف تو ضرور ہوتا ہے پر نایاب اب آپ کو اس کے اختتام کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے کہ کبھی کبھار کی بے جا طوالت بھی اچھی بھلی کہانی کا ناس مار کے رکھ دیتی ہے۔ "محبت دعا جیسی" نے کوئی خاص تاثر تو قائم نہیں کیا مگر بس صحیح تھا ایک نئی رائٹر کے لیے تو اتنا لکھ لینا کہ نہ وہ کسی کو برا لگے اور نہ اچھا، بس درمیانہ سا، ہو تو وہ بھی بڑی بات ہوتی ہے، پلیز مائنڈ نہ کیجیے گا، رمشا کا "تعلیم یافتہ" بہت اچھا لگا، پھر سندس جبیں کا "شناخت" زبردست تحریر تھی، رشک حبیبہ کے "ضرب ضمیر" نے بہت مزا دیا، بہت ہی حساس اور ہمارے آج کل کے دور کے بے حد خطرناک المیے پر بہت بولڈ طریقے سے لکھا انہوں نے جو کہ اگر ایک طرف نوجوانوں کو آئینہ دکھا رہا ہے تو دوسری طرف ہماری صنف کے منہ پر بھی طمانچہ ہے۔

عنیقہ نے ہاٹ ایشو میرا مطلب ساس جیسے خطرناک ایشو کو چھیڑنے کی کوشش کی ہے اور یہ کہہ کر کامیاب بھی ہو گئیں کہ "میری ساس بری نہیں" اور واقعی برا تو وہ ڈر ہوتا ہے جو کہ ہر ماں کے دل میں ہوتا ہے کہ آنے والی بہو کہیں ہم سے ہمارا بیٹا نہ چھین لے، اچھی کاوش تھی، کیپ اٹ اپ عنیقہ! افسانوں میں "صراط مستقیم" میں صائمہ نے بہت اچھا میسج دیا ہے اب یہ ہم جیسے گناہ گاروں پر منحصر ہے کہ ہم کس حد تک سیدھے راستے پر چل سکتے ہیں وہ سیدھا اور سچا راستہ جو ہمیں ہمارے رب سے ملا دے گا، آپ بھی دعا کیجیے گا اور میں بھی کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمام امت مسلمہ پر اپنا خصوصی فضل و کرم فرمائے اور سب کو نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(آمین) عظمٰی کا "عزم سال نو" بھی اچھا لگا، عشنا سردار کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں، انشا جی کے لیے بشریٰ رحمٰن صاحبہ کا مضمون پڑھ کر بہت اچھا لگا، انٹرویوز میں "نیہا" اور "کرن خان" سے ملاقات سو سو رہی البتہ "مہوش افتخار" سے مل کر اور ان کی پسند ناپسند کے بارے میں جان کر اچھا لگا، سروے میں پہلے سوال کے جوابات، فرحت عباس شاہ، سید وصی شاہ اور ہمایوں سعید کے اچھے لگے، دوسرے سوال کے جواب میں تینوں نے بھی بالکل صحیح کہا کہ واقعی میڈیا وہ کچھ بھی دکھا رہا ہے جو کہ قطعاً "نہیں دکھانا چاہیے" اور وزیراعظم والی بات پر تو سب ہنس ہی سکتے ہیں کہ ہنسنے کے علاوہ پاکستانی قوم اور کر بھی کیا سکتی ہے، ازل سے مجبور قوم جو ٹھہری۔

"کرن کرن خوشبو" میں قطعہ "زہر" اور "سال نو" نظم اچھی لگی "نامے میرے نام" میں سب بہنوں نے میرے لیے جن خوب صورت اور نیک، مخلص جذبات کا اظہار کیا ہے اس کے لیے میں آپ سب کی شکر گزار ہوں اور آپ سب بھی میری دعاؤں میں شامل ہیں اور رہیں گے ہمیشہ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اب اجازت دیں اور اللہ سے دعا ہے کہ ہمارا کرن خوب ترقی حاصل کرے۔ (آمین)

## سدرہ، اقرا ارشد بٹ...... سیالکوٹ

بڑی امید کے ساتھ آپ کو یہ پہلا او [illegible] "آخری خط لکھ رہی ہوں۔ میرا یہ خط کرن میں ضرور شامل کیجیے گا۔ میرے خط لکھنے کی وجہ نایاب جیلانی کا ناول "اور رے پیا" ہے۔ پلیز نایاب جی زرجان اور حریم کی جوڑی ہی سوٹ کرے گی۔ اور نبیلہ جی! پلیز آپ اپنے ناول میں مریم اور عدیل کا ذکر [illegible] کیا کریں یہ میرے پسندیدہ کردار ہیں۔ پلیز نایاب جی میری ریکوئسٹ پر غور کیجیے گا۔

## ثوبیہ نصیر...... سیالکوٹ

میرا نام ثوبیہ ہے اور میں بی ایس (آنرز) کی طالبہ ہوں۔ شعاع، خواتین، کرن باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ اب آتے ہیں کرن کی طرف۔ ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ "کرن خان" کا انٹرویو پڑھ کے اچھا لگا۔ اس شمارے میں

شرکت کرنے کی وجہ نبیلہ عزیز کا ناول "دردِ دل" ہے۔ میری چچی جان کا پیغام ہے کہ پلیز علیزے کو ماورائی مخلوق نہ بنائیں نہ جانے کیوں انہیں پڑھ کر کسی اور ہی مخلوق کا گمان ہوتا ہے۔ دل آور شاہ اور زری کے بارے میں زیادہ لکھا کریں۔ باقی ساری کہانی بہت بہت اچھی چل رہی ہے۔

ویل ڈن 'نایاب جیلانی کا "اور یہ پیا" میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ فیفا کے ساتھ کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے۔ حریم اور ماہیر دونوں میرے فیورٹ کردار ہیں۔ ویل ڈن نایاب!

رمشا خالد کا ناولٹ "تعلیم یافتہ" بھی بہت اچھا تھا۔ تعلیم تو انسان کو اندھیروں سے نکالتی ہے۔ روشنی میں لے جاتی ہے اور یہ بات سچ ہے کہ محلے کی عورتیں واقعی بڑا دماغ خراب کرتی ہیں۔ چغلیاں کرنا تو خواتین کی فیورٹ ہابی ہے۔ رشک حبیبہ کے ناولٹ "ضرب ضمیر" کے بارے میں یہ کہنا چاہوں گی کہ واقعی میں 'ایسا ہوتا ہے'۔

یہ حقیقت ہے طالب علموں کی اکثریت اس سینالوجی کا غلط استعمال کرتی ہے۔ باقی سب بہترین ہے۔ اللہ تعالیٰ کرن کو خوب ترقی دے۔ اور اسی طرح یہ ہمارے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنا رہے۔ (آمین)

کرن فاطمہ...... قصور

آداب عرض ہے۔ ہم تو خوشی سے جھوم اٹھے یہ جان کر کہ ہم بھی کرن کی محفل میں داخل ہونے کے لائق ہیں۔ بھلا کرن کو کرن میں جگہ نہ ملے ایسا ہو سکتا ہے کیا؟ پر ہم نے محفل میں "نامعلوم" بن کر انٹری دی' چلو کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اللہ نے آپی فوزیہ کو ماں کا رتبہ عطا کیا۔ آپی آپ کو ڈھیروں مبارک باد ..... اللہ بچی کے بلند بخت کرے۔ (آمین)

میں چند عزیز رائٹرز سے ریکوسٹ کرتی ہوں کہ وہ کرن کے دروازے پر اب دستک دے دیں ان میں نبیلہ ابر راجہ اور نادیہ جہانگیر تو پہلے نمبر پر ہیں۔ فرحانہ ناز ملک کی اسٹوری "سوہرا تے جوائی" بھی بہت پر لطف تحریر تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ "مجھ سے ملیے" میں نبیلہ ابر راجہ سے ہماری ملاقات کرائی جائے اور ابرار الحق کا انٹرویو بھی دیا جائے۔ جاتے جاتے اتنا کہنا چاہوں گی کہ ہمیشہ اچھا سوچیں اور اچھا کریں اور انسانوں سے امید لگانے کی بجائے اللہ سے لو لگائی جائے اسی میں زندگی کا سکون پوشیدہ ہے۔

سائرہ ستار...... نامعلوم

کرن ڈائجسٹ کی دن دگنی رات چگنی ترقی کے لیے ہمیشہ سے دعاگو ہوں مگر ایک خاموش قاری نے بالآخر آپ سے رابطہ کرنے کی ہمت کر ہی لی۔ سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ آپ کے تینوں پرچوں کی تعریف کے لیے کون سے الفاظ کا انتخاب کروں کیونکہ کوئی کمی نہیں ہے ان میں۔ میں اس وقت سے ان کو پڑھ رہی ہوں جب مجھے لفظوں کا علم نہیں تھا اور ان لفظوں میں چھپے مفہوم سے بھی ناآشنا تھی۔ اس کے باوجود یہ تینوں پرچے ہمیشہ میرے زیر مطالعہ رہے ہیں۔ اس دوران بہت سی ایسی کہانیاں بھی نظر سے گزریں جو اب تک دل پر نقش ہیں اور یقیناً "ناقابل فراموش" ہیں میرے لیے' ان کہانیوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا کہ آج میں زندگی میں قدم قدم پر استفادہ کر رہی ہوں۔ رائٹرز میں عمیرہ احمد' نگہت عبداللہ' فائزہ افتخار اور رضیہ جمیل ہیں' جو کہ فیورٹ ہیں۔

سوچا کئی بار تجھے لکھوں اک غزل
لیکن دل نے پھر میرا ساتھ نہ دیا

ان تمام رائٹرز کے علاوہ بھی کئی ایسی کہانیاں شائع ہوتی رہیں کہ بے اختیار دل چاہا کہ اپنے احساسات قلمبند کروں مگر ہمت ہی نہیں ہوئی اور اب جس طرح نئی رائٹرز کو موقع مل رہا ہے سب قلم کا حق ادا کر رہی ہیں۔ میں نے بھی ایک کہانی لکھی ہے کیا میں وہ بھیج دوں؟ اوہ آئی ایم سوری میں نے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔ میں سائرہ ستار اور بی اے آنرز کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ میرے ابو ایک ٹیچر ہیں۔ سو مطالعہ کی عادت ہمیں بچپن سے ہی ہے۔ امید ہے آپ ہمیں اپنی اس محفل اور اس خوب صورت ڈائجسٹ کا حصہ بننے دیں گی اور اس کے علاوہ اس دفعہ کا تمام رسالہ ہی اچھا لگا۔ خدائے بزرگ و برتر آپ کے ادارے پر اپنا سایہ رحمت ہمیشہ رکھے آمین ثم آمین۔

✿ ✿ ✿